خطباتِ محمود

(خطباتِ عید الاضحیٰ)

فرمودہ

سیّدنا حضرت مرزا بشیر الدّین محمود احمد المصلح الموعود

خلیفۃ المسیح الثانی

جلد ۲

زیرِ اہتمام

خُطباتِ عیدُ الاضحیٰ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ۞ وَ عَلٰی عَبْدِہِ الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی دی ہوئی توفیق سے حضرت فضل عمر المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کے نہایت ہی لطیف اور پُر معارف خطبات کی دوسری جلد احباب جماعت کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

پہلی جلد حضرت المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کے خطبات عید الفطر پر مشتمل تھی۔ اس دوسری جلد میں خطبات عید الاضحیہ کا مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ان خطبات میں جو حوالہ جات آتے ہیں یا جو تاریخی واقعات اور علمی و ادبی نکات بیان کئے گئے ہیں ان کے اصل ماخذ کی نشاندہی کر دی جائے۔ اس سلسلہ میں جو حوالے نہیں مل سکے ان کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے تاکہ بعد میں حوالہ مل جانے پر اسے مکمل کر دیا جائے۔ ان خطبات کے عناوین مندرجہ فہرس تدوین کے وقت مضمون کی مناسبت سے تجویز کئے گئے ہیں تاکہ قارئین آسانی کے ساتھ استفادہ کر سکیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے ۱۹۱۴ء میں مسندِ خلافت پر متمکن ہونے سے لیکر ۱۹۵۸ء تک کے خطبات سلسلہ وار درج کئے گئے ہیں۔ ایک خطبہ خلافت سے پہلے کا ہے جسے ابتداء میں درج کیا گیا ہے۔ اس عرصہ میں حضور رضی اللہ عنہ نے جس سال خطبہ نہیں دیا یا اگر دیا ہے اور وہ کسی وجہ سے الفضل میں شائع نہیں ہو سکا، الفضل نے اس کا خلاصہ شائع کر دیا ہے تو اس کا اپنے اپنے مقام پر الگ طور پر ذکر کر دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور ہماری عاجزانہ دُعا ہے کہ وہ اس حقیر کوشش کو اپنے فضلوں سے نوازے۔ اسے ہمارے لئے دینی و دنیوی برکات کا موجب بنائے اور اس قیمتی خزانے سے صحیح رنگ میں فائدہ اُٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

"یہ صاف بات ہے کہ جتنا بڑا کوئی انسان بنتا ہے اُتنی ہی زیادہ اُسے اس مرتبہ تک پہنچنے کے لئے قربانی کرنی پڑتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قربانی کی۔ خدا تعالیٰ نے اس قربانی کے بدلے اُن کی اولاد کو بے نظیر ترقی دی۔ اگر تم بھی چاہتے ہو کہ تمہاری اولاد ترقی کرے تو تم بھی اپنی اولاد کو قربان کرو۔ اس سے ایسی محبت نہ کرو جو تم کو ان کی اصلاح اور علوم کے سکھانے سے باز رکھے اور تم اُن کی نگرانی چھوڑ دو۔ اگر تمہیں یہ خواہش ہے کہ تمہاری نسل بڑھے اور ترقی کرے تو بجائے ان کے آرام اور آسائش کی فکر کے ان کی روحانی تربیت کرنی چاہیے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد ترقی کرے اور آسمان کے ستاروں کی طرح گنی نہ جاسکے تو اس کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ ہم اپنی اولاد کو بچپن میں آوارہ، آرام طلب، کاہل اور سست نہ بنائیں بلکہ ان کے اعمال اور اخلاق کی پوری نگرانی کریں۔" (خطبہ عید الاضحیٰ فرمودہ ۲ر جولائی ۱۹۲۵ء)

"میں اپنی جماعت کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ اور اس عید سے سبق سیکھے۔ اگر آپ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ کو ہمیشہ سکھ حاصل ہو اور آپ کے مرنے کے بعد بھی آپ کی عیدیں ختم نہ ہوں تو آپ اپنے بچوں کو قربان کریں اور اُن کو دُنیا کی ہر قسم کی مشقت برداشت کرنے کی عادت ڈالیں تاکہ وہ دین اور اسلام کے جھنڈے کو بلند کرنے کے لئے کسی تکلیف اور مشقت سے خوف نہ کھائیں۔" (خطبہ عید الاضحیٰ فرمودہ ۲ر جولائی ۱۹۲۵ء)

فہرستِ عناوین

نمبر شمار	عناوین خطبات	تاریخ فرمودہ	صفحہ
۱	قیامت کے روز اوّلین و آخرین کے اجتماع میں لباسِ تقویٰ ہی کام آئے گا۔	۲ر دسمبر ۱۹۱۱ء	۱
۲	اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے اولاد کی قربانی اور اسکی اہمیت	۳۱ر اکتوبر ۱۹۱۴ء	۳
۳	عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں کیا تعلیم دی گئی ہے	۲۰ر اکتوبر ۱۹۱۵ء	۸
۴	خدا تعالےٰ کی راہ میں پیش کی جانے والی سچی قربانی رائیگاں نہیں۔	۹ر اکتوبر ۱۹۱۶ء	۱۴
۵	حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ کی عید الاضحیٰ سے مشابہت	۲۸ر ستمبر ۱۹۱۷ء	۲۵
۶	دین و دُنیا کی ترقی قربانیوں کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی	۱۷ر ستمبر ۱۹۱۸ء	۳۹
۷	قربانی وہی ہے جسے خدا تعالیٰ قبول کرے	۷ر ستمبر ۱۹۱۹ء	۵۴
۸	عید الاضحیٰ ایک عظیم الشان قربانی کی یادگار ہے۔	۲۶ر اگست ۱۹۲۰ء	۶۰
۹	قربانی کے احکام اور اُن کی حکمت	۵ر اگست ۱۹۲۲ء	۷۱
۱۰	خطبات کی عظمت اُن کی طوالت کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اس اخلاص کی وجہ سے ہوتی ہے جس سے سُنانے والا سُناتے اور سُننے والا سُنتے۔	۲۵ر جولائی ۱۹۲۳ء	۷۵
۱۱	دینی اغراض کے لئے جو سفر اختیار کیا جاتا ہے اُس کی کامیابی کا انحصار مجاہدہ اور دعاؤں کی قبولیت پر ہے	۱۴ر جولائی ۱۹۲۴ء	۷۹
۱۲	دُنیا میں وہی قوم زندہ و پائندہ رہ سکتی ہے جو نسلاً بعد نسل اپنی اولاد کی تربیت اور اخلاق کا خیال رکھتی اور اُن میں قربانیوں کی رُوح پیدا کرتی ہے	۲ر جولائی ۱۹۲۵ء	۸۰

نمبر شمار	عناوینِ خطبات	تاریخ فرمودہ	صفحہ
۱۳	عید الاضحی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم قربانی کی یادگار ہے جو اپنے اندر یہ سبق رکھتی ہے کہ قوموں کی ترقی کا راز اُن کی قربانیوں میں مضمر ہے	۲۲ر جون ۱۹۲۶ء	۹۱
۱۴	عید کی قربانی میں تربیتِ اولاد کا سبق	۱۱ر جون ۱۹۲۷ء	۱۱۲
۱۵	عید الاضحی اس عزم کا اظہار ہے کہ رضائے الٰہی کے حصول کے لئے جان و مال حتّٰی کہ اولاد تک کو قربان کرنے سے دریغ نہیں کیا جائے گا	۳۰ر مئی ۱۹۲۸ء	۱۱۹
۱۶	عیدِ قُربان کُلّی طور پر خدمتِ دین میں محو ہو جانے کی یادگار ہے۔	۲۰ر مئی ۱۹۲۹ء	۱۲۸
۱۷	جماعتِ احمدیہ کے قیام کی اصل غرض اور اس کے حصول کے لئے قربانی کی اہمیت۔	۱۰ر مئی ۱۹۳۰ء	۱۳۳
۱۸	قربانیوں کی عید یہ سبق دیتی ہے کہ دینی مقاصد کے حصول کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے کبھی دریغ نہ کیا جائے۔	۱۷ر اپریل ۱۹۳۲ء	۱۴۲
۱۹	اشاعتِ اسلام اور ابراہیمی سُنّت پر عمل کرنے کی ضرورت	۶ر اپریل ۱۹۳۳ء	۱۴۸
۲۰	قربانی اور اس کے ثواب کا دار و مدار ہر انسان کے حُسنِ نیت اور خلوصِ دل پر ہے۔	۲۷ر مارچ ۱۹۳۴ء	۱۶۵
۲۱	خدا تعالیٰ کی راہ میں قربانیاں کرنا ہی حقیقی عید ہے	۱۶ر مارچ ۱۹۳۵ء	۱۷۴
۲۲	اسلام کی عالمگیر ترقی کے لئے ہر احمدی مرد کو حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ہر احمدی عورت کو حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین۔	۴ر مارچ ۱۹۳۶ء	۱۸۸
۲۳	عید الاضحی تمثیلی رنگ میں "ابراہیم زندہ باد" کا نظارہ پیش کرتی ہے۔	۲۲ر فروری ۱۹۳۷ء	۱۹۶

نمبر شمار	عناوین خطبات	تاریخ فرمودہ	صفحہ
۲۴	خداتعالیٰ کی راہ میں قربانی کرنے سے کبھی بخل نہیں کرنا چاہیئے۔	۱۱ر فروری ۱۹۳۸ء	۲۰۸
۲۵	آباء واجداد کی طرف سے ورثہ میں ملنے والی خوشی استحقاق قربانی اور ایثار ہی کے ذریعہ قائم رہ سکتا ہے۔	یکم فروری ۱۹۳۹ء	۲۲۳
۲۶	حقیقی عید یہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اولاد کو خدمتِ دین کے لئے وقف کردیا جائے	۲۰ر جنوری ۱۹۴۰ء	۲۴۴
۲۷	اگر جماعت احمدیہ اولاد کی ترقی چاہتی ہے تو اسے خدا کی راہ میں قربان کرے۔	۹ر جنوری ۱۹۴۱ء	۲۵۰
۲۸	حضرت رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے روحانی فرزند حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت کی پیشگوئیاں	۲۹ر دسمبر ۱۹۴۱ء	۲۶۵
۲۹	اگر جماعت احمدیہ کا ہر فرد اسمٰعیلی نمونہ بن جائے تو دُنیا کی ساری طاقتیں مل کر بھی احمدیت کو نہیں مٹا سکتیں۔	۲۷ر نومبر ۱۹۴۴ء	۲۷۸
۳۰	عیدِ قربان یہ سبق سکھاتی ہے کہ بوقتِ ضرورت خدا کی راہ میں صرف جانوں ہی کو نہیں، اموال کو بھی قربان کردیا جائے گا۔	۵ر نومبر ۱۹۴۶ء	۲۸۳
۳۱	عید الاضحیہ غم بھول جانے کا سبق سکھاتی۔ اس لئے تقسیمِ ملک کی وجہ سے مبتلائے مصائب مسلمان بھائی تقدیرِ الٰہی کو خوشی سے قبول کریں اور مصائب وآلام کو ہمت واستقلال سے برداشت کریں۔	۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۷ء	۲۹۵
۳۲	سنّتِ ابراہیمی کے مطابق قومی اور دینی ترقی کے وقفِ اولاد کی اہمیت۔	۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۸ء	۳۰۶

نمبر شمار	عناوین خطبات	تاریخ فرمودہ	صفحہ
۳۳	جماعت احمدیہ کی حقیقی عید یہ ہے کہ وہ اپنے خدا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ ہونا ثابت کرے اور تبلیغ اسلام کی ایسی رُو چلائے کہ اسلام دُنیا کے کونے کونے میں پھیل جائے	۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۹ء	۳۱۸
۳۴	عید الاضحیہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کو یاد دلاتی ہے کہ وہ دینِ متین اسلام کو دنیا کے کناروں تک پھیلائے گا۔	۲۳ر ستمبر ۱۹۵۰ء	۳۲۷
۳۵	دُرود شریف میں جس قربانی کے کرنے کی دعا کی جاتی ہے عید الاضحیہ ہر سال اُسی کی یاد دلانے کے لئے آتی ہے	۱۳ر ستمبر ۱۹۵۱ء	۳۳۶
۳۶	نماز، زکوٰۃ اور روزے کی طرح حج بھی ایک ضروری فریضہ ہے جس کی ادائیگی کیلئے ہر مسلمان کو اپنے دل میں ایک غیر معمولی جذبہ اور شوق پیدا کرنا چاہیئے۔	یکم ستمبر ۱۹۵۲ء	۳۵۱
۳۷	حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کی قربانی کوئی قصہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت اور مشعلِ راہ ہے جسے ہر سال عید الاضحیہ کے ذریعہ امتِ مسلمہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔	۲۱ر اگست ۱۹۵۳ء	۳۶۴
۳۸	وہی قوم ترقی کرتی ہے جو خدا تعالےٰ کے وعدوں کے پیشِ نظر دُنیا کو قربانی، اخلاق اور رُوحانیت کا درس دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی۔	۱۰ر اگست ۱۹۵۴ء	۳۷۷
۳۹	مکہ معظمہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام نے توحید کا جو جھنڈا بلند فرمایا تھا، وہ قیامت تک قائم رہے گا	۳۱ر جولائی ۱۹۵۵ء	۳۸۷
۴۰	عید الاضحیہ بڑی عظمتوں والی اور بے مثل عید ہے۔	۱۹ر جولائی ۱۹۵۶ء	۳۸۸
۴۱	عید الاضحیہ یہ سبق دیتی ہے کہ ہم اسلام کی تبلیغ کیلئے باہر نکل جائیں اور ویران دنیا کو رُوحانیت سے آباد کر دیں تا ہمیں بھی اسمٰعیلی برکات سے حصہ وافر عطا ہو۔	۹ر جولائی ۱۹۵۷ء	۳۹۷
۴۲	جماعتِ احمدیہ کا فرض ہے کہ وہ دین کی راہ میں مسلسل قربانیوں کے ذریعہ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کو قریب سے قریب کر دیں۔	۲۹ر جون ۱۹۵۸ء	۴۰۵

۱

(خطبہ عید الاضحی* فرمودہ ۲؍ دسمبر ۱۹۱۱ء بمقام قادیان)

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا
عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۖ وَنَحْنُ اَقْرَبُ
اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ
قَعِيْدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ
الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۖ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ۝ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۖ ذٰلِكَ
يَوْمُ الْوَعِيْدِ ۝ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ۝ لَقَدْ
كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ
حَدِيْدٌ ۝ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ۝ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ
كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ۝ اِلَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ
اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ۝ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ
اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ۝ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَ
قَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ۝ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا
بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝[ق]

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عام طور پر عیدین میں سورہ قٓ، سورہ جمعہ، سورہ مومنون، سورۂ غاشیہ ان سورتوں کو پڑھا کرتے تھے[۲] اس نسبت سے کہ ان سورتوں میں خصوصیت کے ساتھ اجتماع کے واقعے مذکور ہیں۔ فطرتاً ہر شخص اپنے عیوب ظاہری و باطنی کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بخلاف اس حالت کے کہ جب مکان میں اپنے خلوت میں ہوتا ہے تو بڑی بے تکلفی سے رہتا ہے۔ کچھ اپنے عیوب اور نقائص کی پرواہ نہیں کرتا۔ مگر جب مجلسوں میں ہوتا

---

* "عید (یوم النحر) کا خطبہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب نے پڑھا۔ جو ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ (محمد صادق عفی اللہ عنہ ایڈیٹر بدر)"

ہے تو بڑا محتاط ہر امر میں اپنے آپ کو بناتا ہے ڈرتا ہے کہ مبادا کہیں میرا کوئی نقص کسی پر ظاہر ہو جائے یہ ایک فطری تقاضا ہے۔ جو ہر انسان کی طبیعت میں ہوا کرتا ہے۔ بعض انسانوں کو تخلیہ میں اگر کچھ نصیحت کرو تو وہ اُسے خاموشی سے سنتے ہیں۔ مگر وہی نصیحت کی باتیں ان کو جب مجلس میں سنائی جاویں تو اس کو بُرا مناتے ہیں اور سُننا پسند نہیں کرتے۔

سورۂ قٓ[1] میں جو ایک خاص غرض ہے اس کو مَیں انشاء اللہ بیان کروں گا۔ عید کے دنوں میں عام طور پر زیادہ سے زیادہ دو تین لاکھ انسانوں کا مجمع ہوتا ہے۔ مگر بروز قیامت اولین و آخرین[2] کا اجتماع ہوگا۔ اور وہاں وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيدٌ کا نظارہ ہوگا۔ اور وہاں یہ دیکھا جاوے گا کہ لباس التقویٰ سے مزیّن ہو کر کون آیا ہے۔ اور اس لباس تقویٰ پر کس کس کے عیب دار داغ پڑے ہوئے ہیں۔ اور کس کے تقویٰ کے کپڑے بے عیب اور مَیل کچیل سے پاک صاف ہیں[3]۔ کیسی ذلت کی بات ہے کہ وہاں دوست دشمن خویش و اقارب اور ماں باپ سب حاضر ہوں گے[4]۔ جو کچھ بدی دنیا میں کسی نے یہاں کی ہوگی وہ تمام اولین و آخرین کے سامنے ظاہر ہونے لگے گی۔ اور متعیّن قرین بھی شہادت دے گا۔ کہ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ۔ پھر وہاں بحثیں بھی ہونے لگیں گی۔ مجرم اپنی بریت ظاہر کرنے کے لئے حیلے حوالے کرنے لگے گا اور الزام دوسرے پر پھینکنا چاہے گا۔ آگے سے قرین یوں کہکر ردّ کرے گا۔ رَبَّنَا مَآ أَطْغَيْتُهُ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيدٍ۔ پروردگار احکم الحاکمین کی جناب سے یُوں فیصلہ ہوگا کہ یہ وقت بحث مباحثات کا نہیں ہے۔ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُمْ بِالْوَعِيدِ اور ارشاد ہوگا کہ ہم نے پہلے ہی سے نذیر بھیج کر آج کے دن کی مصیبت سے تم کو آگاہ کر دیا تھا۔ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ۔ فیصلہ کرنے میں کسی پر ظلم نہیں کروں گا۔ میرے حضور میں چالاکیوں سے جو حق الامر ہے اس میں تبدّل و تغیّر راہ نہیں پا سکتی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ یوم الجزاء اور اجتماعِ عظیم کے دن کے لئے لباس التقویٰ سے مزیّن ہو کر دنیا سے جاویں اور اپنے پروردگار سے پاک و صاف ملیں۔ آمین ثم آمین۔[5] (بدر قادیان ۲ دسمبر ۱۹۱۱ء)

---

[1] قٓ ۵۰: ۱۷ تا ۳۰

[2] جامع ترمذی کتاب العیدین باب القراءۃ فی العیدین۔ صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب القراءۃ فی الجمعۃ (غالباً سہوِ کتابت کی وجہ سے سورۂ مومنون لکھا گیا ہے۔ یہ دراصل سورۂ منافقون ہے۔ تمام روایات اسی پر متفق ہیں)

[3] صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفّون النسلان فی المشی۔

[4] تفسیر دُرِّ منثور جلد ۳ صفحہ ۷۶ زیر آیت لباس التقویٰ ذٰلک خیر۔ [5] ہود ۱۱: ۱۰۴

۲

(فرمودہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء بمقام میدان دار العلوم قادیان)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۔

آج کا دن قربانی کا دن کہلاتا ہے۔* مسلمانوں میں بہت قربانیاں کی جاتی ہیں لاکھوں لاکھ بکرے اور ہزاروں ہزار اونٹ اور گائیں خدا کے نام پر ذبح کی جاتی ہیں۔

قربانی کیا ہے اور اس کے کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس سوال کا جواب قربانی کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ اور اس سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ دنیا میں بہت سی قربانیاں ہوتی رہی ہیں اور اب بھی ہوتی ہیں۔ بعض اپنے بتوں کے لئے بعض اپنے دیوی دیوتاؤں کے لئے اور بعض اپنے نبیوں کے لئے قربانیاں کرتے حتّٰی کہ بیٹوں کو بھی ذبح کر دیتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اہل دنیا کو بتایا کہ بتوں، دیوی دیوتاؤں اور نبیوں کے لئے قربانی کرنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اگر تم اپنے بیٹوں کی قربانی کرنا چاہتے ہو تو ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ اس طرح کرنی چاہیئے۔ دیکھو ایک بیٹے کی قربانی ہم نے ابراہیمؑ سے کروائی۔ رؤیا میں قربانی کا نظارہ اس کو دکھایا کہ بیٹے کو ذبح کر دے۔ اس رنگ میں ہم نے اس کو بتایا کہ بیٹے کی قربانی یہ ہوتی ہے کہ اس کو ایسی تعلیم دی جائے کہ دین کے لئے وہ اپنے آپ کو قربان کر سکے۔ اور ساری زندگی دین کے لئے وقف کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کو وادیٔ غیر ذی زرع میں اللہ کے حکم کے ماتحت چھوڑ آئے جہاں نہ پانی تھا نہ کھانا۔ نہ کوئی ساتھی تھا اور نہ مددگار۔ اور یہی اُن کے بیٹے کی قربانی تھی جو انہوں نے کر دی۔ اور یہ بہت بڑی قربانی تھی۔ اپنے ہاتھ سے بیٹے کو ذبح کر دینا آسان ہے لیکن ایک ویران و سنسان جنگل میں بغیر کسی معین و مددگار اور بغیر کسی دانہ پانی کے چھوڑ آنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ذبح کرنے والا سمجھتا ہے کہ ایک دم میں جان نکل جائے گی اور پھر کوئی تکلیف نہ رہے گی مگر جنگل میں اس طرح چھوڑ آنے کا بظاہر یہ مطلب ہے کہ تڑپ تڑپ کر کسی وقت جان نکلے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے لیکن خدا تعالیٰ کا اسی طرح حکم تھا اور اس نے بتا دیا تھا کہ جو میرے حکم کے ماتحت

---

* الفضل کی رپورٹ کے مطابق نماز عید مسجد نور میں ادا کی گئی۔ (مرتب)

اپنی اولاد کی قربانی کرتے ہیں ان کی اولاد دنیا میں کبھی ضائع نہیں ہوسکتی۔

میں آج تم دیکھ لو کہ ملکوں کے ملک آباد ہیں۔ اور ہزارہا ایسی قومیں ہیں جو اپنے آپ کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد بتاتی ہیں۔ تو خدا تعالیٰ نے اولاد کو اپنی راہ میں قربان کرنے کا طریقہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا۔ اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ وہ لوگ بے وقوف اور کم عقل ہیں، جو چھری سے اپنے بیٹوں کو ذبح کر کے خدا کی راہ میں قربانی دیتے ہیں۔ یہ ان کی قربانی کسی کام کی نہیں ہوتی اور نہ اس کا کوئی نتیجہ ان کے لئے مرتب ہوتا ہے۔ اصل قربانی اپنی اولاد کو خدا کی راہ میں وقف کر دینا ہوتی ہے۔ اور یہ ایک بیج کی طرح ہوتی ہے جس سے آگے لاکھوں دانے پیدا ہوتے ہیں۔ اور کبھی ایسی قربانی ضائع نہیں ہوتی۔ آج مکہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہزارہا قربانیاں ہو رہی ہیں اور وہی یادگار قائم کی جا رہی ہے[۵]

تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال کو دیکھو وہ کس طرح اس جنگل میں اپنے بیٹے کو چھوڑ کر چلے گئے تھے اور خدا نے جنگل سے ہی اس کے لئے پانی اور دانہ مہیا کر دیا۔ یہ بڑا دردناک واقعہ ہے۔ حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ کو بمعہ ان کے بچے کے اس جنگل میں چھوڑ چلے تو حضرت ہاجرہ نے پوچھا کہ آپ ہمیں یہاں کس کے بھروسہ پر چھوڑ چلے ہیں جہاں نہ پانی ہے نہ کھانا، نہ کوئی ساتھی ہے اور نہ مددگار۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں تم کو خدا* پر چھوڑ چلا ہوں۔ انہوں نے کہا۔ بس جاؤ۔ اب ہمیں کسی کی پرواہ نہیں۔ ہمارے لئے ہمارا خدا کافی ہے۔ جب وہ مشکیزہ پانی کا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے لئے چھوڑ گئے تھے ختم ہوگیا اور اسماعیل پیاس کی وجہ سے رونے لگا۔ اور وہاں اردگرد پانی چھوڑ کہیں سبزہ بھی نہ تھا تو اس وقت حضرت ہاجرہ گھبرائیں اور بچے کو بلبلاتا ہوا ان سے نہ دیکھا گیا تو اِدھر اُدھر پانی کی تلاش میں دوڑنے لگیں۔ لیکن وہاں پانی کہاں مل سکتا تھا۔ خالی ہاتھ واپس بچے کے پاس آئیں۔ مگر بچہ کی شکل دیکھ کر پھر گھبرا گئیں۔ اور بچے کے اضطراب اور بلبلاہٹ کو نہ دیکھ سکیں پھر دوڑنے لگیں۔ آخر کار ایک فرشتہ کے ذریعہ انہیں معلوم ہوا کہ ایک چشمہ پھوٹا ہے۔ وہ اس جگہ آئیں اور اس چشمہ کو پایا۔ جس کو آب زمزم کہا جاتا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر ہاجرہ اس چشمہ کو روک نہ دیتیں تو یہ دُور دُور تک پھیل جاتا[۶] تو یہ ایک قربانی تھی آج بھی قربانیاں کی جائیں گی۔ لیکن ان قربانیوں کے کرنے والوں کو خیال کرنا چاہیئے کہ یہ قربانیاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی سے کیا نسبت رکھتی ہیں ان کی تو یہ قربانی تھی کہ خدا تعالیٰ نے

---

* غالباً یہاں کچھ الفاظ رہ گئے ہیں حضور رضی اللہ عنہ کے کہنے کا منشاء یہ ہے کہ میں تمہیں خدا کے سہارے چھوڑ چلا ہوں (مرتب)

حکم دیا کہ اپنے بچے اور اس کی ماں کو جنگل میں چھوڑ آؤ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہیں پوچھتے۔ کہ ان کے کھانے، ان کے پینے کا وہاں کیا بندوبست ہوگا۔ جنگل کے درندے تو انہیں نہیں کھا جائیں گے یہ کہاں رہیں گے اور کون ان کا خبرگیراں ہوگا۔ وہ بلا کسی سوال اور عذر معذرت کے جھٹ اُن کو جنگل میں چھوڑ کر واپس آجاتے ہیں تو یہ قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی اور ایسی ہی قربانی اللہ تعالیٰ ہر ایک مسلمان سے چاہتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ جس چیز سے محبت ہوتی ہے اس کے لئے انسان سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس وقت ہی دیکھ لو۔ دنیا میں ایک قربانی ہو رہی ہے کوئی اپنے وطن کے لئے، کوئی اپنی تجارت کے لئے، کوئی اپنی عزت کے لئے، کوئی اپنی آبرو کے لئے، اور کوئی اپنے احسان کا بدلہ اُتارنے کے لئے جانیں قربان کر رہے ہیں اور آج دنیا میں ایک نہایت خطرناک جنگ ہو رہی ہے [۱] اور بکروں اور دُنبوں کی طرح انسان قتل ہو رہے ہیں اور خون کی ندیاں پانی کی طرح بہہ رہی ہیں۔ ایک دن میں لاکھ لاکھ اور دو دو لاکھ انسان ہلاک ہو رہے ہیں۔ لیکن مرنے والوں کی جگہ دوسرے بڑی خوشی سے لیتے اور لڑتے ہیں۔ ایک مُردہ ہو کر گرتا ہے تو دوسرا خوشی سے اس کی جگہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور ایسے خاندان بھی ہیں جن کے اگر آٹھ جوان تھے تو آٹھوں، اگر چار تھے تو چاروں جنگ میں شریک ہیں یعنی ساری کی ساری اولاد لڑ رہی ہے۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ یہ کیوں اس طرح کر رہے ہیں۔ یہ اپنی آبرو۔ اپنے وطن اپنی تجارت اپنی عزت اور اپنے اموال کے لئے جانیں قربان کر رہے ہیں۔ اور کچھ لوگ احسان کی خاطر جو کہ اُن پر کیا گیا اپنی جانیں دے رہے ہیں۔ ایک کہتے ہیں کہ ہم جرمن ہیں ہم کسی سے نہیں ہار سکتے۔ ایک کہتے ہیں ہم فرانسیسی ہیں۔ ہم فرانس کی خاطر اپنی ہستی مٹا دیں گے اور جیتے جی اس پر کسی کو قابض نہ ہونے دیں گے۔ ایک کہتے ہیں ہم برطانوی ہیں۔ ہم کبھی کسی کے ماتحت نہیں رہے اور نہ رہ سکتے ہیں۔ ایک بلجیم کے رہنے والے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم معاہدہ کے خلاف نہیں کریں گے تو یہ لوگ ان باتوں کے لئے اپنی جانوں کی قربانیاں کر رہے ہیں۔ پھر کس قدر شرم کی بات ہے کہ ایک مسلمان خدا کے لئے کوئی قربانی نہ کرے۔ یہ عزت، آبرو وطن اور مال کے لئے پانی کی طرح خون بہاتے اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ ہم اپنے وقار کے لئے لڑ رہے ہیں۔ حالانکہ ان کی غرض محض دُنیا ہی دنیا تک محدود ہے اور دین کی قطعاً کوئی بات ان کے مدِّنظر نہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ ایک مسلمان سے اس لئے قربانی چاہتا ہے کہ وہ اس کا خالق اور رازق ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بہت کم ایسے مسلمان ہیں جو خدا کے لئے قربانی کرتے ہیں۔

خدا کے لئے قربانی نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو یقین نہیں ہوتا کہ ہمارا کوئی رب ہے جو خالق اور رازق ہے۔ اور وہ دنیا کی حکومتوں کو خالق اور رازق سمجھتے ہیں اس لئے ان کے لئے تو جان دیتے ہیں لیکن خدا کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ قربانی اللہ تعالےٰ کے قرب کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اللہ تعالےٰ چاہتا ہے کہ میرے بندے کچھ کر کے دکھائیں تب میں انہیں اپنا مقرب بناؤں۔ جو شخص اللہ کے لئے اپنے نفس کو قربان نہیں کرتا۔ وہ اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں خدا کی محبت ہے تو وہ جھوٹا ہے اس کو نہ خدا سے کوئی محبت ہے اور نہ کوئی تعلق ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ اے مومنو! تم سارے کے سارے پورے طور پر مسلمان ہو جاؤ اور اسلام کی تابعداری کا جوا اپنی گردنوں پر رکھ لو۔ یا اے مسلمانو! تم ساری فرمانبرداری کی راہیں پوری کرو۔ اور کوئی بھی فرمانبرداری کی راہ نہ چھوڑو۔ یہ قربانی ہے جو اللہ تعالےٰ ہر ایک مومن سے چاہتا ہے کہ انسان اپنی تمام آرزوؤں۔ تمام خواہشوں، تمام اُمنگوں اور تمام امیدوں کو خدا کے لئے قربان کر دے اور اس طرح نہ کرے کہ جو اپنی مرضی ہو وہ کرے اور جو نہ ہو وہ نہ کرے یعنی اس طرح کہ اگر شریعت اس کو کچھ حق دلاتی ہو تو کہے کہ مَیں شریعت پر چلتا ہوں اور اسی کے ماتحت فیصلہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر شریعت اس سے کچھ دلوائے تو کہے کہ قانون کی رُو سے فیصلہ ہونا چاہیئے۔ قانون کچھ نہیں دلواتا۔ اس لئے مَیں بھی کچھ نہیں دیتا۔ ابھی ایک معاملہ ہوا ہے۔ ایک شخص سے جب ایک چیز مانگی گئی۔ تو اس نے کہا مَیں بے خبر نہیں بیٹھا رہا۔ مَیں نے خوب اچھی طرح دریافت کر لیا ہے کہ قانوناً مَیں اس چیز کا مالک ہوں۔ چونکہ شریعت کی رُو سے اسے اس چیز کے رکھنے کا کوئی حق نہیں اس لئے وہ قانون کی آڑ لے کر بچنا چاہتا ہے اور یہ نفس پرستی ہے کیونکہ وہ نفس کی خاطر دین اور ایمان کو بیچتا ہے اور قانون کی پناہ لینی چاہتا ہے۔ قانون کی ھستی ہی کیا ہے؟ یہ تو صرف انسانی عمر تک ہی ہوتا ہے۔ لیکن خدا کا قانون یعنی شریعت ابدالآباد تک کے لئے ہے جو کوئی ظلم سے دوسرے کا حق لیتا ہے اور خواہ اس کے لئے کوئی وجہ تراشتا ہے وہ کبھی خدا تعالےٰ کی عقوبت سے نہیں بچ سکتا۔ اور ایسا شخص ھرگز ایماندار نہیں ہے۔ کیونکہ وہ خدا کے لئے قربانی نہیں کرتا۔ ہر ایک مسلمان کے دل میں کسی معاملہ کے تصفیہ کے وقت جو سب سے پہلے خیال پیدا ہونا چاہیئے وہ یہ ہونا چاہیئے کہ شریعت کیا کہتی ہے اور مجھے کسی چیز کا حقدار قرار دیتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں دیتی تو قانون اگر دلوائے تو بھی نہیں لینی چاہیئے۔ کیونکہ خدا کے نزدیک یہ لینا جائز نہیں۔ مومن کو تو ایسا ہونا چاہیئے کہ اگر قانون نہ بھی دلوائے اور شریعت دلوائے تو فوراً دے دینا چاہیئے۔ جس میں یہ مادہ نہیں وہ مسلمان ہی نہیں۔ مومنوں کو فرمانبرداری کا ہر ایک پہلو اور ہر ایک رنگ، زیرِ نظر رکھنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ تم شیطان کے پیچھے نہ چلنا، کیونکہ وہ تمہارا دشمن ہے۔ یہ کیا ہی لطیف بات بیان فرمائی ہے۔ قربانی کرنے والا اس لئے قربانی کرتا ہے کہ بڑی چیز حاصل ہو۔ ایک طالب علم وقت کی قربانی اس لئے کرتا ہے۔ کہ بی۔ اے اور ایم۔ اے ہو کر گورنمنٹ سے کوئی اچھا عہدہ لے۔ تمام دنیا کے مذاہب قربانی کرنا تو سکھاتے ہیں لیکن ان کی قربانیاں کرنے والے کسی نیک نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ تمہیں شیطان جس قربانی کا حکم دیتا ہے اُسکو مت قبول کرو۔ وہ تمہارا دشمن ہے اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم تم سے جو قربانی چاہتے ہیں اور جس کا تمہیں حکم دیتے ہیں اس کا نتیجہ ضرور نیک نکلتا ہے۔ یہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں فرق ہے کہ اور مذہب انسان سے قربانی کروا کر یعنی کچھ ترک کروا کر دیتے کچھ نہیں۔ لیکن اسلام ایسی قربانی کرواتا ہے کہ انسان کا اس میں نفع ہی نفع ہے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم جو تمہیں حکم دیتے ہیں ان کو پورے طور پر بجالاؤ۔ کیونکہ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ تو یہ کس قدر بے حیائی کی بات ہے کہ انسان اپنے افعال، اموال، خیالات اور ارادوں کو ترک کر کے خدا تعالیٰ کا حکم قبول نہ کرے۔

خدا تعالیٰ تم سب کو سچی قربانی کرنے کی توفیق دے۔ (الفضل ۱۳ر نومبر ۱۹۱۴ء صفحہ ۸)

۱۔ البقرہ ۲ : ۲۰۹

۲۔ یوم النحر۔ یوم الاضحیٰ (صحیح بخاری کتاب العیدین باب الاکل یوم النحر)

۳۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۳

۴۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۸۔ ابراہیم ۱۴ : ۳۸

۵۔ انوار انبیاء صفحہ ۵۵ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۹ء۔ الحج ۲۲ : ۲۷ تا ۲۹۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۸۔ ابن ماجہ کتاب الاضاحی باب ثواب الاضحیۃ۔

۶۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی

۷۔ پہلی جنگِ عظیم کی طرف اشارہ ہے جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک لڑی گئی جس میں ایک کروڑ فوجی اور اتنے ہی شہری ہلاک۔ دو کروڑ زخمی اور اتنے ہی لوگ قحط اور مختلف وباؤں کی وجہ سے لقمۂ اجل بن گئے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ WAR ایڈیشن ۱۹۷۲ء)

۸۔ روحانی خزائن جلد ۱۶ (خطبہ الہامیہ) صفحہ ۳۳

۳

(فرمودہ ۲۰ / اکتوبر ۱۹۱۵ء بمقام عید گاہ ۔ قادیان)

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَکَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۔ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُکُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۔[1]

انسان کی پیدائش کی غرض اور اس کے پیدا کرنے کا مقصد اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے یہ کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ[2] نہیں پیدا کیا میں نے جن و انس کو مگر اس لئے کہ وہ میری جناب میں عبودیت اختیار کریں، پس عبد بننا اور خدا تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری اور اس کے حضور میں تذلل، یہ انسان کی پیدائش کا مقصد ہے۔

دوسری چیزیں خدا تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتی ہیں۔ بلکہ بہت انسان تو خدا کے حکم کو توڑتے بھی ہیں مگر یہ اشیاء حکم کو ہرگز نہیں توڑتیں۔ پھر اس بات کے فرمانے کے کیا معنے ہوئے کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ جسے عبادت کے لئے پیدا کیا وہ تو نافرمانی کرتا ہے اور جس کی پیدائش کی یہ غرض بیان نہیں فرمائی وہ نافرمانی و خلاف ورزی نہیں کرتی۔ یہ کیا بات ہے۔

اس کے لئے یاد رکھنا چاہیئے کہ عبادت کے معنے ہیں تذلل اختیار کرنا[3] خشوع تام۔ اپنی تمام محبت، اپنا تمام پیار، تمام تعلق خدا ہی کے لئے کر دینا۔ سب چیزوں کو چھوڑ کر سب تعلقات کو قطع کر کے۔ تمام برائی اور تکبر کے خیالات کو علیحدہ کر کے خدا کے حضور جھک جانا[4] اور محبت و پیار کا اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ حاصل کرنا۔ یہ بات ہم دیکھتے ہیں اور کسی چیز میں نہیں پائی جا سکتی۔ کیونکہ یہ تو اسی ہستی میں ہو سکتی ہے جو کچھ قدرت رکھتی ہو۔ جس کے اندر یہ حس ہی نہیں یا دہ ہی نہیں۔ یہ طاقت ہی نہیں کہ دو چیزوں میں سے ایک کو چھوڑ کر دوسری کو اختیار کرے اور

خدا تعالیٰ کے لئے تذلّل اختیار کر سکے۔ اس سے ایسا مطالبہ ہی بیجا ہے۔ یہ تو صرف انسان ہی میں قدرت ہے۔ پس حقیقی معنوں میں عابد انسان ہی بن سکتا ہے یہ مرتبہ تو ملائکہ بھی نہیں حاصل کر سکتے۔ اس لئے انسان ہی کی پیدائش کی غرض یہ ہوئی کہ خدا کا عبد بنے اور اپنی تمام خواہشات تمام ارادوں کو ترک کر کے خدا کے حضور جھک جائے۔

پھر انسان کو اس راہ میں کامیاب کرنے کے لئے اور اس کا درجہ بڑھانے کے واسطے کچھ ایسی کششیں بھی رکھیں جو عبادت کے خلاف اس کو کھینچیں۔ لیکن ساتھ ہی اپنی طرف سے پکارنے والے بھی بھیجتا ہے جو انسان کا قدم صراط مستقیم سے پھسلنے نہ دیں اور پھر چونکہ ایسے لوگ ایک خاص مدت کے بعد آتے ہیں اس لئے خود انسان کے اندر ایسی طاقتیں نیکی کی رکھی ہیں جو ان محرکات بدی پر غالب آسکیں یا کم از کم نیکی اور بدی میں تمیز کر سکیں۔

یہ آیت جو میں نے اس وقت پڑھی ہے اس میں ایسے منادوں کا ذکر ہے جو خدا کی طرف سے انسان کو اس کی پیدائش کی غرض پر متوجہ و قائم کرنے کے لئے آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ الٰہی! ہم نے ایک پکارنے والے کی آواز سُنی۔ وہ آواز کیا تھی۔ تجارت یا مال اسباب کی طرف بلانے کے لئے نہ تھی بلکہ وہ ایک پاک منادی کی آواز تھی جو یہ پکارتا تھا کہ انسانو! تم مان لو۔ کس کو مان لو؟ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ تم اس خدا کو مان لو جس نے پیدا کیا اور ادنیٰ حالت سے بڑھا کر بڑے درجے تک ترقی دی۔ اس کے احکام کو قبول کرو۔ ہم نے اس کی بات کو قبول کر لیا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا۔ الٰہی ہم نے مان لیا۔ مگر تیرے احکام پر چلنا بڑا بھاری کام ہے پہلے بھی بہت غلطیاں کر چکے ہیں آگے بھی لغزشوں سے از خود محفوظ نہیں رہ سکتے اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ حضور رب ہیں چھوٹے سے بڑے کو ترقی دینا آپ کا کام ہے۔ پس ہمارے ایمان کو بڑھا دیجئے۔ گناہ معاف ہوں۔ وَکَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا۔ روکیں مٹ جائیں بلکہ بدیوں کو ہٹا ہی دیں۔ سزا سے بچائیں۔ وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ۔ نیکوں میں شامل کر کے وفات دیں۔ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ۔ اپنے رسولوں سے تو نے جو وعدے کئے تھے، وہ وعدے پورے کر دے۔ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اور ہمارے اعمال کو اپنے احکام کے ایسا ماتحت کر دے کہ قیامت تک دُکھ اور تکلیف نہ پہنچے تیرے حضور شرمندہ نہ ہوں سزا کے مستوجب نہ بنیں۔

یہ آواز ہے جو منادی دیتے ہیں اور جو اس منادی کے قبول کرنے والے کہتے ہیں اور دنیا کے لئے سب سے بڑی عید کا دن تو یہی ہوتا ہے کہ ان میں کوئی آیات اللہ پڑھنے والا انہیں خدا سے نصرت کی بشارت دینے والا ہو۔ انہیں ان کے محبوب و معبود سے ملانے والا ہو۔ اس سے بڑھ کر کوئی خوشی کا دن نہیں ہو سکتا۔

دیکھو مجمع میں کسی کا بچہ گم ہو جائے۔ اور پھر ایک دو گھنٹہ کے بعد جب وہ بچہ اپنے باپ سے ملتا ہے تو بچہ کو اور باپ کو کس قدر خوشی ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا تعالےٰ سے بھٹکا ہوا بندہ جب خدا سے ملتا ہے اور خدا کے حضور پہنچتا ہے تو بندے کو بھی خوشی ہوتی ہے اور اللہ تعالےٰ بھی راضی ہوتا ہے۔ پس حقیقی عید اگر ہے تو یہی ہے اور یہ عید تو اس عید کی طرف راہنما ہے۔ عید بھی گھر میں اور وطن میں ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ایک شخص جنگل میں ہو۔ چاروں طرف درندے ہوں ڈاکو ہوں۔ جان خطرے میں ہو۔ اسے عید کی کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ عید تو اس کی ہے جو گھر میں ہو۔ رشتہ داروں میں ہو۔ احباب میں ہو۔ خطرات سے مامون ہو۔ اسی طرح جو انسان خدا کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے۔ ضلالت کے جنگل میں مارا مارا پھر رہا ہے اس کی حقیقی عید کیا ہو سکتی ہے۔ عید تو خوشی کا نام ہے اور خوشی دل کے اطمینان، دل کی راحت سے پیدا ہوتی ہے۔ تمام محبتوں کا مرکز تو اللہ تعالےٰ ہے۔ اسی سے کامل محبت چاہیئے اور اسی سے محبت ہو سکتی ہے۔ پس خوشی بھی اسی کو حاصل ہوگی اور حقیقی عید بھی اسی کی ہوگی جو اپنے مولیٰ کے حضور پہنچا ہو گا کیونکہ تمام قسم کی راحتوں، خوشیوں، عیدوں کا سرچشمہ تو وہی پاک ذات ہے۔ اسی حالت کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی عیدیں آجکل ماتم بن گئی ہیں۔ عید آئی اور ان کے گھروں میں جھگڑا شروع ہوا بیوی زیور کے لئے۔ بچے کپڑوں کے لئے چلا رہے ہیں۔ کھانے کا سامان نہیں سو الگ۔ پھر مقروض ہو کر تمام سال دُکھ میں گذارتے ہیں۔ یہ عیدیں اس لئے نہ تھیں بلکہ یہ عیدیں تو اپنے اندر ایک اور ہی حقیقت رکھتی تھیں جس سے آجکل کے مسلمان بالعموم غافل ہیں۔

ماہِ صیام کی عیدمیں تو یہ بتایا کہ انسان کو اس وقت کے لئے تیار رہنا چاہیئے جب اس کے مولیٰ کی طرف سے منادی آئے۔ وہ کھانے، پینے، بیوی بچوں کے اشتغال سے وقت نکال کر اس کے انصار میں داخل ہو سکے۔ جیسا کہ وہ ماہِ رمضان میں یہ مشق کرتا رہا ہے۔ اور عید قربان میں سکھایا کہ نہ صرف بیرونی انعامات سے بلکہ اندرونی انعامات سے بھی اگر علیحدگی اختیار کرنی پڑے اور اپنی جان قربان کرنی پڑے تو بھی دریغ نہ ہو۔ جب یہ حالت تم میں پیدا ہوگی تو پھر تمہاری عید ہی عید ہے۔

خدا کے نبی آکر یہی عہد لیتے ہیں اور سعادت مند یہ اقرار کرتے ہیں فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ۔ اور ان کا مولےٰ اسے شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ چونکہ بندوں نے ایک عہد کیا۔ اس لئے خدا بھی اس کے مقابل پر جزائے خیر دیتا ہے۔ اور ارشاد فرماتا ہے۔ اَنِّیْ لَا اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی۔ مَیں کسی کام کرنے والے کا کام ضائع نہیں کرتا۔ مرد ہو یا عورت۔ حیرت آتی ہے کہ بعض یورپین مصنفین نے لکھا ہے[۵] کہ اسلام تو عورتوں میں رُوح

ہی نہیں مانتا۔ حالانکہ یہ آیت ایسی آیت ہے کہ مَیں نے کسی اور کتاب آسمانی میں اس مضمون کی آیت نہیں دیکھی۔ جس زور کے ساتھ عورتوں کے حقوق اسلام نے قائم کئے ہیں اور ان کے اعمال کی قبولیت اور انعامات کا ذکر کیا ہے کسی مذہب کی کتاب میں ایسا ذکر نہیں۔ پھر قرآن مجید تو جو کہتا ہے اس کی دلیل بھی دیتا ہے۔ چنانچہ یہاں فرمایا۔ مرد و عورت کو عمل کی جزا یکساں کیوں ملے گی۔ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ۔ تم ایک ہی ہو۔ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ ؏ فرمایا جنہوں نے چھوڑ دیا۔ کیا چھوڑ دیا؟ مال چھوڑ دیئے۔ منہیات سے رک گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ طرح طرح کے دکھ دیئے گئے۔ اپنی جانوں کی پرواہ نہیں کی۔ ایسے لوگوں کی نسبت فرمایا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ مَیں ان تمام بدیوں کو ڈھانک دوں گا۔ اور پھر وہ ایسی جگہوں میں پہنچائے جائیں گے جہاں دُکھ اور تکلیف نہ ہوگی اور جہاں انعام کا سلسلہ جاری رہے گا۔ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ میں یہی دونوں باتیں بتائیں۔ جَنّٰتٍ کہتے ہیں سایہ دار جگہوں کو جہاں تکلیف اور دُکھ نہیں ہوتا۔ پھر ان کے نیچے نہروں کا سلسلہ بتا کر سمجھایا کہ وہ جَنّٰتٍ سرسبز و شاداب رہیں گے۔ پس اس دنیا میں بھی مومنوں کو جو انعامات ملیں گے وہ جاری رہیں گے۔

سب سے کامل مومن تو نبی ہوتا ہے۔ اور نبیوں کے سردار حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں اس کامل انسان سے وعدہ کامل رنگ میں پورا ہُوا۔ آپؐ نے ایسی ہجرت کی کہ کسی اور نے نہیں کی۔ اپنی جان کو خدا کی راہ میں قربان کیا تو ایسا کیا کہ کوئی اور نہ کرے گا۔ اس کا نتیجہ بھی آپ کو بے مثال ملا۔ باقی نبیوں کے ادیان خاص وقت تک رہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو یہ انعام ملا کہ آپؐ کا سلسلہ قیامت تک رہے گا اور فرما دیا کہ تمہارا باغ نہ سوکھیگا جب کوئی فتور آنے لگے گا تو ایک باغبان بھیجا جائے گا جو اس کو پھر سرسبز و شاداب بنا دے گا۔ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کے باغ کے نیچے وہ نہر جاری کی کہ جس درخت کے نیچے چلتی ہے اس کو سرسبز و شاداب بنا دیتی ہے۔ جو شخص اس تعلیم پر چلتا ہے۔ صالحین و شہداء و صدیقین سے ہو جاتا ہے اور روحانی وجسمانی انعامات الٰہیہ سے بقدر اپنی قابلیت کے حصّہ پاتا ہے۔ اور اس کے مقابل اگر کوئی آتا ہے تو شکست کھاتا ہے۔ دیکھو ایک اَن پڑھ سے اَن پڑھ احمدی سے بھی غیر احمدی ملّاں گھبراتا ہے۔ پس سچی عید یہی ہے کہ اللہ کے منادی کی آواز کو سُن لیا جائے۔ اور اس کے رستے میں مال و جان قربان کر دیں۔ یاد رکھو کہ جتنا تم میں نقص ہوگا اتنی ہی خدا کے احکام میں کمی ہوگی۔ جو لوگ اسلام میں ہو کر پھر تکلیف میں ہیں ضرور ان کی اطاعت میں کچھ نقص ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچّا ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا۔ ؎

یہ باتیں دوسروں کے لئے بطور قصّہ کہانی کے ہوں مگر ہمارے لئے نہیں ہوسکتیں کیونکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے خدا کے ایک منّاد کو دیکھا۔ لوگوں نے چاہا کہ اُسے مسل دیں مگر وہ مظفر ومنصور ہوا۔ جو خاک اس چاند پر ڈالنی چاہتے تھے وہ انہی لوگوں کے مونہوں پر پڑی۔ یہ سلسلہ ایک بچّہ کے مانند تھا جس کے گرد کئی خونخوار شیر تھے۔ جن کے مونہوں کو انسانی خون لگ چکا ہو۔ حملہ کرنے کے لئے کھڑے ہوں۔ غیب سے ایک ہاتھ نکلا اور اس نے شیر کے جبڑے کو چیر دیا پس اس عظیم الشان نصرت کے بعد ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا مولٰے ہمارے ساتھ نہیں۔ اب جو انعامات میں کمی رہے گی تو اسی لئے کہ خود ہمارے عہدوں کے ایفاء میں کوئی نقص ہوگا۔ ہمیں چاہیئے کہ خدا کے رستے میں دُکھ اُٹھائیں۔ نفسوں کو قربانی کے لئے تیار کریں یعنی وہ پورے طور پر خدا کی رضامندی کے نیچے ہوں۔ ہم اُس کی راہ میں ہجرت کریں۔ ہجرت سے مراد وطنوں کو چھوڑ دینا ہی نہیں۔ ہجرت کیا ہے۔ اُن خیالات بد کو چھوڑ دینا جن میں پہلے تھے۔ ان بُرے دوستوں کو چھوڑ دینا جو دینی ترقی میں حارج ہوں۔ پھر ضرور ہے کہ ہم گھروں سے نکالے جائیں گھر سے مراد سُستی، کاہلی غفلت کا مقام چھوڑ دینا ہے۔ پھر ہم میں یہ بات ہو کہ ہمیں محض خدا کے لئے خدا کی راہ میں دکھ دیا جائے۔ جو متبع کامل ہو اس کو ضرور دکھ دیا جاتا ہے۔ جو دنیا داروں کے دکھوں سے بچا رہے اُسے سوچنا چاہیئے کہ اس کے ایمان میں کوئی نقص تو نہیں دیکھو گاؤں میں کوئی سفید پوش جائے تو کتے اسے بھونکتے ہیں، وہ اسے بیگانہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح جو دنیا کے کل مکروہات سے پاک ہوگا، دنیا پرست اس کی ضرور مخالفت کریں گے اور جس کی مخالفت نہ ہو اسے ضرور ان سے مناسبت ہے جبھی تو وہ اس کی مخالفت نہیں کرتے۔ اگر مومن کے نفس کے اندر تبدیلی پیدا ہو اور وہ ہر طرح کی دنس سے پاک ہو تو کلابُ الدُّنیا کا بھونکنا بھی اس کیلئے بطور لازم وملزوم ہے۔ کتّا تو غیر جنس ہے اس کتے کو تو پتھر مارا جائے گا۔ مگر یہ کتے ایسے نہیں ہوتے کہ انہیں پتھر مارا جائے بلکہ ان کے لئے بھی علاج ہے کہ خوب ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا جائے اور نہ صرف اپنی حفاظت کریں بلکہ دوسروں کو بھی بچائیں۔ پہلے تو تلوار کا جہاد تھا اس لئے قٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا سے اَور مراد تھی مگر اب تو دلائل کی شمشیر سے جہاد کرنے کا زمانہ ہے۔ اس لئے سب کو مقتول ہونا پڑے گا۔ یعنی دین کی اشاعت میں ایسا انہماک ہو کہ اسی میں موت آجائے۔ ایسے لوگوں کے لئے وعدہ الٰہی ہے کہ ان کی بدیاں چھپا دی جائیں گی۔ ایسے آدمیوں پر یہ فضل الٰہی ہوتا ہے کہ اگر ان میں کوئی بدی فی الواقعہ بھی ہو اور اسے کوئی شائع کرنا چاہے تو خدا کا غضب اس پر نازل ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا تو اپنے بندے کی عزت قائم کرنا چاہتا ہے اور یہ اس عزت میں رخنہ ڈالتا ہے۔ پس فرمایا ہے کہ میرے ساتھ کامل محبت کرو۔ جس کا

نشان یہ ہے کہ مومن ہجرت کرے۔ اپنے مولیٰ کی راہ میں دُکھ دیا جائے۔ مخالفینِ حق سے مقابلہ کرے اس کے عوض میں اس کی بدیوں کو مٹا دوں گا اور جنات میں داخل کروں گا۔

چونکہ یہ عید کا موقعہ ہے لوگ قربانیاں کریں گے اس لئے یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ[10]۔ قربانیوں کا گوشت اور خون اللہ تک نہیں پہنچتا کیونکہ خون تو مٹی میں مل جاتا ہے اور گوشت بھی نہیں پہنچتا کیونکہ وہ بھی تم خود کھا لیتے ہو۔ ہڈیاں پھینکی جاتی ہیں۔ پھر اس قربانی کا فائدہ کیا ہے وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ۔ تمہارا تقویٰ خدا تک پہنچتا ہے اور اس کی غرض یہ ہے کہ اپنے نفس کو قربان کر دو۔ قربانی کے وقت مومن اقرار کرتا ہے کہ جیسے اس بکری نے سر آگے ڈال دیا اسی طرح میں اپنے نفس کے خیالات برائے میرے مولیٰ! حضور کے ارادے کے مقابل چھری پھیرتا ہوں اور یہی وہ بات ہے جو خدا کے ہر منشا کے وقت اللہ تعالیٰ لوگوں سے چاہتا ہے اور یہ وہ سچی عید ہے جس کی آرزو ہر مومن کو چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ ہم نفسوں کی قربانیاں کر سکیں۔ کمزوریاں دُور ہوں کامل محبت پیدا ہو۔ اعلیٰ سے اعلیٰ نیک بندوں کے انعام حاصل ہوں اور ہمیں وہ عید نصیب ہو جس میں کوئی دُکھ نہ ہو اور جس میں عید منانے والوں کے سروں پر خدا کی رحمت کا سایہ ہوتا ہے اور جس عید کی کوئی شام نہیں ہوتی۔ آمین۔ (الفضل ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۵ء صفحہ ۶-۸)

۱؎ آل عمران ۳: ۱۹۴ تا ۱۹۶۔ ۲؎ الذّٰریٰت ۵۱: ۵۷۔ ۳؎ لسان العرب جلد ۱۲ صفحہ ۲۷۔ زیر لفظ عبد

۴؎ ۔ملفوظات جلد ۳ صفحہ ۲۹۹۔ روحانی خزائن جلد ۲۲ (حقیقۃ الوحی) صفحہ ۵۴

۵؎ 1, GEORGE SALE, THE KORAN. P.80 2, MAXMULLER, THE SACRED BOOKS OF THE EAST, P XXV (INTRODUCTION)

3, SIR WILLIAM MUIR, THE LIFE OF MAHOMET. P 348

۶؎ تجدید دین کی طرف اشارہ ہے۔ سنن ابوداؤد کتاب الملاحم باب ما یذکر فی قرن المائۃ میں ہر صدی میں مجدد آنے کی پیشگوئی کی گئی ہے۔ ۷؎ النساء ۴: ۱۲۳۔

۸؎ ۔بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی (۱۸۳۵ء-۱۹۰۸ء) مسیح موعود و مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام

۹؎ ۔روحانی خزائن جلد ۱۷ (تحفہ گولڑویہ) صفحہ ۲۵۶۔ روحانی خزائن جلد ۱۶ (خطبہ الہامیہ) صفحہ ۵۹۔ ملفوظات جلد ۷ صفحہ ۳

۱۰؎ ۔الحج ۲۲: ۳۸

۴

(فرمودہ ۹ر اکتوبر ۱۹۱۶ء بمقام عیدگاہ۔ قادیان)

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ
أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ ۝ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ ۖ فَمَنْ
تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ رَبَّنَا إِنِّي
أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا
لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ
مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ۝ رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ ۗ
وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۝ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي
وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ۝ [۱]

آج کا دن انسان کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے لئے دی ہوئی کوئی چیز ضائع نہیں جاتی۔ ہر ایک وہ چیز جو انسان صرف کرتا ہے۔ فنا ہو جاتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہر ایک وہ چیز جو انسان کے پاس ہوتی ہے فنا ہو جاتی ہے مگر جو چیز انسان خدا کے سپرد کر دیتا ہے وہ کبھی فنا نہیں ہوتی۔ آج کا دن ہمیں اسی بات کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ کئی ہزار سال گذر گئے قریباً چار ہزار سال ہو گئے کہ ایک انسان نے خدا کے لئے کچھ قربانی کی تھی۔ اللہ کے حکم کے ماتحت اس نے اپنی بیوی اور بچے کو ایک ایسے جنگل میں جس میں نہ پانی تھا نہ کھانا، نہ محافظ تھا نہ نگہبان، لا کر ڈال دیا تھا پھر خدا تعالیٰ نے اس قربانی کو ایسا قبول کیا کہ گو چار ہزار سال گذر گئے مگر آجتک لوگ اسے بار بار یاد کرتے ہیں اور کوئی سال ایسا نہیں گذرتا کہ اس قربانی کو یاد نہ کیا جاتا ہو۔ بہت سے لوگ خدا کے حضور اسی کی یاد میں قربانیاں گذارتے ہیں۔

میرے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ رؤیا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں[۲] اسی رنگ میں پوری ہوئی کہ آپ حضرت اسمٰعیل کو ایک جنگل میں چھوڑ گئے۔ یہی حقیقی تعبیر تھی اس رؤیا کی۔ وہ دراصل ایک پیشگوئی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ایک وقت آئے گا جبکہ تم خدا کے حکم کے ماتحت اپنے لڑکے کو ایسے جنگل میں جہاں بظاہر زیست کا کوئی سامان نہ ہوگا۔ چھوڑ آؤ گے اور اس کی بجائے قربانیاں ہوا کریں گی[۳] چنانچہ حضرت ابراہیم کو یہی دکھایا[۴] گیا کہ دنبہ ذبح کر جس کو انہوں نے کر دیا۔ اب اسی کی یاد میں قربانیاں ہوتی ہیں۔

ہر ایک انسان اس نظارہ کو اس وقت تک سمجھ ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ اپنی آنکھوں نہ دیکھ لے کہ ایک ایسی جگہ جہاں نہ سبزہ ہے نہ پانی۔ نہ پھل ہے نہ پھول بلکہ کوئی کھیتی بھی نہیں ہوتی اور اب تک نہیں ہوتی۔ بعض لوگوں نے کھیتی کرنی چاہی ہے مگر اس میں ناکامی ہوئی ہے۔ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں منیٰ کے قریب نظر آتی ہیں مگر وہ بھی خشک سی۔ ایسی حالت کے ہوتے ہوئے اب وہاں لاکھوں انسانوں کی بستی ہے جنہیں ہر ایک چیز عمدہ اور تازہ مل جاتی ہے۔ انگور اور انار جیسے عمدہ وہاں ملتے ہیں ویسے ہندوستان بھر میں مَیں نے نہیں دیکھے۔ وہ ایسے اعلیٰ ہوتے ہیں کہ کابلی اور قندھاری بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ادھر ایک انار ہوتے ہیں جن کے دانے خشک سے اور چھوٹے ہوتے ہیں۔ ایک بڑے دانے والے ہوتے ہیں ان کے دانے کھٹے اور ترش ہوتے ہیں لیکن مکہ میں مَیں نے دیکھا ہے انار کا دانہ بہت موٹا اور شیریں ہوتا ہے اسی طرح انگور کا دانہ بڑا بڑا اور گول ہوتا ہے اور نہایت شیریں۔ گنّا سارے حجاز میں نہیں ہوتا مگر مکہ میں بکتا ہے۔ سنگترہ شام وغیرہ سے چلا جاتا ہے۔ غرض ہر قسم کے اور ہر موسم کے میوے اور سبزیاں جمع ہو کر وہاں چلی جاتی ہیں۔[۶] کیوں؟ اس قربانی کے عوض میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی اور اپنے لڑکے کو ایک عظیم الشان مذہب کی بنیاد کے طور پر ایک ایسے جنگل میں چھوڑ آئے تھے جہاں نہ پانی تھا نہ دانہ۔

پھر اسی قربانی کی یاد میں وہاں ایک زمزم کا چشمہ ہے۔[۷] ایک وقت تو یہ حال تھا کہ وہاں پانی کی ایک بوند نہ ملتی تھی یا اب یہ حالت ہے کہ وہاں سے پانی کو کُپیوں اور بوتلوں میں بند کر کے تمام جہان میں لے جایا جاتا ہے۔ اور اس قدر پانی نکلتا ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا حالانکہ تمام دنیا میں جاتا ہے۔ وہاں کے لوگ پیتے ہیں اور یاد کرتے ہیں کہ یہ اس چشمہ کا پانی ہے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے پیاسے تڑپنے اور ایک قطرہ پانی کا نہ ملنے کے وقت نکلا تھا۔ اور آج اس میں اس قدر پانی ہے کہ ذرا بھی کمی نہیں آتی۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ خدا تعالیٰ کسی کی قربانی کو ضائع نہیں کرتا۔ اور وہ قربانی جو خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کی جاتی ہے وہ کبھی ضائع نہیں جاتی بلکہ بہت سی برکات کا موجب ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حضرت ہاجرہ کو اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو جنگل میں چھوڑنے کے متعلق حدیث سے پتہ لگتا ہے۔[۸] اور کچھ بائیبل میں بھی اس کا ذکر ہے۔[۹] حضرت ابراہیم علیہ السلام جب ان کو لے کر آئے تو انہیں وہاں چھوڑ کر کچھ دیر ٹھہرے رہے تا یہ غافل ہوں اور مَیں ان کے پاس سے چلا جاؤں۔ ایک تھیلی کھجوروں کی اور ایک مشک پانی کی ان کے پاس رکھ دی۔ اور آپ نظر بچا کر چل پڑے۔ حضرت ہاجرہ نے آپ کو جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ حضرت

ہاجرہ ان کے پیچھے پیچھے چلیں اور کہا۔ آپ ہمیں کہاں چھوڑ چلے ہیں۔ یہاں نہ پانی ہے نہ کھانا، نہ کوئی ساتھی ہے اور نہ آبادی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کچھ جواب نہ دیا۔ آپ پر اس وقت رقت طاری تھی اور آپ بول نہ سکتے تھے۔ حضرت ہاجرہ نے پھر کہا کہ آپ ہمیں کہاں چھوڑ چلے ہیں اس کا بھی انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر تیسری دفعہ حضرت ہاجرہ نے کہا۔ آپ ہمیں کہاں چھوڑ چلے ہیں۔ پھر بھی آپ خاموش رہے۔ اس پر حضرت ہاجرہ نے کہا۔ کیا خدا تعالیٰ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے جواب میں صرف اتنا کہہ سکے کہ ہاں۔ اس سے زیادہ اور کچھ جواب نہ دے سکے۔ نبیوں کا دل تو پہلے ہی بہت نرم ہوتا ہے۔ اور یہ نظارہ ہی ایسا تھا کہ سخت سے سخت دل رکھنے والا بھی پگھل جاتا۔

اس سے دیکھو کہ حضرت ہاجرہ کا ایمان کیسا مضبوط اور قوی تھا۔ وہ موقعہ ایسا تھا کہ اگر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ چل پڑتیں تو انہوں نے کیا کہنا تھا یا کم از کم ان کو پکڑ کر بیٹھ رہتیں کہ ہمیں کہاں چھوڑ چلے ہو۔ میں آپ کو بھی جانے نہیں دوں گی۔ یا اگر یہ بھی نہ ہوسکتا تو ان کے پیچھے پیچھے ہی چل پڑتیں۔ اور اگر ان کے ساتھ نہ جاتیں تو کسی بستی اور آبادی میں ہی چلی جاتیں اس طرح کچھ حرج بھی نہ تھا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو حکم ہوا تھا وہ تو انہوں نے پورا کر دیا تھا۔ اور حضرت ہاجرہ کو کوئی ایسا حکم نہ دیا گیا تھا کہ وہ ضرور وہاں ہی بیٹھی رہیں۔ کوئی کہے کہ حضرت ہاجرہ کو اس دردناک نظارہ کی وجہ سے اتنی ہوش ہی نہ رہی تھی کہ ایسا کرتیں اگر یہ بات مان لی جائے تو کم از کم وہ یہ تو کرتیں کہ روتیں، چیختیں، چلاتیں اور شور مچاتیں کہ یہ ہم سے کیا دھوکہ کیا گیا ہے۔ ہمیں جنگل میں لا کر ڈال دیا گیا ہے اور خود چلے گئے ہیں۔ مگر اس قسم کی کوئی ایک بات بھی ان کے منہ سے نہیں نکلی بلکہ کہا تو یہی کہا کہ اِذَنْ لَّا یُضَیِّعُنَا اگر خدا کا یہ حکم ہے تو وہ ہمیں ضائع نہیں ہونے دے گا۔ نہ وہ روتی ہیں نہ چلاتی ہیں نہ یہ کہتی ہیں کہ میں یہاں نہیں بیٹھوں گی۔ بلکہ خدا کا حکم سُن کر کہتی ہیں کہ وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب پانی ختم ہوگیا اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو سخت پیاس لگی اور حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگتی پھریں تو خدا تعالیٰ کے فرشتہ نے اس جگہ ایک چشمہ پھوڑ دیا۔ اور پھر اسی چشمہ پر ایک قافلہ لا کر ڈال دیا اور وہیں ایک بستی بسا دی۔ اب وہاں ہر ایک نعمت ملتی ہے۔

اس سے خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ سمجھایا ہے کہ دیکھو خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کی ہوئی قربانی کبھی ضائع نہیں جاتی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا تعالیٰ کے نبی تھے انہوں نے جو کچھ کیا اپنی شان کے مطابق کیا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ابھی بچے تھے۔ اگر وہ اس وقت کچھ

نہ سمجھتے تھے تو نہ سہی لیکن ہر ایک مومن مرد اور عورت کے لئے حضرت ہاجرہ کی مثال موجود ہے کہ وہ نبی نہ تھی۔ ایک عورت تھی اور کمزور دل عورت تھی لیکن اسے ایک ایسے جنگل میں چھوڑا جاتا ہے جو بالکل ویران اور غیر آباد ہے۔ پھر اس کے لئے موقعہ ہے کہ اپنا بچاؤ کرلے۔ مگر جب اس نے سُنا کہ یہ خدا تعالےٰ کے حکم کے ماتحت کیا گیا ہے تو کہا کہ ہم یہیں رہیں گے۔ خدا ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔

مَیں نے حج کے موقعہ پر بڑے بڑے جسیم اور موٹے تازے مَردوں کو اس لئے روتے دیکھا ہے کہ ان سے ان کے ساتھی جُدا ہو گئے حالانکہ اگر ساتھی جُدا ہو گئے تو کیا مکہ ایک شہر ہے کوئی ویران جنگل نہیں۔ رستے بنے ہوئے ہیں، ہر قسم کا انتظام موجود ہے۔ مگر باوجود اس کے مَیں نے ساتھیوں کے جدا ہو جانے کی وجہ سے کئی ایک مَردوں کو روتے اور چلّاتے دیکھا ہے۔ لیکن دیکھو ہاجرہ عورت ہوکر ایک ایسے جنگل میں رہتی ہے جس میں کھیتی تک نہیں ہوتی اور پانی کا ایک قطرہ تک نہیں مل سکتا۔ کوئی آبادی نہیں، کوئی خبر گیراں نہیں، کوئی محافظ نہیں لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجھے خدا کے حکم کے ماتحت یہاں چھوڑا گیا ہے تو کہتی ہے کہ خدا ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ یہ کامل ایمان کی علامت ہے۔ جب تک کسی میں ایسا ہی ایمان نہ ہو اس وقت تک وہ مومن نہیں کہلا سکتا اور جس میں ایسا ہی ایمان نہ ہو وہ یہ امید کیونکر رکھ سکتا ہے کہ خدا مجھے ضائع نہیں کرے گا۔

اِس وقت خدا تعالےٰ نے ہماری جماعت سے بھی ایسا ہی ایک معاملہ کیا ہے۔ ہماری جماعت کے لوگوں کو بھی ایک قربانی کرنی پڑتی ہے۔ ان سے عہد لیا جاتا ہے کہ ہم دین کو دنیا پر مقدم کریں گے لیکن افسوس سے دیکھا جاتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہماری بڑی ضروریات ہیں ہم ان کے لئے کہاں سے خرچ کریں۔ حالانکہ وہ نہیں دیکھتے کہ حضرت ہاجرہ سے زیادہ قربانی تو ان سے نہیں کرائی جاتی۔ اس کی قربانی کو دیکھیں اور پھر اپنی قربانی پر نظر کریں اور پھر حضرت ہاجرہ کے ایمان کو دیکھیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ ہاجرہ سے ابھی بہت پیچھے ہیں۔ حالانکہ یہ مرد ہیں اور وہ عورت تھی۔ پھر عورتیں بھی اس سے بہت پیچھے ہیں۔ حالانکہ ہاجرہ بھی انہیں کی طرح کی ایک عورت تھی اور اسی آدم کی اولاد تھی جس کی ہم سب ہیں مگر جس ایمان کو اس نے ظاہر کیا وہ تمام مَردوں عورتوں کے لئے قابلِ رشک ہے۔ مگر افسوس ہے کہ کئی لوگ ایسے ہیں کہ جن کو اگر دین کے لئے خرچ کرنے کو کہا جائے تو آگے سے کئی قسم کی مجبوریاں پیش کر دیتے ہیں اور کئی قسم کے عذرات گھڑ لیتے ہیں حالانکہ ہر ایک عید انہیں بتاتی ہے کہ خدا کے لئے جو قربانی کی جاتی ہے وہ کبھی ضائع نہیں جاتی۔ آدمؑ سے لے کر اس وقت تک کوئی ایک بھی ایسی مثال نہیں پیش کی جاسکتی کہ خدا کے لئے کسی نے کوئی قربانی کی ہو اور اس کا نتیجہ اس کے حق میں عمدہ نہ نکلا ہو۔ بلکہ جس کسی نے بھی خدا کے لئے قربانی کی ہے اس کے لئے خدا تعالےٰ نے ملائکہ مقرر کر دیئے ہیں کہ اس کی

مدد اور تائید کریں اور اسے ضائع نہ ہونے دیں لیکن یہ بات کس قدر افسوسناک ہے کہ وہ لوگ جن کو خدا تعالیٰ نے صحابہ میں سے قرار دیتا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے متعلق ان کے سیکرٹری یہ رنجیدہ شکایات کرتے رہتے ہیں۔ کہ انہیں جب کبھی کسی دینی کام میں حصّہ لینے کے لئے کہا جائے تو کہدیتے ہیں کہ ہماری تو اپنی بہت سی ضروریات ہیں یا اور اسی قسم کے عذرات پیش کردیتے ہیں۔ ایک شخص نے مجھے لکھا کہ میری بیوی کہتی ہے کہ تم قادیان میں کچھ نہ بھیجو اور جس قدر وہاں بھیجتے ہو اس سے آدھا مجھے دے دیا کرو۔ مَیں اس کے بدلے اپنا مہر تمھیں معاف کردونگی کیا مَیں اس کی بات مان لوں۔ اس شخص کا مجھ سے یہ پوچھنا ہی بتا رہا ہے کہ اس کے دل میں خدا تعالےٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کا کس قدر جوش ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی کیوں نہ اپنی بیوی کی بات کو یہ کہکر رد کردیا کہ مَیں تیرا حکم مانوں یا خدا کا۔

پھر کئی لوگ ہیں جو خدا تعالےٰ کے راستہ میں خرچ کرنا گویا نقصان اٹھانا خیال کرتے ہیں حالانکہ خدا تعالےٰ کے لئے جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے وہ بیج کی طرح ہوتا ہے کبھی کوئی زمیندار ایسا نہیں دیکھا گیا کہ جو زمین میں اس خیال سے بیج نہ بوئے کہ اُسے بیج کے ضائع چلے جانے کا ڈر ہے بلکہ وہ تو یہ سمجھتا ہے کہ جب میں کھیت میں دانے ڈالوں گا تو وہ بہت زیادہ بڑھیں گے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ کے لئے جو خرچ کرتا ہے وہ بھی بیج کی طرح ڈالتا ہے۔ اور جس طرح کھیت میں ڈالا ہُوا ایک دانہ سینکڑوں دانے پیدا کردیتا ہے اسی طرح خدا کے راستہ میں خرچ کرنے پر بہت کچھ ملتا ہے اگر کوئی خدا کے لئے خرچ نہیں کرتا تو اس کے لئے یہی کہہ سکتے ہیں کہ اسے اس بات پر ایمان نہیں کہ خدا کسی سے کچھ لے کر اسے ضائع نہیں ہونے دیتا۔ کیونکہ اگر اسے یہ ایمان حاصل ہو تو ضرور خدا کے لئے اسی یقین اور ایمان سے خرچ کرے جس کے ساتھ زمیندار کھیت میں دانہ ڈالتا ہے اور خوشی خوشی ڈالتا ہے کہ بہت زیادہ دانے حاصل ہوں گے کوئی زمیندار مصیبت اور تکلیف سمجھ کر بیج نہیں ڈالتا بلکہ خوشی خوشی ایسا کرتا ہے لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ دین کے راستہ میں خرچ کرنے والے اوّل تو اس خیال سے خرچ ہی نہیں کرتے کہ ہمارا مال خرچ ہوجائے گا اور جو خرچ کرتے ہیں وہ اس یقین اور ایمان کے ساتھ خرچ کرتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ دیا وہ ضائع ہوگیا۔ اس سے ہمیں کچھ حاصل نہ ہوگا حالانکہ خدا تعالےٰ کہتا ہے کہ جو میرے راستے میں خرچ کرتا ہے اسے سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ ہم دیتے ہیں[۱۱]۔ زمین میں بویا ہوا دانہ اس قدر دانے نہیں اُگا سکتا لیکن خدا تعالےٰ تو کہتا ہے کہ مَیں سات سو نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ دیتا ہوں اور زیادہ کی کوئی حد بندی نہیں۔

اس کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال کو دیکھ لو کہ کس طرح خدا کے لئے ایک دانہ

ڈالنے سے کروڑوں کروڑ دانے پیدا ہوجاتے ہیں۔ دنیا میں تو گیہوں بونے والا گیہوں ہی کاٹتا ہے اور جَو بونے والا جَو۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک دانہ سے کئی قسم کے پھل اور میوے حاصل ہوئے۔ انہیں بچے بھی ملے، سلطنت بھی ملی، دولت بھی ملی، عزّت بھی ملی غرضیکہ ہر ایک چیز حاصل ہوئی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا تعالیٰ کے لئے قربانی کرنے سے اس کے نتیجہ میں کئی قسم کی کھیتیاں نکلتی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ایک بچہ کو قربان کیا تھا اس کے بدلہ میں خدا تعالیٰ نے ان کو کہا کہ جس طرح آسمان کے ستارے نہیں گنے جاتے اسی طرح تیری نسل بھی نہیں گنی جائے گی۔[۱۲] اب دیکھ لو، کوئی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو گن سکے۔ جس قدر دنیا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کے آدمی ہیں اس قدر کسی اور انسان کی نسل ہرگز نہیں مل سکتی۔ اور یہ نسل اتنی پھیلی ہے کہ آسمان کے ستاروں کی طرح گنی نہیں جاسکتی۔ پھر اگر روحانی طور پر دیکھا جائے۔ تو تمام دنیا کا بیشتر حصّہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ماننے والا ہے پھر مال و دولت کے لحاظ سے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ قریباً چار ہزار سال تک ان کی نسل یا ان کے متبعین کے ہاتھوں میں حکومت رہی اور اب عیسائی حکومت کر رہے ہیں۔ وہ بھی آپ کو مانتے ہیں۔ روحانیت کے لحاظ سے دیکھو تو جتنے بڑے بڑے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد گذرے ہیں وہ آپ ہی کی نسل سے تھے۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم انہی کی نسل سے تھے۔ پھر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی لکھا ہے۔ کہ میں بھی اسحٰقؑ کی نسل سے ہوں[۱۳] اس لئے آپؑ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی نسل سے ہوئے۔ غرض کوئی نعمت ایسی نہیں جو ان کو حاصل نہ ہوئی۔ دنیا کے لحاظ سے حکومت اور طاقت روحانیت کے لحاظ سے دولت نسل کے لحاظ سے سب سے زیادہ نسل آپؑ کو دی گئی اور وہ جگہ جو اس وقت تک بھی غیر ذی زرع ہے اس کو ایسی برکت نصیب ہوئی کہ اب سب کچھ وہاں پہنچتا ہے بلکہ مکّہ کے رہنے والوں کو کوئی کام ہی نہیں کرنا پڑتا۔ ان کو مکانوں کا کرایہ ہی اس قدر آجاتا ہے کہ ان کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ایک سو سے لے کر دو تین سو تک ایک چھوٹے سے مکان کا کرایہ لیتے ہیں۔ پھر وہاں لوگوں کے جمع ہونے کی وجہ سے ان کی تجارت خوب چلتی ہے۔ اور وہ ان سے خوب نفع کماتے ہیں۔ پھر وہی زمزم کا چشمہ جو خدا تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے لئے کھولا تھا۔ اسی کے پانی کی تجارت کرتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے مٹی کے برتن میں پانی بھر کر لے جاتے ہیں جسے زمزمی کہتے ہیں اور دو روپے لے لیتے ہیں۔ غرض اس جگہ کو بھی خدا تعالیٰ نے ایسا آباد کیا کہ اس کی نظیر اور کہیں نہیں مل سکتی۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی نسل کسی رنگ میں بھی گھاٹے میں نہ رہی۔ دنیا کی کوئی نسل اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ دراصل وہ قربانی ایک بیج

تھا جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسی جگہ میں ڈالا جہاں بظاہر اس کی ہلاکت تھی لیکن چونکہ خدا تعالےٰ کے لئے ڈالا گیا تھا اس لئے اس قدر بڑھا کہ اس سے کروڑوں کروڑ دانے نکلے۔

کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ کہیں جا رہا تھا اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی ایسا درخت لگا رہا تھا جو بہت دیر میں پھل دینے کے قابل ہو سکتا ہے۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا تم جو یہ درخت لگا رہے ہو، یہ تمھیں کیا فائدہ دے گا۔ اس نے کہا، دوسروں کے لگائے ہوئے درختوں سے ہم نے فائدہ اٹھایا ہے ہمارے لگائے ہوئے سے دوسرے فائدہ اٹھائیں گے۔ بادشاہ نے کہا۔"زہ" اس سے اس کی یہ مراد ہوتی تھی کہ مَیں خوش ہُوا ہوں، انعام دو۔ اس پر اس شخص کو چار ہزار انعام دیا گیا۔ انعام لینے کے بعد اس نے کہا۔ دیکھیئے۔ اس درخت نے ایک پھل تو مجھے اسی وقت دے دیا ہے۔ بادشاہ نے پھر "زہ" کہا اور اسے دوسری بار انعام دیا گیا پھر اس نے کہا۔ اور لوگوں کو تو سال بھر میں ایک دفعہ پھل حاصل ہوتا ہے لیکن مَیں نے چونکہ بڑی نیک نیتی سے یہ درخت لگایا ہے اس لئے مجھے دو دفعہ پھل ملا ہے۔ بادشاہ نے کہا "زہ" پھر اسے تیسری دفعہ انعام دیا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے کہا۔ چلو اب اس سے کچھ نہ پوچھنا چاہیئے، یہ تو ہمیں لوٹ لے گا۔ یہ تو اس بادشاہ نے کہا۔ لیکن اللہ تعالےٰ کبھی یہ نہیں کہتا اور نہ وہ دینے سے تھکتا ہے۔ کیونکہ اس کا خزانہ غیر محدود ہے۔ خدا تعالےٰ ایک ہی بیج سے بے انتہا دانے پیدا کر دیتا ہے۔ اور پھر ایک ہی بیج سے آم، خربوزے، انار، انگور وغیرہ جس قدر بھی میوے ہیں اور جس قدر بھی نعمتیں ہیں سب پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے بڑھکر اور کیا انعام ہو سکتا ہے اگر زمینداروں کو کوئی ایسا بیج مل جائے جس سے وہ کروڑوں پھل حاصل کر سکتے ہوں اور پھر ایک ہی بیج سے کئی قسم کے پھل میسر آسکیں۔ تو ان کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے وہ تو اپنا سب کچھ بیچ کر اور تمام زمینیں فروخت کر کے صرف ایک دو گز زمین رکھ لیں اور اس بیج کو خرید لیں۔ لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایسا بیج خدا تعالےٰ کے حضور سے ملتا ہے مگر بہت کم لوگ اس کے لینے کی کوشش اور سعی کرتے ہیں۔ اور یہ کوئی خیالی اور وہمی بیج نہیں بلکہ حقیقی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پھل اس کی تصدیق کے لئے موجود ہیں۔

یہ بات خوب سمجھ لینی چاہیئے کہ خدا تعالےٰ کے راستہ میں دی ہوئی کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ عید منانے والے لوگ اس بات کو سوچیں۔ کیا عید یہ نہیں بتاتی کہ خدا کے راستہ میں دی ہوئی کوئی چیز ضائع نہیں جاتی۔ پھر کیوں وہ خدا کے راستہ میں قربانی کرنے سے دل چراتے اور کتراتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اپنا مال اس طرح خرچ کریں گے تو ضائع ہو جائیگا

اصل بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا خدا تعالیٰ پر ایمان نہیں ۔ اگر ان میں حضرت ہاجرہ جتنا ایمان ہوتا تو وہ کبھی یہ خیال بھی نہ کرتے اور دین کے راستہ میں اپنی جانوں اور مالوں وغیرہ کو خرچ کرنے سے ذرا بھی نہ گھبراتے ۔ اور یقین رکھتے کہ اس طرح خرچ کرنے سے ہمارے اموال ضائع نہیں جائیں گے بلکہ اس کے بعد اتنے انعامات حاصل ہوں گے کہ جنہیں ہم شمار بھی نہ کر سکیں گے تو یہ ایمان کی کمزوری کا ہے ۔ عید ہر سال اسی کمزوری کے دُور کرنے کے لئے آتی ہے ۔ تا کہ وہ لوگ جنہیں یقین نہ ہو کہ کس طرح خدا کے راستہ میں ایک دانہ خرچ کرنے سے اس قدر پھل مل سکتے ہیں انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمونہ دکھا دیا جائے ۔ عید کو عام لوگ ایک میلہ سمجھتے ہیں ۔ مگر دراصل یہ ان کے لئے تازیانہ عبرت ہے ۔ تا کہ وہ بیدار اور ہوشیار ہوں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں اور وہی برکت حاصل کریں جو انہیں حاصل ہوئی مگر افسوس کہ بہت لوگ اس میں سستی اور کوتاہی کرتے ہیں ۔

ہماری جماعت کے لئے تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی قربانی کا زندہ نمونہ موجود ہے ۔ جب آپؑ نے دعویٰ کیا ۔ اس وقت آپ کی کیا حالت تھی ۔ قادیان میں بھی اکثر لوگ آپ کو نہ جانتے تھے[۵] اور آپ یہ دعویٰ سے کہتے کہ کوئی اس بات کی تردید کرے کہ دعویٰ سے پہلے میرے نام کوئی خط تک نہ آتا تھا[۱۰] مگر خدا تعالیٰ کے لئے قربانی کرنے جس قدر اس کو پوشیدہ رکھا جائے اسی قدر زیادہ خدا تعالیٰ اسے ظاہر کرتا ہے ۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کہتے کہ میں نے اپنے آپ کو دنیا سے چھپانا چاہا مگر خدا تعالیٰ نے مجھے کھڑا کر دیا[۱۱] اور ایسا کھڑا کیا کہ اب دنیا کے چاروں کونوں سے آپ کی قربانی کے پھل پیدا ہو رہے ہیں ۔ کوئی افریقہ سے کوئی امریکہ سے کوئی ایران سے کوئی ہندوستان سے کوئی افغانستان سے کوئی یورپ سے ۔ غرضیکہ ہر علاقہ میں آپ کی شاخیں پھیل کر پھل پیدا کر رہی ہیں ۔ پھر دیکھو آپ کو کس بات کی کمی رہی ۔ آپ نے خدا تعالیٰ کے لئے گالیاں سنیں ، مگر گالیاں دینے والے آپ کو اس جوش سے گالیاں نہیں دیتے تھے جس جوش سے اب آپ پر درود بھیجنے والے پیدا ہو گئے ہیں ۔ پھر آپ نے خدا تعالیٰ کے لئے اپنے ایسے رشتہ دار اور دوست چھوڑے جو اپنی غرض اور مطلب کے تھے لیکن ان کے بدلہ میں خدا تعالیٰ نے ایسے رشتہ دار اور دوست دیئے جو آپ کے نام پر جانیں قربان کرنے کو تیار ہیں ۔ پہلے رشتہ دار اور دوست ان کا کہاں مقابلہ کر سکتے ہیں وہ ایسے تھے کہ جب تک حضرت صاحب ان کو دیتے اور ان کی حاجتیں پوری کرتے وہ آپ کے ساتھ تھے اور اگر کچھ نہ دیتے تو الگ ۔ لیکن ان کی بجائے جو خدا نے دیئے وہ ایسے تھے کہ خود حضرت صاحب کو اپنا مال دیتے اور اس بات کو اپنے لئے موجب فخر سمجھتے ، یہ کتنا بڑا فرق ہے ۔ ایک تو

اپنے مطلب کے دوست اور رشتہ دار تھے لیکن ان کی بجائے جو خدا تعالیٰ نے دیئے وہ بس بات کی تمنا رکھتے تھے کہ ہم سے حضرت صاحبؑ کوئی خدمت لیں تا کہ اس طرح ہمارا بیڑا پار ہو جائے۔ تو ہر رنگ میں خدا تعالیٰ نے آپ کو آپ کی قربانی کا بہت بڑھ چڑھ کر بدلہ دیا۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ساری دنیا آپ کے قدموں میں آ گرے کیونکہ ابھی ابتدائی زمانہ ہے۔ مگر کہتے ہیں "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔ تمام مذاہب والے اس بات کو قبول کر رہے ہیں کہ اگر دنیا میں کوئی ایسا پودا ہے جس سے ڈرنا چاہیئے تو وہ وہی ہے جو مرزا صاحب نے لگایا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے ہمارے درخت نہیں بڑھ سکتے۔ جہاں ایک قوی درخت ہو، وہاں اور کوئی درخت پھل پھول نہیں سکتا اور نہ ہی بڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح تمام مذاہب والے کہتے ہیں کہ گو یہ پودا ہی ہے مگر اس کے مقابلہ میں ہمارے درخت بھی نہیں بڑھ سکتے بلکہ سوکھ رہے ہیں۔ حضرت صاحب کہتے کہ عیسائی مشنری اور ان کی عورتیں یہاں قادیان میں آیا کرتی تھیں لیکن اب دیکھ لو کہ قادیان کے نام تک سے وہ کانپتے ہیں۔ اور کئی کئی میل دور سے گذر جاتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایسا زبردست پودا ہے کہ جہاں یہ ہو وہاں ہمارے اگانے سے کچھ نہیں اُگ سکتا۔ ہمارے پودے اسی وقت تک اُگ سکتے ہیں جبکہ اس سے دور ہی ہوں، اس لئے اس سے دور دور ہی رہتے ہیں۔ لیکن خدا کے فضل سے یہ پودا وہاں بھی پہنچ جاتا ہے، اس لئے پھر وہاں سے انہیں بھاگنا پڑتا ہے۔ پاک درخت کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ[۱] اس کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں اور اس کا پھیلاؤ آسمان تک ہوتا ہے۔ یہی بات ہم نے اس شجر کے متعلق دیکھ لی ہے اور ہم نے تجربہ کر لیا ہے کہ اس کی موجودگی میں دوسروں کی کھینیاں نہیں اُگتیں اور اگر اُگتی ہیں تو خشک ہو جاتی ہیں۔ گو اس وقت ہماری جماعت کمزور ہے مگر آثار بتا رہے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں باقی تمام پودے مرجھا رہے ہیں۔ اور ایک دن آئے گا جبکہ بالکل خشک ہو جائیں گے اور سایہ کُن درخت صرف یہی ہوگا۔

ہمارے سامنے یہ نظیر موجود ہے۔ غیر اگر بے توجہی کریں تو کریں مگر وہ جو اس خدا کے مامور اور نبی پر ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی بیعت کی اور سب کچھ دیکھا۔ ان میں سے اگر کوئی اس طرح ناامیدی ظاہر کرے کہ اگر میں خدا کے لئے خرچ کروں گا تو ضائع ہو جائے گا۔ وہ بہت ہی قابل افسوس ہے۔ اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کے لئے دی ہوئی چیز نہ کبھی پہلے ضائع ہوئی ہے اور نہ اب ہو سکتی ہے تم نے تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا نمونہ دیکھ لیا ہے۔ پھر اپنے اپنے گاؤں میں دیکھ لو کہ جنہوں نے اس سلسلہ کے لئے سچی قربانیاں کی ہیں انہیں کیا کچھ

حاصل ہوا ہے۔ جنہوں نے نہیں کیں بلکہ پھر گئے انہوں نے کیا کچھ نقصان اٹھایا ہے۔

اخیر پر مَیں پھر بتا دیتا ہوں کہ عیدیں کوئی کھیل نہیں، میلہ نہیں، تماشا نہیں۔ اسلام کی ہر بات میں حکمت ہوتی ہے۔ پس عید میں بھی ایک بہت بڑی حکمت ہے اور وہ یہ کہ عید یہی بات بتانے کے لئے آتی ہے کہ خدا تعالےٰ کے لئے جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے وہ کبھی ضائع نہیں جاتا بلکہ کئی گُنا ہو کر ملتا ہے۔

پس جو لوگ خدا کے لئے خرچ کرنے میں سُست ہیں۔ وہ چُست ہو جائیں تا کہ خدا تعالےٰ کے لئے ہر قسم کی قربانی کریں۔ اور جو چست ہیں وہ اور تیز ہو جائیں کہ اس راستہ میں جس قدر تیزی دکھائی جائے اسی قدر زیادہ بلندی حاصل ہوتی ہے۔

خدا تعالےٰ ہماری جماعت کو اس بات پر عمل کرنے کی توفیق دے اور عید سے سچی قربانی کرنے کا سبق سکھائے۔ آمین۔

(الفضل ۲۴ر اکتوبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۵ تا ۹)

۱؎۔ ابراہیم ۱۴: ۳۶ تا ۴۰

۲؎۔ الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۰۳

۳؎۔ الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۰۸

۴؎۔ پیدائش باب ۲۲۔ آیت ۱۲۔۱۳ میں عبارت اس طرح ہے: "اور ابرہام نے نگاہ کی اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے تب ابرہام نے جا کر اس مینڈھے کو پکڑا۔ اور اپنے بیٹے کے بدلے سوختنی قربانی کے طور پر چڑھایا۔"

۵؎۔ مکّہ مکرمہ سے تین میل کے فاصلہ پر عرفات کی جانب ایک بستی کا نام ہے جہاں حاجی قربانی کرتے اور تین چھوٹے چھوٹے مینار (جمرات) پر سات سات کنکریاں مارتے ہیں۔

۶؎۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا (سورۂ ابراہیم ۱۴: ۳۸) کی قبولیت کے نشان۔

۷؎۔ زمزم حجر اسود کے سامنے مطاف کے کنارے پر ایک کنواں ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے زمانہ میں یہ ایک چشمہ تھا۔ پھر رفتہ رفتہ گہرا ہوتے ہوتے کنواں بن گیا۔ اب اس کا عرض ۴ گز اور گہرائی ۶۹ گز ہے۔ اور یہ نام اس کے پانی کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ (مجمع بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۶۵)

۸؎۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی۔

۹؎۔ پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۴ تا ۱۹

۱۰۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی

۱۱۔ البقرہ ۲ : ۲۶۲

۱۲۔ پیدائش باب ۱۵ آیت ۵ ، باب ۱۶ آیت ۱۰

۱۳۔ الاستفتاء ص۷۷ مطبوعہ قادیان ۱۳۲۵ھ

۱۴۔ مجانی الادب فی حدائق العرب جزء ثانی ص۱۶۴

۱۵۔ روحانی خزائن جلد ۲۱ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۲ و ص۱۳۶

۱۶۔ ملفوظات جلد ۸ ص۳۶۹

۱۷۔ حقیقۃ الوحی ص۱۴۸ و ۱۴۹ ۔ ملفوظات جلد ۷ ص۴۳-۴۴

۱۸۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ کا مکتوب مندرجہ فتح اسلام طبع اول ص۶۲ وحیات احمد جلد اول ص۲۰۳ حاشیہ و سیرت المہدی حصہ سوم ص۱۶

۱۹۔ ملفوظات جلد ۱۰ ص۲۹۵

۲۰۔ ابراہیم ۱۴ : ۲۵

٥

(فرمودہ ۲۸ ستمبر ۱۹۱۷ء بمقام کوٹھی شہزادہ واسدیو سنگھ شملہ)*

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝[1]

اس عید کو جس کا ہمارے ملک میں لوگوں نے بقرہ عید نام رکھا ہوا ہے (معلوم ہوتا ہے یہاں ابتدائے اسلام میں اس عید کے دن گائیں بہت ذبح ہوتی ہوں گی) ہندو اسے بکرا عید کہتے ہیں۔ کچھ مدت ہوئی ایک ہندو اخبار نے لکھا تھا کہ مسلمان اس عید پر خواہ مخواہ ہندوؤں کو تنگ کرنے کے لئے گائے ذبح کرتے اور فساد پھیلاتے ہیں۔ اس کا تو نام ہی جو بکرا عید ہے بتا رہا ہے کہ بکرے ذبح کرنے چاہئیں۔ یہ تو اس کی عربی دانی کی حقیقت تھی۔ عربی میں اس کو عید الاضحی کہتے ہیں۔ عوام میں عید الضحیٰ یعنی دوپہر کی عید مشہور ہے حالانکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے عَجِّلِ الْاَضْحٰى وَ اَخِّرِ الْفِطْرَ[2] یعنی عید الاضحی کو جلدی پڑھو اور عید الفطر کو دیر سے پڑھو۔

یہ عید ہمارے سلسلہ سے خاص تعلق اور مناسبت رکھتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس عید کو ہمارے سلسلہ میں ایک خاص خصوصیت دی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کبھی کسی جمعہ یا عید کا خطبہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ مگر ایک مرتبہ اسی عید کے موقعہ پر الہام کے ذریعہ آپ کو حکم ہوا کہ خطبہ پڑھیں۔ چنانچہ آپ نے پڑھا اور اب وہ خطبہ الہامیہ[3] کے نام سے چھپکر موجود ہے۔ تو یہ عید ہمارے سلسلہ سے ایک خاص مناسبت اور تعلق رکھتی ہے اور خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کی مناسبت بیان فرمائی ہے جو اس طرح ہے کہ حضرت مسیح موعودؑ کے زمانہ کو عید الاضحی سے مشابہت بتائی ہے اور وہ مشابہت اللہ تعالیٰ نے سورۃ کوثر میں بیان کی ہے جو میں نے ابھی پڑھی ہے۔ فرماتا ہے۔ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝

کوثر کے اصل معنی عربی میں خیر کثیر کے ہیں[4]۔ اور کوثر کثرت سے نکلا ہے۔ یعنی بہت خیر۔ چنانچہ ان محقق صحابہؓ نے جو اس بات کو سمجھتے تھے کہ کسی خاص معنوں کے ساتھ کسی آیت کے معنوں کو محدود نہیں کرنا چاہیئے۔ انہوں نے اس کے یہی معنی کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خیر کثیر دیا ہے[5]۔

---

* "نماز عید اور جمعہ شملہ میں شہزادہ واسدیو سنگھ صاحب کی کوٹھی پر پڑھی گئی۔ پونے بارہ بجے خطبہ عید ختم ہوا۔ اس کے بعد سنتیں پڑھ کر حضرت نے مختصر سا خطبہ جمعہ پڑھا۔" (الفضل ۲ اکتوبر ۱۹۱۷ء)

مگر حدیثوں میں یہ بھی آیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ کوثر ایک نہر ہے جو جنت میں ہے اور مجھے دی گئی ہے اور یہ کوئی ضعیف و کمزور حدیثیں نہیں ہیں بلکہ صحیحین میں ہیں[4] اور قابلِ قبول ہیں لیکن ان میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق سعید ابن جبیرؓ[5] نے اس طرح فیصلہ کر دیا ہے کہ جب اس نے کوثر کے معنی خیر کثیر لوگوں کے سامنے پیش کئے اور انہوں نے کہا کہ اس کے معنی تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک نہر کے کئے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ کیا حوضِ کوثر خیر نہیں ہے یا کیا وہ شر ہے[6]۔ اس پر سب خاموش ہو گئے تو بے شک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کوثر کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ وہ جنت[7] میں ایک نہر ہے۔ اس کے بڑے بڑے فوائد ہیں۔ اس کے پانی کی بہت اعلیٰ درجے کی لذت ہے۔ یہ صحیح لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوثر سے مراد وہی نہر ہے اور کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ عبداللہ بن عباسؓ[8] جن کے تفقہ فی الدین کی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی[9]۔ چنانچہ آپ کو ایسا علم قرآن عطا بھی ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں سب سے آگے بٹھاتے تھے اس پر بعض صحابہ کو اعتراض پیدا ہوا کہ عباسؓ کے بیٹے کو تو آگے بٹھایا جاتا ہے۔ ہمارے بیٹوں کو کیوں نہیں بٹھایا جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ کسی وقت میں تمھیں بتاؤں گا کہ عباسؓ کے بیٹے کو کیوں آگے بٹھایا جاتا ہے اور اوروں کے بیٹوں کو کیوں نہیں بٹھایا جاتا۔ ایک دن جب بہت لوگ جمع تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کا مطلب بتاؤ۔ سب نے بتایا کہ اس میں اسلام کی ترقی اور فتوحات کی پیشگوئی کی گئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ تو الفاظ سے ہی ظاہر ہے کچھ اور بتاؤ مگر کسی نے کچھ نہ بتایا۔ اس پر آپ نے ابن عباسؓ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دی گئی ہے۔ یہ سُنکر سب نے مان لیا کہ واقعی ابن عباسؓ اس قابل ہے کہ اسے آگے بٹھایا جائے[10]۔ تو انہوں نے کوثر کے یہی معنے کئے ہیں[11]۔ پھر حسن بصری[12] رضی اللہ عنہ جو بہت اعلےٰ درجہ کے بزرگ اور پارسا گذرے ہیں انہوں نے بھی خیر کثیر ہی معنے کئے ہیں[13]۔ اصل بات یہ ہے کہ اس لفظِ کوثر کے معنوں میں وہ نہر بھی شامل ہے جس کی خبر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دی ہے لیکن اور بھی جس قدر خیر کی چیزیں ہیں وہ سب اس کے معنوں میں داخل ہیں۔ پھر بہت سے تابعین جو قرآن کریم کے مفسّر گذرے ہیں انہوں نے یہی معنے کئے ہیں[14]۔

اس سورۃ میں لفظِ کوثر رکھ کر خدا تعالےٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا ہے، کہ ہم نے تجھے خیر کثیر دیا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو چیز بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ملی۔ اس کا نمونہ کسی اور جگہ نہیں پایا جاتا۔ دیکھو کتاب ملی تو وہ کہ جس کا نمونہ تمام دنیا میں نہیں مل سکتا۔

اس کا مقابلہ وہ کتابیں بھی نہیں کرسکتیں جو الہامی کہلاتی ہیں ۔ پھر انسانوں کی بنائی ہوئی کتابوں نے کیا کرنا ہے جس طرح سورج کے چڑھنے سے تمام دیئے گُل ہوجاتے ہیں اسی طرح قرآن کریم کے نازل ہونے پر باقی تمام کتابیں بے نور ہوگئیں ۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جو روحانی درجہ حاصل ہوا ۔ وہ بھی خیر کثیر کا نمونہ تھا ۔ پھر آپ کو جو اخلاق عطا کئے گئے وہ بھی ایسے تھے کہ جن کا نمونہ ملنا محال ہے ۔ پھر جو صحابہؓ ملے وہ بھی ایسے کہ جن کا نمونہ صفحۂ عالم سے ناپید ہے ۔ کوئی قوم ان کے مقابلہ پر نہ ٹھہر سکی ۔ انہوں نے اطاعت کی تو ایسی کہ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس کی جماعت نے ان جیسی اطاعت کی ہو ۔ ایک دفعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خطبہ فرما رہے تھے کہ کسی کو حکم دیا بیٹھ جاؤ ۔ ایک صحابیؓ نے آپؐ کی یہ آواز گلی میں سُنی اور وہیں بیٹھ گئے اور بیٹھے بیٹھے ہی مسجد تک گئے کسی نے کہا ۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یہاں تو حکم نہیں دیا تھا کہ تم گلی میں ہی بیٹھ گئے ہو ۔ انہوں نے کہا ۔ کیا معلوم ہے مسجد تک جاتے ہوئے جان نکل جائے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم بجالانے کا موقعہ نہ ملے[16] پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے انصار سے معاہدہ کیا ہوا تھا کہ اگر کوئی مدینہ پر حملہ کرے تو تم ہماری مدد کرنا ، ہمارے ساتھ ہو کر لڑنا لیکن اگر ہمیں باہر جاکر حملہ کرنا پڑے تو تم نہ جانا[17] ۔ اس معاہدہ کے بعد کفار کی شرارتوں کی وجہ سے ضروری ہوا کہ آگے بڑھ کر ان پر حملہ کیا جائے ۔ اس وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلایا اور کہا کہ ہم باہر دشمن پر حملہ کرنے چلے ہیں آپ لوگوں کی مرضی ہے تو چلو ۔ ورنہ تم نہ جانے کی وجہ سے قطعًا نہ خدا کے نہ اس کے رسول کے گناہ گار ہوگے ۔ اس وقت انصار میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ یا رسول اللہ ! ہم لوگ موسٰےؑ کی امت کی طرح نہیں ہیں کہ آپؐ کو کہدیں ۔ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ[18] ۔ کہ جا تُو اور تیرا رب جا کر لڑتے پھرو ہم تو یہ بیٹھے ہیں ۔ ہم نے آپؐ کو خدا کا سچا رسول سمجھکر قبول کیا ہے ۔ پھر وہ معاہدہ کیسا ہوا کہ آپ لڑنے جائیں اور ہم گھر بیٹھے رہیں ۔ ہم آپؐ کے ساتھ چلیں گے ۔ اور اگر آپؐ سمندر میں کود پڑنے کا حکم دیں گے تو اس میں گھوڑے ڈال دیں گے اور آپؐ تک کوئی دشمن اس وقت تک نہیں پہنچ سکیگا جب تک ہماری لاشوں کو روندتا ہوا نہ جائے گا[19] ایک ایسے صحابی جو سولہ غزوات میں شریک ہوئے وہ ایک مجلس میں اس صحابی کی یہ کلام بیان کرکے کہتے ہیں کہ کاش میں سولہ غزوات میں شامل نہ ہوا ہوتا مگر یہ بات میرے منہ سے نکلی ہوتی[20]

پھر غزوہ حنین[21] میں جب بنو ثقیفہ اور ہوازان سے مقابلہ ہوا ۔ اور بعض نومسلموں یا کفار کے تکبّر کی وجہ سے کہ وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ شامل تھے مسلمانوں کو بھاگنا پڑا ۔ چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر میرے ساتھ بارہ ہزار مسلمان شامل ہوجائیں تو میں ساری

دُنیا کو فتح کر لوں[۲۴]۔ اور اس دن مسلمانوں کی فوج کی تعداد بارہ ہزار تھی جن میں کفار اور نئے مسلمان شدہ بھی شامل تھے[۲۴]۔ اس لئے ان میں سے بعض نے کہا کہ آج دیکھیں گے کہ کون ہمارے مقابلہ میں ٹھہر سکتا ہے۔ مدینہ والوں کو چونکہ وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کی نسبت اپنے آپ کو زیادہ بہادر اور جنگجو سمجھتے تھے اس لئے ان میں تکبر پیدا ہو گیا[۲۴]۔ مگر جب وہ آگے بڑھے تو دشمنوں نے اس ترکیب سے پے در پے تیر برسائے کہ ان کے پاؤں اُکھڑ گئے اور بھاگنے پر مجبور ہوئے ان کے گھوڑے بدک کر پیچھے کو بھاگنے اور سارے لشکر میں بھاگڑ مچ گئی۔ اس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم آگے بڑھنے لگے تو صحابہؓ نے روکا مگر آپ نہ رُکے۔ آپؐ کے ایک چچازاد بھائی نے آپؐ کے گھوڑے کو آگے کیا۔ اُسی وقت آپؐ نے عباسؓ کو حکم دیا کہ بلند آواز سے کہو کہ اے انصار! اللہ کا رسول تمہیں وعدہ یاد دلاتا ہے اس کو پورا کرو۔ ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ اس وقت معلوم نہیں گھوڑوں کو کیا ہو گیا تھا ان کی ایسی حالت تھی کہ ہم ان کے لگام کھینچتے اور اس قدر کھینچتے کہ ان کا سر دُم تک پیچھے آ جاتا۔ مگر وہ واپس نہ لوٹتے اور لگام کھینچ کھینچ کر ہمارے ہاتھوں سے لہو نکل آیا۔ مگر جب ہم نے عباسؓ کی آواز سنی تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا صُور پھونکا گیا ہے اس وقت ہم نے گھوڑوں کو واپس موڑنے کے لئے بڑی کوشش کی اور جو نہ مُڑتے ان کی تلوار سے گردن کاٹ کر ہم پیدل واپس لوٹ آئے[۲۵]۔

تو ایسے وفادار اور جاں نثار آپؐ کے صحابہ تھے۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِنِّیْ مُکَاثِرٌ بِکُمُ الْاُمَمَ[۲۶] میں اپنی امت کی کثرت پر قیامت کے دن فخر کروں گا تو ہر وہ چیز جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو دی گئی کثیر ہی دی گئی اور ہر رنگ میں خدا تعالیٰ نے آپؐ کو کوثر دی لیکن اس کوثر کے ماتحت دو معنی خاص طور پر ہیں ایک تو وہ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائے ہیں کہ مجھے ایک نہر دی گئی ہے جس کا نام کوثر ہے۔ دوسرے وہ جو لُغت میں آئے ہیں۔ لُغت میں کوثر کے معنے ہیں الرجل کثیر العطاء[۲۷] ایسا آدمی جو بڑا سخی ہو اور جس کو سب طرح کی خیر ملی ہو۔ تو اس کے وسیع معنے تو یہ ہوئے کہ ہم نے تجھے خیر کثیر دی ہے۔ اور اس کے ماتحت جنت والی نہر بھی آجاتی ہے۔ اور یہ بھی کہ آپؐ کو ایک ایسا بیٹا اور انسان دیا گیا جو بڑا سخی ہے۔

بہت سی حدیثوں میں آیا ہے کہ کفار نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ابتر کہا[۲۸] اور ان کے اس اعتراض پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اب اگر اس سورۃ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی بیٹے کی بشارت نہیں دی گئی تو پھر اس کے معنی ہی نعوذ باللہ لغو ہو جاتے ہیں اور اُلٹا اعتراض ہوتا ہے کہ کہا تو یہ گیا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ مگر جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اس کو ایک نہر

دی گئی ہے۔ گو کسی رنگ میں یہ بھی جواب ہو مگر بظاہر یہ خیال آتا ہے کہ صرف نہر کا مراد لینا دشمنوں کے سوال کو رد نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر کوثر کے معنی خیر کثیر کئے جائیں تو سب باتیں اس میں آجاتی ہیں اور اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو سب کچھ دیا ہے۔ اور کسی خیر اور بھلائی کے دینے میں کمی نہیں کی۔ اور اگر اس کے معنی صرف نہر کے کئے جائیں تو یہ ایک بے معنی کلام بن جاتا ہے۔ اور ایسی ہی بات بن جاتی ہے کہ کسی نے ایک شخص کو کہا کہ تو نے اپنے کھیت کو باڑ کیوں دی ہے تو اس نے کہا تو نے بھی تو اپنی لڑکی کا نکاح کیا ہی تھا۔ مگر خدا تعالےٰ کے کلام کے متعلق ایسا خیال نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس سے اس کے معنی صاف ہو جاتے ہیں کہ عربی میں یہ محاورہ ہے کہ بتر الرجل یعنی ایک ایسا شخص جس کی اولاد نرینہ نہ ہو یا نہ رہے اور یہ بھی کہ اس انسان میں کوئی خیر اور بھلائی نہ ہو۔ ان دونوں باتوں کا جواب خدا تعالےٰ نے یہ دیا ہے کہ ہم نے تجھے کوثر عطا کی ہے۔ اس بات کا ثبوت کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر کفار یہ اعتراض کرتے تھے کہ آپؐ ابتر ہیں اس سے بھی مل سکتا ہے کہ کعب بن اشرف جب مکہ میں گیا اور وہاں کے لوگوں نے اسے کہا کہ انت سید المدینۃ و ھذا الرجل صابی المبتر کہ تو مدینہ کا سردار ہے اور یہ شخص (آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم) جو ابتر ہے وہ اچھا ہے یا ہم۔ تو اس نے کہا کہ تم اچھے ہو تو کفار کے اس اعتراض کے متعلق خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ وہ جھوٹا ہے جو تجھے کہتا ہے کہ تیرے اندر کوئی خیر نہیں یا تو کوئی نرینہ اولاد نہیں رکھتا۔ ہم نے تو تجھے ہر قسم کی خیر اور بھلائی دی ہے اور اولاد بھی ایسی دی ہے جیسی اور کسی کو نہیں دی۔ عربی میں بتر الرجل اس شخص کو کہتے ہیں جس کا کوئی لڑکا نہ ہو۔ خواہ لڑکیاں کتنی ہوں۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی لڑکیاں تو تھیں مگر باوجود اس کے طبری میں آیا ہے۔ کہ جب آنحضرت صلعم کے صاحبزادہ ابراہیم کی وفات ہوئی تو کفار نے آپؐ کو بتر الرجل کہا جس سے ان کی یہی مراد تھی کہ آپ کوئی نرینہ اولاد نہیں رکھتے پس اس اعتراض کے جواب میں جب اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ تو ضرور ہے کہ اس میں اولاد کے متعلق اعتراض کا ہی جواب ہو اور پھر اس میں عطائے خیر کی خبر بھی دی گئی ہو پس اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ ہم نے تجھے ایسی خیر کثیر عطا کی ہے جو اسی دنیا میں ختم ہونے والی نہیں ہے بلکہ جنت میں بھی جاری رہے گی۔ یہ معنے کرنے سے کفار کا اعتراض رد ہو جاتا ہے اور یہی درست ہیں۔ گویا ان کو کہا گیا ہے کہ اگر تم یہ کہتے ہو کہ اس میں کوئی خیر نہیں تو یہ غلط ہے ہم نے تو اسے اتنی خیر عطا کی ہے کہ جو نہ صرف اس دنیا تک محدود ہے بلکہ آخرت میں بھی جائے گی اور اگر کہو کہ اس کی اولاد نہیں تو ہم اسے ایک ایسا بیٹا دیں گے۔

جو بہت نیک اور بڑا سخی ہوگا۔ اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون ہے جس کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا بیٹا قرار دیا گیا ہے۔ اگر یہاں ہم عقل و فکر سے کام لیں اور قرآن کریم کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوجاتا ہے کہ اس آیت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی جس اولاد کا ذکر کیا گیا ہے وہ جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہے کیونکہ جسمانی اولاد کے متعلق تو خدا تعالےٰ صاف طور پر فرما چکا ہے کہ یہ نبی تم میں سے کسی کا باپ نہیں ہے[۳۲]

اب جبکہ یہ ثابت ہوگیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو جسمانی اولاد کی خبر نہیں دی گئی بلکہ روحانی کی دی گئی ہے تو یہ بات باقی رہ گئی ہے کہ یہ خبر کس زمانہ اور کس وقت میں پوری ہونی چاہیئے تو یہ صاف بات ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کفار کا روحانی اولاد کے سلسلہ کے نہ چلنے کے متعلق اعتراض نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ اس وقت ابو بکرؓ۔ عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ اور بہت سے اعلیٰ شان اور درجہ کے صحابہؓ موجود تھے۔ اور وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد روحانی سلسلہ کو جاری رکھ سکتے تھے چنانچہ انہوں نے جاری رکھا تو یہ اعتراض اسی وقت ہوسکتا تھا جبکہ یہ خطرہ ہو کہ روحانی نسل کا سلسلہ منقطع ہوجائیگا اس لئے ایسے ہی زمانہ کے متعلق یہ خبر ہے کہ جس کے متعلق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس وقت مسلمان یہودی اور نصاریٰ ہوجائیں گے[۳۳] پس جس زمانہ میں مسلمان یہودی اور نصاریٰ ہوگئے تو پھر یہ صاف بات ہے کہ اس وقت وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد نہیں ہوسکتے۔ اسی وقت یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ پھر ان کی روحانی اولاد کا سلسلہ کس طرح چلیگا اس کا جواب خدا تعالےٰ نے یہ دیا ہے کہ اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ ہم تجھے اس وقت ایک ایسا بیٹا دیں گے جس سے روحانی نسل چلے گی۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب مسیح آئے گا تو وہ لوگوں کو اس قدر مال دے گا کہ کوئی قبول نہیں کرے گا۔ یعنی وہ اس قدر سخی ہوگا کہ ساری دنیا پر اس کی سخاوت پھیل جائے گی۔ اس کے متعلق یُفِیْضُ الْمَالَ[۳۴] بھی آیا ہے اور یَفِیْضُ الْمَالُ[۳۵] بھی کہ وہ خوب مال لٹائے گا اور لوگوں کو خوب مال ملے گا۔ مگر لوگ نہیں لیں گے ہاں اس کی طرف سے دینے میں کوئی کوتاہی نہ ہوگی تو گویا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے امّتِ محمدیہ میں آنے والے مسیح کا نام دوسرے لفظوں میں کوثر رکھا ہے کیونکہ کوثر کے معنے بہت بڑے سخی کے بھی ہیں۔ اور مسیح کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اس قدر سخاوت کرے گا کہ لوگ قبول نہیں کرینگے عام طور پر سخی اس کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی مانگے اور وہ دے۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت مسیح کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ خود لوگوں کے پاس جا کر مال دے گا۔ نہ یہ کہ جب

اس سے مانگنے آئیں گے تو دے گا۔ یہ بہت بڑھ کر سخاوت ہے اور یہ صرف حضرت مسیح کے متعلق ہی فرمایا ہے اور کسی کے متعلق نہیں فرمایا۔ اور ایسے ہی آدمی کو کوثر کہہ سکتے ہیں۔ تو اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ میں مسیح موعود کی آمد کی پیشگوئی کی گئی ہے۔

پھر دیکھئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ سلمان مِنَّا اھل البیت کہ سلمان میرے اہل بیت سے ہیں۔ یہاں سوال ہوتا ہے کہ جس طرح سلمانؓ فارسی صحابی ہونے کی وجہ سے اہل بیت تھے تو اسی طرح تو اور صحابہ بھی اہل بیت ہیں سے ہی تھے پھر ان کے متعلق خاص طور پر کیوں کہا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے ایک بیٹے کا وعدہ دیا گیا تھا اور وہ حضرت سلمان فارسیؓ کی نسل سے ہونا تھا اس لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنا اہل بیت قرار دے کر یہ بتایا ہے کہ وہ میرا ہی بیٹا ہوگا تو اس طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک فارسی النسل کو اپنا بیٹا قرار دیا ہے پس ان سب باتوں کو پیش نظر رکھنے سے کہ

(۱) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر کہ مسلمان بالشت با بالشت یہود و نصارٰی کی اتباع کریں گے یعنی پورے پورے یہودی اور عیسائی بن جائیں گے' بتا دیا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جبکہ روحانی سلسلہ منقطع ہونے کے اسباب پیدا ہو جائیں گے۔

(۲) یہ کہ حضرت مسیح کے متعلق یَفِیْضُ الْمَالَ فرما کر پیشگوئی کی ہے کہ مجھے ایک ایسا روحانی بیٹا دیا جائے گا جو بڑا سخی ہوگا اور وہ میری روحانی نسل کو منقطع ہونے سے بچالے گا۔

(۳) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر کفار کا ابتر ہونے کا اعتراض کرنا اور اس کے جواب میں خدا تعالےٰ کا اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ فرمانا۔

(۴) کوثر کے معنی لغت میں بہت بڑے سخی کے ہونا۔ ان سب باتوں سے پتہ لگتا ہے کہ یہاں حضرت مسیح موعودؑ ہی مراد ہیں لیکن اگر کوثر کے معنی محدود کر دیئے جائیں اور اس سے صرف بہشت کی نہر سمجھی جائے تو یہ ایسی ہی بات ہو گی کہ اعتراض کچھ کیا تھا اور جواب کچھ اور دیا گیا ہے جس کا اعتراض سے بالکل کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی کوئی عقل مند اسے اس اعتراض کا جواب کہہ سکتا ہے۔ پس اس وجہ سے کوثر کے ایسے معنے کرنا ضروری ہیں کہ جن سے بیٹا مراد ہو مگر باوجود اس کے ہم کوثر کے معنی کو اسی پر محدود نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہی کہتے ہیں کہ کوثر سے جس طرح اس نہر کی طرف اشارہ ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہے اسی طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک روحانی بیٹے کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے۔

پھر دیکھیے اللہ تعالیٰ اس بات کو اور کھولتا ہے۔ فرماتا ہے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ پس اپنے رب کی عبادت کر اور قربانی دے۔ یہ عبادت اور قربانی بیٹے ہی کی پیدائش کی خوشی میں بتائی گئی ہے۔ اور نبی ایسے موقعہ پر بھی خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے اور قربانی دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں حضرت زکریاؑ کے متعلق آیا ہے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ سے دُعا کی ہے کہ میں بے اولاد ہوں مجھے اولاد عطا کی جائے اور یہ دعا روحانی اولاد کے متعلق ہی تھی نہ کہ جسمانی اولاد کے لیئے۔ چنانچہ آپ کہتے ہیں کہ مجھے ایسا بیٹا عطا کیا جائے جو میرا اور آل یعقوب کا وارث ہو۔[۵۶] چونکہ انہیں خطرہ تھا کہ میرے بعد روحانی سلسلہ مٹ جائے گا، اس لئے روحانی بیٹے کی دعا کی ہے۔ اس پر خدا تعالیٰ نے آپ کو بیٹا دیا۔ پھر آپ پوچھتے ہیں کہ الٰہی میں اس نعمت کے شکریہ میں کیا کروں۔ اس کے متعلق خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ تین دن روزے رکھو۔[۵۷] انہوں نے خود روزے رکھے اور دوسروں کو عبادت کرنے کی تلقین کی۔ چنانچہ ان کے متعلق قرآن کریم میں آیا ہے۔ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا۔[۵۸] تو اولاد کی خوشخبری پر نبی خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے اور نماز پڑھتے ہیں۔ اس لیئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ کی خوشخبری سنانے کے بعد فرمایا فَصَلِّ لِرَبِّكَ کہ اس کے شکریہ میں اپنے رب کی عبادت کرو۔ وَانْحَرْ قربانی دو۔ یہ بھی صاف بات ہے کہ بیٹے کی پیدائش پر عقیقہ کیا جاتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ ہم نے تجھے کوثر دی ہے۔ پس اس نعمت کے ملنے پر خوب عبادت کرو اور قربانیاں دو۔ ایک زمانہ آئے گا جبکہ لوگ تمہیں بے اولاد بنانے کی کوشش کریں گے اور ساری دنیا تمہاری روحانی اولاد کے سلسلہ کو منقطع کرنا چاہے گی اور اب بھی تم پر بے اولاد ہونے کا اعتراض کیا جاتا ہے مگر تمہیں ایک ایسا بیٹا دیا جائے گا کہ جو تیرے دشمنوں کو ان کی کوششوں میں ناکام و نامراد رکھے گا۔ تیرا دشمن تیرے بعد تیرہ سو سال زور مارتا رہے گا اور ایک حد تک اپنی کوشش میں اسے کامیابی بھی نظر آئے گی۔ مگر اس وقت تمہیں ایسا بیٹا دیا جائے گا کہ جس کی وجہ سے تیرے دشمن ابتر ہو جائیں گے اور شیطان اپنے منصوبوں میں ناکام ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ ایک پیشگوئی ہے کہ حضرت مسیح موعود کے زمانہ میں شیطان اپنی پوری قوت اور طاقت سے اپنا آخری حملہ کرے گا مگر ناکام رہے گا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی فرمایا ہے کہ ایک وقت آئے گا جبکہ ساری دنیا کا مذہب اسلام ہو جائے گا۔[۵۹]

ان سب باتوں سے پتہ لگتا ہے کہ اس سورۃ میں حضرت مسیح موعود کی بعثت کی پیشگوئی[۶۰] کی گئی ہے نیز اسے عید الضحیٰ سے مشابہت دی گئی ہے کیونکہ اس میں نماز پڑھنے اور قربانی دینے کا حکم ہے۔ اور یہی وہ عید ہے جس کے موقعہ پر نماز پڑھی اور قربانی دی جاتی ہے۔ پس

اس طرح اس عید کو حضرت مسیح موعودؑ کے زمانہ کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ جس طرح اس میں مومن کے لئے ضروری ہے کہ نماز پڑھے اور قربانی دے۔ اسی طرح مسیح موعودؑ کے زمانہ میں مومنوں کا فرض ہوگا کہ خوب خدا تعالےٰ کی عبادت کریں اور قربانیاں دیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ مسیح موعودؑ کے آنے کے وقت ان کو ایک ایسا انعام دیا جائے گا کہ اس کے شکریہ میں وہ اپنے رب کے حضور جس قدر بھی ہو سکے عبادت کریں۔ یہاں پہلے عبادت کرنے کا حکم دیا ہے یعنی انسان پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرے اور پھر قربانی کرے یعنی دوسروں کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اس میں اُسے جو کچھ خرچ کرنا پڑے کرے۔ اصل قربانی نفس کی ہی ہوتی ہے اور اسی کو کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

تو اس آیت میں خدا تعالےٰ نے دو اشارے فرماتے ہیں ایک یہ کہ وہ زمانہ خوشی کا زمانہ ہوگا۔ اور مومنوں کو اس میں خاص طور پر خوشی کا اظہار کرنا چاہیئے کیونکہ اگر کوئی ایسا نہ کرے تو گویا وہ خدا تعالےٰ کے اس فضل کو رد کر دیتا ہے اور اس طرح کرنے والے سے خدا تعالےٰ وہ انعام چھین لیتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ کہ اگر تم میرے انعامات پر شکر کرو تو میں اُسے بہت بڑھا دوں گا۔ اور اگر ناشکری کرو تو یاد رکھو کہ میرا عذاب بھی بہت سخت ہے۔ تو جو انسان خدا تعالےٰ کے انعام کی قدر نہیں کرتا اس سے چھین لیا جاتا ہے۔ چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا تعالےٰ نے اپنا ایک خاص فضل اور انعام قرار دیا ہے۔ اگر اس انعام کے ملنے پر خوشی کا اظہار نہ کیا جائے گا تو اس سے محروم کر دیا جائے گا۔ تو خدا تعالےٰ نے یہاں یہ بتایا ہے کہ تمہارا فرض صرف مسیح موعود کو ماننا ہی نہیں بلکہ اس پر خوشی اور فخر کرنا بھی ضروری ہے۔ اور وہ ایسی خوشی ہونی چاہیئے جیسی کہ کسی کو اپنے گھر بیٹا ہونے کے وقت ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ مسیح موعود تمہارے رسولؐ کے ہاں روحانی بیٹا پیدا ہؤا ہے۔ پس تم کو ایسی خوشی کرنی چاہیئے کہ تمہارے چہروں سے اس کا پتہ لگے۔ تمہاری حرکات و سکنات سے معلوم ہو کہ تم مسیح موعود کو مان کر بہت خوش ہو۔ لیکن اگر کوئی مسیح موعود کو ماننے کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال اور افعال اس کے چہرہ مُہرہ سے، اس کی بات چیت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اسے خوشی ہے تو گویا اس نے مسیح موعود کو قبول ہی نہیں کیا اور اسے کچھ حاصل ہی نہیں ہؤا۔ کیونکہ جس کو کوئی انعام ملتا ہے اس کی خوشی کی علامات اور آثار ضرور اس میں پائے جاتے ہیں۔ تو فرمایا کہ اگر تم مسیح موعود کو خدا کا انعام سمجھتے ہو تو تمہارے اعمال، افعال، گفتگو اور بشرہ سے اس انعام کی خوشی کے علامات کا پتہ لگنا چاہیئے

اور ہمیں مسیح موعود کی بعثت پر خوب خوشیاں کرنا چاہئیں اوّل تو ہر احسان اور انعام پر خوشی کا اظہار کرنا چاہیئے مگر یہ تو ایسا انعام ہے کہ جس کے متعلق خود خدا تعالےٰ خوشی کرنے کا ارشاد فرماتا ہے۔ پھر سوچ لو کہ کس قدر خوشی کرنا چاہیئے۔

پھر دوسرا اشارہ اس آیت میں یہ ہے کہ اس زمانہ میں یہ ضروری ہوگا کہ دعائیں بہت کثرت کے ساتھ کی جائیں اور خوب قربانیاں کی جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد پھیل جائے گی اور آپ کے دشمنوں کی نسل منقطع ہو جائے گی اور وہ ابتر ہو جائیں گے ان کی روحانی اولاد باقی نہ رہیگی کیونکہ سب جگہ مومن ہی مومن پھیل جائیں گے۔

ہمیں اس آیت سے یہ فائدہ اور یومِ عید سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ عید ہمیں یاد دلاتی ہے کہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ پر عمل کریں۔ پس ہماری جماعت کا فرض ہے کہ خوب دعائیں کرے اور قربانیوں میں لگی رہے۔

قربانیوں میں سب سے ضروری اپنے نفس کی قربانی ہے اس کے کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اور دوسری بھی ہر قسم کی قربانیوں سے دریغ نہ ہونا چاہیئے۔ جب یہ ہوگا تو اس وقت ہماری کامیابی یقینی ہے کیونکہ اسی وقت ہمارا دشمن ابتر ہوگا اور اسکی نسل منقطع ہو جائیگی یہاں خدا تعالےٰ نے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کے بعد اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ رکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ کی عبادت اپنے نفس کی اصلاح کرنے اور قربانیاں دینے کے بعد دشمن ابتر ہوگا

تو اللہ تعالےٰ نے ہمارے دشمنوں کے ناکام ہونے کے ساتھ یہ شرط لگا دی ہے اس لئے ہمارا فرض ہے کہ اس حکم کے ماتحت اپنے نفس کی خاص اصلاح کریں اور قربانیاں دیں۔ اپنے خیالات، اپنے اموال، اپنی اولاد، اپنے رشتہ دار اور اپنے نفس کی۔ غرضیکہ جو قربانی بھی کرنی پڑے کریں۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کہتا ہے کہ یہ قربانی کرنے کا زمانہ ہے۔ پس یہ عید ہمیں اس طرف متوجہ کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ جس طرح اس دن تم بکروں وغیرہ کو ذبح کرتے اور ان کی گردنوں پر چھری رکھتے ہو۔ اسی طرح اپنے مالوں اور جانوں کو قربان کرو تاکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی رُوحانی نسل بڑھے اور آپ کے دشمن ابتر ہوں۔

پس میں یہاں کی جماعت کو نصیحت کرتا ہوں۔ جو لوگ بیٹھے ہیں وہ سُن لیں اور باقیوں کو انشاء اللہ اخبار کے ذریعہ سے یہ باتیں پہنچ جائیں گی۔ بہت لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے مسیح موعودؑ کو مان لیا ہے اب ہمیں کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس طرح خدا تعالیٰ

خوش نہیں ہو گا۔ خوش اسی وقت ہو گا جبکہ تَصَبَّتِ لِرَبِّكَ وَ انْحَرْ پر عمل کیا جائے گا اور اپنے آپ کو خدا تعالےٰ کے حضور گرا دیا جائے گا اور ہر ایک قربانی کی جائے گی لیکن اگر یہ نہیں تو پھر کچھ نہیں۔ پس ہماری جماعت کے لوگوں کو چاہیئے کہ اپنے فرائض سمجھیں اور ایک طرف اپنے اخلاق و عادات، اعمال و افعال، تقویٰ و طہارت میں ترقی کریں تو دوسری طرف ہر ایک قربانی کریں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص دوسرے انسان کے احسان کے مقابلہ میں کہدے کہ میں نے بہت قربانی کر دی ہے مگر اللہ تعالےٰ کے کسی فضل اور انعام کے مقابلہ میں کوئی بڑی سے بڑی قربانی ایسی نہیں جو پیش کی جا سکے۔ اس کے لئے تو اگر خدا کے لئے جان و مال، بیوی بچے، عزیز و رشتہ دار بھی قتل کرا دینے پڑیں تو پھر بھی کچھ نہیں۔ ایک شاعر تھا تو بے دین مگر اس کا ایک شعر مجھے بہت پسند ہے کہتا ہے ؎

جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا[۱]

تو دنیا میں ایک انسان کے مقابلہ میں انسان قربانی کر کے اس کا بدلہ اتار سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ اور اس کے خاص بندوں کے احسانات اور انعامات کہ وہ بھی خدا ہی کی طرف سے ہوتے ہیں ان کے مقابلہ میں کوئی انسانی قربانی ایسی نہیں جو کچھ حیثیت رکھتی ہو کیونکہ اس کے انعام اس قدر عظیم الشان ہوتے ہیں کہ جن کا شکریہ ادا ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے انسان جو بھی قربانی کرے وہ کم اور تھوڑی ہے مگر کئی لوگ ایسے ہیں جو کچھ خدمتِ دین کر کے یا چندہ دے کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے بہت کچھ کر لیا ہے۔ پھر اگر ان سے چندہ مانگا جائے تو اعتراض کرتے ہیں کہ ہر وقت چندہ ہی مانگا جاتا ہے، ہم پہلے جو دے چکے ہیں۔ لیکن ان کو دیکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ کے احسانات کے مقابلہ میں کیا قربانی کی ہے۔ وہ تو اگر اپنا سب کچھ بھی خدا کی راہ میں دے دیتے تو پھر بھی احسان ادا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو کچھ انسان کے پاس ہوتا ہے، وہ سب کچھ خدا تعالےٰ کا ہی دیا ہوا ہوتا ہے اگر وہ سارا ہی لے لے تو انسان کیا کر سکتا ہے۔ مگر یہ بھی اس کا احسان اور رحم ہے کہ اپنی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کچھ ہی کہتا ہے اور باقی ہمارے پاس رہنے دیتا ہے تو اس قسم کے خیالات شیطانی خیالات ہوتے ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالےٰ کے حکم کے خلاف کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ مومن کو چاہیئے کہ جس قدر بھی اس سے ہو سکے، قربانی کرے لیکن ہو سکنے کا فیصلہ اپنے دل سے نہیں کرنا چاہیئے بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس وقت دین کو کس قدر قربانی کی ضرورت ہے۔ اور وہ اس سے کیسی قربانی کا مطالبہ کر رہا ہے کیونکہ خدا تعالےٰ کی طرف سے کوئی دینی ضرورت ایسی نہیں پیدا کی جاتی کہ جس کے پورا کرنے کے لئے اس وقت کے لوگوں میں طاقت اور ہمت نہ ہو[۲] بلکہ ایسی ہی پیدا کی جاتی ہے جس کو لوگ

پُورا کر سکیں اس لئے دین کی ضرورت کو دیکھکر قربانی کرنا چاہیئے اور یہ وسوسہ ہرگز دل میں نہ آنے دینا چاہیئے کہ ہم نے بہت کچھ کر لیا ہے۔ اب کرنے کی ضرورت نہیں ہے یا ہم کر نہیں سکتے۔

اللہ تعالیٰ ہماری جماعت کو توفیق دے کہ اس زمانہ کو سمجھیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ جو خدا تعالیٰ کا ہم پر فضل ہوا ہے اور ہم پر جو انعامات کے دروازے کھولے گئے ہیں ان کا شکریہ ادا کر سکیں اور جہاں تک ہو سکے ہر رنگ میں قربانی کرنے کی خواہش اور موقعہ نصیب ہو اور کچھ خدمت دین کر کے اس پر فخر اور ناز نہ ہو بلکہ اس پر بھی خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں کہ اس نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے اس کے کرنے کی توفیق دی ہے۔

(الفضل ۷؍ اکتوبر ۱۹۱۷ء صفحہ ۶ تا ۱۰)

ے۱ - الکوثر ۱۰۸ : ۲ تا ۴

ے۲ - مشکوٰۃ المصابیح باب صلوٰۃ العیدین ص۱۲۷ مطبوعہ دہلی ۱۹۳۲ء - نیل الاوطار امام شوکانی جلد ۳ ص۱۷۶ و ۱۷۷

ے۳ - ۱۱ اپریل ۱۹۰۰ء مطابق ۱۰ ذوی الحجہ ۱۳۱۷ھ کو عیدالاضحی کی نماز ادا کرنے کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے الٰہی تصرف کے ماتحت عربی زبان میں ایک نہایت فصیح و بلیغ فی البدیہہ خطبہ ارشاد فرمایا یہ خطبہ بعد میں خطبہ الہامیہ کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس میں پہلا حصّہ الہامی ہے اور اور ایک زبردست اعجازی نشان ہے باقی چار ابواب آپ نے بعد میں رقم فرمائے۔ اس خدائی نشان کی تفصیل کے لئے دیکھیں حقیقۃ الوحی ص۳۶۲، ص۳۶۳

ے۴ - مفردات امام راغبؒ - فتح البیان مصری جلد ۱۰ ص۳۴۷

ے۵ - تفسیر کبیر امام رازی جلد ۸ ص۴۹۵

ے۶ - صحیح بخاری کتاب التفسیر باب سورۃ کوثر - صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب حجۃ من قال البسملۃ اٰیۃ من اول کل سورۃ

ے۷ - صحیح بخاری کتاب التفسیر باب سورۃ کوثر - تفسیر کبیر امام رازی جلد ۸ ص۴۹۷

ے۸ - حضرت عبداللہ بن عباسؓ - بنو ہاشم - اسلام ۳ھ قبل ہجرت - وفات ۶۸ھ یا ۷۰ھ

ے۹ - صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابہ - صحیح بخاری کتاب المناقب باب مناقب ابن عباسؓ

ے۱۰ - صحیح بخاری کتاب التفسیر باب سورۃ نصر۔

ے۱۱ - تفسیر ابن کثیر حاشیہ تفسیر فتح البیان جلد ۱۰ ص۳۰۵

ے۱۲ - حضرت حسن بصریؒ (۲۱ھ - ۱۱۰ھ) مشہور تابعی اور علوم ظاہری و باطنی میں یگانہ روزگار عالم تھے۔

۱۳ھ - تفسیر ابن کثیر حاشیہ تفسیر فتح البیان جلد ۱۰ صـ۳۰۵

۱۴ھ - تفسیر ابن کثیر حاشیہ تفسیر فتح البیان جلد ۱۰ صـ۳۰۶

۱۵ھ - حضرت ابو عبد الرحمن عبداللہ بن مسعودؓ - بنو تمیم - وفات ۳۲ھ بعمر ۶۰ سال (طبقات ابن سعد ۱۱۰/۳، تاریخ کامل ابن اثیر ۱۳۰/۳)

۱۶ھ - سنن ابی داؤد، کتاب الصلوۃ باب الامام یکلم الرجل فی خطبتہ

۱۷ھ - السیرۃ الامام ابن ہشام الجزء الاول صـ۱۲۹

۱۸ھ - المائدۃ ۵ : ۲۵

۱۹ھ - حضرت مقداد بن عمروؓ نے مہاجرین کی طرف سے اور حضرت سعد بن معاذؓ نے انصار کی طرف سے یہ الفاظ کہے تھے۔ السیرۃ الامام ابن ہشام الجزء الثانی صـ۱۳۱-۱۲ - صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۃ مائدہ و کتاب المغازی باب غزوہ بدر۔

۲۰ھ - صحیح بخاری کتاب المغازی ابواب غزوہ بدر۔ عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری جلد ۱۷ صـ۸۰

۲۱ھ - یہ غزوہ ۸ھ میں ہوا حنین مکہ اور طائف کے درمیان ذی المجاز کے پہلو میں ایک وادی کا نام ہے (معجم البلدان جلد ۳ صـ۳۵۴)

۲۲ھ - تمام مستند تواریخ میں یہ روایت اس طرح بیان ہوئی ہے۔ فلما رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرۃ من معہ قال لن نُغلب الیوم من قلۃ (تاریخ کامل ابن اثیر ۲۶۲/۲)

۲۳ھ - السیرۃ الامام ابن ہشام جلد ۳ صـ۹ ذکر غزوہ حنین

۲۴ھ - التوبۃ ۹ : ۲۵

۲۵ھ - السیرۃ الامام ابن ہشام جلد ۳ صـ۱۰ - صحیح مسلم کتاب الجہاد باب غزوہ حنین

۲۶ھ سنن ابی داؤد کتاب النکاح باب تزویج ابکار - جامع ترمذی ابواب الطہارۃ باب ماجاء فی فضل الطہور - سنن ابن ماجہ کتاب النکاح باب ماجاء فی فضل النکاح

۲۷ھ - مفردات امام راغب زیر لفظ کوثر - تفسیر کبیر امام رازی جلد ۸ صـ۴۹۸

۲۸ھ - طبقات ابن سعد جلد ۱ صـ۸۵ مطبوعہ لیدن Leiden ۱۳۲۲ھ تفسیر درمنثور جلد ۶ صـ۴۰۴

۲۹ھ - تاج العروس جلد ۳ صـ۱۵۲

۳۰ھ - تفسیر دُرِ منثور جلد ۶ صـ۴۰۳

۳۱ھ - غالباً سہو کتابت ہے تاریخ طبری یا تفسیر طبری میں ذکر نہیں البتہ تاریخ کی بعض دیگر کتب سے آنحضرتؐ کے بیٹے قاسم کی وفات پر ابتر کہنا ثابت ہے۔

۳۲ھ - الاحزاب ۳۳ : ۴۱

۳۳ھ - حضرت ابوبکر عبداللہ ابن ابی قحافہ - بنو تیم - خلیفۃ الرسول الاول خلافت ۱۱ھ/۶۳۲ء وفات ۱۳ھ/۶۳۴ء۔

۳۴ھ - حضرت عمرؓ بن الخطاب - بنو عدی - خلیفۃ الرسول الثانی - خلافت ۱۳ھ/۶۳۴ء وفات ۲۳ھ/۶۴۴ء

۳۵ھ - حضرت عثمانؓ بن عفان - بنو عبد الشمس - خلیفۃ الرسول الثالث خلافت ۲۳ھ/۶۴۴ء وفات ۳۶ھ/۶۵۶ء -

۳۶ھ - حضرت علیؓ ابن ابی طالب - بنو ہاشم - خلیفۃ الرسول الرابع - خلافت ۳۶ھ/۶۵۶ء وفات ۴۰ھ/۶۶۱ء -

۳۷ھ - حضرت ابو محمد طلحہؓ بن عبید اللہ - بنو تمیم - عشرہ مبشرہ میں سے ایک تھے ۳۶ھ جنگ جمل میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے -

۳۸ھ - حضرت ابو عبد اللہ زبیرؓ بن العوام - القرشی الاسدی - عمۃ رسولؐ حضرت صفیہ کے صاحبزادہ اور عشرہ مبشرہ میں سے ایک تھے - وفات ۳۶ھ

۳۹ھ - صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب ما ذکر عن بنی اسرائیل - صحیح مسلم کتاب العلم باب اتباع سنن الیہود والنصاریٰ

۴۰ھ - صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب نزول عیسیٰ بن مریم -

۴۱ھ - صحیح مسلم کتاب الایمان باب نزول عیسیٰ بن مریم حاکماً بشریعۃ نبیّنا صلی اللہ علیہ وسلم

۴۲ھ - حضرت ابو عبد اللہ سلمان الخیر الفارسیؓ - اسلام ۵ھ - وفات ۳۵ھ

۴۳ھ - اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ جلد ۲ ص۳۲۸

۴۴ھ - مریم ۱۹ : ۶-۷

۴۵ھ - مریم ۱۹ : ۱۱

۴۶ھ - مریم ۱۹ : ۱۲

۴۷ھ - تبلیغ رسالت جلد ۶ ص۸

۴۸ھ - ایک غلطی کا ازالہ ص۱۵ مطبوعہ لاہور

۴۹ھ - روحانی خزائن (خطبہ الہامیہ) جلد ۱۶ ص۶۷-۶۹

۵۰ھ - ابراہیم ۱۴ : ۸

۵۱ھ - تذکرہ طبع سوم ص۴۲۶

۵۲ھ - دیوان غالب مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور ۱۹۶۰ء - ص۴۷

۵۳ھ - البقرہ ۲ : ۲۸۷ - تفسیر دُرِّ منثور جلد ۱ ص۳۷۶

۶

(فرمودہ ۱۷ ستمبر ۱۹۱۸ء بمقام عید گاہ۔ قادیان)

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا

اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ ہمیشہ کسی جماعت کی ترقی اور اس کی بلندی قربانیاں چاہتی ہے اور کوئی جماعت ایسی نہیں ملے گی جسے بغیر قربانی کے ترقی حاصل ہوئی ہو۔ کوئی انسان ایسا نہیں ملیگا جس نے بغیر قربانی ترقی پائی ہو۔ ترقی اور کامیابی کے لئے ضرور قربانی کرنی پڑتی ہے۔ اور جب تک انسان قربانی نہ کرے وہ کوئی بڑی کامیابی اور عزت حاصل نہیں کرسکتا۔ پس ہر ایک وہ شخص جس کے مدنظر ترقی ہو خواہ وہ دنیاوی ہو یا دینی، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام ان قربانیوں پر عامل ہو جو اس ترقی کے لئے ضروری ہیں اور ان قربانیوں کے لئے اس کے دل میں کسی قسم کی جھجک اور کسل پیدا نہ ہو کیونکہ جس کے دل میں ایسا خیال پیدا ہوتا ہے وہ کوئی قربانی نہیں کرسکتا اور جو قربانی نہیں کرتا اس کی امیدیں ناامیدی سے بدل جاتی ہیں اور اس کی ترقی کی خواہشات کبھی پوری نہیں ہوسکتیں۔

دنیا میں قربانی کا قانون ہر کام میں جاری ہے اور چھوٹی چیز بڑی چیز کے لئے قربان ہو رہی ہے۔ دیکھو غلّہ لاکھوں اور کروڑوں من بڑی محنت سے پیدا کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا انجام کیا ہوتا ہے یہی کہ انسان کے اندر ایک بھٹی ہے جس میں جھونک دیا جاتا ہے۔ ہندو ہوَن کرتے ہیں اور اس میں گھی، صندل، نافہ وغیرہ وغیرہ چیزیں جلاتے ہیں۔ حالانکہ ان چیزوں کو بیرونی آگ پر جلا کر ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ خود انسان کے اندر ہی ایک آگ ہے جس میں ان کو جلایا جاتا ہے اور اس طرح وہ اس کی زیست کا باعث بنتی ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ کروڑوں من غلّہ انسان کی زیست کے لئے اس کے پیٹ کے بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ اور اربوں من بھوسہ جانوروں کے تنورِ شکم میں جلایا جاتا ہے یہ کیوں؟ اس لئے کہ جانوروں اور انسانوں کی زندگی بھوسہ اور غلّہ سے بہت قیمتی ہے۔ اور وہ اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ ان چیزوں کو اس کے لئے قربان کیا جائے پس وہ اس کی خاطر قربان ہوتی ہیں۔ پھر ایک بڑے آدمی کی بقا کے لئے جس سے ملک اور قوم کو فائدہ پہنچتا ہو، ہزاروں چھوٹے انسان قربان ہوتے ہیں اور ہزاروں اپنے وقت، علم اور محنت اور جان تک کو اس کی زندگی قائم رکھنے کے لئے قربان کر دیتے ہیں

تو تمام دنیا کے کاموں میں قربانی کا سلسلہ جاری ہے اور جتنی کارآمد کوئی چیز ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ اس کے لئے قربانی کی جاتی ہے۔ بعض انسانوں کے لئے ہزاروں لاکھوں انسان قربان ہو جاتے ہیں ایک بادشاہ کے لئے۔ ایک جرنیل کے لئے۔ ایک افسر کے لئے بیسیوں نہیں سینکڑوں اور ہزاروں لیا آدمی اپنے آپ کو قربان کر دیتے ہیں اور اگر ایک کارآمد انسان بہت بڑی انسانی قربانیوں کے کے بعد بچا لیا جائے تو بہت بڑی کامیابی سمجھی جاتی ہے اور جس دن ایسی کامیابی حاصل ہوئی ہو اسے عید کا دن سمجھا جاتا ہے۔ اور اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جو شخص کسی قوم کے لئے یا ملک کے لئے یا مذہب کے لئے مفید تھا اور لاکھوں انسانوں کی زندگی کا سہارا اور ان کے لئے آرام کا باعث تھا اس کی حفاظت کے لئے اگر ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کو بھسم ہونا پڑا ہے تو ہو گئے ہیں۔ اور اس ایک جان کے لئے بے شمار جانیں قربان کر دی گئی ہیں۔ اور قربان ہونے والے اس قربانی پر فخر کرتے ہیں کہ یہ خدمت ہم بجا لا سکے۔

اس قسم کے نظاروں کے شاہد تاریخی اوراق ہیں جن سے اس قسم کے بہت سے واقعات مل سکتے ہیں۔ یہ تو ایک مشہور واقعہ ہے اور ہندوستان کی تاریخ پڑھنے والے بچے بھی جانتے ہیں کہ جس وقت ہمایوں بادشاہ شیر شاہ سے شکست کھا کر بھاگا ہے۔ اس وقت اس کا مشہور جرنیل بیرم خاں دشمنوں کے قبضہ میں آگیا جس کے ساتھ اس کا غلام بھی گرفتار ہوا جب ان سے پوچھا گیا کہ بیرم خاں کون ہے تو غلام نے کہا میں ہوں اس پر بیرم خاں نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنا آپ دشمنوں پر ظاہر کر دے اور انہیں یقین دلا دے کہ میں ہی بیرم خاں ہوں لیکن اس کے غلام نے ایسا رنگ اختیار کیا اور ایسے طریق سے گفتگو کی کہ دشمنوں کو یقین آگیا کہ وہی بیرم خاں ہے اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ اس طرح بیرم خاں بچ گیا۔ اگرچہ غلام نے جھوٹ سے کام لیا لیکن اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنے آپ کو آقا پر قربان کر کے اس کی جان بچا لی۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ میرے وجود کی نسبت اس کا وجود بہت قیمتی اور کارآمد ہے۔ چنانچہ بیرم خاں ہمایوں کی اس مصیبت کے وقت میں بہت کام آیا اور اسی کے ذریعہ ہمایوں کو بہت سی فوج ملی جس سے اس نے ہندوستان کو دوبارہ فتح کیا۔

یہ تو ایک شخص کی قربانی کا واقعہ ہے۔ بعض جگہ تو ہزاروں اور لاکھوں انسانوں نے صرف ایک شخص کے لئے اپنی جان قربان کر دی ہے۔ ابھی قریب ہی کے زمانہ میں ایک مشہور بادشاہ گذرا ہے جس کا نام نپولین تھا۔ یہ ایک معمولی خاندان کا ممبر اور بہت ہی معمولی حیثیت کا انسان تھا حتیٰ کہ مؤرخین کو اس کے والدین کے تاریخی حالات میں بھی شبہ پڑا

ہوا ہے۔ بعض اس کے والد کے متعلق کچھ لکھتے ہیں اور بعض کچھ۔ یہ جزیرہ کارسیکا کا رہنے والا تھا اور تعلیم پانے کے لئے فرانس میں آیا تھا لیکن اپنی دانائی اور ملک کی خیرخواہی کی وجہ سے آہستہ آہستہ فرانس کا بادشاہ بن گیا۔[۸] فرانس میں جب بغاوت اور فساد ہوا۔ تو بادشاہ اسی کو بنایا گیا تھا نسلی یا خاندانی تو کوئی وجہ ایسی نہ تھی کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے اور اسے اپنا شہنشاہ بنا لیتے۔ لیکن اس میں جو قابلیت اور ملک کی خیرخواہی تھی، اس کی وجہ سے یہ مقام اسے حاصل ہوا۔ کہ بعض اوقات لاکھوں ہزاروں انسان اس کی خاطر اور اس کی حفاظت کرتے ہوئے ذبح ہو گئے۔[۸] آخری دفعہ واٹرلو کے میدان میں جب انگریزوں اور جرمنوں نے اس کو شکست دی ہے۔ اس وقت کے واقعات نہایت مؤثر اور رقت پیدا کرنے والے ہیں۔ اس کے متعلق اسی کا ایک جرنیل لکھتا ہے کہ جس وقت نپولین کو یہ دھوکا لگ گیا کہ اس نے سمجھا کہ اس کی فوج کا وہ حصہ جسے اس نے پیچھے اپنی مدد کے لئے چھوڑ رکھا تھا کہ بعد میں آملے وہ آ رہا ہے۔ حالانکہ آنیوالی فوج دشمن کی فوج تھی، اور وہ بالکل قریب آ گئی تھی تو یہ خبر لے کر میں ہی نپولین کے پاس گیا۔ جس وقت میں گیا تو ہماری ساری فوج پراگندہ ہو رہی تھی اور گولہ بارود بالکل ختم ہو چکا تھا۔ آگے اور پیچھے دونوں طرف دشمن حملہ آور تھا اس خطرناک صورت میں ہر ایک جرنیل نپولین کے پاس آتا اور کہتا کہ اب آپ میدان سے ہٹ جائیں لیکن اس کا یہی جواب تھا کہ جس میدان میں میں اپنے ملک کے نوجوانوں کو لا کر قربان کر رہا ہوں اس سے خود کس طرح ہٹ جاؤں۔ میں یہاں سے کبھی نہیں ہٹوں گا۔ اس وقت توپخانہ کے آدمی نہتے ہو کر نپولین کے گرد کھڑے تھے جن سے پوچھا گیا کہ جب تمہارے پاس لڑائی کا سامان نہیں تو کیوں نہیں ہٹ جاتے۔ انہوں نے کہا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے پاس سامان نہیں ہے لیکن ہم اس لئے میدان سے نہیں ہٹتے کہ ہمارے ہٹنے سے نپولین پکڑا جائے گا۔ آخر اس کے گارڈ کے آدمی بھی کٹنے شروع ہو گئے بلکہ قریباً کٹ گئے تو بھی نپولین میدان سے ہٹ جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ اور اس کی جان نہایت خطرہ میں پڑ گئی۔ تو دو جرنیل آئے اور انہوں نے اس کے گھوڑے کی باگیں پکڑ لیں۔ اور کہا کہ اب ملک کی خیرخواہی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اس بارہ میں آپ کی اطاعت نہ کریں۔ یہ کہا اور نپولین کے گھوڑے کو ایڑ لگا کر دوڑاتے ہوئے میدان سے لے گئے۔[۹]

اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ نپولین کے لئے کس قدر لوگوں نے اپنے آپ کو قربان کیا ہوگا۔ تاریخ اس سے بھی بڑی بڑی قربانیاں ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ یہ قربانیاں تو وہ تھیں جو ایک آدمی کے لئے کی گئیں۔ لیکن ایک وہ قربانیاں ہوتی ہیں جو اس سے بھی بڑی

ہوتی ہیں اور آدمی کی قربانیاں ان قربانیوں کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ وہ چیز جس کے لئے اس سے بھی زیادہ قربانیوں کی ضرورت ہے، وہ حق اور صداقت ہے۔ اللہ کا قرب اور اس کی محبت ہے۔ اللہ کی رضا کا حصول ہے اور انسانوں کو جو اصلی اور حقیقی بڑائی حاصل ہوتی ہے وہ بھی اس کے حصول کے بعد ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت موسٰے علیہ الصلوٰۃ والسلام بڑے آدمی تھے لیکن کیوں؟ اسی لئے کہ خدا کی رضا ان کو حاصل تھی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تمام بنی نوع انسان کے سردار اور سب سے بڑی شان اور عظمت رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ سب سے زیادہ خدا کا قرب اور اس کی رضا آپ کو حاصل ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جس چیز نے تمام آدم زادوں سے بڑا اور معزز بنایا وہ خدا کا قرب اور اس کی رضا ہی ہے۔ اور اس کی وجہ سے آپؐ کا درجہ سب سے بلند اور اعلیٰ ہے تو بڑائی اسی میں ہے کہ ہم خدا کی رضا حاصل کریں۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بڑائی بھی اسی میں ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بڑائی اپنی ذات کے باعث نہیں۔ موسٰے علیہ السلام کی بڑائی اپنی ذات کے باعث نہیں۔ نوح علیہ السلام و ابراہیم علیہ السلام کی بڑائی اپنی ذات کے سبب نہیں۔ ان کی بڑائی اور بزرگی کا سبب خدا کی محبت، اس کا قرب اور اس کی رضامندی ہی ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو رسولوں کی سرداری کس بات سے حاصل تھی۔ اسی سے کہ آپؐ سب سے زیادہ خدا کی محبت میں گداز تھے اور آپؐ پر سب سے زیادہ خدا کے صفات جلوہ گر ہوئے تھے تو حق وصداقت، رضا اور قرب الٰہی ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے لئے جتنی بھی بڑی سے بڑی قربانی کرنی پڑے کرنی چاہیئے۔ دیکھو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جیسی عزیز اور قیمتی جان کو میدان میں دشمنان حق کے مقابلہ کے لئے اسی لئے جانا پڑا کہ آپؐ حق کی حفاظت کریں۔ چونکہ دشمن حق کو مٹانا چاہتے تھے اس لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسی قیمتی جان کو بھی اس کی حفاظت کے لئے اپنی قربانی دینے سے انکار نہیں تھا۔ اس سے سمجھ لو کہ حق کتنی بڑی اور عظیم الشان چیز ہے اور اس کے لئے تمہیں کس قدر قربانی کرنی چاہیئے۔

تمام کائنات میں یہ قانون جاری ہے کہ چھوٹی چیز بڑی چیز کے لئے قربان ہو رہی ہے۔ بڑے درخت کے نیچے چھوٹا درخت ہو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ چھوٹا بڑے کے لئے قربان ہو جائے گا اور سوکھ جائے گا۔ یہ خدا کا قانون ہے اس سے کسی چیز کو مفر نہیں اور قانونِ قدرت اس بات کا شاہد ہے کہ جو خود بخود قربانی کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اسے بھی دوسروں کے لئے قربان کر دیا جاتا ہے۔ دیکھو انسان کے فنا ہونے کے ہزاروں ذریعے ہیں

کہیں مختلف قسم کی بیماریوں سے لوگ مرتے ہیں، کہیں زہر سے مرجاتے ہیں، بعض قتل کئے جاتے ہیں غرض ہزاروں ذریعوں سے لوگ مرجاتے ہیں اور کوئی نہیں جو ہمیشہ زندہ رہا ہو۔ سب سے بڑا انسان جو دنیا میں آیا اور جس سے بڑا قیامت تک نہیں آئے گا وہ ہمارے آنحضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لیکن کیا آپ زندہ رہے؟ ہرگز نہیں بلکہ آپ کو بھی آخر دنیا کو چھوڑنا ہی پڑا۔ آپ کی وفات کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی دفات کے لئے بطور دلیل پیش کیا کرتے تھے کہ جب آپ زندہ نہیں رہے تو حضرت عیسےٰ کس طرح زندہ رہ سکتے ہیں۔ آپ سیّدُ وُلدِ آدم تھے۔ تمام بنی آدم کے سردار تھے۔ اور آپ کی وہ شان ہے کہ خدا تعالےٰ آپ کو فرماتا ہے۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو اور اس کے محبوب بننا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ میری اطاعت کرو۔ جب تم ایسا کروگے تو خدا تعالےٰ تم سے پیار کرے گا۔ پس جب آپ ایسا عظیم الشان اور بے نظیر انسان بھی بالآخر فوت ہی ہوگیا اور ایسے وقت میں ہؤا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے جلیل القدر انسان کو کہنا پڑا کہ اگر کوئی یہ کہے گا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فوت ہوگئے ہیں تو میں اس کا سر تلوار سے اُڑا دوں گا۔ غرض آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو جہان چھوڑنا ہی پڑا۔ اور آپ کی وفات پر حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ؎

کُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِیْ فَعَمِیَ عَلَیْکَ النَّاظِرُ
مَنْ شَاءَ بَعْدَکَ فَلْیَمُتْ فَعَلَیْکَ کُنْتُ اُحَاذِرُ

کہ تو میری آنکھ کی پُتلی تھا۔ تیرے فوت ہونے سے میری آنکھ اندھی ہوگئی ہے۔ تیرا مرنا مجھ پر شاق تھا۔ اب جو چاہے مرے مجھے اس کی کچھ پرواہ نہیں۔

غرض مرنا تو سب کو ہے لیکن موت وہی مبارک ہے۔ جو خدا کے لئے اور اس کے دین کی خاطر ہو۔ غلہ ہزاروں من ضائع ہوجاتا ہے لیکن کیا وہ قیمتی کہا جا سکتا ہے یا سے جو انسان کے پیٹ میں جائے۔ پھر وہ پھل قیمتی ہے جسے انسان کھائے یا وہ جو اگرچہ کچھ زیادہ دنوں درخت پر رہے لیکن گل سڑ کر زمین پر گر پڑے۔ یقیناً ماننا پڑے گا کہ وہی پھل قیمتی ہے جسے انسان نے کھایا اور جو انسان کے جسم کا کوئی جزو بنا اور خدا کی رضا کے ماتحت چلنے والا ہؤا۔ مثلاً وہ سیب کس قدر قیمتی تھا جس کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کھایا۔ اور وہ آپ کے جسم اطہر کا کوئی حصہ بنا اور اس نے اس ذریعہ سے خدا کی رضا کے حاصل کرنے والے کام کئے۔ تو اس سیب کو نہایت قیمتی کہا جائے گا۔ اور اس کی موت و قربانی قابلِ قدر ہوگی جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وجود کا جزو ہوئی۔ اسی طرح وہ جان جو خدا کی راہ میں صرف ہوئی

وہ قیمتی ہوسکتی ہے یا وہ جو یونہی ضائع ہوگئی یقیناً خدا کی راہ میں قربان ہونے والی قیمتی ہے۔

پس جب موت ہر ایک انسان کو لگی ہوئی ہے اور اس سے کوئی باہر نہیں تو پھر کیوں انسان اپنی جان ایسی جگہ صرف نہ کرے جس سے خدا کی رضا حاصل ہو۔ کیونکہ مبارک ہے وہ موت جو خدا کے لئے قبول کی جائے۔ بابرکت ہے وہ مال جو اس کی راہ میں صرف ہو اور جس کا نتیجہ رضاءِ مولیٰ ہو اور افسوس ہے اس زندگی پر جو خرچ تو ہو مگر حق و صداقت کے لئے خرچ نہ ہو۔ افسوس ہے اس مال پر جو صرف تو ہو لیکن رضاءِ مولےٰ کے لئے صرف نہ ہو۔ ضائع ہوگئی وہ زندگی جو خدا کے لئے نہ دی گئی اور تباہ ہوگیا وہ مال جو اس کی راہ میں صرف نہ ہوا۔ اور برباد ہوگیا وہ وقت جو خدا کی محبت سے خالی گذرا۔ خدا نے تو انسان کے لئے بڑے بڑے اعلیٰ درجے کے مدارج رکھے ہیں مگر افسوس کہ اکثر انسان ان کی طرف سے لاپرواہی کرتے ہیں۔

انسان اگر اپنی ابتداء پر غور کرے تو حیران ہو جائے کہ کن کن چیزوں کا خلاصہ ہے اور کیسی ادنیٰ چیزیں اس کا جزو ہیں۔ کچھ چنے ہیں کچھ ماش ہے اور کچھ گیہوں ہے کچھ ساگ پات وغیرہ چیزیں ہیں جو اس کے باپ نے کھائیں اور ان سے ایک خلاصہ تیار ہوا جو اس کی ماں کے رحم میں گیا اور اس سے وہ پیدا ہوا اور خدا کی توفیق سے چلنے پھرنے لگا۔ پھر خدا نے اپنے فضل کی راہیں اس پر کھول دیں اور اپنی ذات و صفات کا علم حاصل کرانے کے لئے اس کی جنس میں سے کسی انسان پر اس کی خاطر اپنا کلام نازل کیا۔ پھر اس کو توفیق دی کہ اس کلام کو سُنے اور اسے تسلیم کرے خدا کے ان مرسلوں میں ایک سب سے عظیم الشان محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں۔

انسان اپنی اس ابتداء کو دیکھے اور پھر انتہاء پر نظر کرے۔ ابتداء میں تو یہ کہیں گوشت میں نظر آتا ہے، کہیں سبزی میں، کہیں غلّہ وغیرہ میں۔ مگر انتہاء یہ ہوتی ہے کہ ازلی ابدی خدا اس پر ظاہر ہوتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے اور اس کی ہر جگہ اور ہر حالت میں اور ہر شر اور مصیبت میں حفاظت کرتا ہے اور اگر ضرورت پڑے تو اس کی خاطر لاکھوں انسانوں کو قربان کر ڈالتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کونسا درجہ ہے جو انسان کو حاصل ہوسکتا ہے لیکن یہ کس طرح حاصل ہوسکتا ہے اسی طرح کہ خدا کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دیا جائے۔ اور جو خدا کے لئے اپنے آپ کو قربان کرتا ہے وہ ضرور کامیاب ہو جاتا ہے۔

پس اس بات کو خوب یاد رکھو کہ جو خدا کے لئے قربان ہوتا ہے وہ مسِ خام بھی ہوتا ہے تو کندن ہو کر نکلتا ہے۔ بکرا ذبح ہوتا ہے تو انسان اس کو کھاتے ہیں اور اس طرح اس کی قربانی ضائع نہیں جاتی بلکہ انسانوں کے جسم کا جزو بن جاتا ہے اسی طرح ہزاروں چیزوں کو انسان کے لئے قربان ہونا پڑتا ہے۔ اور انسان کو خدا کے لئے قربان ہونا پڑتا ہے۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا

ہے کہ وہ خدا کا محبوب ہو جاتا ہے۔

جو لوگ خود خدا کے لئے قربان نہیں ہوتے۔ فنا تو ان کو ہونا ہی پڑتا ہے مگر ان کی یہ فنا قابل قدر نہیں ہوتی۔ اکثر تو ایسے ہوتے ہیں کہ دنیا میں ہی ان کی زندگی ان کے لئے وبال ہو جاتی ہے۔ آپ لوگوں نے دیکھا ہو گا۔ کہ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جن کے علم کی بڑی شہرت ہوتی ہے مگر ان پر ایک وقت ایسا آجاتا ہے جبکہ وہ ارذل العمر کو پہنچ جاتے ہیں ایسی حالت میں لوگ جو ان کے شاگرد اور عزیز ہوتے ہیں اور جو ہمیشہ ان کے مشوروں کے محتاج ہوتے ہیں ان کی باتوں پر ہنسنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو سٹھیا گیا ہے یا کہتے ہیں کہ میاں اس کے پاس کیا جائیں وہ تو بڑھاپے کی وجہ سے چڑچڑا ہو گیا ہے۔ ایک دن تو وہ معلّم ہوتا ہے لیکن جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو متعلّم بھی اس کو کوئی نہیں بناتا۔ یا تو وہ استاد ہوتا ہے یا وہ شاگرد ہونے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا۔ غرض وہ قعرِ مذلت میں گر کر اس حالت کو پہنچ جاتا ہے۔ مگر جو خدا کی راہ میں اپنے آپ کو قربان کر دیتے ہیں اور اس کے پیارے ہوتے ہیں ان کی یہ حالت ہرگز نہیں ہوتی۔

دنیا میں بڑے بڑے بادشاہ ہوئے ہیں جن کا بڑا رعب اور بڑی سطوت تھی لیکن آخری عمر میں فالج کی وجہ سے ان کے ہوش و حواس زائل ہو گئے اور ان کی زندگی ان کے لئے موت سے بدتر ہو گئی۔ پھر کئی بادشاہ ایسے گذرے ہیں جن کے آخری لمحے نہایت حسرت و یاس کے ساتھ ختم ہوئے اور وہ ہاتھ ملتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے مگر کوئی ایک نبی بھی تو ایسا نہیں گذرا جس کا ایسا انجام ہوا ہو۔ بڑے بڑے جرنیل گذرے ہیں جو ایڑیاں رگڑتے رگڑتے مر گئے ہیں۔ اور بڑے بڑے بہادر ہوئے ہیں جنہوں نے نہایت عبرت انگیز طریق سے دم توڑا ہے۔ مگر نبیوں اور ان کے خلفاء میں سے کسی کی یہ حالت نہیں ہوئی۔ کیوں؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ کہ چونکہ وہ خدا کی راہ میں مرنے سے پہلے مر چکے ہوتے ہیں۔ اس لئے خدا انہیں ہمیشہ کی ہلاکت سے بچا لیتا ہے۔ انسان کو قربان تو ہونا ہی پڑتا ہے کوئی اپنے نفس کے لئے قربان ہوتا ہے کوئی عزت کے لئے، کوئی اپنے کسی عزیز کے لئے۔ اور کسی کو زمانہ کے ہاتھوں قربان ہونا پڑتا ہے مگر مبارک ہے وہ جو خدا کے لئے قربان ہو اور قربانیوں کے لئے ہلاکت ہے مگر خدا کے لئے قربان ہونے کے نتیجہ میں ہمیشہ کی زندگی نصیب ہوتی ہے اور ایسے شخص کو ہمیشہ ہمیش کے لئے ہلاکت سے بچا لیا جاتا ہے بلکہ جو اس کو فنا کرنے کے لئے اٹھے اس کو فنا کر دیا جاتا ہے اور مٹا دیا جاتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا اس وقت کا ایک الہام ہے جس وقت آپ کی بیعت میں ابھی ایک شخص بھی نہ تھا۔ کہ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ۔ آپ نے دیکھا

کہ ہزاروں بھیڑیں ہیں جو زمین پر لٹائی ہوئی ہیں اور قصائی چھریاں لے کر ان کو ذبح کرنے کو تیار ہیں آپ فرماتے ہیں کہ اس حالت میں مَیں نے دیکھا کہ انہوں نے منہ آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھے۔ گویا کسی آواز کی منتظر تھیں۔ اس وقت میری زبان پر یہ آیت تھی قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ۔ میرا یہ پڑھنا تھا کہ ان قصائیوں نے ان کے گلوں پر چھری پھیر دی اور وہ بے دردی سے ذبح ہو گئیں[۱]

اس کا یہ مطلب تھا کہ اس رنگ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو یہ سمجھایا گیا کہ تُو نے جو خدا کے لئے اپنے نفس کو قربان کیا ہے۔ اس سے ہمارے حضور میں تُو اس قدر معزز ہو گیا ہے کہ تیری خاطر ہزاروں اور لاکھوں کو ہم قربان کر دیں گے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو آپ کے مخالف بھیڑوں کی شکل میں دکھائے گئے۔ بھیڑوں کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ گند کی طرف جاتی ہیں۔ اس سے بتایا کہ تیرے مخالف بھی بدی کی طرف جائیں گے اور چاہیں گے کہ تجھ کو ہلاک اور فنا کر دیں۔ مگر تو ان کی مخالفت کی ذرا پرواہ نہ کرنا۔ ہم تیری خاطر ان لاکھوں کو فنا کر دیں گے۔ اور جو تجھکو مٹانا چاہیں گے ہم ان کے نام و نشان مٹا دیں گے۔ خدا تعالیٰ کو اپنے پیاروں کے مقابلے میں کسی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ دیکھو حضرت نوح علیہ السلام کا مقابلہ کرنے والوں نے نوحؑ کو ادنیٰ درجہ کا خیال کیا اور آپؑ کو مٹانا چاہا۔ مگر خدا نے ایک نوحؑ کی خاطر کتنوں کو پانی میں غرق کر دیا اور ذرا پرواہ نہ کی[۲]۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ فرعون نے کیا اور آپ پر ہنسی اڑانے کے لئے ہامان سے کہا کہ ایک محل تو بنا تا اس پر چڑھ کر موسیٰؑ کے خدا کو دیکھوں[۳]۔ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے تھے کہ میرا رب بلند اور عرش پر ہے۔ اس لئے اس نے اس طرح ان کے ساتھ ہنسی اور تمسخر کیا۔ اگر وہ محل بنوا کر اس کے اوپر چڑھتا تو وہاں بھی خدا اپنی قدرت اسے دکھا سکتا تھا مگر اس نے نہ چاہا کہ اسے اوپر چڑھنے پر تباہ کیا جائے اور اس طرح اسے زمین سے بلند ہونے کا موقع دیا جائے۔ اس لئے خدا نے اپنا وجود جو اسے دکھایا تو اس طرح پر کہ سمندر کی تہہ میں اس کو بٹھا دیا[۴] اور وہاں اپنی قدرت کا جلوہ دکھایا۔ اس نے تو بطور تمسخر خدا کو دیکھنے کے لئے اوپر چڑھنا چاہا تھا۔ مگر خدا نے بوجہ اس کی سرکشی اور استہزاء کے اتنا بھی اسے موقع نہ دیا بلکہ اسے تحت الثریٰ میں گرا دیا۔ اب دیکھو کہ وہ فرعون جو حضرت موسیٰؑ پر ہنسی کرنے کے لئے محل بنوانا چاہتا تھا خدا نے اس سے کیا سلوک کیا۔ یہ کہ اپنی قدرت نمائی کے لئے اسے سمندر کے نچلے حصہ میں غرق کر دیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو لوگوں نے ذلیل کرنا چاہا اور آپ کے مٹانے کی کوشش کی مگر حضرت عیسیٰؑ معزز ہوئے اور آپ کو ذلیل کرنے والے خود رسوا اور ذلیل ہو گئے[۵]

اب سوال ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے پاس، حضرت نوحؑ کے پاس، حضرت عیسیٰؑ کے پاس اور بالآخر ہمارے سید و مولیٰ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس وہ کیا چیز تھی۔ جس کی وجہ سے خدا نے ان کو یہ رفعت بخشی اور ذلیل کرنے والوں کو ذلیل و رسوا ہی نہ کیا بلکہ صفحۂ عالم سے مٹا دیا۔ وہ محض صداقت اور حق تھا جو اُن کو دیا گیا اور ان کی قربانی تھی جو انہوں نے خدا کی راہ میں کی۔ چونکہ ان کا مقابلہ کرنے والے دراصل ان کو نہیں مٹانا چاہتے تھے بلکہ وہ خدا کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اس لئے خدا کو ان کے تباہ کرنے میں کیا پرواہ ہوسکتی تھی۔

پس جو قربانی خدا کے لئے کی جائے وہ ہرگز ضائع نہیں جاتی بلکہ اس سے ہمیشہ کی بقا حاصل ہوجاتی ہے اس لئے ہر ایک انسان کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو خدا کی راہ میں قربان کرکے ہمیشہ کی زندگی حاصل کرے۔ ورنہ قربان تو اسے ہونا ہی ہے۔ اگر خود بخود نہ ہوگا تو خدا تعالےٰ کا ہاتھ اسے کردے گا۔ لیکن اس طرح اس کا قربان ہونا کسی مصرف کا نہ ہوگا۔ پس مبارک ہے وہ جس نے خود اپنے آپ کو خدا کی راہ میں قربان کیا۔ اور ہمیشہ کے لئے زندہ ہوگیا۔ اور ہلاکت ہے اس کے لئے جسے خدا نے تباہ و برباد کردیا۔ اس لئے وہی راہ اختیار کرنا چاہیئے جس سے ہمیشہ کی سلامتی نصیب ہوتی ہے۔

دیکھو مثلاً دو جگہ آگ جل رہی ہو۔ اور انسان کو اختیار دیا جائے کہ ان میں سے جس میں چاہے اپنے آپ کو ڈال دے۔ جس میں سے ایک میں گرنے کا تو یہ نتیجہ ہو کہ جو اس میں گرے وہ ہمیشہ کے لئے تباہ ہوجائے اور دوسری کا یہ انجام ہو کہ جو اس میں پڑے اس کو ایسی زندگی دی جائے جس کا کبھی انقطاع نہ ہو۔ تو بتاؤ ان میں سے کونسی آگ میں گرنے والا اعقل مند کہلائے گا! وہی جو اپنے جسم کو ایسی آگ میں جلائے گا جس میں جل کر ہمیشہ کی زندگی حاصل ہوتی ہے ایسی پر قیاس کرلو کہ انسان ایک ایسی ہستی ہے کہ جس پر ضرور فنا آنی ہے خواہ وہ ہزار چاہے کہ بچ سکوں تو بھی نہیں بچ سکتا۔ اسی طرح اپنے مال کو سنبھال سنبھال کر رکھنے کی ہزار کوشش کرے وہ ضرور خرچ ہوگا یا چرایا جائے گا یا کوئی اور آفت آئے گی، زمین میں گاڑ کر بھول جائے گا۔ اسی طرح بال بچے ہیں، عزیز و رشتہ دار ہیں، ان سب سے ایک نہ ایک دن ضرور جدائی اختیار کرنی پڑتی ہے وہ اس کو چھوڑ جائیں گے یا یہ ان کو چھوڑ جائے گا۔ اور اگر انسان چاہے بھی کہ ان سے جدا نہ ہو تو اس کو اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ لیکن جو جان خدا کے رستہ میں خرچ ہو۔ جو مال اس کی راہ میں صرف ہو اور جن عزیزوں کو خدا کے لئے قربان کیا جائے ان میں سے ایک چیز بھی الگ نہیں کی جاسکتی بلکہ وہ اس سے بڑھا چڑھا کر اس کو دی جاتی ہیں تو کیوں نہ انسان ان چیزوں کو خدا کے لئے ہی صرف کرے۔ دانائی کس میں ہے! آیا اس میں کہ وہ ان چیزوں کو خدا کی راہ

میں قربان نہ کرکے بچانا چاہتا ہے مگر نہیں بچا سکتا۔ یا اس میں کہ جو خدا کے لئے خرچ کر ڈالتا ہے اس کی یہ چیزیں ضائع نہیں کی جاتیں۔ ماننا پڑے گا اور ہر دانشمند اسے تسلیم کرے گا کہ دانشمندی اسی میں ہے کہ ان اشیاء کو خدا کے لئے قربان کر دیا جائے تاکہ وہ ضائع نہ ہوں کیونکہ ابدی نجات خدا کے لئے قربانی کرنے میں ہے۔ اور ابدی ہلاکت خدا کے لئے قربانی کرنے میں بخل میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا۔ ان کو کہدو کہ خدا کو تمہاری کیا پرواہ ہے اگر تمہاری دعا نہ ہو۔ پس ضرور تم نے جھٹلایا اس جھٹلانے کے وبال سے تم بچ نہیں سکتے۔ یہی الہام حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بھی ہوا جس کا مطلب یہ ہے کہ تم ان بھیڑوں سے کہدو کہ تم ہو کیا چیز۔ غلاظت کھانے والی بھیڑیں ہی ہو اور تمہاری تخلیق نطفہ سے ہے جو ایک حقیر پانی ہے۔ اگر تم خدا کی رضا کے حصول کی طرف نہیں آتے تو اس کو تمہاری کچھ پروا نہیں۔ بچہ کو مٹی کے کھلونے کی پروا ہوتی ہے۔ مگر خدا کو تمہاری اتنی بھی پروا نہیں۔ اگر تم اس کی عبادت کرو تو اس کی شان بڑھ نہیں جاتی اور اگر انکار کرو تو اس کا کچھ حرج نہیں ہوتا۔ ایک بچہ کو کھلونا توڑتے وقت تکلیف محسوس ہوتی ہے مگر خدا کو ساری دنیا کے ہلاک کر دینے میں اتنی پروا نہیں ہو سکتی۔ ہاں تمہاری دعائیں اور التجائیں ہیں جن کی وجہ سے وہ تم پر رحم فرماتا ہے۔

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب خلافت اور انجمن کی حیثیت اور تعلقات کا جھگڑا اُٹھا تو اس کے متعلق حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ نے چند سوال میرے پاس بھی بھجوائے اور ان کا تحریری جواب دینے کے لئے ارشاد فرمایا۔ چونکہ یہ معاملہ نہایت نازک اور اہم تھا اور جماعت پر بڑا اثر ڈالنے والا تھا۔ اس لئے میں ڈرا کہ اس میں کوئی ایسی رائے نہ دے دوں جس سے خدا کے عذاب کا مستوجب ٹھہروں۔ اگرچہ میں خلیفہ کو انجمن کا مطاع یقین کرتا تھا لیکن بغیر دعا کے میں نے اس کے متعلق رائے نہ دینا چاہی۔ اس لئے میں دعا میں مصروف ہو گیا۔ اور خدا سے اس بارے میں مدد طلب کی۔ کیونکہ میں چاہتا تھا کہ خدا تعالیٰ بالکل کھلے اور واضح طور پر مجھے الہام یا کشف و رؤیا کے ذریعہ اس حقیقت پر مطلع فرما دے۔ پس میں دعا میں مصروف رہا۔ لیکن مجھ کو کچھ تفہیم نہ ہوئی حتیٰ کہ وہ دن آ گیا جو آخری تاریخ حضرت خلیفۃ المسیح نے جواب دینے کے لئے مقرر فرمائی تھی۔ اور صرف ۲۴ گھنٹے اس میں باقی رہ گئے۔ اس وقت میں سخت مضطرب ہوا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ چونکہ مجھے خدا کی طرف سے کچھ نہیں بتایا گیا اس لئے میں اس مجلس میں ہی نہیں جاؤں گا کہیں اور باہر چلا جاؤں گا۔ لیکن اس ارادہ پر بھی اطمینان نہ ہوا۔ آخر جب اضطراب زیادہ ہوا۔ تو اس وقت مجھے الہام ہوا کہ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ

اس سے میرا شرح صدر ہوگیا کہ مَیں جس خیال پر ہوں وہ درست ہے اگر قُـلْ کا لفظ نہ ہوتا تو اس کے مضنے یہ ہوتے کہ خلافت کے منکروں کا جو خیال ہے وہ درست ہے لیکن یہاں لفظ قُـلْ تھا جس طرح کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو خدا تعالےٰ نے حکم دیا کہ تم کہہ دو۔ اسی طرح مجھے کہا گیا کہ جو تمہارے خلاف خیال رکھتے ہیں۔ ان کو کہدو کہ یورپ کی تقلید میں کامیابی اور فلاح نہیں یہ دینی سلسلہ ہے اس لئے جس طرح خدا کے نبیوں کے خلیفہ ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی خلافت ہی ہوگی لیکن اگر وہ باز نہیں آئیں گے تو خدا کو ان کی کوئی پروا نہیں کامیابی اسی میں ہے کہ وہ خدا کے حضور گرجائیں اور زاری کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو خدا کا عذاب موجود ہے۔ جب میرا شرح صدر ہوگیا تو پھر مَیں نے حضرت مولوی صاحبؓ کو اپنی رائے لکھکر بھیجدی۔ تو فرمایا قُـلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ آج بھی قربانیوں کا دن ہے۔ خدا کی طاقتوں میں کمی نہیں آگئی۔ خدا اب بھی وہی خدا ہے جو پہلے تھا بلکہ آج پہلے سے زیادہ شان کے ساتھ ظاہر ہورہا ہے۔ کیونکہ آجکل ہلاکت کے بہت زیادہ سامان پیدا ہوگئے ہیں۔ ہزاروں قسم کے نئے امراض پیدا ہوچکے ہیں۔ اور خود انسان نے اپنی ہلاکت کے لئے عجیب عجیب آلات ایجاد کرلئے ہیں۔ پہلے تلوار کے وار سے زرہ پہنکر انسان بچ سکتا تھا۔ تیر سے محفوظ رہ سکتا تھا لیکن اب کوئی زرہ نہیں جو گولی کی زد سے بچاسکے۔ طاعون سے وہ ٹیکہ نہیں بچاسکتا جو بمبئی میں بنتا ہے بلکہ اس کا علاج وہی ٹیکہ ہے جو قادیان میں تیار ہوتا ہے۔ پس اس خدا کے لئے، حق وصداقت کے لئے قربانیاں کرو۔ اپنے آپ کو، عزیز واقارب کو، مال و دولت کو، عزّت و حرمت کو۔ غرض ہر پیاری سے پیاری چیز کو اُس کی راہ میں خرچ کرو۔

دیکھو کیسے عظیم الشان نتائج ہیں اس قربانی کے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو قربان کرنا چاہا۔ آج دنیا میں جہاں بھی کوئی خدا کا سچا نام لیوا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس سُنّت پر عمل کرتا ہے اور یہاں تک خدا نے آپؑ کو بزرگی دی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے جو دعا کی جاتی ہے اس میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام بطور تمثیل کے داخل کیا گیا ہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰۤى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰۤى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰۤى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ ۔۔۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ عمل کے ساتھ جب تک نیّت نہ ہو عمل کوئی چیز نہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک بیٹے کو قربان کرنا چاہا۔ مگر آپ کی نیّت بہت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ قربانیاں تو بہت بہت لوگوں نے کیں۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس ایک قربانی کو کوئی نہیں پہنچتی۔ کیونکہ جو نیّت ان کی تھی ویسی کسی کی نیت نہیں۔ مثلاً جنگ اُحد میں مشہور ہوگیا کہ آنحضرت صلے اللہ

علیہ وآلہ وسلم شہید ہوگئے۔ تو ایک صحابیہ عورت گھبرا کر مدینہ سے نکل آئی اور ایک شخص سے جو میدانِ جنگ سے واپس آ رہا تھا اس نے پوچھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا حال ہے۔ اس نے اس کا تو کوئی جواب نہ دیا اور کہا کہ تیرا باپ شہید ہوگیا ہے۔ عورت نے کہا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا حال ہے۔ اس نے کہا تیرا بھائی بھی شہید ہوگیا۔ عورت نے کہا میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال پوچھتی ہوں۔ وہ شخص چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بخیر وعافیت دیکھ آیا تھا۔ اس لئے بے فکر تھا۔ اس نے کہا۔ اے عورت تیرا خاوند بھی مارا گیا۔ اس نے کہا۔ مَیں تجھ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال پوچھتی ہوں۔ ان کا کیا حال ہے۔ اس نے کہا۔ وہ تو زندہ سلامت ہیں۔ عورت نے کہا۔ الحمد للہ! جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ ہیں تو کسی کی موت کی پرواہ نہیں[۲۴]۔ تو اتنے رشتہ دار اس عورت نے قربان کئے مگر حضرت ابراہیمؑ اور اس عورت کی نیتوں میں کچھ تو فرق تھا کہ ابراہیمؑ کے محض ارادہ کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے مگر اس عورت کی ان قربانیوں کا ایسا نتیجہ نہیں نکلا۔ اسی طرح عبداللہ ابن اُبی ابن سلول کے بیٹے نے اپنے باپ کو اس لئے قربان کرنا چاہا کہ اس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور گستاخی کی[۲۵]۔ یہ قربانیاں بجائے خود تو بہت بڑی تھیں۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نیت کا مقابلہ ان کی نیت نہیں کرسکتی اسی لئے نتیجہ میں فرق ہُوا۔ اسی طرح مسلمانوں کی عراق میں ایرانیوں سے جب جنگ ہو رہی تھی تو ایرانی میدان میں ہاتھی لائے تھے وہ مسلمانوں کو کچلتے پھرتے تھے اور ایسی حالت مسلمانوں کی ہوگئی تھی کہ اگر وہاں شکست ہوجاتی تو ایران وعراق میں مسلمانوں کی فتوحات کا خاتمہ ہوجاتا۔ اس وقت ایک مسلمان عورت کے چار بیٹے تھے۔ اس نے ان چاروں کو بلایا اور کہا مَیں نے تمھیں پرورش کیا اور تمہارے باپ کی کبھی خیانت نہیں کی۔ میرا تم پر حق ہے اور وہ حق مَیں آج اس طرح مانگتی ہوں کہ تم چاروں جاؤ اور اسلام کی حفاظت میں جان دیدو مگر پیچھے نہ ہٹو[۲۶]۔ جان دینے کے لئے بھیجنا یہ بھی ایک قربانی ہے مگر اس کے چار بیٹے دے دیئے اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے ایک بیٹا قربان کرنے میں بڑا فرق تھا اور وہ فرق نیت کا ہی تھا۔ جس سے معلوم ہُوا کہ نیّت پر ہی ہر قسم کے اعمال کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔

رسُول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی نسبت فرمایا کہ ان کی بزرگی ان کی نمازوں کے باعث نہیں ہے۔ بلکہ اس بات کے باعث ہے جو ان کے دل میں ہے یعنی نیّت پس درجہ کو بڑھانے والی عمل سے بڑھ کر نیت ہوتی ہے جیسی اعلیٰ نیّت ہو۔ ویسا ہی اعلیٰ نتیجہ نکلتا ہے قربانی میں بھی نیت اصل چیز ہے اس لئے یاد رکھو۔ اسلام کے لئے خدا کے لئے اور یہ

سلسلہ جو اسلام کا قائم مقام ہے۔ اس کے لئے جو قربانیاں کی جائیں گی ضائع نہیں جائیں گی اور پھران قربانیوں میں جو نیت ہو گی اس کے مطابق پھل ملے گا۔ آج ہم مال، جان عزت و آبرو، سیاست اگر خدا کے لئے قربان کریں گے تو خدا اسے ضائع نہیں ہونے دیگا۔ سیاست تو کتنے کو ہے ورنہ یہ کام خدا نے ایک ایسی قوم کے سپرد کر دیا ہوا ہے جو عدل و انصاف سے حکمرانی کرتی ہے پس ہر ایک چیز جو قربان کی جائے اس کے ساتھ نیت ہونی ضروری ہے۔ اور اس کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال بہترین مثال ہے۔ پھر دیکھو مکہ چھوڑنے کو تو سب نے چھوڑا۔ رسول کریمؐ نے۔ ابوبکر صدیقؓ نے۔ حضرت عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ نے۔ مگر ہر ایک کو اس کی نیت کے مطابق بدلہ ملا۔ اسی طرح گھر تو سب نے چھوڑے مگر خلیفہ سب نہیں بن گئے تھے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر ایک کی نیت ایک جیسی نہیں ہوتی اور جتنا جتنا فرق ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق بدلہ ملتا ہے۔ اس فرق یا کمی کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ ایک کے مقابلہ میں دوسرے کی نیت ناقص اور خراب ہوتی ہے بلکہ یہ کہ مدارج میں فرق ہوتا ہے۔ ایک کی نیت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے اور دوسرے کی اس سے کم درجہ کی نہ کہ خراب۔

حال میں مولوی محمد علی صاحبؒ نے مجھے ایک چٹھی لکھی ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی فرد رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں ایسا کامل نہیں ہوا جیسا کہ حضرت مرزا صاحب۔ بلکہ آپ کے مقابلہ میں ان میں کمی رہی ہے۔ اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ یہ امت محمدیہ کے بزرگوں کی ہتک کی گئی ہے۔ حالانکہ کمی کے معنے یہ نہیں ہوتے کہ کمال ہوتا ہی نہیں۔ کمال تو ہوتا ہے مگر اس کے بھی درجے ہوتے ہیں۔ دیکھو حضرت موسیٰؑ۔ عیسیٰؑ و داؤدؑ۔ ہزاروں نبی ہوئے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان میں کوئی ایک کامل ہے۔ اور باقی ناقص ہیں۔ کامل تو وہ تھے مگر ہر ایک کے درجہ میں فرق ہے اور اس میں کسی کی ہتک نہیں۔ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جو بزرگ ہوئے انہیں جس قدر تقویٰ و طہارت حاصل تھا اس میں کوئی نقص نہ تھا لیکن وہ کمال کے اس درجہ تک نہیں پہنچا ہوا تھا جو مرتبہ نبوت پانے کے لئے ضروری ہے اور یہ بات صرف حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہی حاصل تھی اس لئے آپؑ نبی ہوئے۔

اس وقت میں نے جو یہ کہا ہے کہ ہجرت تو سب نے کی لیکن سب کو ایک جیسے نتائج حاصل نہ ہوئے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جن کی ہجرت کے کم درجہ کے نتائج نکلے ان کی نیت درست اور ٹھیک نہ تھی۔ ٹھیک تھی لیکن مقابلہ کے لحاظ سے اس میں فرق تھا اور فرق نقص نہیں ہوتا اس کو نقص قرار دینا نادانی اور بیوقوفی ہے تو عمل کے ساتھ نیت کو بہت بڑا دخل ہے اس لئے میں اپنی جماعت کو نصیحت کرتا ہوں کہ جہاں ان کے لئے ہر قسم کی قربانیاں کرنے کی ضرورت ہے

وہاں اس کی ضرورت ہے کہ خالص ارادوں، پاک نیتوں کے ساتھ تیار ہوں تاکہ خدا کے فضلوں کے وارث ہوں کیونکہ بغیر قربانی اور خالص نیت کے ترقی اور کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ خدا تعالیٰ ہماری جماعت کو اس بات کی توفیق بخشے۔" (الفضل ۲۸ ستمبر ۱۹۱۸ء صفحہ ۵ تا ۱۱)

له۔ الفرقان ۲۵: ۸

له۔ نصیر الدین محمد ہمایوں (۹۱۳ھ/۱۵۰۸ء - ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء) شیر شاہ سوری از سنہ ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء تک شکست دریائے گنگا کے کنارے بمقام بھوج پور میں ہوئی۔ (خلاصہ التواریخ مصنفہ سبحان رائے بٹالوی صفحہ ۳۳۳ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء۔ منتخب البیان حصہ اول صفحہ ۱۱)

له۔ مغل بادشاہ ہمایوں کا مشہور اور معتمد جرنیل۔ بادشاہ اکبر کا اتالیق و سرپرست۔ اکبر نے اسے خان خاناں کا لقب دیا تھا۔ ۹۶۸ھ بمقام بندرگاہ کنبھایت حج پر جاتے ہوئے مبارک خاں نامی پٹھان کے ہاتھوں قتل ہوا۔

له۔ تاریخ ہندوستان مصنفہ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب جلد ۳ صفحہ ۳۰۶

له۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 صفحہ ۴۹۲

له۔ نپولین بونا پارٹ (۱۷۶۹ - ۱۸۲۱ء)

له۔ نپولین ۱۸ مئی ۱۸۰۴ء کو فرانس کا بادشاہ بنا (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۱۶ صفحہ ۵)

له۔ NAPOLEON By H.A.L. FISHER. P:184, 185, 200.

له۔

له۔ الاعراف ۷: ۱۴۵

له۔ النجم ۵۳: ۹ تا ۱۱۔ یٰسٓ ۳۶: ۲-۳۔ الاعراف ۷: ۱۵۹۔ الانبیاء ۲۱: ۱۰۸

له۔ آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۵۶ و صفحہ ۳۷۹

له۔ جامع ترمذی ابواب المناقب باب ماجاء فی فضل النبی صلی اللہ علیہ وسلم

له۔ آلِ عمران ۳: ۳۲

له۔ سیرۃ ابن ہشام (اردو ترجمہ) صفحہ ۶۰۹ طبع اول ۱۹۶۱ء

له۔ دیوان حسان بن ثابت مع شرح صفحہ ۱۶۵ مطبوعہ مصر ۱۹۲۹ء

له۔ تذکرہ طبع سوم صفحہ ۵۹

له۔ ہود ۱۱: ۴۴-۴۵

۱۹۔ المؤمن ۴۰: ۳۷-۳۸
۲۰۔ یونس ۱۰: ۹۱ تا ۹۳
۲۱۔ النساء ۴: ۱۵۹، آل عمران ۳: ۴۶
۲۲۔ الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۰۳
۲۳۔ صحیح بخاری کتاب الدعوات باب الصلوٰۃ علی النبی صلے اللہ علیہ وسلم
۲۴۔ سیرۃ ابن ہشام حصہ سوم (اردو ترجمہ) صـ۳۸۷۔ السیرۃ الحلبیہ جلد ۲ صـ۲۷۸
۲۵۔ جامع ترمذی ابواب التفسیر سورۃ المنافقون۔ السیرۃ الامام ابن ہشام الجزء الثانی صـ۱۶۹
۲۶۔ تاریخ الطبری الجزء الثالث صـ۵۴۳ مطبوعہ مصر ۱۹۶۲ء
۲۷۔ نزہۃ المجالس ومنتخب النفائس مصنفہ عبدالرحمٰن الصفوری جلد ۲ صـ۱۵۲
۲۸۔ مولوی محمد علی صاحب ایم۔اے (۱۸۷۴ء - ۱۹۵۱ء) امیر غیر مبائعین۔

۷

(فرمودہ ۶ ستمبر ۱۹۱۹ء بمقام باغ حضرت مسیح موعود علیہ السلام قادیان)

"وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ"[1]

یہ عید قربانی کی عید کہلاتی ہے۔ عید الاضحیٰ بھی اسے کہتے ہیں۔ کیونکہ اس پر قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ہمارے ملک میں اسی کا ترجمہ کر کے اس کا نام بعض لوگوں نے عید قربان رکھ لیا ہے۔ اس عید میں اور اس سے پہلی عید میں جو عید الفطر کہلاتی ہے۔ یہ فرق ہے کہ عید الفطر میں بوجہ اس کے کہ رمضان کا تمام مہینہ طاقت رکھنے والے مسلمان روزے رکھتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس عید کے دن یہ سنت تھی کہ آپ صبح کچھ ناشتہ کر کے عید پڑھنے کے لئے جاتے تھے[2] مگر آج کی عید کے دن کا پہلا حصہ نیم روزہ اور پچھلا حصہ قربانی کا ہوتا تھا۔ اور آپ کی سنت تھی کہ عید پڑھنے سے پہلے کچھ تناول نہ فرماتے تھے، بعد میں جا کر قربانی کے گوشت سے کھاتے تھے[3] اس لئے یہ عید اپنے اندر دو نمونے رکھتی ہے کیونکہ اس کا ایک حصہ روزے کا اور دوسرا حصہ کھانے کا ہے مگر پہلی عید ایک ہی رنگ رکھتی ہے کہ مہینہ بھر روزے رکھے جاتے ہیں اور اس دن کھایا پیا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ عید بڑی عید کہلاتی ہے، اور رمضان کے بعد جو عید آتی ہے وہ چھوٹی۔ یُوں تو ان کی بڑائی چھوٹائی اللہ تعالےٰ ہی جانتا ہے لیکن یہ یقینی امر ہے کہ جس شخص نے جس عید پر خدا تعالےٰ کے قرب کی راہ تلاش کی وہی عید اس کے لئے بڑی ہے۔ اور جس عید کا دن یُونہی گذر گیا وہ عید اس کے لئے چھوٹی چھوڑ محرم اور ماتم کا دن ہے تو بڑی اور چھوٹی عید نسبتی امر ہے حقیقت میں کوئی نہیں جانتا کہ کونسی عید بڑی ہوگی اور کونسی چھوٹی۔ عموماً چونکہ اس عید پر قربانیاں ہوتی ہیں اور لوگ خوب کھاتے پیتے ہیں اس لئے اس کو بڑی عید کہتے ہیں۔ مگر لوگوں کے اس فیصلہ کے علاوہ اس کے متعلق ہم ایک خدائی فیصلہ بھی دیکھتے ہیں لوگوں نے تو اس کا نام بڑی عید رکھا مگر جہالت سے کہ کھانے پینے کا خوب موقع ملتا ہے لیکن خدا تعالےٰ کی طرف سے بھی اس کو بڑائی کا خطاب ملا ہوا ہے۔ پرانے زمانہ کو تو جانے دو کہ اس میں خدا تعالیٰ نے اس عید کی کیا فضیلت بیان کی ہے۔ اسی زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو الہام ہوا کہ اس عید پر عربی میں خطبہ پڑھنا۔ خدا تعالےٰ تمہاری زبان پر الفاظ جاری کرے گا چنانچہ ایسا ہی[4]

تو یہ عید ہماری جماعت کے لئے ایک خاص نشان ہے کیونکہ اس پر خدا تعالیٰ نے یہ معجزہ دکھایا کہ ایک ہمارے ہی ملک کا باشندہ جو نہ کبھی عرب میں گیا نہ کبھی عالم کہلایا نہ اس نے علم عربی کی خاص طور پر تعلیم پائی اور لوگ مولوی چھوڑ اسے مجلسی آدمی بھی نہیں سمجھتے تھے کیونکہ اس نے سب کو چھوڑ چھاڑ کر گوشہ تنہائی میں زندگی بسر کی اور لوگوں سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ اس پر خدا نے اپنا کلام جاری کیا۔ اور اس نے بغیر کسی قسم کی تیاری اور عربی زبان میں تقریر کرنے کی مشق کے ایک لمبے عرصہ تک تقریر کی جو ایسی شستہ اور فصیح تھی کہ جس کو اس ملک والے بھی دیکھکر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں جن کی مادری زبان میں وہ کی گئی اور ایسی اعلیٰ درجہ کی ہے کہ اگر قرآن کریم کے بعد آسانی اور سہولت سے کوئی عبارت حفظ ہو سکتی ہے تو یہی تقریر ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمائی۔ یہ حفظ کرنے کے اس قدر اقرب ہے کہ وہ دن جس میں کی گئی تھی ابھی ڈوبا نہیں تھا کہ چھوٹے چھوٹے بچے اس کے فقرے گلیوں میں دوہراتے پھرتے تھے۔ وجہ یہ کہ ایسی مقفیٰ اور مسجع ہے کہ بہت آسانی سے یاد ہو سکتی ہے۔ اس وقت میری عمر بارہ برس کے قریب تھی اور کئی بچے مجھ سے بھی چھوٹی عمر کے تھے مجھے یاد ہے ہمیں اس تقریر کے کئی فقرے یاد ہو گئے تھے اور تقریر کرنے کے وقت کے نقشہ کا ایسا اثر تھا کہ بغیر اس بات کے علم کے کہ سواری کا پڑھنے کے ساتھ خاص تعلق ہوتا ہے ہم دیواروں کو گھوڑا بنا لیتے اور فقرات کو پڑھتے اور ہم سمجھتے کہ سواری سے ان فقرات کو خاص مناسبت ہے۔ تو بلحاظ اس کے کہ اس عید کو ہماری جماعت کے ساتھ یہ خاص خصوصیت ہے کہ اس پر خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ ایک بہت بڑا معجزہ دکھایا ہمارے لئے یہ بڑی عید ہے۔ پھر اس لحاظ سے بھی بڑی ہے کہ اس کے ذریعہ قربانیوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے اور تمام برائیوں کے حاصل کرنے کے لئے نفس کی قربانی ضروری ہوتی ہے اس عید پر نفس کی قربانی کی طرف اشارہ ہے اور مال کی قربانی کرائی جاتی ہے لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے، بڑائی چھوٹائی نسبتی امر ہے اور جس سے کوئی فائدہ اُٹھائے، وہی اس کے لئے بڑی ہے تاہم چونکہ اس عید میں قربانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اس لئے جو اس سے فائدہ اٹھائے وہ اسے بڑا کہہ سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں ایک طرف تو قربانی کی حقیقت اور اس کا نفع اور فائدہ بتایا گیا ہے اور دوسری طرف اس سے اس قربانی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے کی۔

دنیا میں لوگ معمولی معمولی باتوں کے لئے بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھا کر چاہتے ہیں کہ ان کا نام مشہور ہو جائے مثل مشہور ہے کہتے ہیں کوئی عورت تھی اس نے انگوٹھی بنوائی۔ عورتوں کو دکھانے کے لئے وہ اس انگلی سے جس میں انگوٹھی پہنی ہوئی تھی باتوں باتوں میں اشارے کرتی۔

مگر اتفاق کی بات ہے کسی نے نہ دیکھی۔ اس پر اس نے اپنے گھر کو آگ لگا دی جب عورتیں اس کے پاس ہمدردی کرنے کے لئے آئیں تو انہوں نے پوچھا کہ کچھ بچا بھی یا سب کچھ جل گیا۔ اس نے کہا اور تو کچھ نہیں بچا صرف یہ انگوٹھی بچی ہے۔ اس پر جیسا کہ بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ نئے کپڑے یا زیور کو دیکھکر بے اختیار بول اٹھتی ہیں کہ کب بنوایا ہے۔ کسی عورت نے اس سے پوچھا کہ بہن تم نے یہ انگوٹھی کب بنوائی ہے۔ اس نے کہا۔ یہ سوال اگر کوئی مجھ سے پہلے کرتی تو میرا گھر ہی کیوں جلتا۔ تو شہرت لوگوں کو اتنی مطلوب ہوتی ہے کہ ناجائز رنگ میں بھی اس کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جو جائز شہرت اور عزت خدا نے دی ہو اس کے متعلق تو خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ کہ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ کہ اللہ نے جو تجھ پر انعام کیا ہے اس کو بیان کر اور لوگوں کو بتا۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسا کرنا پڑا۔ مگر اس کے ساتھ لا فخر بھی آپ فرماتے رہے تو بڑائی اور عزت، شہرت اور رتبہ خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت، خدا کی رحمتوں میں سے ایک رحمت۔ خدا تعالےٰ کے احسانوں میں سے ایک احسان ہے۔ اور خدا تعالےٰ جب کسی پر اپنا فضل کرتا ہے تو اس کو عزت بھی ساتھ ہی دے دیتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص ذلیل بھی ہو اور خدا کا پیارا بھی۔ کیونکہ خدا کے قرب کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ انسان مکرّم اور معزز ہو۔ چنانچہ خدا تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ کہ تم میں سے اکرم وہی ہے جو اتقٰی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا تعالےٰ نے اتقٰی کو مکرّم قرار دیا ہے۔ وجہ یہ کہ عزت اور تقوٰی ایسی لازم و ملزوم چیزیں ہیں کہ کبھی جدا ہو ہی نہیں سکتیں۔ اور ذلت ہمیشہ خدا کی نافرمانی کی وجہ سے ہی آیا کرتی ہے۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ خدا کے نافرمان لوگ بظاہر دنیا کی عزت والے نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ ہے کہ جو خدا کا مقرب ہو وہ کبھی ذلیل نہیں ہوتا۔ یہ تو ہوگا کہ ان لوگوں کو بظاہر عزت مل جائے جو متقی اور نیکوکار نہیں۔ مگر یہ کبھی نہیں ہوگا کہ کوئی متقی ہو اور اسے حقیقی عزت حاصل نہ ہو۔ تو عزت و توقیر خدا کا بہت بڑا فضل اور احسان ہے اور انسان چاہتا ہے کہ اُسے عزت اور شہرت حاصل ہو۔ اس عید پر خدا تعالےٰ نے بتایا ہے کہ دیکھو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قربان کیا اس وقت پر ہزاروں سال گذر گئے ہیں مگر آج تک ان کا نام عزت و توقیر سے لیا جاتا ہے اور ان کو ایسی عزت اور شہرت حاصل ہوگئی ہے جو کبھی مٹ نہیں سکتی۔ پس جب لوگ معمولی معمولی عزتوں کے لئے جانیں دے دیتے ہیں مثلاً لڑائیوں میں لوگ جانیں دیتے ہیں کہ عزت اور ناموری حاصل ہو مگر کب تک یاد رہتی ہیں بہت ہی قلیل عرصہ تک۔ اسی لڑائی میں دیکھ لو۔ ابھی سے یہ بحث ہو رہی ہے کہ سب سے

بڑا تمغہ اس لڑائی میں سب سے پہلے کس نے حاصل کیا تھا۔ گویا اتنے تھوڑے عرصہ میں یہ بھی یاد نہیں رہا۔ تو دنیا کی عزت جس کی یہ حالت ہے اس کے لئے جب جانیں قربان کی جاتی ہیں تو سوچنا چاہیئے کہ خدا کی طرف سے عزت حاصل کرنے کے لئے جو ہمیشہ رہنے والی ہے کس قدر قربانی ہونی چاہیئے۔

مگر اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کے لئے جو قربانیاں کی جاتی ہیں ان کا نام تو قربانیاں ہوتا ہے مگر دراصل وہ خدمتیں ہیں جن کے معاوضے ملنے ہوتے ہیں کیونکہ قربانی تو اس کو کہتے ہیں کہ بغیر کسی معاوضہ کے کوئی کام کیا جائے۔ گو بندہ خدا تعالیٰ سے سودا کر کے قربانی نہیں کرتا مگر دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو انسان خدا کے لئے قربانیاں کرتا ہے اسے اس کے بدلہ میں اس قدر انعام ملتے ہیں کہ جن کی کوئی حد نہیں رہتی۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ خدا کے لئے جو قربانیاں کی جاتی ہیں وہ قربانیاں ہوتی ہیں بلکہ انہیں معمولی سے معمولی خدمتیں بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ان کے بدلے میں بہت بڑا معاوضہ اور اجر ملتا ہوتا ہے۔ تو خدا کے لئے جو قربانی کی جاتی ہے گو اس کا نام قربانی ہی ہے۔ لیکن یہ بھی محض خدا کا فضل اور احسان ہے کہ بندہ اپنی عزت اور مرتبہ کے بلند ہونے کے لئے جو کام کرتا ہے اس کا نام قربانی رکھ دیا گیا ہے ورنہ وہ کام معمولی خدمت بھی کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا۔ تو یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کے لئے جو قربانیاں کی جاتی ہیں خواہ وہ نفس کی ہوں یا مال کی وہ درحقیقت خدمتیں ہیں کہ جن کے بدلے بہت بڑھ چڑھ کر ملتے ہیں۔ اور اس قدر ملتے ہیں کہ وہ قربانیاں خدمات کہلانے کی بھی مستحق نہیں ہیں۔

بہت لوگ اس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے دھوکہ میں پڑ جاتے ہیں اور دین کا کوئی کام کر کے کہتے ہیں ہم نے یہ قربانی کی ہے حالانکہ وہ قربانی کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔ قربانی تو یہ ہے کہ ایک شخص ڈوب رہا ہو، انسان اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر اسے نکال لائے۔ یا ایک پیاسا ہو اُسے اپنا پانی دے دیا جائے گویا جب کسی کو احتیاج ہو اور اپنے مفاد کو نظر انداز کر کے اس کی مدد کی جائے تو اس کو قربانی کہا جاتا ہے مگر خدا تعالیٰ کو تو کسی قسم کی احتیاج نہیں ہے اور نہ اس کو کسی کی امداد کی ضرورت ہے۔ ایک ڈوبنے والا یہ نہیں کہتا کہ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے لیکن خدا تعالیٰ کو تو کسی کی پروا نہیں ہے بلکہ وہاں تو یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ فلاں نے جو میرے نام سے کام کیا ہے اُسے قبول کیا جائے یا رد کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ آیت جو میں نے پڑھی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ دو آدمیوں نے قربانی کی جن میں سے ایک کی قبول کر لی گئی۔ اور دوسرے کی رد کر دی گئی تو خدا تعالیٰ کے حضور اور ہی رنگ ہے۔ قربانی تو یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص دوسرے کی خاطر خود تکلیف اُٹھا کر کوئی کام کرتا ہے اور دوسرا اس کا ممنونِ احسان

ہوتا ہے مگر خدا تعالےٰ کے لئے جو قربانی کیجاتی ہے اس کے متعلق وہ فیصلہ کرتا ہے کہ قبول کروں یا ردّ کروں۔ پس یہ در اصل قربانی نہیں بلکہ خدمت ہوتی ہے جو انسان اپنے ہی فائدہ اور نفع کے لئے کرتا ہے اور اس کو قربانی اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے اس کا نام قربانی رکھا ہے۔

پس جس کسی کو دین کی خدمت کرنے کا کوئی موقع ملے اس کو اس پر کوئی گھمنڈ نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس کی خدمت کے متعلق تو ابھی یہ سوال درپیش ہوتا ہے کہ خدا کے حضور وہ قبول ہوئی بھی ہے یا نہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے دین کی کوئی خدمت کرکے یہ خیال کیا کہ ہم بھی کچھ کر رہے ہیں اور کچھ کر سکتے ہیں وہ تباہی کے گڑھے کے کنارے نہیں بلکہ گڑھے میں گر گئے اور ہمیشہ کی تباہی میں مبتلا ہو گئے۔ یہ آیات جو مَیں نے پڑھی ہیں ان میں آدم کے دو بیٹوں کا ذکر ہے۔ یہ کوئی خاص بیٹے نہیں۔ کوئی ہوں۔ ان دونوں نے خدمت یعنی قربانی کی جن میں سے ایک کی ردّ ہو گئی اور دوسرے کی قبول ہو گئی اور معزز و مکرم وہی ہوا جس کی قربانی خدا تعالےٰ نے قبول کر لی۔ بہت لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے قربانیاں کی ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ صرف قربانیاں کرنا قابلِ فخر بات نہیں ہے یوں تو ہابیل بھی کہتا تھا کہ میں نے قربانی کی ہے لیکن کیا وہ اس کے لئے قابلِ فخر قربانی تھی۔ ہرگز نہیں۔ پس یہ کہنا کہ مَیں نے فلاں قربانی کی ہے کوئی عزت اور فخر کی بات نہیں ہے۔ کیا آدم کا وہ بیٹا جس کی قربانی خدا تعالےٰ نے قبول نہ کی۔ معزز و مکرم ہوا یا ذلیل و خوار۔ خدا تعالےٰ کہتا ہے کہ وہ ذلیل ہی ہوا[۵۵]

تو محض قربانیاں کرنا کوئی فخر اور عزت کی بات نہیں۔ ہاں خدا تعالےٰ کا کسی قربانی کو قبول کر لینا فخر اور عزت ہے۔ اگر ایک شخص بہت بڑی قربانیاں کرتا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہوتیں تو اس کے لئے کوئی فخر نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ایک پیسہ کی قربانی کرتا ہے اور خدا تعالےٰ کے ہاں قبول ہو جاتی ہے تو یہی اس کے فخر کا باعث ہے تو اس عید پر اس لئے فخر نہیں ہونا چاہیئے کہ قربانی کرنے سے عزت حاصل ہو جاتی ہے بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ قربانی قبول ہونے سے عزت ملتی ہے چونکہ ہمارا سلسلہ اللہ تعالےٰ کی جانب سے ہے اور اس میں داخل ہونے والوں کو بھی بڑی بڑی قربانیاں کرنے کی ضرورت ہے اس لئے ہماری جماعت کے لوگوں کو خوب اچھی طرح خیال رکھنا چاہیئے کہ کوئی قربانی کر دینے سے اس وقت تک عزت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ خدا تعالےٰ قبول نہ کر لے۔ ہاں جب خدا تعالےٰ قبول کر لے تو اس وقت عزت حاصل ہوتی ہے اور جب خدا قبول کر لیتا ہے تو پھر بندہ اس پر فخر نہیں کرتا۔

ان آیات میں جو مَیں نے پڑھی ہیں خدا تعالےٰ دو آدمیوں کا ذکر کرتا ہے کہ دونے قربانی کی تھی ان میں سے ایک کی قبول ہو گئی اور دوسرے کی ردّ کر دی گئی۔ جس کی قبول ہوئی اس کا تو کوئی

فقرہ نقل نہیں کیا گیا لیکن جس کی رد کی گئی اس کے متعلق فرماتا ہے کہ اس نے دوسرے کو کہا۔ میں تجھے مار دوں گا۔ گویا اس طرح وہ اپنی قربانی جتلاتا ہے اس کے جواب میں دوسرا اپنی قربانی کا ذکر نہیں کرتا بلکہ یہی کہتا ہے اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۔ یہ کیا بیہودگی ہے کہ تمہاری قربانی قبول نہیں ہوئی اس لئے تم اور الٹا کام کرنے لگے ہو۔ تمہیں تو چاہیئے تھا کہ اور زیادہ عجز اور انکسار اختیار کرتے نہ کہ مجھے قتل کرنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ اگر ایسا کرو گے تو اتقاء کی حدود سے بالکل باہر نکل جاؤ گے اور پھر تمہاری قربانی کبھی قبول نہ ہو سکے گی۔ جو حالت اس شخص کی ہوئی اسی طرح بہت سے لوگوں کی ہوتی ہے۔ ان کے سپرد جب کوئی دین کا کام ہوتا ہے تو پھر کہتے ہیں کہ فلاں کو تو خدمت کا یہ بدلہ ملا تھا ہم کو نہیں ملا۔ ایسے لوگوں کو ان دو شخصوں کی مثال پر نظر رکھنی چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ عزت، رتبہ اسی کو حاصل ہوتا ہے جس کی قربانی قبول ہو۔ اور اگر قربانی رد ہو جائے تو پھر کچھ نہیں ملتا۔ پس صرف قربانی پر فخر کرنا ایک مرض ہے۔ ایک زہریلا کیڑا ہے، ایک قسم کا دق ہے جس سے بہت ممکن ہے کہ انسان ہلاک ہو جائے اور جب تک کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ محض خدا کے فضل سے کیا ہے۔ اور وہ قربانی نہیں بلکہ خدا کا فضل ہی ہے اس وقت تک اس کو عزت نہیں مل سکتی بلکہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

اس وقت دیکھو ہمارے مقابلہ میں بعض ایسے لوگ کھڑے ہو گئے جنہوں نے دعویٰ لیا کہ چونکہ ہم نے بڑی بڑی نوکریاں اور بڑے بڑے فوائد چھوڑے اور ہم نے قربانیاں کی ہیں۔ اس لئے ہم عزت کے قابل ہیں۔ مگر وہ نہیں جانتے کہ محض قربانی کرنے سے کسی قسم کی عزت حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ قبول نہ ہو جائے۔ اگر ایک شخص نے ایسی قربانی کی جو نظر نہ آئے مگر خدا نے اس کو قبول کر لیا تو اسی کو عزت ملے گی۔ لیکن اگر بظاہر کسی نے بہت بڑی قربانی کی اور وہ قبول نہ ہوئی تو ہرگز اسے عزت حاصل نہ ہو گی۔ تو ظاہری قربانیوں کو نہیں دیکھنا چاہیئے۔ بلکہ قربانی وہی ہوتی ہے جس کو خدا تعالیٰ قبول کر لے۔ خدا تعالیٰ ہماری جماعت کو دین کی خدمت کرنے کا موقع دے اور ان میں قربانی کی روح پیدا کرے اور وہ اسکو خدا کا احسان اور فضل سمجھیں تا کہ خدا تعالیٰ ان کی قربانیوں کو قبول کرے۔ آمین

(الفضل ۲۰؍ستمبر ۱۹۱۹ء صفحہ ۲ تا ۶)

۱؎ المائدہ ۵: ۲۸۔ ۲؎ صحیح بخاری کتاب العیدین باب الاکل یوم الفطر قبل الخروج۔ ۳؎ جامع ترمذی ابواب ،، ،،

کتاب السنن الکبریٰ بیہقی کتاب صلوٰۃ العیدین باب یترک الاکل یوم النحر حتی یرجع ۲۸۳ ۔ ۴؎ الضحیٰ ۹۳: ۱۲

۵؎ مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحات ۲۸۰، ۲۹۵۔ ۶؎ الحجرات ۴۹: ۲،

۷؎ جنگِ عظیم اول۔ اس کے متعلق نوٹ پہلے آ چکا ہے۔ ۸؎ المائدہ ۵: ۲۲-۳۲

۸

(فرمودہ ۲۶ اگست ۱۹۲۰ء بمقام ڈلہوزی)

یہ عید قربانی کی عید کہلاتی ہے کیونکہ ایک عظیم الشان قربانی کی یاد میں قائم کی گئی ہے لوگ بحث کرتے ہیں کہ یہ قربانی حضرت اسحٰقؑ کی تھی یا حضرت اسمٰعیلؑ کی۔ لیکن اصل بات یہی ہے، کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی اس قربانی میں پیش کئے گئے تھے۔[1]

تورات کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا تھا کہ اپنا اکلوتا بیٹا قربانی میں پیش کریں۔ "اس نے کہا (اللہ تعالیٰ نے) تو اپنے بیٹے ہاں اکلوتے بیٹے کو جسے تو پیار کرتا ہے۔ اضحاق کو لے اور زمین صوریاہ میں جا اور اسے وہاں پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے لئے چڑھا۔"[2] مگر چونکہ حضرت اسحٰقؑ حضرت اسمٰعیلؑ سے چھوٹے تھے۔ اس وجہ سے اکلوتے بیٹے کے لفظ کا اطلاق ان پر نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن بڑے بیٹے پر اکلوتے کا لفظ عائد ہو سکتا ہے کیونکہ جب تک حضرت اسحٰق پیدا نہیں ہوئے تھے حضرت اسمٰعیلؑ ہی اکلوتے تھے۔

یہود کو یا تو دھوکا لگا ہے یا انہوں نے عمداً حق پوشی کر کے لوگوں کو دھوکا دیا ہے اور اس خواب میں اضحٰق کا لفظ بڑھا دیا ہے تاکہ قربانی کے فوائد اور وعدوں کا وارث اپنی قوم کو ثابت کر کے حق اپنی طرف منسوب کریں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رؤیا میں دکھایا گیا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کرتے ہیں۔[3] یہ ایک خواب تھی جس کی تعبیر تھی اور یہ ظاہر اپنے اندر ایک حقیقت رکھتا تھا۔ اور یہ رؤیا کچھ معنی رکھتی تھی مگر چونکہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی قانون نازل نہ ہوا تھا کہ رؤیا پر کیونکر عمل کیا جائے اور خواب کی حقیقت اور معانی سمجھ کر کیونکر اسے عملی جامہ پہنایا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رؤیا کو اپنے ظاہر پر محمول کیا اور واقعہ میں اپنے جگر گوشہ کو خدا کے حکم کے ماتحت اور اس کی رضا کے حصول کے لئے قربان کرنے کو تیار ہو گئے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو جن کی رضا بھی اس میں شامل تھی۔ زمین پر لٹا دیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے عین اس وقت کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام گویا اپنی طرف سے حضرت اسمٰعیلؑ کو قربان ہی کر چکے تھے۔ اس رؤیا کی حقیقت بتائی اور اس خواب کو ظاہری طور پر پورا کرنے کے لئے حکم دیا کہ اللہ کی راہ میں ایک بکرا قربان کیا جائے۔[4]

دراصل یہ رؤیا ایک بنیاد تھی جس کا دامن قیامت تک کے لئے وسیع تھا اور اس رؤیا کے دونوں پہلو تھے مُنذر بھی اور مبشر بھی۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ رؤیا کے منذر حصّہ کی تکالیف اور دُکھ سے بچنے کے لئے بکرے کی قربانی ادا کرو۔

چنانچہ اسی ابراہیمی سنت کے ماتحت مسلمانوں کو بھی قربانی کا حکم ہے۔ اور اس پر مسلمان ہمیشہ سے عمل کرتے چلے آئے ہیں۔ مگر چونکہ اس رؤیا کے دونوں پہلو میں منذر بھی اور مبشر بھی اسی وجہ سے اس قربانی اور صدقہ میں فرق ہے۔ صدقہ کی قربانی کا گوشت انسان کو خود کھانا جائز نہیں[۵] مگر اس قربانی کا گوشت انسان خود بھی استعمال کر سکتا ہے اور اپنے دوستوں اور غرباء و مساکین میں بھی تقسیم کیا جاتا ہے[۶]۔

دراصل یہ رؤیا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ہجرت کی پیشگوئی تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قبل از وقت اشارۃً بتائی گئی کہ اپنے ننھے بچے کو ایک ایسے بے آب و دانہ جنگل میں جہاں سینکڑوں میل تک نہ پانی نہ کھانے کا سامان کچھ بھی میسر نہ ہوگا، وہاں چھوڑنا پڑے گا۔ جو دراصل ان حالات کے ماتحت ذبح کرنے سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔ اور یہی وہ قربانی تھی جس کی طرف رؤیا میں اشارہ تھا۔ ورنہ یہ خیال کہ بچے کو ذبح کردو اور پھر بس۔ اس کے بعد اس کا کوئی نتیجہ نہیں، یہ تو ایک تمسخر بن جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور انبیاء کی شان سے بعید ہے گو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہی سمجھا جس کے مطابق اپنے اخلاص اور علم کی بناء پر عمل درآمد کیا مگر دراصل منشاء الٰہی وہی تھا جو واقعات سے ثابت ہوا۔

غور کا مقام ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر اس وقت گیارہ یا بارہ برس کی ہے۔ حکم ہوتا ہے کہ اس کو لق و دق جنگل میں چھوڑ آؤ۔ جہاں سینکڑوں میل تک پانی ہے نہ دانہ۔ حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس واقعہ کو یوں بیان فرماتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک تھیلے میں تھوڑی کھجوریں اور ایک مشکیزہ میں کچھ پانی لیا۔ اور حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیل کو لے کر ایک جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت ہاجرہ پوچھتی ہیں کہ آپ کہاں جاتے ہیں اور ہمیں کدھر لے جاتے ہیں۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کوئی جواب نہ دیا اور جنگل کی طرف چلے گئے۔ حضرت ہاجرہ بار بار پوچھتی تھیں مگر کوئی جواب نہ ملتا تھا۔ حتیٰ کہ اس خاص مقام پر پہنچے جہاں مکہ مکرمہ تھا۔ اور جس جگہ ان کو پہنچانے کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر کھجور کا تھیلہ اور پانی کا مشکیزہ ماں بچے کے پاس رکھ کر آپ واپس روانہ ہوئے۔ حضرت ہاجرہ نے جب دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو اس جنگل میں یکہ و تنہا چھوڑ کر خود واپس جا رہے ہیں تو وہ ان کے پیچھے ہولیں اور عرض کیا کہ ہمیں اس جنگل میں چھوڑ کر آپ کہاں تشریف لے جاتے ہیں۔ مگر

کوئی جواب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو نہ دیا اور چپکے چلتے گئے۔ حضرت ہاجرہ نے پھر عرض کیا دوبارہ سہ بارہ پوچھا کہ حضور ہمیں اس بے گیاہ، بے آب و دانہ خوفناک اور بھیانک جنگل میں جہاں نہ انسان ہے اور نہ کوئی مونس و غمخوار، تنہائی اور جدائی ڈراتی ہیں، ایسے لق و دق سنسان بیابان میں بے سروسامان چھوڑ کر کہاں تشریف لے جاتے ہیں؟ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ تو حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا عرض کرتی ہیں کہ کیا اللہ تعالےٰ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اور کیا آپ اللہ کے حکم سے ہمیں یہاں چھوڑتے ہیں۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اتنا جواب دیا نعم (ہاں)۔

حضرت ہاجرہ کا ایمان بھی کیسا کامل ایمان ہے اور کس پایہ کی مطیع اور متوکلہ عورت ہیں کہ جب اللہ کا نام آیا، دل قوی ہوگیا۔ تمام خطرے جاتے رہے۔ ساری تنہائی اور بے سروسامانی بھول گئی۔ نہایت انشراحِ صدر اور کمالِ اطمینان سے کہتی ہیں۔ اِذَنْ لَّا یُضَیِّعُنَا۔ یہ کہکر حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے اپنے لختِ جگر، نورِ بصر کی طرف لوٹ آتی ہیں اور رضاءِ الٰہی پر شاکر اور اس کے حکم کی بجا آوری کے لئے صابر ہیں۔

ادھر حضرت ابراہیم علیہ السلام جب راستہ کے موڑ پر پہنچے اور دیکھا کہ آپ اب ان کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ منہ قبلہ کی طرف پھیرلیا اور کھڑے ہوکر اپنی پیاری بیوی اور عزیز بچے کو اللہ کے سپرد کرتے اور دعا کرتے ہیں رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ۔ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ۔ اس دعا کے بعد گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام مطمئن ہوگئے اور ان کو اللہ کے وعدوں پر کامل یقین اور پورا بھروسہ تھا کہ وہ ان کو ضائع نہ ہونے دے گا۔ اور ایسا بڑھائے گا کہ دنیا کی ریت کے ذرات کا گننا جانا ممکن مگر یہ کبھی نہ گنے جاسکیں گے۔ دعا بھی کیسی کامل دعا کی ہے کہ ان کی روحانی جسمانی ضروریات کو مدِنظر رکھکر جامع دعا کی ہے۔

حضرت ہاجرہؑ اور ان کے بچےؑ کے پاس تھوڑی سی کھجور اور تھوڑا پانی تھا۔ جلدی ختم ہوگیا۔ بچے بھوک پیاس کی زیادہ برداشت نہیں کرسکتے۔ پیاس سے تنگ آکر حضرت اسمٰعیلؑ نے رونا اور چلانا شروع کیا۔ ماں کی مامتا مشہور ہے ان کے بیتاب اور لوٹ پوٹ ہونے کو دیکھ نہ سکیں اور ادھر ادھر پانی کی تلاش میں دوڑنے لگیں۔ ایک طرف صفا کی پہاڑی اور دوسری جانب مروہ کی بلندیاں تھیں۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر سات مرتبہ دوڑی تھیں کہ کہیں کوئی پانی کا نشان مل جائے۔ گھبراہٹ میں تھیں، بچہ جاں بلب تھا۔ اس درد کا کون اندازہ کرسکتا ہے آخر ایک آواز

کان میں آئی جو محض آواز ہی تھی۔ سننے کے لئے کان لگائے۔ پھر آواز آئی اس کو امداد کے لئے پکارا۔ مگر وہ فرشتہ تھا جس نے اپنے پاؤں کی ایڑی سے یا اپنے پر سے ایک پتھر کو ٹھوکر لگائی۔ اور وہاں سے چشمۂ صافی رواں ہو گیا۔ جس سے اپنے بچے کو پلایا اور خود بھی پیا۔ وہی چشمہ اب دنیا میں زمزم کے نام سے موسوم ہے۔[۹]

صفا اور مروہ کی سعی ایام حج میں اسی عظیم الشان قربانی کی یاد میں قائم ہوئی ہے۔[۱۰] یہ قربانی کیا پھل لائی اور کیسی بار آور ہوئی۔ دنیا جانتی ہے۔

یہ قربانی تھی جسکی طرف اشارہ تھا اور یہی وہ قربانی ہے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کو بھی کرنا تھی پہلی کتابوں میں یونہی لکھا تھا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد کے خلاف تمام دنیا کا ہاتھ اٹھے گا اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد کا ہاتھ تمام دنیا کے خلاف ہوگا۔ چنانچہ پیدائش باب[۱۶] میں یوں بیان ہوا ہے۔

"اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے۔ اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بودوباش کرے گا۔"

اور جس کا یہ حال ہو کہ تمام دنیا اس کے خلاف جمع ہو جائے اسے قربانی بھی بہت کرنی پڑتی ہے۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے آپ کے حقیقی وارث حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی سب سے بڑی قربانی کرنی پڑی چنانچہ اسی مقام پر جہاں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ہجرت کرنی پڑی تھی۔ اسی مقام[۱۱] پر آپ کا دانہ اور پانی روک دیا گیا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تو ایسے وقت میں وہاں پہنچائے گئے تھے کہ وہاں دانہ پانی تھا نہیں مگر یہاں یہ حالت ہے کہ دانہ اور پانی تو موجود ہے مگر پہرہ مقرر کر دیا جاتا ہے کہ ان کو نہ دانہ پہنچے اور نہ پانی۔ اور متواتر چھ[۱۲] سال تک یہی حالت رہتی ہے حتیٰ کہ فاقوں کی وجہ سے لوگوں کے چہرے پہچاننے مشکل ہو گئے اور پھر یہ وہی قربانی کے ایام ہیں جن میں آپ کی نہایت پیاری بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انہی مشکلات مصائب اور مشقتوں میں فوت ہوئیں۔[۱۳]

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے واسطے تو وہ مشکل چند روزہ تھی۔ مگر یہاں متواتر چھ سال کا عرصہ انہی مشکلات میں بسر کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ بڑی قربانی آپ کو اس لئے کرنی پڑی کہ آپ ہی وہ نبی تھے کہ جن کا ہاتھ تمام دنیا کے خلاف اور جن کے خلاف تمام جہان کھڑا ہونے والا تھا۔

عیسائی کہتے ہیں کہ ان الفاظِ تورات سے مراد ڈاکو ہیں[۱۵]۔ مگر یہ ٹھیک نہیں۔ ڈاکو بھی بھلا کوئی حیثیت رکھتے ہیں جن کے خلاف تمام دنیا اور سارے جہان کو جمع ہونے کی ضرورت پیش آوے۔ بڑے بڑے ڈاکو دنیا میں پیدا ہوئے اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ آخر ان کا کیا انجام ہوا۔ تھوڑے

ہی دلوں میں باندھکر ان کو سزائیں مل گئیں مگر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور اس کی اولاد کی نسبت تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ باوجود سب دنیا کی مخالفت کے وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے آبود و باش کرے گا یعنی ان کی مخالفت ان کو نقصان نہ پہنچا سکے گی۔

در اصل یہ ایک بہت بڑے انقلاب اور عظیم الشان تغیرات کی طرف اشارہ تھا جو ہمیشہ ہمیش کے لئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور انکی اولاد کے خلاف دنیا میں بپا ہونے والا تھا اور جسے اب دنیا آئے دن مشاہدہ کر رہی ہے جس دن سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ کے پاک اور متبرک مقام پر کھڑا کیا گیا تھا اسی دن سے دُنیا میں اس عظیم الشان تغیر کی بنیاد رکھی گئی تھی آپ کو نہ مٹنے اور نہ بدلنے والے مقام پر کھڑا کیا گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ دنیا کو اس کی اور اس کی اولاد کی طرف سے کھا جانیوالا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ قاعدہ کی بات ہے کہ بدلتی رہنے والی چیز اور مٹ جانیوالی ہستی کا لوگوں کو زیادہ خوف نہیں ہوتا۔ اصل خوف اور زیادہ ڈر اسی چیز کا ہوتا ہے جس کے متعلق خیال ہو کہ یہ نہ بدلے گی اور نہ مٹے گی۔ کیونکہ بدلنے اور مٹ جانے والی چیز کے متعلق وہ دلوں کو تسلی دے لیتے ہیں کہ چند روز بعد بدل جائے گی یا مٹ جائے گی مگر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو جس مقام پر کھڑا کیا گیا تھا اس کے متعلق وعدہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیش قائم رہے گا نہ مٹے گا اور نہ بدلے گا۔ اور یہی امر دنیا کی زیادہ مخالفت کا باعث ہوا۔ غرض یہ رؤیا اس قربانی پر دلالت کرتی تھی کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کو صداقت اور حق کی تبلیغ و اشاعت کے لئے تمام دنیا کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو مذہب دیا گیا وہ اس حقیقت کا پورا ثبوت اور بیّن دلیل ہے۔

اسلام کا اصل الاصول قربانی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسمٰعیلؑ کو قربان کر کے آئندہ نسلوں کے لئے ترقیات اور وصول الی اللہ کی سنت قائم کر دی اور کمال فرمانبرداری کا نمونہ دکھا کر اپنا مذہب کھول کر بتا دیا ہے۔ جس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان جب تک خدا کے لئے اپنے اوپر ایک موت وارد نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہر قسم کی ذلت اور رسوائی کو اپنے اوپر لینے کے لئے تیار نہیں ہو جاتا اور مشکلات اور مصائب کے خاردار کوہ و دشت میں نہیں پھینکا جاتا۔ اور دنیا سے بالکل منقطع ہو کر کاٹا نہیں جاتا اس وقت تک قبول بھی نہیں کیا جاتا۔

ابراہیمی سنّت اور اسمٰعیلی ایثار و فرمانبرداری کا رنگ جب تک انسان اپنے اندر پیدا نہیں کرتا (جس کا کامل نمونہ ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکی زندگی میں کمال صبر اور کمال استقلال سے دکھا کر حقیقی قربانی کی مثال ہمیشہ ہمیش کے واسطے بطور نمونہ اور اسوۂ حسنہ

قائم کر دی۔ اور جو بعد کو مدنی زندگی کے زمانہ میں رنگ لائی، بارآور ہوئی اور اس قربانی کی قبولیت کا ثبوت اور منظوری کی شہادت اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل سے دی) اس وقت تک انسان کو خدا تعالےٰ کے حضور نہ قبولیت کا شرف بخشا جاتا ہے اور نہ ہی وہ منظور نظر ہو سکتا ہے۔

مگر لوگ بالعموم قربانی کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ مَیں دیکھتا ہوں طبائع میں عام طور پر کامل فرمانبرداری اور اطاعت کا مادہ بہت کم پایا جاتا ہے۔ نفس کا مارنا اور خدا تعالےٰ کے احکام کے مقابلہ میں اپنی تمام خواہشات اور امنگوں کو قربان کر کے گردن ڈال دینا، اپنا آپ بھلا کر تمام تر خدا کے لئے ہو جانا اور اباء و استکبار کو ترک کر دینا نہایت ہی مشکل اور موت سے بھی سخت تر ہے۔ بہت ہیں کہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے پابند ہوں گے مالوں کی قربانی میں دلیری اور حوصلے سے کام لیں گے۔ نفسانی خواہشات کو قربان کر کے ایثار کا ثبوت دیں گے۔ بدنی اور جسمانی خدمات کے لئے کمربستہ ہوں گے اپنے اوقات گرامی کی قربانی کے لئے آمادہ نظر آئیں گے مگر تعمیل فرمانبرداری اور ترک اباء و استکبار کے امتحان میں کچے نکلیں گے اور پیچھے رہ جائیں گے کیونکہ وہ اعمال تو ایسے ہیں کہ کرتے کرتے ان کی عادت پختہ ہو جاتی ہے۔ اور وہ انسان کے ایسے عادت ثانی ہو جاتے ہیں کہ پھر ان کا ترک کرنا انسان کے واسطے مشکل ہو جاتا ہے۔

مگر فرمانبرداری اس بات کا نام ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی روح اور اس کے قلب میں ایک ایسا احساس پیدا ہو جائے کہ وہ ان تمام احکام کی فرمانبرداری اور تعمیل کے لئے ایسا کمربستہ ہو جائے کہ جب جب بھی کوئی حکم اللہ تعالےٰ کی طرف سے، اس کے رسولوں اور انبیاء کی طرف سے یا اُن کے نواب اور خلفاء کی طرف سے صادر ہو۔ سو یہ اس کے ماننے اور فرمانبرداری کے لئے اپنے دل میں کوئی خلش نہ پائے۔ اور تعمیل کے لئے بالکل تیار ہو۔ اباء و استکبار اور نافرمانی کا خیال و وہم تک بھی اس کے قلب میں نہ گذرے۔ پس انسان ہزار نمازیں پڑھے، صدقات دے اور ظاہری قربانیاں ادا کرے مگر جب تک وہ قلب سلیم نہیں جس میں یہ یقینی عزم ہو کہ خدا تعالےٰ کا مقابلہ نہیں کرنا، اباء و استکبار نہیں کرنا اور خدا کے لئے ہر موت اپنے اوپر وارد کرنا منظور ہے تب تک کچھ بھی نہیں۔

ایک شخص تھوڑی نمازیں پڑھنے والا اور کم تسبیح و تحمید کرنے والا اور ظاہری احکام کی پابندی میں بظاہر دوسروں سے کم ہے۔ مگر اس کے اندر وہ سعید روح موجود ہے اور دل میں سچا جوش اور تڑپ ہے کہ جب بھی کوئی حکم خدا تعالےٰ کی طرف سے اسے ملتا ہے وہ اس کی تعمیل و فرمانبرداری کے لئے حتی الوسع تیار ہوتا ہے اور اباء و استکبار نہیں کرتا بلکہ خوش ہوتا ہے اور اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہے کہ اسے بھی کسی حکم کی تعمیل کا موقع و توفیق ملی اور شکر کرتا ہے۔ کہ وہ بھی اس قابل ہوا

کہ اسے کوئی موقع خدمت کا دیا گیا، ہزار درجہ بہتر اور لاکھ درجہ افضل ہے اس انسان سے جو سارا دن نمازوں اور تسبیح و تحمید میں گذار دیتا ہے۔ اور سارے مال کو اللہ کی راہ میں تقسیم کر دیتا ہے مگر ابھی اس کے اندر وہ مادہ پیدا نہیں ہوا جس کے ذریعہ سے وہ ہر ایک حکم کے لئے اپنے آپ کو بشرح صدر تیار پاتا ہے یا اس کا نفس بعض احکام پر برا مانتا اور ان کی اطاعت میں اپنی حق تلفی سمجھ لیتا ہے۔ درحقیقت وہ مسلم نہیں، اس کے نفس نے اس کو دھوکا دے رکھا ہے۔ اور اس میں وہ رگ باقی ہے جس کی وجہ سے ابلیس راندۂ درگاہ ہوا۔

قربانی کے معنے ہیں کہ انسان ایک مُردہ کی طرح ہو جائے جو بدست زندہ ہو وہ اسے جدھر چاہے پھیر دے اور جہاں چاہے رکھ دے۔ نہ کوئی اس کی خواہش ہو اور نہ اس کا اپنا کوئی جذبہ ہو۔ وہ اپنے ارادے اور نیت کو بالکل کھو چکا ہو۔ ایسا مُردہ انسان بلکہ بے حس و حرکت پتھر بھی لاکھ درجہ بہتر ہے اس انسان سے جو اپنے ظاہری اعمال سے اپنے اسلام و فرمانبرداری کا دعویٰ کرے مگر امتحان کے وقت جھوٹا ثابت ہو اور اِباء و استکبار کرے۔

کہتے ہیں کہ ابلیس بڑا عابد و زاہد تھا۔ یہ مان لیا کوئی بعید از قیاس بات نہیں بلکہ قرین قیاس ہے کیونکہ ہمیشہ انبیاء و صادقین کی آمد سے پہلے بھی ایک ایسا گروہ موجود ہوتا ہے جو مدعی اسلام و فرمانبرداری ہوتا ہے۔ دور کی بات نہیں ہمارے اسی زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے سب سے بڑے دشمن مولوی محمد حسین بٹالوی ہی کی نسبت ہم نے تحقیقات کرائی ہے۔ وہ شریعت کے ظاہری احکام کا بڑا پابند تھا تہجد گزار تھا اور سوائے خاص مجبوری کے تہجد ترک نہ کرتا تھا۔ انبیاء و راستبازوں کی آمد سے پہلے ایک گروہ ایسا بھی ہوا کرتا ہے۔ اور ایک گروہ ایسا بھی ہوا کرتا ہے جیسے مولوی ثناء اللہ۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ بعثت سے پہلے بھی ایک شخص زید نامی مشہور زاہد تھا اور وہ شرک کے خلاف وعظ بھی کیا کرتا تھا اور ایسی غیرت کا اظہار کیا کرتا تھا کہ ایک دفعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے کھانے کے لئے بلوایا تو اس نے جواب دیا کہ مَیں تمہارا کھانا نہیں کھا سکتا کیونکہ تم لوگ مشرک ہو۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے یقین دلایا کہ ہم لوگ ہرگز مشرک نہیں ہیں۔ مگر آخر ایسا مدعی بھی جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے اور آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت نبوت کا اعلان کیا تو شاکی ہوا اور اس نے اپنی حق تلفی سمجھی کہ خدمات تو میں نے کی ہیں اور نبوت آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مل گئی۔ اِباء کیا، استکبار دکھایا، مردود ہوا اور محروم رہ گیا۔

غرض اِباء و استکبار ایک ایسی آگ ہے جو ایک دم میں سالہا سال کی محنت، ریاضت، زہد و تعبد

کو جلا کر راکھ بنا دیتی ہے اور عمروں کے اعمال کو حبط کر کے خالی ہاتھ کر دیتی ہے۔

محض گناہ یا محض نافرمانی تو حضرت آدم علیہ السلام کی طرف بھی منسوب ہوئی ہے۔ کیونکہ نافرمانی کہتے ہیں حکم کے نہ ماننے کو۔ سو وہ تو حضرت آدم علیہ السلام سے بھی ہوئی ہے اور ابلیس کی طرف بھی نافرمانی منسوب ہوتی۔ مگر فرق کیا ہے؟ جس سے حضرت آدم علیہ السلام تو باوجود نافرمانی کے مقرب اور محبوب رہے اور ابلیس ہمیشہ ہمیش کے لئے مردود اور متروک ہو گیا۔ فرق صرف یہی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے نافرمانی سرزد ہوئی مگر نسیان سے عمداً نہیں، اباء سے نہیں، استکبار سے نہیں۔ اور ابلیس سے نافرمانی ہوئی اباء سے اور استکبار سے۔

ایک مسلمان اگر نماز نہیں پڑھتا مگر اندر ہی اندر نادم ہوتا ہے اور نماز کا انکار تو نہیں کرتا بلکہ اپنی سستی اور غفلت کا اقبال کرتا ہے۔ اور کسی کے پوچھنے پر شرمندگی سے سر نیچا کر لیتا ہے گردن ڈال دیتا ہے اور خاموش ہو جاتا ہے تو وہ مومن ہے اور مسلمان ہے لیکن اگر اباء کرتا استکبار دکھاتا اور اپنے گناہ پر مُصر ہے اور اسے مستحسن سمجھتا ہے تو وہ ایمان سے خارج ہو جائے گا۔ محض گناہ انسان کو ایمان سے خارج نہیں کرتا خواہ انسان اعمال ظاہری میں سست ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن بظاہر پابند شریعت ہو کر اباء و استکبار کرنے والا کبھی بھی مومن نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک نکتہ ہے کہ جس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ دھوکا کھاتے ہیں۔ اکثر سوال ہوتا ہے کہ فلاں شخص تو بڑا نیک پارسا تھا۔ عابد تھا۔ زاہد تھا۔ خادم دین تھا۔ تبلیغ میں حصہ وافر لیتا تھا، وہ کیسے مرتد ہو گیا۔ مگر وہ نہیں جانتے کہ ایسے بڑے کہلانے والے۔ ایسے قربانیاں کرنے والے لوگ، لوگوں کے نفسوں کا تو محاسبہ کرتے ہیں۔ مگر اپنے نفس کے محاسبہ کا انہیں کبھی خیال تک بھی نہیں آتا۔ وہ عبادت کرتے ہیں مگر اس لئے کہ عبادت کرتے کرتے ان کے اندر ایک ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ زہد کرتے ہیں مگر اسی ذوق کی بناء پر۔ ان کے قلب کا انجن ٹھیک نہیں ہوتا۔ ان کے دل میں وہ ایمان اور وہ روح پیدا نہیں ہوتی جو حقیقت رس ہو۔ اس کی مثال بعینہٖ کلاک کے پنڈولم (PENDOLUM) کی ہے جو موازنہ سے حرکت کرتا ہے۔ ذرا سی روک آئی اور ختم گیا۔ اس روک کے مقابلہ کرنے والی قوت ان کے دلوں میں پیدا نہیں ہوئی ہوتی۔

میں دیکھتا ہوں کہ ہماری جماعت میں بھی شاذ ہیں جو اس نکتہ کو سمجھے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ اگر وہ ظاہر کے ساتھ اپنے باطن کی صفائی پر بھی زور دیتے۔ اور ان کے اندر یہ روح پیدا ہو جاتی کہ جب جب کوئی حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اس کے رسولوں کی طرف سے یا اُن کے نواب و خلفاء کی طرف سے آتا، وہ اس کے قبول کرنے اور بسر و چشم ماننے

کو تیار ہو جاتے۔ اگر اس نکتہ کو لوگ سمجھ لیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں تو بہت جلد ایک ایسی مضبوط جماعت تیار ہو سکتی ہے جو بجائے ذرا ذرا سی بات پر اڈ بیٹھنے اور معمولی باتوں کو ہتک سمجھ کر الگ ہو جانے کے ایسی مضبوط ہو کہ اگر اسے آروں سے بھی چیر دیا جائے تو بھی اس کے اندر کمزوری نہ پیدا ہو اور اسے ابتلا نہ آوے۔ بلکہ وہ بڑے بڑے ابتلاؤں کو بھی ابتلاء قرار دینے سے پرہیز کرے اور پوری صادق اور صابر اور فرمانبردار ہو۔

اللہ تعالےٰ ہماری جماعت کو اس کے سمجھنے کی توفیق دے اور اباء و استکبار کا مادہ جو ابتداء سے دنیا میں چلا آیا ہے اس سے بچائے اور جس فرمانبرداری اور قربانی کی بنا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے رکھی تھی اور جسے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے درجہ تکمیل تک پہنچایا تھا، اس پر کاربند ہونے کی توفیق عطا فرماوے۔ آمین ثم آمین ۔"

(الفضل ۶ ستمبر ۱۹۳۰ء صفحہ ۶ تا ۹)

۱؎ ۔ تاریخ طبری جلد ۱ صفحہ ۲۶۲ تا صفحہ ۲۶۹ ۔ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام مصنفہ علامہ عباس محمود العقاد المصری ترجمہ مولانا راغب رحمانی صفحہ ۱۳۳ تا ۱۳۶

۲؎ ۔ پیدائش باب ۲۲ آیت ۲

۳؎ ۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۳

۴؎ ۔ پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۲-۱۳

۵؎ ۔ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب اذا تحولت الصدقۃ ۔

۶؎ ۔ صحیح مسلم کتاب الاضاحی باب عن اکل لحوم الاضاحی ۔ سُنَنِ کبریٰ الجزء الخامس صفحہ ۲۳۹ سُنَن الدارمی الجزء الاوّل صفحہ ۲۹۶

۷؎ ۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی

۸؎ ۔ ابراھیم ۱۴ : ۳۸

۹؎ ۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی

۱۰؎ ۔ " " " " " " " "

۱۱؎ ۔ پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۲

۱۲؎ ۔ شعب ابی طالب کی طرف اشارہ ہے جو ایک پہاڑی درہ تھا۔ جہاں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے متبعین اڑھائی تین سال تک محصور رہے۔ (طبقات ابن سعد الجزء الاوّل صفحہ ۱۶۳

تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۱۱۹۹ مطبوعہ بیروت

۱۳؎ ۔ غالباً سہو کتابت ہے۔ اصل مدت اڑھائی تین سال ہے (تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۱۱۵۹)

۱۴؎ ۔ زرقانی شرح المواہب اللدنیہ جلد ۱ صفحہ ۲۵۶

۱۵؎ ۔ Commentary on The Old Testament, New York. 1893.
(زیر پیدائش باب ۱۶۔ آیت ۱۲)

۱۶؎ ۔ تاریخ الخمیس جزء اول صفحہ ۵۸

۱۷؎ ۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی (۱۸۴۲ء ۔ ۱۹۲۰ء) اہلحدیث کے مشہور عالم اشاعۃ السنۃ کے مدیر اور احمدیت کے اشد ترین مخالف تھے۔

۱۸؎ ۔ مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری (۱۸۶۸ء ۔ ۱۹۴۸ء) مشہور معاند احمدیت امیر اہلحدیث۔

۱۹؎ ۔ صحیح بخاری کتاب المناقب باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل

۲۰؎ ۔ طٰہٰ ۲۰ : ۱۱۶

۲۱؎ ۔ البقرہ ۲ : ۳۵

۹

"مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۲۱ء کو عید کا مبارک دن تھا۔ حضور کی طبیعت بفضلہ تعالیٰ اچھی رہی۔ نماز عید میں قریباً سوا تین سو احباب شامل ہوئے۔ حضور نے خطبہ میں مسائل عید و قربانی بیان فرمائے اور آخر میں یہاں[1] کی جماعت کو بہت سی نصائح فرمائیں"

(الفضل ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء)

افسوس ہے یہ خطبہ جماعت کے کسی اخبار یا رسالہ میں شائع نہیں ہوا۔

(مرتب)

[1] آسنور کشمیر

۱۰

فرمودہ ۵؍ اگست ۱۹۲۲ء بمقام قادیان*

مَیں آج آپ لوگوں کے سامنے لمبا مضمون بیان کرنے کے لئے کھڑا نہیں ہوا بلکہ مختصرًا بعض باتیں بیان کرتا ہوں تاکہ خطبہ عید کی جو غرض ہے وہ پوری ہو۔

حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریق تھا کہ آپ عید کے خطبوں میں اللہ تعالٰی کی تسبیح و تحمید بیان فرماتے اور قیامت کے متعلق صحابہؓ کو توجہ دلاتے تھے[1]۔ عید کے خطبوں میں آپ کا مضمون زیادہ تر اس بات کے متعلق ہوتا تھا کہ بعث مابعد الموت کے متعلق توجہ ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ عید کا دن بھی بعث مابعد الموت کے ساتھ ملتا ہے۔ عید کے دن بہت سے لوگ جمع ہوتے ہیں اور یہ بھی ایک قسم کا حشر ہوتا ہے۔ حشر کے معنے اکٹھا کرنے کے ہیں۔ چنانچہ عید کے دن بھی لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس دن جمع ہونے کے متعلق یہاں تک تاکید ہے۔ کہ حائضہ عورتیں بھی جمع ہوں[2]۔ وہ نماز نہ پڑھیں مگر دوسروں کے ساتھ دُعا میں شامل ہوں پس یہ وہ دن ہے کہ اس دن مسلمان خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے سب جمع ہوتے ہیں۔ ایسے اجتماعوں کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ زینت کرنی چاہیئے اور خوشبو لگانی چاہیئے[3]۔ چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دستور تھا کہ جمعہ کے دن، عید کے دن، حج کے ایام میں احرام باندھنے سے پہلے خوشبو لگاتے تھے[4]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجمع میں تزئین کرنی چاہیئے۔ اور یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ مجمع میں خوبصورت نظر آئے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حکم میں فطرت انسانی کی ترجمانی فرمائی ہے۔

لوگ میلے میں، جلسوں، شادیوں میں کیوں خوشبو لگاتے ہیں؟ اسی لئے کہ وہ اچھے نظر آئیں جب ان کی یہ خواہش ہوتی ہے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس حکم کا منشاء یہ ہے کہ اس سے اس طرف توجہ ہو کہ قیامت کے دن جہاں اگلے پچھلے سب جمع ہوں گے خوبصورت نظر آنے کی کس قدر کوشش کی ضرورت ہے۔ آپ کا منشاء تھا کہ لوگ اس سفر اور اگلے جہان کے لئے تیاری کریں۔

---

* یہ وہ مبارک ایام تھے جن میں حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ روزانہ چار ساڑھے چار گھنٹے تک قرآن کریم کا درس دیا کرتے تھے۔ چنانچہ عید کے دن بھی حضور نے باقاعدہ درس دیا۔ (الفضل ۱۰؍ اگست ۱۹۲۲ء)

پھر آپ اس عید کے خطبہ میں قربانی کے احکام بیان فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس عید کے احکام یہ ہیں کہ ہر ایک خاندان کی طرف سے ایک بکرے کی قربانی ہو سکتی ہے۔ اگر کسی میں وسعت ہو تو ہر ایک شخص بھی ایسا کر سکتا ہے۔ ورنہ ایک خاندان کی طرف سے ایک قربانی کافی ہے[۳۵] یہاں خاندان سے دور و نزدیک کے رشتے مراد نہیں۔ بلکہ خاندان کے معنے ایک شخص کے بیوی بچے ہیں۔ اگر کسی شخص کے لڑکے الگ الگ ہیں اور اپنا علیحدہ کماتے ہیں تو ان پر علیحدہ قربانی فرض ہے۔ اگر بیویاں آسودہ ہوں اور اپنے خاوندوں سے علیحدہ ان کے ذرائع آمد ہوں تو وہ علیحدہ قربانی کر سکتی ہیں۔ ورنہ ایک قربانی کافی ہے۔ بکرے کی قربانی ایک آدمی کے لئے ہے اور گائے اور اونٹ کی قربانی میں سات آدمی شامل ہو سکتے ہیں[۳۶]۔ ائمہ کا خیال ہے کہ ایک گھر کے لئے ایک حصہ کافی ہے[۳۷] اگر گھر کے سارے آدمی سات حصے ڈالیں تو وہ بھی ہو سکتا ہے۔ ورنہ ایک گھر کی طرف سے ایک حصہ بھی کافی ہے۔ اور اس طرح ہر ایک شخص کی طرف سے آج کے دن قربانی ہو جاتی ہے۔ لیکن کئی لوگ غریب ہوتے ہیں۔ اس لئے اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ کوئی شخص قربانی سے محروم نہ رہ جائے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دستور تھا کہ غربا امت کی طرف سے ایک قربانی کر دیا کرتے تھے اسی طریق کے مطابق میرا بھی قاعدہ ہے کہ اپنی جماعت کے غرباء کی طرف سے ایک قربانی کر دیا کرتا ہوں۔

اس کے بعد یہ بات یاد رکھو کہ ہماری جماعت میں اس بات کی سستی ہے کہ نماز عید وقت پر پڑھیں۔ گو پہلے کے لحاظ سے آج ہم نے جلدی نماز پڑھی ہے مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں یہ عید اس وقت پڑھی جاتی تھی جبکہ آفتاب ایک نیزہ کی بلندی پر ہوتا تھا[۳۸]۔ اور رمضان کے بعد کی عید اس وقت پڑھی جاتی تھی۔ جبکہ آفتاب دو نیزے کی بلندی پر آجاتا تھا[۳۹]۔ لیکن ہم نے آج جس وقت عید کا خطبہ شروع کیا ہے چار نیزے کے برابر سورج بلند ہو چکا تھا حالانکہ ابھی ہم نے جلدی کی تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ بعض غلطیاں غلط فہمیوں کے باعث ہو جاتی ہیں۔ ایک دعوت میں میں نے ایک شخص کو بائیں ہاتھ سے پانی پینے سے روکا تو اس نے کہا کہ حضرت صاحبؑ بھی بائیں ہاتھ سے پانی پیا کرتے تھے۔ حالانکہ حضرت صاحبؑ کے ایسا کرنے کی ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ آپؑ بچپن میں گر گئے تھے۔ جس سے ہاتھ میں چوٹ آئی اور ہاتھ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اس سے گلاس تو اٹھا سکتے تھے۔ مگر منہ تک نہ لے جا سکتے تھے۔ مگر سنت کی پابندی کے لئے آپؑ گو بائیں ہاتھ سے گلاس اٹھاتے تھے مگر نیچے دائیں ہاتھ کا سہارا بھی دے لیا کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وقت میں عید کی نماز کے لئے دیر ہو جایا کرتی تھی اور اس میں ایک حکمت تھی اور وہ یہ کہ باہر کی

---

[۳۵] کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۱ صفحہ ۷۱۶

جماعتیں تھوڑی تھیں احباب بیرون جات سے یہیں آتے تھے۔ اس لئے ریل کے وقت کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ ریل تو کسی کے اختیار میں نہیں تھی۔ اور نو یا ساڑھے نو بجے بٹالہ میں ریل سے اُتر کر یہاں پہنچ جاتے تھے اور اس صورت میں انتظار جائز ہے۔ اور اگر ضرورت ہو تو زوال تک بھی انتظار ہو سکتا ہے۔ لیکن اب یہ حالت نہیں۔ ہر جگہ ہماری جماعتیں کافی تعداد میں ہو گئی ہیں اس طرح انتظار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اب اگر ہو گا تو محض سُستی سے ایسا کیا جائے گا۔ چونکہ اتباع سنت ہمارا فرض ہے اس لئے عید کی نمازیں مطابق سنت ہونی چاہئیں۔ اور اس عید میں جلدی کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ لوگوں نے قربانی کرنی ہوتی ہے۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے کہ قربانی کے گوشت سے کھانا کھاتے تھے[۵۵]۔ اب اگر اس وقت نماز پڑھی جائیگی تو قربانی کا گوشت کھانے کے وقت تک تیار نہیں ہو سکتا۔

قربانی کے جانور کے لئے یہ شرط ہے کہ بکرے وغیرہ دو دل کے ہوں۔ دُنبہ اس سے چھوٹا بھی قربانی میں دیا جا سکتا ہے۔ قربانی کے جانور میں نقص نہیں ہونا چاہئیے۔ لنگڑا نہ ہو۔ بیمار نہ ہو۔ سینگ ٹوٹا نہ ہو یعنی سینگ بالکل ہی ٹوٹ نہ گیا ہو۔ اگر خول اوپر سے اُتر گیا ہو اور اس کا مغز سلامت ہو تو وہ ہو سکتا ہے۔ کان کٹا نہ ہو لیکن اگر کان زیادہ کٹا ہوا نہ ہو تو جائز ہے[۵۶]۔

قربانی آج اور کل اور پرسوں کے دن ہو سکتی ہے[۵۷]۔ لیکن اگر سفر ہو یا کوئی اور مشکل ہو تو حضرت صاحبؑ کا بھی اور بعض اور بزرگوں کا بھی خیال ہے کہ اس سارے مہینہ میں قربانی ہو سکتی ہے[۵۸]۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپؐ ان دنوں میں تیسرے دن تک تکبیر تحمید کیا کرتے تھے[۵۹] اور اس کے مختلف کلمات ہیں۔ اصل غرض تکبیر و تحمید ہے خواہ کسی طرح ہو۔ اور اس کے متعلق دستور تھا کہ جب مسلمانوں کی جماعتیں ایک دوسری سے ملتی تھیں تو تکبیریں کہتی تھیں مسلمان جب ایک دوسرے کو دیکھتے تو تکبیر کہتے۔ اُٹھتے بیٹھتے تکبیر کہتے کام میں لگتے تو تکبیر کہتے[۶۰]۔ لیکن ہمارے ملک میں جو یہ رائج ہے کہ محض نماز کے بعد کہتے ہیں اس خاص صورت میں کوئی ثابت نہیں اور یہ غلط رائج ہو گیا ہے باقی یہ کہ تکبیر کس طرح ہو یہ بات انسان کی اپنی حالت پر منحصر ہے جس کا دل زور سے تکبیر کہنے کو چاہے وہ زور سے کہے جس کا آہستہ وہ آہستہ مگر آواز نکلنی چاہئیے۔

قربانیوں کے گوشت کے متعلق یہ ہے کہ یہ صدقہ نہیں ہوتا۔ چاہئیے کہ خود کھائیں۔ دوستوں کو دیں چاہے تو سکھا بھی لیں[۶۱]۔ امیر غریبوں کو دیں۔ غریب امیروں کو کہ اس سے محبت بڑھتی ہے لیکن محض امیروں کو دینا اسلام کو قطع کرنا ہے اور محض غریبوں کو دینا اور امیروں کو نہ دینا اسلام میں درست نہیں۔ امیروں کے غریبوں اور غریبوں کے امیروں کو دینے سے محبت بڑھتی ہے۔ اور

مذہب کی غرض جو محبت پھیلانا ہے پوری ہوتی ہے۔ پس چاہیئے کہ امیر غریبوں کو دیں اور غریب امیروں کو تاکہ محبت بڑھے۔ بس یہی چند نصائح ہیں جو میں کرنی چاہتا ہوں۔

(الفضل ۷ اگست ۱۹۲۲ء صفحہ ۴-۳)

لہ۔ سنن نسائی کتاب صلوٰۃ العیدین باب قیام الامام متوکئاً علی انسان۔ نیل الاوطار ۱۸۱/۳

لہ۲۔ صحیح بخاری کتاب العیدین باب اذا لم یکن لھا جلباب فی العید

لہ۳۔ صحیح بخاری کتاب الجمعۃ باب الطیب للجمعۃ۔ نیل الاوطار ۱۲۵/۳

لہ۴۔ سُنن ابی داؤد کتاب المناسک باب الطیب عند الاحرام

لہ۵۔ جامع ترمذی ابواب الاضاحی باب ما جاء انّ الشاۃ الواحدۃ تجزی عن اھل البیت۔

لہ۶۔ صحیح مسلم کتاب الحج باب الاشتراک فی الھدی واجزاء البقرہ والبدنۃ کل منھما عن سبعۃ۔

لہ۷۔ سنن ابی داؤد کتاب المناسک باب فی ھدی البقر۔ نیل الاوطار ۱۰۹/۵ مطبوعہ مصر ۱۳۵۷ھ

لہ۸،۹۔ نیل الاوطار ۱۲۷/۳۔ فقہ احمدیہ حصہ اول صفحہ ۴۹ مطبوعہ مارچ ۱۹۲۴ء

لہ۱۰۔ السنن الکبریٰ امام بیہقی ۲۸۳/۳

لہ۱۱۔ جامع ترمذی ابواب الاضاحی باب مایکرہ من الاضاحی

لہ۱۲۔ مشکوٰۃ المصابیح باب فی الاضحیۃ۔ نیل الاوطار ۱۲۵/۵ مطبوعہ مصر ۱۳۵۷ھ

لہ۱۳۔ مشکوٰۃ المصابیح باب فی الاضحیۃ۔ نیل الاوطار ۱۲۵/۵ مطبوعہ مصر ۱۳۵۷ھ

لہ۱۴۔ صحیح بخاری کتاب العیدین باب فضل العمل فی ایام التشریق۔ السنن الکبریٰ امام بیہقی ۳۱۳/۳
تکبیر و تحمید کے الفاظ یہ ہیں۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَ لِلّٰہِ الْحَمْدُ۔

لہ۱۵۔ صحیح بخاری کتاب الاضاحی باب مایؤکل من لحوم الاضاحی ومایتزوّد۔

۱۱

(فرمودہ ۲۵ جولائی ۱۹۲۳ء بمقام مسجد نور* قادیان)

گو بوجہ نزلہ اور کھانسی میں بول نہیں سکتا تھا مگر میں نے مناسب سمجھا کہ چونکہ عید کا دن ہے اس لئے میں اپنی زبان سے ہی چند کلمات کہہ دوں۔ کیونکہ خطبہ کے لئے ضروری نہیں ہوتا کہ بہت لمبا ہی ہو بلکہ بعض دفعہ نہایت مختصر الفاظ میں خطبہ کر دیا جاتا رہا ہے۔ اور اسی سے فائدہ ہوتا رہا ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق بعض لوگوں نے لکھا ہے گو تاریخی طور پر مجھے معلوم نہیں مگر صوفیاء کہتے ہیں کہ خلافت کے پہلے دن جب آپ خطبہ پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو چند مسنون الفاظ پڑھکر بیٹھ گئے۔[1] صوفیاء کہتے ہیں۔ اس وقت ان کا اس طرح خموشش بیٹھ جانا ہی خطبہ تھا۔[2] گویا ان کی وہ جو خموشی تھی وہی خطبہ تھا۔ تو بعض اوقات خموشی بھی خطبہ ہو جاتی ہے اور اس کا اتنا اثر ہوتا ہے جو بڑے لیکچر کا نہیں ہوتا۔ دراصل خطبات کی بڑائی اور عظمت ان کی لمبائی کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اس اخلاص کی وجہ سے ہوتی ہے جس سے سُنانے والا سنائے اور سننے والا سُنے۔ اگر سُنانے والا اخلاص سے سُنائے اور سننے والا قبول کرنے کے لئے سُنے تو چھوٹی بات بھی بہت بڑا اثر کرتی ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو بڑے سے بڑا لیکچر بھی کچھ فائدہ نہیں دیتا۔

صوفیاء نے لکھا ہے ایک شخص تھا جو کئی قسم کی برائیوں اور بدکاریوں میں مبتلا تھا اسے بڑی نصیحتیں کی گئیں مگر وہ یہی کہے کہ نادان ہیں وہ لوگ جو دنیاوی چیزوں کو عیش و عشرت کے لئے استعمال نہیں کرتے۔ ایک دن وہ گلی میں سے گذر رہا تھا کہ ایک آدمی قرآن کریم پڑھ رہا تھا اس وقت اس کے کان میں یہ آیت پڑی۔ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ[3] کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ مومنوں کے قلوب ڈر جائیں۔ اس آیت کا یک لخت اس پر اثر ہوا اور اس نے اس کی حالت کو بدل ڈالا۔ تو لمبے لمبے وعظ، طول طویل لیکچر، اور عجیب عجیب نکتے، تو اس کے لئے کچھ بھی مفید نہ ہوئے۔ مگر ایک شخص جو اپنے طور پر آیت پڑھ رہا تھا اور ادھر سے یونہی گذر رہا تھا اس کا ایسا اثر ہوا کہ اس میں تاب مقاومت نہ رہی اور اس کی یک لخت اصلاح ہو گئی۔[4]

---

* نماز عید بوجہ بارش عیدگاہ کی بجائے مسجد نور میں ادا کی گئی۔ (الفضل ۲ اگست جولائی ۱۹۲۳ء)

پس جب سننے والے قبولیت کا مادہ لے کر بیٹھیں اور سنانے والا اخلاص سے سنائے تو یہ دونوں باتیں مل کر چھوٹی بات کو لمبی اور اہم بنا دیتی ہیں اور اگر یہ نہ ہوں تو لمبی بات بھی چھوٹی ہو جاتی ہے۔ اصل بات یہی ہے کہ انسان اخلاص کو لے کر اور دل کو صاف کر کے بیٹھے تو چھوٹی سے چھوٹی بات کا بھی بڑا اثر ہوتا ہے۔ دیکھئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چھوٹے چھوٹے فقروں نے صحابہؓ میں ایسے تغیرات پیدا کر دیئے کہ وہ ساری دنیا کے استاد بن گئے۔ مگر آج لوگ بڑی لمبی لمبی تقریریں اور لیکچر سنتے ہیں مگر کورے کے کورے ہوتے ہیں۔ وعظ اور لیکچر میں واہ وا اور سبحان اللہ کہتے ہیں مگر جب اُٹھتے ہیں تو ان کے دل اسی طرح صاف ہوتے ہیں جس طرح دھوبی میل نکال کر کپڑا صاف کر دیتا ہے۔ اور لمبے وعظوں اور خطبوں میں سوائے اس کے کہ لیکچرار کا زور اور وقت خرچ ہو اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

مَیں اس وقت دوستوں کو یہی نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر تم ترقی کرنا چاہتے ہو، اگر اپنی اصلاح کی فکر رکھتے ہو، اگر خدا تعالےٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو جو کچھ تمہیں سنایا جائے کان کھول کر سنو۔ منافقین کے متعلق آتا ہے۔ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں بیٹھتے مگر باہر جا کر ایک دوسرے سے پوچھتے کیا باتیں ہوئی ہیں؟ کیا وہ باتیں نہیں سنتے تھے؟ سنتے تھے مگر بہروں کی طرح اور دیکھتے تھے مگر اندھوں کی طرح۔ پس اگر کوئی خطبہ اور وعظ سنتا ہے مگر اس پر اثر نہیں ہوتا یا دائمی اثر نہیں ہوتا تو اس خطبہ اور وعظ سننے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ وقت ضائع کرنا ہے۔ تم اگر خدا کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو۔ اگر اسلام سے فیض حاصل کرنا چاہتے ہو، اگر روحانی ترقی کرنا چاہتے ہو تو میری اس نصیحت کو یاد رکھو کہ خدا تعالےٰ کی باتوں کو سننے کے لئے کان اور دل کھول کر بیٹھو۔ کیونکہ اگر کانوں اور دل پر پردہ ہو، تو خدا تعالےٰ اپنی باتیں نہیں سناتا اور اپنی ہتک سمجھتا ہے کہ وہ اپنی نعمت دے اور لینے والا دروازے بند کر کے بیٹھا ہو۔ دیکھو اگر کوئی کسی کو اعلےٰ درجہ کا کھانا دے مگر وہ اسے پھینک دے تو پھر نہیں دیتا۔ اسی طرح اگر خدا تعالےٰ کی طرف سے نعمت آئے اور انسان کا قلب بند ہو تو پھر نہیں دیتا۔

عید میں بھی ہمارے لئے ایسی ہی مثال ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کیا دوسروں سے زیادہ سنتے تھے پھر وہ کیا چیز تھی جس نے ان پر اثر کیا۔ اور انہیں ابراہیم بنا دیا۔ وہ یہی تھی قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ[۱] خدا تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو کہا مسلمان ہو جا۔ انہوں نے کہا۔ مَیں مسلمان ہو گیا۔ یہ کتنا چھوٹا سا فقرہ ہے۔ اور کیا اور لوگ یہ فقرہ نہیں سنتے۔ یہ فقرہ بھی اور اس سے لاکھوں کروڑوں بڑھ کر بھی سنتے ہیں، پڑھتے ہیں یعنی سارا

قرآن کریم پڑھتے ہیں مگر پھر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کیا اس کے غلاموں جیسے بھی نہیں بنتے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے غلاموں کا تو بڑا درجہ ہے مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے غلاموں جیسے بھی نہیں بنتے۔ اسی فقرہ سے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا تعالےٰ نے یہ فرمایا کہ جاؤ ہم نے تمہیں لوگوں کا امام بنا دیا۔ مگر اوروں پر ایسا اثر نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محض حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل کا اثر اور کیفیت تھی جس نے اس فقرہ سے ایسا اثر قبول کیا کہ آپ ابراہیم بن گئے اور ایسا درجہ اور رتبہ ملا کہ نہ صرف خود نبی بنے بلکہ نبیوں کے باپ بن گئے حتیٰ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی احسان کے طور پر آپؑ ہی کی نسل سے ہوئے اور بیٹا خواہ کتنا بڑا ہو جائے باپ کا ادب ہی کرتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان بہت ہی اعلیٰ اور ارفع ہے مگر آپؐ نے یہی سکھایا کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبودیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بڑھ کر تھے۔ مگر اس لحاظ سے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آپ کے باپ تھے یہ ادب ملحوظ رکھا تو خدا تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہ درجہ دیا کہ سب نبیوں کا باپ بنا دیا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کی نسل سے ہوئے اور حضرت مسیح موعودؑ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت سے۔

یہ عید کیا ہے اس فقرہ کی یاد ہے کہ خدا تعالےٰ نے کہا۔ اَسْلِمْ اپنے آپ کو میرے سپرد کر دے اور میرے لئے قربان کر دے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا اَسْلَمْتُ۔ مَیں نے اپنی جان آپ کے سپرد کر دی۔ اسی کی یاد میں یہ عید ہے۔ عملی نمونہ کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کہا گیا قربانی کے لئے بیٹا لاؤ اور انہوں نے وہ بھی پیش کر دیا۔ پھر آپ سے وطن کی قربانی مانگی۔ وُہ بھی آپ نے دے دی۔ غرض کہ ہر ایک پیاری سے پیاری چیز آپ نے خدا کے لئے قربان کر دی۔ اسی کی یادگار عید ہے۔

پس عید یادگار ہے اس امر کی کہ جو کوئی خدا کی بات کو سنتا اور اس طرح سنتا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بات کے لئے قلب کھول کر بیٹھتا ہے وہ گو مر جاتا ہے اور اس پر صدیاں گذر جاتی ہیں مگر خدا اسے مرنے نہیں دیتا۔ کیونکہ اس کی زندگی سے خدا تعالےٰ کا کلام زندہ رہتا ہے۔

یہ مختصر سی نصیحت ہے جو مَیں اس وقت کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے زیادہ مَیں اس وقت نہیں بول سکتا کیونکہ سینہ میں درد ہوتی ہے۔

دوسرا خطبہ پڑھتے ہوئے فرمایا:۔

مَیں اس خطبہ کے طریق کی طرف بھی توجہ دلاتا ہوں جس طرح عید لوٹ لوٹ کر آتی ہے اسی طرح

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبے بھی دو رکھے ہیں[۱۱]۔ اس سے بار بار وعظ اور خطبہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ دو دفعہ پڑھ کر تکرار رکھا ہے اور بتایا ہے کہ اگر تم تکرار کرو گے تو کامیاب ہو جاؤ گے اور اگر کوئی کام ایک بار کر کے چھوڑ دو گے تو اس کا اثر نہیں ہوگا۔

دیکھو مارڈ کیا میں؟ یہ بڑے بڑے اونچے چبوترے میں مگر پانی نے ان پر بہہ کر بڑی بڑی گہری غاریں بنا دی ہیں اور جب پانی جیسی نرم چیز بھی پتھر جیسی سخت چیز پر اتنا اثر کر سکتی ہے تو خدا تعالے کا کلام انسان کے دل میں کیوں نہ اپنی جگہ بنا لے گا اگر بار بار اس کا تکرار کیا جائیگا تو خطبہ کے تکرار سے بھی ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ نیک کام میں تکرار کرنا چاہیئے۔"

(الفضل ۳؍ اگست ۱۹۲۳ء صـ۵ تا ۶)

۱۔ کتاب الطبقات الکبیر لابن سعد قسم الاول ۔ جزء الثالث ص۳۴

۲۔ مثنوی مولنا رومؒ دفتر چہارم ص۴۳

۳۔ الحدید ۵۷ : ۱۷

۴۔ یہ حضرت فضیل بن عیاضؒ کا واقعہ ہے ۔ تذکرۃ الاولیاء شیخ فرید الدین عطار مترجمہ عبدالرحمٰن شوق مطبوعہ لاہور ص۸۱

۵۔ محمد ۴۷ : ۱۷

۶۔ البقرہ ۲ : ۱۳۲

۷۔ البقرہ ۲ : ۱۲۵

۸۔ صحیح بخاری کتاب الدعوات باب الصلوٰۃ علی النبی صلے اللہ علیہ وسلم

۹۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۳ تا ۱۰۶

۱۰۔ الانبیاء ۲۱ : ۷۲ ۔ العنکبوت ۲۹ : ۲۷

۱۱۔ جامع ترمذی ابواب الجمعۃ باب ماجاء فی الجلوس بین الخطبتین ۔

(۱۲)

(فرمودہ ۱۴؍ جولائی ۱۹۲۴ء بمقام نماڑ ریلوے اسٹیشن)[1]

مَیں اس وقت اس بات کی نصیحت آپ لوگوں کو کرنی چاہتا ہوں کہ ہر کام کی تیاری اس کے موافق کرنی چاہیئے۔ چھوٹا سا سفر انسان اختیار کرتا ہے تو اس کے موافق تیاری کرتا ہے جس سفر کے واسطے ہم جا رہے ہیں۔[2] یہ سفر اپنے اغراض کے لحاظ سے بہت بڑا سفر ہے اس کی تیاری یہی ہے کہ اس کی کامیابی کے لئے دعائیں کی جائیں۔ مجاہدہ اور دعائیں ہی ہیں جو اس سفر کو کامیاب بنائیں گی۔ اس لئے سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ ذکر اللہ کرو اور دعاؤں سے کام لو۔ تا اللہ تعالیٰ ہم کو کامیاب کرے۔ اور اگر ہماری غفلت سے کامیابی میں کوئی روک ہو تو وقت اور روپیہ ضائع جائے گا۔ خدا تعالیٰ ہمارے اعمال کو ضائع ہونے سے بچائے۔ آمین۔

(الحکم ۲۱؍ جولائی ۱۹۲۴ء صفحہ ۷)

---

1. یہ خطبہ حضور رضی اللہ عنہ نے ۱۹۲۴ء میں پہلے سفر یورپ کے دوران دیا تھا۔ اس خطبہ کے متعلق حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی رضی اللہ عنہ ایڈیٹر الحکم جو اس سفر میں حضور کے ہمرکاب تھے رقمطراز ہیں "۱۴؍ جولائی ۱۹۲۴ء کو گیارہ بجے نماڑ (یہ بہت بڑا جنکشن ہے۔ یہاں سے سورت اور احمد آباد کی طرف گاڑی جاتی ہے) پہنچتے ہی نماز عید ہم نے حضرت کے ہمراہ سیکارم (اس سے مراد غالباً پلیٹ فارم ہے) پر ادا کی۔ اس تقریب پر آپ نے مختصر خطبہ پڑھا۔ (گاڑی کے کمرے میں آکر دعا کی۔ اگرچہ اس خطبہ میں حضرت نے اپنے خدام سفر کو خطاب فرمایا ہے مگر دراصل تمام جماعت اس کی مخاطب ہے۔" (الحکم ۲۱؍ جولائی ۱۹۲۴ء)

2. حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا پہلا سفر یورپ۔ ۱۲؍ جولائی تا ۲۴؍ نومبر ۱۹۲۴ء۔ (تاریخ احمدیت جلد ۵ صفحہ ۳۹۰ تا ۴۴۴)

(۱۳)

(فرمودہ ۲ جولائی ۱۹۲۵ء بمقام باغ حضرت مسیح موعود قادیان)

"آج کا دن ہمارے لئے جہاں اور بہت سے سبق پیش کرتا ہے وہاں اس دن آئندہ نسلوں کے متعلق بھی عظیم الشان سبق ہے۔ اگر اس عید کے سبق کو ہماری جماعت یا کوئی جماعت بھی پوری طرح یاد رکھے، تو وہ کبھی تباہ اور برباد نہیں ہو سکتی۔ درحقیقت تباہی کا موجب یہ امر ہوتا ہے کہ کوئی شخص یا کوئی جماعت اپنی عزت کو، اپنے وقار کو، اپنی روحانیت کو قائم رکھنے کے لئے کوئی اپنا قائم مقام نہیں چھوڑتی۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں دنیا کی ہر ایک چیز تباہ ہو رہی ہے اور اگر کسی جنس کے افراد اپنی تباہی کے بعد کوئی اپنا قائم مقام نہ چھوڑیں تو اس جنس کا دنیا سے بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے۔

ہر ایک چیز ایک حد تک پہنچ کر پھر اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ اس کا قیام اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے قائم مقام چھوڑ کر اپنی جنس کو قائم رکھے۔ انسان مرتے ہیں۔ اگر وہ اپنی اولاد کو اپنا قائم مقام نہ چھوڑ جائیں تو آئندہ انسانی نسل کا دنیا سے خاتمہ ہو جائے۔ درخت اُگتے ہیں، پھل لاتے ہیں، پھر سوکھ جاتے ہیں۔ اگر نئے درخت ان کی جگہ نہ لیں اور ان کے قائم مقام نہ بنیں تو ان درختوں کا بالکل وجود ہی مٹ جائے۔ غرض ہر ایک چیز ہم دیکھتے ہیں کہ تباہ ہو رہی ہے۔ اور وہ اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتی جب تک کہ وہ اپنا قائم مقام نہ چھوڑ جائے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ بغیر اپنا قائم مقام چھوڑے موجودہ حالت کے ساتھ دنیا میں قائم رہ سکتا ہے تو یہ ایک غلط خیال ہوگا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے جب آپ اپنے اس وجود کے ساتھ دنیا میں نہیں رہے اور تریسٹھ سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی تو اور کون شخص کہہ سکتا ہے کہ میں موجودہ حالت کے ساتھ اپنے وجود میں قائم رہ سکتا ہوں۔ لوگوں نے حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو انیس سو سال سے آسمان پر زندہ سمجھ رکھا تھا۔ مگر ان کے متعلق بھی اس زمانہ کے مرسل اور مامور نے ثابت کر دیا کہ فوت ہو چکے ہیں زندہ نہیں۔ پس اگر انبیاء بھی اپنے قائم مقاموں کے بغیر اپنے سلسلہ کو قائم نہیں رکھ سکتے تو پھر ہم اپنے قائم مقاموں کے بغیر اپنی جماعت کو کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہو کہ موجودہ حالت کے ساتھ ہی انسان یا کوئی دوسرا وجود دنیا میں قائم رہ سکتا ہے تو پھر اس بات کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے کہ ایک انسان مرے

اور اس کا بچہ اس کا قائم مقام ہو یا ایک درخت تباہ ہو اور دوسرا درخت اس کا قائم مقام قرار پائے۔ یہ اسی لئے ہوتا ہے کہ کوئی وجود ہمیشہ کے لئے قائم نہیں رہ سکتا۔ اور ہر ایک نوع کا قیام اس کی جنس کے قیام کے ساتھ وابستہ ہے۔ آم کا درخت فنا ہوتا ہے مگر چونکہ اس کے قائم مقام اور آم کے درخت پیدا ہو جاتے ہیں اس لئے وہ اپنی نوع میں فنا نہیں ہوتا۔ اسی طرح سنگترہ کی جگہ سنگترہ گیہوں کی جگہ گیہوں، چاولوں کی جگہ چاول پیدا ہو جاتے ہیں اور اس طرح ان کا وجود دنیا میں قائم رہتا ہے کیونکہ جب جنس قائم رہتی ہے تو گویا وجود ہی قائم رہتا ہے۔

کسی استاد کے مرنے پر اس کے لائق اور ہوشیار شاگرد کی موجودگی میں کہا جاتا ہے کہ جس استاد کا ایسا لائق اور ہوشیار شاگرد موجود ہو وہ نہیں مرا۔ اسی طرح جو جماعت کہ دین اور رُوحانیت کی حامل ہو اگر اپنے پیچھے ایسی نسلیں چھوڑ جائے جو دین کی اور رُوحانیت کی حامل ہو۔ تو وہ جماعت بھی زندہ جماعت ہوتی ہے اور ایسی جماعت یا قوم کبھی نہیں مرتی۔

پس اگر ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اور احمدیت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف یہی طریق ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کو عید کے اس دن سے جو سبق حاصل ہوتا ہے وہ یاد کرائیں اس عید سے جو ہمیں سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عید ہمیں ایک پرانا واقعہ یاد دلاتی ہے جو ابوالانبیاء حضرت ابراھیم علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ وہ واقعہ ہمیں یہ سبق سکھاتا ہے کہ ہماری جماعت کس طرح قائم رہ سکتی ہے اور ہماری آئندہ نسلیں کس طرح ترقی کر سکتی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام کو خدا تعالےٰ نے رؤیا اور الہام میں یہ حکم دیا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو ذبح کر دیا اور جُدائی کی چھری اس کی گردن پر پھیر دی۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کے حکم کے مطابق انہوں نے اپنی بیوی اور بچے کو ایسے جنگل بیابان میں چھوڑ دیا جہاں نہ غلہ تھا نہ پانی۔ نہ کوئی بازار تھا نہ آبادی کہ کسی آدمی سے مانگ کر ہی کچھ کھانے پینے کو میسّر آ سکتا۔ یعنی حضرت ابراھیم علیہ السلام خدا تعالےٰ سے الہام پا کر اپنے بچے اور اس کی ماں کو مکّہ مکرمہ کی زمین میں جو اس وقت بالکل غیرآباد وادی تھی صرف ایک مشکیزہ پانی کا اور ایک تھیلی کھجوروں کی دے کر چھوڑ آئے[۳۴] جب آپ واپس آنے لگے تو حضرت ہاجرہ نے پوچھا آپ کہاں چلے ہیں۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام وفورِ غم کی وجہ سے کوئی جواب نہ دے سکے۔ حضرت ہاجرہ نے پھر دریافت کیا اس جنگل میں آپ ہمیں کہاں چھوڑ چلے ہیں لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام زبان سے پھر بھی کچھ جواب نہ دے سکے۔ آخر ان کے متواتر پوچھنے پر اشارہ سے انہوں نے یہ جواب دیا کہ خدا کے حکم سے مَیں تم کو یہاں چھوڑ چلا ہوں۔ تب حضرت ہاجرہ نے کہا کہ اگر خدا کے حکم سے آپ ہمیں یہاں چھوڑ چلے ہیں تو پھر ہمیں آپ کی حفاظت کی ضرورت

نہیں۔ آپ بے شک جائیں۔ خدا خود ہماری حفاظت کرے گا اور وُہ ہم کو ضائع نہیں ہونے دیگا اور تسلی سے واپس آگئیں۔ اور اپنے بچے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے پاس جو اس وقت چھ سات برس کی عمر سے زیادہ کے نہ تھے بیٹھ گئیں۔ اس وقت اگر وہ چاہتیں تو کسی آبادی کی طرف رُخ کر لیتیں مگر انہوں نے خدا تعالےٰ کے حکم کا احترام کیا اور اسی کے توکل اور بھروسہ پر اس جنگل بیابان کی رہائش منظور کر لی جہاں نہ کوئی آبادی تھی نہ بازار، نہ کوئی کنواں تھا نہ تالاب۔ آخر پانی کا ایک مشکیزہ اور کھجوروں کی ایک تھیلی کیا ہوتی ہے۔ تھوڑے عرصہ میں پانی بھی ختم ہوگیا اور کھجوریں بھی ختم ہوگئیں۔ حضرت ہاجرہ کو بھی گو تکلیف تھی مگر بچے کی تکلیف کو دیکھکر وہ بہت بے قرار ہوگئیں اور صفا اور مروہ دونوں پہاڑیوں پر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دَوڑنا اور اوپر چڑھکر دیکھنا شروع کیا تا شاید کوئی آتا جاتا قافلہ ہی نظر آجائے جس سے پانی لے کر بچے کو پلائیں اور خود بھی پئیں۔ جب وہ صفا پر یا مَروہ پر چڑھتیں تو ساتھ ہی چلّا کر ہر دفعہ یہ بھی کہتیں کہ کوئی خدا کا بندہ ہے جو ہمیں پانی دے؟ اور ساتھ ہی بچے کی حالت کو دیکھکر اور بھی پریشان ہو جاتیں۔ جب ان کی گھبراہٹ انتہا کو پہنچ گئی تو خدا کے فرشتے نے ان کو بشارت دی کہ اے ہاجرہ! گھبرا نہیں۔ جا تیرے بچے کا سامان خدا نے کر دیا ہے۔ چنانچہ جب وہ بچے کے پاس آئیں تو دیکھا کہ خدا نے وہاں پانی کا چشمہ پیدا کر دیا ہے جو آجتک قائم ہے اور زمزم کہلاتا ہے انہوں نے بچے کو پانی پلایا اور خود بھی پیا۔ آہستہ آہستہ وہاں آبادی ہوگئی۔ کوئی قافلے والے جو وہاں سے گذرے تو انہوں نے تجارتی ترقی کے لئے یہ مناسب سمجھا کہ اس چشمے پر پڑاؤ قائم کیا جائے جہاں قافلے آکر ٹھہرا کریں۔ چنانچہ اسی خیال سے وہ اپنے کچھ آدمی اس چشمہ پر چھوڑ گئے کہ اس سے ہماری تجارت میں ترقی ہوگی۔ آخر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعاؤں کے نتیجہ میں وہاں بہت بڑی آبادی ہوگئی۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا تعالےٰ کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور اس تعلق اور محبت کی کچھ پرواہ نہ کی جو اُن کو اپنے بچے سے تھی۔ کیونکہ طبعی طور پر بڑھاپے میں جا کر جو اولاد ہوتی ہے اس سے انسان کو بہت محبت ہوتی ہے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بڑھاپے میں آپ کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں ان کی نہایت گہری اور شدید محبت تھی مگر خدا کے لئے انہوں نے اس کو قربان کر دیا۔ تب اللہ تعالےٰ کی طرف سے ان کو الہام ہوا کہ اے ابراہیم! آسمان کی طرف دیکھ۔ کیا تو آسمان کے ان ستاروں کو گن سکتا ہے۔ انہوں نے عرض کیا۔ یہ میری طاقت سے باہر ہے کہ مَیں آسمان کے ستاروں کو گن سکوں تب خدا نے فرمایا۔ اے ابراہیم! مَیں نے تیری قربانی کو دیکھا۔ اب مَیں تیری اس قربانی کے بدلے

تیری اولاد کو اس قدر بڑھاؤں گا کہ جس طرح آسمان کے ستاروں کو کوئی گن نہیں سکتا۔ اسی طرح تیری اولاد کو بھی کوئی گن نہیں سکے گا۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں اس وعدہ الٰہی کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو اتنی کثرت حاصل ہوئی ہے کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کونسی قوم ان کی اولاد میں سے نہیں۔ تمام دنیا کے لوگوں میں ان کا خون مل گیا ہے اور تمام دنیا ان کی ممنون ہے۔ سینکڑوں قومیں ہیں جو ان کی اولاد میں سے ہونے کی مدعی ہیں۔ زرتشتی ہیں تو وہ اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہودیوں کا تو دعویٰ ہی ہے کہ وہ ان کی اولاد میں سے ہیں۔ عیسائی بھی انہی کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں۔ اور مسلمان بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آپ کی نسل میں سے ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ خدا تعالےٰ نے ان کی اس قربانی کے بدلے ان کی اولاد کو تعداد کے لحاظ سے اور عزت کے لحاظ سے اس قدر بڑھایا کہ تمام بڑے بڑے مذاہب انہی کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں اور ان کی بہت بڑی عزت کرتے ہیں۔ اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اگر کوئی اپنی اولاد کو بڑھانا چاہے تو وہ بچپن میں اپنی اولاد کو اسی طرح قربان کرے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بچے کو قربان کیا! صرف انہوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ہی قربانی نہیں کی بلکہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی بھی قربانی کی جن کی ایسی تربیت کی کہ بڑے ہو کر وہ بھی خدا تعالیٰ کے نبی ہوئے اور یہ صاف بات ہے کہ جتنا بڑا کوئی انسان بنتا ہے اتنی ہی زیادہ اسے اس مرتبہ تک پہنچنے کے لئے قربانی کرنی پڑتی ہے۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دونوں بیٹوں کے متعلق قربانی کی۔ خدا تعالےٰ نے اس قربانی کے بدلے ان کی اولاد کو بے نظیر ترقی دی۔ اگر تم بھی چاہتے ہو کہ تمہاری اولاد ترقی کرے تو تم بھی اپنی اولاد کو قربان کرو۔ اس سے ایسی محبت نہ کرو جو تم کو ان کی اصلاح اور علوم کے سکھانے سے باز رکھے اور تم ان کی نگرانی چھوڑ دو۔ اگر تمہیں یہ خواہش ہے کہ تمہاری نسل بڑھے اور ترقی کرے تو بجائے ان کے آرام اور آسائش کی فکر کے ان کی روحانی تربیت کرنی چاہیئے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد بھی اسی طرح ترقی کرے اور آسمان کے ستاروں کی طرح گنی نہ جائے تو اس کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ ہم اپنی اولاد کو بچپن میں آوارہ، آرام طلب، کاہل اور سست نہ بنائیں۔ بلکہ ان کے اعمال اور اخلاق کی پوری پوری نگرانی کریں۔

خیال کرو! حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی بچپن کی زندگی کس طرح گذری اور انہوں نے کس قدر مشقت اٹھائی۔ انہیں تو خوراک حاصل کرنے کیلئے بھی جنگلوں میں پھرنا اور شکار کر کے پیٹ پالنا پڑتا تھا۔ شکار بندھے ہوئے جانوروں کا تو کیا نہیں جاتا کہ گئے اور پکڑ کر لے آئے۔

آج کل جبکہ بندوقیں ہیں بہت دفعہ لوگ شکار کو جاتے ہیں۔ اور خالی ہاتھ واپس آجاتے ہیں لیکن اس زمانہ میں تو تیر اور نیزے کے ساتھ شکار کیا جاتا تھا۔ اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ کتنی دفعہ ان کو خالی ہاتھ واپس آنا پڑتا ہوگا اور کتنے فاقے کاٹتے ہوں گے۔ مگر یہ سب کچھ انہوں نے خدا کے لئے برداشت کیا۔ اور خدا نے ان کو نبوت کے مرتبے پر پہنچایا۔ انہی کی قربانیوں کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کی نسل میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جیسے اولوالعزم رسول پیدا ہوئے۔

پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی کتنی مشقت اٹھائی۔ ابھی آپؐ ماں کے پیٹ میں ہی تھے، آپؐ کے والد فوت ہوگئے۔ پھر ابھی اڑھائی سال کے تھے کہ والدہ کا سایہ بھی آپؐ کے سر سے اٹھ گیا۔ پھر دادا پرورش کرنے لگے۔ لیکن ابھی آپؐ سات ہی برس کے تھے کہ وہ بھی رحلت کر گئے۔ پھر چچا آپؐ کے متکفل ہوئے۔ غرض آپؐ کی یہ زندگی آرام سے نہیں گذری قسم قسم کی تکلیفوں اور مشقتوں میں سے آپؐ کا گذر ہوتا رہا۔ تاریخ میں لکھا ہے آپؐ کی چچی جس وقت بچوں میں کوئی چیز تقسیم کرنے لگتی تو سب بچے اس کے گرد جمع ہو جاتے۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم الگ کونے میں خاموش بیٹھے رہتے جب سب بچے لے چکتے تو پھر وہ ان کو بھی حصہ دیتیں۔ گو وہ محبت سے آپؐ کی پرورش کرتی تھیں اور آپ کو عزیز رکھتی تھیں۔ مگر جو خوشی بچے کو اپنے گھر میں ہو سکتی ہے وہ دوسری جگہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جو تعلق بچے کو اپنے ماں باپ سے ہوتا ہے اور جو ناز وہ ان پر کرتا ہے۔ خواہ دوسرا کتنی بھی محبت کرے بچہ اس سے نہیں کر سکتا۔ بے شک یہ بات بھی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے وقار کی وجہ سے خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ مگر یہ بات بھی تو ہے کہ آپؐ اس بات کو بھی طبعًا محسوس کرتے تھے کہ ان کا رشتہ وہ رشتہ نہیں جو ماں باپ کا ہوتا ہے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کو بھی خدا تعالیٰ نے بامشقت بنانے کے لئے اس قسم کے سامان پیدا کر دیئے جن میں سے آپؐ کو گذرنا پڑا۔

مَیں اپنی زندگی پر ہی غور کرتا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ جو اب غیر مبائع ہوگئے ہیں۔ میرے لئے رحمت کا موجب بن گئے۔ اگر یہ لوگ میرے خلاف نہ اٹھتے اور ہمارے خاندان کو بُرا بھلا نہ کہتے تو میری توجہ روحانی امور کی طرف اتنی چھوٹی عمر میں نہ پھرتی۔ تو ان کا وجود بھی میرے لئے روحانی ترقی کا سامان بن گیا۔

مَیں اپنی جماعت کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ اور اس عید سے سبق سیکھے۔ اگر آپ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ کو ہمیشہ سکھ حاصل ہو۔ اور آپ کے مرنے کے بعد بھی آپ کی عیدیں ختم نہ ہوں تو آپ اپنے بچوں کو قربان کریں۔ اور ان کو دنیا کی ہر قسم کی مشقت برداشت کرنے کی عادت ڈالیں۔ تاکہ وہ دین اور اسلام کے جھنڈے کو بلند کرنے کے لئے کسی

تکلیف اور مشقت سے خوف نہ کھائیں۔ اگر اس عید سے آپ لوگ یہ سبق سیکھ لیں تو آپ کے مرنے کے بعد بھی آپ کی عیدیں ختم نہ ہوں گی۔

مجھے افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ اس معاملہ میں ہماری آئندہ نسل میں بہت بڑی کمزوری پائی جاتی ہے اور مجھے افسوس ہے کہ بعض افراد کے دل میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہے۔ بچوں کی بڑے ہو کر خود بخود اصلاح ہو جائے گی۔ ان کا بچہ اگر کوئی غلطی کرتا ہے۔ تو وہ کہہ دیتے ہیں۔ خیر بچہ ہے بڑا ہو کر سمجھ جائے گا۔ یہ ایک ایسا ناقص اور پاجی خیال ہے کہ اس سے بڑھکر اور کوئی غلط خیال نہیں ہو سکتا اور پھر یہ خیال ان کے دل میں ایسی جڑھ پکڑ گیا ہے کہ نکلنے میں نہیں آتا۔ مَیں پوچھتا ہوں کیا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر ہمیں اپنی اولاد پیاری ہو سکتی ہے۔ آپ کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ اور یہ ایک طبعی امر ہے کہ جب کسی کی اپنی نرینہ اولاد نہ ہو تو اس کو اپنے نواسوں سے بہت محبت ہوتی ہے۔ پس ایک تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ اس لئے طبعًا آپؐ کو اپنے نواسے بہت پیارے تھے۔ دوسرے اس لئے بھی کہ وہ، حضرت فاطمہؓ کے بطن سے تھے جو آپؐ کو بہت پیاری تھیں پھر اس لئے بھی کہ وہ حضرت علیؓ کے بچے تھے جو آپؐ کو بہت عزیز تھے۔ کیا بلحاظ اس کے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بچپن کے زمانہ میں جبکہ قریبی سے قریبی رشتہ داروں نے بھی آپؐ کا ساتھ دینے کی جرأت نہ کی، آپؐ کا ساتھ دیا تھا۔ اور کیا بلحاظ اس کے کہ حضرت علیؓ کے والد ابو طالب نے آپؐ سے عمدہ سلوک کیا تھا۔

شروع شروع میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تمام رشتہ داروں کو جمع کیا اور فرمایا۔ مجھے خدا نے مامور بنایا ہے اور دنیا کی اصلاح کے لئے اس نے مجھے چُنا ہے۔ تم میں سے کون ہے جو اس بوجھ کو اٹھانے میں میرے ساتھ شامل ہو۔ اگرچہ کئی رشتہ دار آپؐ کو سچا یقین کرتے تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جھوٹ نہیں بولتے مگر کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ آپ کا ساتھ دینے کی حامی بھر سکے۔ آپؐ کے کئی چچے تھے جو آپؐ کو سچا اور راستباز یقین کرتے تھے مگر ان مشکلات اور مخالفتوں کی وجہ سے جو آپؐ کا ساتھ دینے میں پیش آنیوالی تھیں خاموش رہے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ جن کی عمر اس وقت گیارہ برس کی تھی وہ آگے بڑھے اور انہوں نے کہا۔ مَیں آپؐ کی مدد کروں گا۔ تو ایسے وقت میں ان کی یہ جرأت اور یہ دلیری خود اپنی ذات میں ایسی چیز تھی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل میں ان کی محبت کے جذبات پیدا کرتی اور انہیں عزیز بناتی تھی۔

علاوہ اس کے وہ ابو طالب کے لڑکے تھے اور ابو طالب وہ تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی ہر طرح سے خدمت کی اور آپ کو آرام پہنچانے میں ہر طرح کی کوشش اور سعی کی۔ یہ اور بات ہے کہ خواہ کوئی کتنی ہی محبت کرے اور آرام پہنچانے کی کوشش کرے، بچہ وہ آرام اور لذت حاصل نہیں کر سکتا جو ماں باپ کی محبت اور سلوک سے حاصل کرتا ہے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ابو طالب نے اتنے لمبے عرصہ تک آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کی ہے کہ کوئی بڑا ہی وفادار دوست اتنے لمبے عرصہ تک تکلیفوں میں ساتھ دے سکتا ہے۔ اگرچہ وہ آپؐ پر ایمان نہ لائے مگر کفار کے بائیکاٹ کے تین سال بھوکوں اور فاقوں میں کاٹنے انہوں نے منظور کئے مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ایک دفعہ قوم کے لوگوں نے ان سے آکر کہا کہ ہم تم کو بہتر سے بہتر نوجوان دیتے ہیں اس کو تم پال لو مگر اپنے اس بھتیجے کا ساتھ چھوڑ دو جس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ او نادانو! کیا تمہاری یہ مرضی ہے کہ اپنے بچے کو تو میں دشمنوں کے آگے ڈال دوں اور تمہارے بچے لے کر پالوں۔ پس بوجہ اس کے کہ حضرت علیؓ ابو طالب جیسے محسن چچا کے بیٹے تھے آپؐ کو وہ بہت عزیز تھے۔ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محض اس لئے ہی اپنے نواسوں سے محبت نہ تھی کہ وہ آپ کے نواسے تھے بلکہ اس لئے بھی آپؐ کو ان سے بہت زیادہ محبت تھی کہ وہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے بیٹے تھے۔

مگر باوجود اس محبت کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ خیال نہ فرمایا کہ انہیں بچپن میں آداب سکھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ جب بڑے ہوں گے تو خود ان کی اصلاح ہو جائیگی بلکہ بچپن میں اس بات کا خیال رکھا چنانچہ ایک دفعہ آپؐ کے پاس صدقے کی کچھ کھجوریں آئیں۔ ان میں سے ایک کھجور امام حسینؓ نے اٹھا کر منہ میں ڈال لی۔ آپؐ نے یہ دیکھ کر خاموشی اختیار نہ کی اور صرف اتنا ہی نہ کیا کہ کھجور ان کے منہ سے نکلوا دی۔ بلکہ ان کے منہ میں انگلی ڈال کر کھجور کے چھوٹے چھوٹے ذرات بھی نکال دیئے۔ میں سمجھتا ہوں آج اگر کوئی شخص ایسا معاملہ اپنے بچے سے کرے تو کئی لوگ ہوں گے جو کہدیں گے۔ جی بچہ تھا۔ ایک کھجور منہ میں ڈال لی تو کیا حرج ہو گیا۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے نواسے کے منہ میں انگلی ڈال کر کھجور کے ذرے نکالے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؓ روتے اور ضد کرتے ہوں گے۔ مگر آپؐ نے اس کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے ان کے منہ میں انگلی ڈال کر کھجور کے ذرات تک نکال ڈالے۔ اور یہ تھپڑ مارنے سے کم نہیں ہے۔ پھر ان کی اسی عمر کا دفعہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آگے سے کھانا نہیں کھا رہے تھے۔ جس پر آپؐ نے فرمایا۔ اپنے آگے سے لو اور داہنے ہاتھ سے کھاؤ۔ کُلْ بِيَمِيْنِكَ وَ مِمَّا يَلِيْكَ یہ اڑھائی برس کی عمر کی تربیت کا واقعہ ہے۔ جس سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ کس عمر سے بچے کی تربیت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اڑھائی برس کی عمر میں اپنے نواسے کی تربیت کی ہے اور اس کی حرکات کی نگرانی کی ہے تو کیا ہمارے زرالے بچے ہیں کہ ان کی نگرانی نہ کی جائے اور یہ کہکر چھوڑ دیا جائے کہ بچہ ہے ناسمجھ ہے بڑا ہوکر سمجھ جائے گا۔ اگر یہ عمر سمجھنے کی نہ ہوتی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی اپنے نواسے کے متعلق ایسا ہی کہہ دیتے۔ مگر آپؐ نے اس کو لوکا اور اس کی حرکت کو نظر انداز نہیں کیا۔

یہ کہہ دینے کے (کہ بچہ بڑا ہوکر خود سمجھ جائے گا) یہ معنے ہیں کہ اس بہانہ سے ہم اپنی اولاد کی تربیت اور اس کے اخلاق کی نگرانی نہیں کرنا چاہتے۔ اور اس بات کو اپنی بے جا محبت کی وجہ سے اس کے لئے تکلیف دہ خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ دنیا کی کوئی قوم بھی اگر اپنی اولاد کی تربیت اور اخلاق کی درستی کا خیال نہیں رکھتی تو وہ کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ یورپ کے لوگوں نے اس گر کو خوب سمجھا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر ہم اولاد کی تربیت اور اخلاق کی نگرانی نہ کریں گے تو ہماری قومی زندگی اور قومی ترقی بحال نہیں رہ سکتی۔ ان کے چھوٹے بچے ماؤں کے ساتھ گرجوں میں جاتے ہیں لیکن کیا مجال کہ وہ وہاں اونچی آواز نکالیں۔ عبادت گاہوں کا ایسا احترام ان کے دلوں میں بٹھایا ہوتا ہے کہ وہ ذرا شور و غل نہیں کرتے۔ اور اگر کوئی بچہ شور کرے تو ماں باپ فوراً اسے وہاں سے لے جاتے اور اس طرح تنبیہہ کرتے ہیں کہ پھر وہ شور نہ کرے۔ مگر یہاں کئی لوگ ہیں جو بچوں کو مسجدوں میں لے آتے ہیں اور بچے دوران نماز شور مچاتے رہتے ہیں۔ مسجد مبارک میں تو بچوں کو لانے سے مَیں نے روکا ہوا ہے۔ دارالفضل کی مسجد میں جب ایسے لوگوں کو منع کیا گیا تو انہوں نے بُرا منایا اور کہدیا کہ وہ بچے ہیں بڑے ہوکر خود سمجھ جائینگے مگر یہ تربیت اولاد کے لئے نہایت مضرات ہے۔

آپ لوگ اپنے ارد گرد اور آس پاس کی قوموں کو دیکھیں کہ وہ اپنی زندگی قائم رکھنے کے لئے اپنی اولاد کی تربیت کا کس قدر خیال رکھتے ہیں۔ یورپ میں مَیں نے دیکھا جو لوگ ہمیں ملنے کے لئے آتے۔ ان کے بچے بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ لیکن ذرا کسی بچے نے رونی صورت بنائی اور وہ گھبرا گئے۔ ذرا دیکھا کہ بچہ گھبرا گیا ہے اور رونے یا آواز نکالنے لگا ہے تو وہ جھٹ اس کو مجلس سے اُٹھا کر لے جاتے۔ بعض دفعہ ہم نے کہا بھی کوئی حرج نہیں ٹھہریں۔ مگر انہوں نے کہا۔ بچہ آواز نکالے گا جس سے دوسرے بُرا منائیں گے اور ان کو تکلیف ہو گی۔ ایک دفعہ ہم چھتری دیکھنے کے لئے گئے جو ہندوستانی سپاہیوں کی یادگار میں وہاں بنائی گئی تھی۔ سمندر کے کنارے چار پانچ ہزار آدمی جمع تھے۔ اور ہزار بارہ سو لڑکے لڑکیاں ہوں گے مگر بالکل خموشی کا عالم تھا۔ کوئی بات بھی کرتا تو آہستہ سے۔ لیکن ہمارے ہاں معمولی اجتماع میں بھی ایک شور برپا

ہوتا ہے۔ آج ہی دیکھ لو۔ اس اجتماع کے موقعہ پر کس قدر شور ہو رہا ہے۔ ادھر میرا خطبہ ہو رہا ہے اُدھران بچوں کے خطبے ہو رہے ہیں۔ حالانکہ ان کے ماں باپ بھی یہاں موجود ہیں۔ مگر ان کو اس بات کا کوئی خیال نہیں تو یہ تربیت میں غفلت اور کوتاھی کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ خطبہ سے پہلے میں نے کہا بھی تھا کہ جو مائیں اپنے بچوں کو چپ نہیں کرا سکتیں وہ اپنے بچوں کو لیکر چلی جائیں تا دوسرے لوگ آرام سے خطبہ سُن سکیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ مساجد میں بچوں کو نماز کے لئے لے جاؤ تو پیچھے کھڑا کرو۔ مگر بعض ماں باپ خود انگلی پکڑ کر بچے کو اپنے ساتھ صف میں کھڑا کر لیتے ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس حکم کی وجہ یہی ہے کہ آخر بچہ بچہ ہی ہے وہ بے چینی اور گھبراہٹ اور بچپن کی حرکات کا اظہار کرے گا اور اس طرح بڑوں کی نماز میں بدمزگی اور خلل واقعہ ہوگا۔ پھر اس حکم کا یہ فائدہ بھی ہے کہ ان کے اندر تربیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ ابھی ہم سیکھ رہے ہیں۔ اور جب تک سیکھ نہ لیں ہمارا حق نہیں کہ آگے کھڑے ہوں۔

پس جب تک بچپن میں تربیت کامل نہ ہو آئندہ نسل اخلاق فاضلہ نہیں سیکھ سکتی اور نہ وہ دین اسلام اور احمدیت کے حامل ہو سکتے ہیں۔ بچوں کو بچپن میں ہی خدا کے متعلق، رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق، حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلیفۂ وقت کے متعلق کچھ کچھ واقفیت کرانی چاہیئے۔ سلسلہ کے نظام کا مختصر سا نقشہ ان کے ذہنوں میں قائم کرنا چاہیئے۔ یہ مت سمجھو کہ بچے سمجھتے نہیں۔ وہ بات کو خوب سمجھتے ہیں۔ پچھلے دنوں ہم دریا پر گئے۔ ایک مہمان عورت کی لڑکی میرے پاس آئی۔ اس کی باتیں بہت پیاری معلوم دیتی تھیں۔ اور بعض دفعہ بہت سنجیدگی سے وہ باتیں کرتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ——— تم کس کی بندی ہو؟ کہنے لگی میں خدا کی بندی ہوں۔ پھر میں نے پوچھا۔ مرید کس کی ہو؟ جواب دیا خدا کی۔ میری لڑکی امتہ العزیز یہ سُنکر ہنس پڑی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ تم کیوں ہنسی ہو۔ کہنے لگی۔ یہ کہتی ہے میں مرید خدا کی ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا۔ بتاؤ تم کس کی مرید ہو۔ تو اس نے بڑے زور سے کہا۔ میں آباجان کی۔ چونکہ اس کے کان میں یہ بات پڑتی رہی ہے اس لئے وہ اس لڑکی سے یہ سُنکر کہ میں خدا کی مرید ہوں سمجھ گئی کہ اس نے غلط کہا ہے۔ تو یہ بات صحیح نہیں کہ بچہ سمجھ نہیں سکتا جس قسم کی بات بچے کے کان میں ڈالی جائے، وہ اپنی استعداد کے مطابق سمجھ سکتا اور سیکھ سکتا ہے۔ اگر اس کے ذہن میں دین کی، سلسلہ کی مختصر باتیں ڈالی جائیں تو بچہ ان کو اپنے ذہن میں قائم رکھ سکتا ہے۔ اور یہ مت خیال کرو کہ تم اگر بچپن میں بچے کی تربیت نہیں کرتے صرف اس خیال سے کہ تم نیک ہو اور وہ بھی نیک ہو جائیں گے۔ تو اس طرح تم اپنے فرض سے سبکدوش

نہیں ہو سکتے۔ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے تم اپنے اہل کے ذمہ دار ہو[۱۹] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا ہے۔ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ[۲۰] کہ ہر ایک تم میں سے راعی اور بادشاہ ہے اور وہ اپنی رعیّت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ بچپن میں تربیت صحیح کے بغیر بڑے ہو کر ان کی اصلاح کی امید رکھنا سخت غلطی ہے۔ دین کی درستی اور اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ظاہری اخلاق درست ہوں۔ اگر بچپن میں ان کے دل میں مقامات مقدسہ کا احترام نہیں اور وہ ایسے مقامات پر شور اور شر کرتے ہیں۔ اور ماں باپ ان کو ایسی حرکت سے نہیں روکتے۔ تو وہ اس بات کے لئے ان کو تیار کر رہے ہیں کہ بڑے ہو کر دینی امور میں وہ تمسخر اور استہزاء سے کام لیں۔ اور ان کے دلوں میں شعائر دین کی کچھ عزّت و وقعت نہ رہے۔ پس میں آپ کو اس قسم کی تربیت کی طرف توجہ دلاتا ہوں تا کہ دشمن بھی یہ سمجھے کہ یہ قوم ایسے اعلیٰ اخلاق کو پہنچ گئی ہے کہ کبھی ہلاک نہیں ہو سکتی۔

غرض یہ عید ہمیں یہ سبق سکھلاتی ہے کہ اگر ہم اپنی اولاد کو صحیح معنوں میں قربان کریں تو ہماری اولاد اتنی بڑھے گی جتنے آسمان کے ستارے۔ پس اگر کوئی سچی محبت خدا اور رسول ؐ سے رکھتا، اور اگر اس کو اسلام اور سلسلہ احمدیہ سے بلکہ اگر اس کو انسانیت سے بھی کچھ انس ہے تو بچپن میں اپنی اولاد کی صحیح تربیت کرے۔ جہاں آپ اپنے نفسوں کو لالچ، طمع، حرص، چوری اور جھوٹ جیسی بداخلاقیوں سے بچاؤ وہاں بچوں کو بھی ان کا عادی نہ ہونے دو اور ان کی پوری پوری نگرانی کرو۔ دین کی اور سلسلہ کی محبت ان کے دلوں میں پیدا کرو۔ ان سے بے جا محبت کر کے اعلیٰ اخلاق کے سیکھنے سے ان کو محروم نہ رکھو تا دوسروں کے لئے نمونہ بنیں بلکہ دنیا میں ایک بڑی قوم اور نسل بنیں۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے جو فرمایا کہ خدا کی بادشاہت میں بچے داخل ہو سکتے ہیں[۲۱] اس کے یہ معنے ہیں کہ کوئی قوم آئندہ زندہ نہیں رہ سکتی جب تک کہ وہ اپنی اولاد کی بچپن میں تربیت کی فکر نہیں کرتی۔ پس بچپن میں اپنی اولاد کے اخلاق کی درستی اور اصلاح کرو۔ تا تم کو دائمی عید نصیب ہو ورنہ اچھے اچھے کپڑے بچوں کو پہنا دینا کوئی خوشی کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو احسن طریق سے پورا کریں۔

(الفضل ۲۱ جولائی ۱۹۲۵ء صفحہ ۵ تا ۸)

---

[۱] صحیح بخاری کتاب المناقب باب وفاة النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ صحیح مسلم کتاب الفضائل باب کم سن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم قبض۔

۲ - ابراہیم ۱۴: ۳۸ - صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی

۳ - پیدائش باب ۱۵ - آیت ۵۵ باب ۱۶ آیت ۱۰

۴ - پیدائش باب ۲۱ آیت ۲۰-۲۱ - صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی

۵ - طبقات ابن سعد ۷۶/۱ زرقانی ۱۰۹/۱ زاد المعاد ۱۸/۱

۶ - حضرت آمنہ کی وفات کے وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عمر ۶ سال تھی۔ (السیرۃ الامام ابن ہشام ۵۷/۱ طبقات ابن سعد ۷۳/۱ السیرۃ الحلبیہ ۱۱۷/۱

۷ - زاد المعاد ۱۸/۱ - طبقات ابن سعد ۷۴/۱ - السیرۃ الحلبیہ ۱۲۵/۱

۸ - السیرۃ الامام ابن ہشام ۷۶/۱ - طبقات ابن سعد ۷۵/۱

۹ - نور الیقین فی سیرۃ خیر المرسلین از محمد خضری ص۱۳ - السیرۃ الحلبیہ ۱۲۹/۱

۱۰ - تاریخ طبری ۳۲۰-۳۲۱/۱ مطبوعہ مصر

۱۱ - السیرۃ الحلبیہ ۱۲۵/۱

۱۲ - طبقات ابن سعد ۱۳۰/۱ - السیرۃ الحلبیہ ۳۷۶/۱

۱۳ - تاریخ طبری ۳۲۲/۲ - طبقات ابن سعد ۱۳۲/۱

۱۴ - غالباً سہو کتابت سے حسینؓ لکھا گیا ہے۔ یہ واقعہ حضرت حسنؓ کا ہے۔ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب مایذکر فی الصدقۃ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم و آلہٖ۔ صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب تحریم الزکوٰۃ علی رسول اللہ وعلی آلہٖ۔

۱۵ - صحیح بخاری کتاب الاطعمۃ باب التسمیۃ علی الطعام والاکل بالیمین و باب الاکل مما یلیہ۔ صحیح مسلم باب آداب الطعام۔ (یہ واقعہ حضرت امام حسنؓ یا حسینؓ کی بجائے حضرت عمرؓ بن ابی سلمہ کا ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ حضرت ام سلمہؓ کے پہلے خاوند سے لڑکے تھے اور بخاری کی حدیث کے یہی راوی ہیں۔ جب حضرت ام سلمہؓ کا نکاح ہوا ہے تو یہ چھوٹے بچے تھے اور انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ پرورش پائی تھی (کتاب الاصابہ فی تمیز الصحابہ ۱۲۳۵/۵)

۱۶ - یہ چھتری برائٹن کے مقام پر سمندر کے کنارے ۶۰×۴۰ فٹ کے رقبہ میں ہندوستانی طرز تعمیر پر بنی ہوئی ہے اس کا گنبد ۸ فٹ قطر کا اور بلندی ۹ فٹ ہے (الفضل ۲۷/۱۱/۱۹۲۴ء) ریویو آف ریلیجنز جنوری ۱۹۲۵ء)

۱۷ - سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ باب مقام الصبیان فی الصف

۱۸ - حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی بیگم محترم صاحبزادہ مرزا حمید احمد صاحب ابن حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ

۱۹ - قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا - (التحریم ۶۶: ۷)

۲۰ - صحیح بخاری کتاب الاستقراض باب العبد راعٍ فی مال سیدہٖ -

۲۱ - متی باب ۱۹ آیت ۱۴

۱۴

فرمودہ ۲۲ جون ۱۹۲۶ء بمقام

وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ ۝ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَاذَا تَعْبُدُونَ ۝ أَئِفْكًا آلِهَةً دُونَ اللَّهِ تُرِيدُونَ ۝ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ ۝ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ ۝ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِينَ ۝ فَرَاغَ إِلَىٰ آلِهَتِهِمْ فَقَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُونَ ۝ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ ۝ فَأَقْبَلُوا إِلَيْهِ يَزِفُّونَ ۝ قَالَ أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ ۝ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ۝ قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ۝ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ۝ وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝ رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ۝ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ۝ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ۝ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۝ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝

میں نے اس وقت جو چند آیات اللہ تعالیٰ کے مقدس اور ہادی کلام میں سے پڑھی ہیں وہ خصوصیت سے اس دن کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں جو آج ہم پر گذر رہا ہے۔ یہ دن اسلامی اصطلاح کی رو سے عید کا دن ہے۔ اور اس کا تعلق خصوصیت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یادگار کے طور پر خصوصیت کے ساتھ اس دن کی یاد کو تازہ رکھا جاتا ہے۔ خصوصیت سے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں سے آگاہ ہونا انسان کے لئے ناممکن ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کسی کام کے متعلق اس کی کیا حکمت ہے اور پھر ایک ہے یا کئی حکمتیں ہیں۔ البتہ جو بتا دی جاتی ہیں ان کے متعلق ہم کسی حد تک کچھ کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں کچھ حکمتیں ہوتی ہیں۔ عید اضحیٰ کے دن میں بھی بعض حکمتیں ہیں ان میں سے بہت سی

ہم کو نہیں بتائی گئیں لیکن جو بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یادگار ہے۔ ہم اسے عید اور بقر قربانی کی عید کہتے ہیں۔ اور قربانی کی عید سے ہماری یہ مراد ہوتی ہے کہ اس دن آسودہ حال لوگ بکروں یا گائیوں یا اونٹوں کی قربانیاں کریں۔ خود بھی کھائیں اور دوسروں کو بھی کھلائیں۔

اس عید کے دن کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس دن قربانی کی جاتی ہے اس کے سوا مسلمانوں کے لئے ایک اور بھی عید ہے جو عید الفطر کہلاتی ہے اُس میں اور اس عید میں ایک فرق ہے جسے ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ پہلی عید فاقہ کی عید تھی وہ ایک مہینہ فاقہ کرنے کے بعد آتی ہے اپنی کسی غرض کے لئے نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کی رضا کے لئے فاقہ سے رہتے ہیں۔ مگر آج کی عید کھانے پینے کی عید ہے اور جس طرح اس عید سے پہلے محض خدا کی رضا کے لئے فاقہ کئے اسی طرح خدا تعالےٰ کی خاطر آج گوشت کھائیں گے۔ تو دونوں میں فرق نمایاں ہے، ایک میں فاقہ دوسری میں کھانا۔

یہ میری منشاء نہیں کہ مسلمان عیدوں پر محض اس لئے خوش ہوتا ہے کہ ایک میں فاقہ کرتا ہے اور دوسری میں گوشت کھاتا ہے۔ بلکہ میری منشا یہ بتانا ہے کہ مسلمانوں کی عید درحقیقت فرمانبرداری میں ہے جو اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ تکلیفوں کے اٹھانے کی وجہ سے خوشی ہے وہ بھی نادان ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ خوشی صرف کھانے پینے میں ہی ہے، وہ بھی نادان ہیں۔ خوشی ان میں نہیں بلکہ خوشی اللہ تعالےٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں ہے۔ اگر اللہ تعالےٰ کی اطاعت میں فاقہ کرنا پڑے یا کھانا کھانا پڑے تو یہی خوشی ہوتی ہے اور یہی عید ہے۔

ضرب المثل کے طور پر یہ بات مشہور چلی آتی ہے کہ ایک بھیڑیئے اور ایک شیر کے درمیان سردی کے بارے میں اختلاف ہو گیا۔ شیر کہے سردی پوہ کے مہینے میں زیادہ ہوتی ہے بھیڑیا کہے ماگھ کے مہینے میں زیادہ ہوتی ہے۔ آخر جب جھگڑا بڑھا تو قرار پایا کہ لومڑی سے فیصلہ کرا لیا جائے چنانچہ انہوں نے لومڑی سے پوچھا۔ اس نے دیکھا اگر میں پوہ کہتی ہوں تو بھیڑیا کھاتا ہے اور ماگھ بتاتی ہوں تو شیر بگڑتا ہے یہ سوچ کر اس نے کہا ؎

سنو سنگھ سردار بھگیلا رائے جی　　پالا پوہ نہ پالا ماگھ جی
پالا مینہہ نہ، پالا وا جی

یعنی پوہ اور ماگھ میں سردی نہیں ہوتی۔ سردی سرد ہوا سے ہوتی ہے تو یہ سمجھنا کہ خدا فاقوں سے خوش ہوتا ہے یا گوشت کھانے سے خوش ہوتا ہے۔ غلط ہے

بعض قوموں میں فاقہ کشی کا بڑا رواج ہے۔ وہ کثرت سے فاقہ کشی کرتی ہیں اور سمجھتی ہیں خدا تعالےٰ کھانے پینے سے نہیں بلکہ فاقہ کشی سے خوش ہوتا ہے۔ سادھو۔ رومن کیتھولک اور

مسلمان فقراء کا بھی ایک گروہ اسی قسم کا ہے وہ فاقہ پر فاقہ کرتے ہیں۔ اور دوسری قسم کی ریاضتیں بھی کرتے ہیں۔ غرض وہ اس قسم کی نفس کُشی سے سمجھتے ہیں کہ خدا تعالےٰ ان سے ہی خوش ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں بعض قومیں ایسی ہیں جو کہتی ہیں کھاؤ پیو، یہی رضاء الٰہی کا ذریعہ ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں خدا تعالےٰ نے ہر چیز ہمارے لئے پیدا کی ہے اس لئے وہ انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھائیں اور خوب کھاتے پیتے رہیں۔ انہوں نے قربانیوں کے معیار کو رد کر دیا، ان کی عید یہی ہوتی ہے کہ خوب کھائیں پئیں۔ روزے ان میں اگرچہ ہیں لیکن ان لوگوں کی بہت کم توجہ ادھر ہوتی ہے۔ مثلاً ہندوؤں میں بعض ایسے فرقے ہیں[۱] جن کا کھانے پینے پر زور ہوتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے یہ چیزیں پیدا ہی اس لئے کی ہیں کہ انسان انہیں کھائے پیئے۔ پس ایک گروہ اگر ایک طرف جھکا ہے تو دوسرا دوسری طرف۔ اور جس طرف کوئی جھک گیا دوسری طرف اس سے بالکل چھُٹ گئی۔

لیکن اسلام وسطی تعلیم[۲] لے کر آیا ہے۔ چنانچہ اس نے جو عیدیں مقرر کیں، ان میں سے ایک فاقہ کے ساتھ آئی ہے اور دوسری کھانے پینے کے ساتھ۔ ایک میں انسان اگر فاقہ کرتا ہے۔ تو خدا کے حکم کے ماتحت اور دوسری میں اگر کھاتا ہے تو خدا کی منشاء کے مطابق۔ اس پر خدا تعالیٰ کہتا ہے تم نے میرے لئے فاقے کئے اور میرے لئے خوشی منائی اس لئے میں بھی خوش ہوں۔ پھر ایک اور خوشی بھی انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ اس موقعہ پر اپنے رشتہ داروں کو بھی کھلاتا ہے، دوستوں کو بھی کھلاتا ہے، ہمسایوں کو بھی کھلاتا ہے، غرباء اور مساکین کو بھی کھلاتا ہے اس میں بھی اسے ایک خوشی ہوتی ہے۔ لیکن ان سب سے بڑی وہی خوشی ہے جو انسان کو اس لئے ہوتی ہے کہ میں نے خدا کے واسطے خوشی کی اور خدا میرے خوشی کرنے پر خوش ہُوا۔

پس نہ فاقوں سے خدا تعالےٰ خوش ہوتا ہے اور نہ کھانے سے خوش ہوتا ہے بلکہ اطاعت سے خوش ہوتا ہے۔ اگر کوئی فاقہ کرتا ہے اور وہ فاقہ خدا کے حکم سے نہیں تو اس کے فاقہ سے خدا تعالےٰ ہرگز خوش نہیں ہوگا۔ کیونکہ ایسا فاقہ کرنے کے لئے اسے خدا نے حکم نہیں دیا۔ اسی طرح اگر وہ کھاتا ہے اور عمدہ عمدہ کھانے کھاتا ہے مگر ایسے کھانے کھانے کے لئے اسے خدا نے حکم نہیں دیا، تو اس پر خدا تعالےٰ ہرگز راضی نہیں ہوگا۔ پس خدا صرف فاقہ اور کھانے سے خوش نہیں ہوتا۔ بلکہ اطاعت سے خوش ہوتا ہے۔ انسان اگر اس کی اطاعت میں فاقہ کرتا ہے یا اس کی اطاعت میں کھاتا ہے تو خدا تعالےٰ خوش ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس کی اطاعت ہے اور اطاعت یہی تو ہے کہ اگر وہ کہے کھاؤ تو کھاؤ اور اگر وہ کہے کہ فاقہ کرو تو فاقہ کرو۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں، عید کے دن شیطان روزے سے ہوتا ہے[۳]۔ اس سے بھی

معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی خوشی نہ کھانے میں ہے نہ فاقے میں۔ بلکہ اس حکمت کے ماتحت ہے کہ انسان دونوں عیدوں پر ایک قسم کی قربانی کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کا حکم بجالاتا ہے۔ تو عیدین ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ جس طرح خدا کی خاطر فاقہ کرنا پڑا تو فاقہ کیا اور اچھے اچھے کھانے چھوڑ دیئے۔ اسی طرح اگر خدا کی خاطر اچھے اچھے کھانے کھانے پڑیں تو کھاؤ۔ کیونکہ اس میں تمہاری اپنی منشاء اور خواہش کو دخل نہیں صرف خدا کی منشاء کی متابعت ہے۔ ایسے لوگوں میں سے جو اچھا کھانے اور اچھا پہننے پر اس لئے اعتراض کیا کرتے ہیں کہ خدا ان باتوں سے خوش نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بھی اعتراض کیا۔ چنانچہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے ایک دفعہ مَیں بازار سے گذر رہا تھا کہ ایک ڈپٹی صاحب میرا راستہ روک کر تعجب سے کہنے لگے مَیں نے سُنا ہے مرزا صاحب بادام روغن اور پلاؤ کھالیتے ہیں۔ اور سنتے ہی کہا۔ فقیروں تو یہ باتیں جائز نہیں۔ مَیں نے کہا۔ اسلام میں یہ چیزیں جائز ہیں۔ اس لئے آپ استعمال کرتے ہیں۔ تو بعض کا خیال ہے کہ اچھی غذا اور اچھے لباس سے خدا خوش نہیں ہوتا۔ حالانکہ بعض موقعے ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر اچھا کھانے اور اچھا لباس پہننے سے ہی خدا خوش ہوتا ہے۔

آج کا دن جو عید اضحیٰ کا دن ہے یہ بھی ان موقعوں میں سے ایک موقعہ ہے۔ جن پر خدا تعالیٰ اچھا کھانے اور اچھا پہننے سے خوش ہوتا ہے۔ آج نہ صرف یہ حکم ہے کہ آپ کھاؤ۔ بلکہ یہ حکم بھی ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بھی کھلاؤ۔ چنانچہ اس حکم کی متابعت میں کوئی مسلمان گھر نہیں رہ جاتا جس میں گوشت نہ پہنچ جاتا ہو۔ غلطی سے رہ جائے تو رہ جائے تقسیم کرنے والوں کی بھول سے کسی کے گھر گوشت نہ پہنچ سکے تو نہ پہنچ سکے ورنہ جس رنگ میں اس دن کے احکام ہیں ان کی رُو سے ہر مسلمان گھر میں پہنچتا ہے۔ اور ہر مسلمان اس دن کھانے کا خاص اہتمام کرتا ہے۔ پس یہ دن بتاتا ہے کہ اس دن خدا تعالیٰ کی خوشی فاقہ میں نہیں بلکہ کھانے پینے میں ہے۔

خدا تعالیٰ کی نعمتوں سے مستفیض ہونا بھی شکر گزاری میں داخل ہے اور نعمتوں کی بے قدری انسان کو خدا تعالیٰ کی نگاہ میں مقہور بنا دیتی ہے۔ ایک دفعہ جب بہت سا مال آیا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انصار سے کہا۔ تم نے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں۔ آؤ مَیں تمھیں مال دوں کیونکہ تم نے مہاجرین کو اپنا مال دیا تھا۔ انصار نے سمجھا کہیں ہماری قربانیوں میں شبہ نہ پڑ جائے۔ اس لئے انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کہا۔ یہ مہاجرین کو ہی دے دیا جائے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا۔ تم نے نعمت کو رد کیا اب ان کو تو اس دنیا میں بھی ملے گا مگر تم کو قیامت کو ہی ملے گا۔ تو انعام کا رد کرنا معمولی بات نہیں

یہ سلبِ نعمت کا سبب ہوجاتا ہے۔ اگر کوئی شخص انعام کو رد کرتا ہے تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ہاتھ سے نعمتوں کے دروازہ کو بند کرتا ہے۔ آج کا دن بھی ایک ایسا دن ہے جس میں عمدہ کھانے کھانا اور اچھے کپڑے پہننا خدا تعالےٰ کا انعام ہے۔ اور اس انعام کو رد کرنا خدا کی خوشی کا باعث نہیں ہوسکتا بلکہ اُلٹا اس کی ناراضگی کا موجب ہوجاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مجلس میں ایک شخص دودھ لایا۔ آپؐ نے دودھ پیا اور پینے کے بعد دائیں بائیں دیکھا۔ دائیں طرف ایک لڑکا بیٹھا تھا اور بائیں طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے لڑکے سے مخاطب ہوکر فرمایا شریعت نے دائیں طرف والے کا حق بے شک مقدم رکھا ہے مگر کیا میں یہ دودھ عُمرؓ کو دے دوں؟ لڑکا فوراً بول اُٹھا یا رسول اللہ! میں تبرک پر ایثار نہیں کرسکتا۔ دودھ مجھے دیدیں اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق کو منظور کرلیا اور اسے دیدیا۔[۵]

شیخ عبدالقادر صاحب جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ مجھ پر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ میں نہیں کھاتا جب تک خدا مجھے نہیں کہتا۔ اے جیلانی! تجھے میری قسم کھا۔ اور میں کپڑا نہیں پہنتا جب تک خدا مجھے نہیں کہتا۔ اے جیلانی! تجھے میری قسم کپڑا پہن۔[۶] پھر لکھا ہے جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خوراک نہایت اعلیٰ ہوتی تھی۔ اور اسی طرح ان کا لباس بھی اس وقت کے لحاظ سے بہت قیمتی اور بہترین ہوتا تھا۔ بلکہ کئی دفعہ وہ بادشاہ کے لباس سے بھی بڑھ کر ہوتا۔ بعض دفعہ ان کا کپڑا ایسا اعلیٰ ہوتا کہ ایک ہزار اشرفی ایک گز قیمت کا ہوتا۔[۷] روایات میں اکثر اختلاف ہوجاتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ اس روایت میں بھی اختلاف ہو۔ لیکن یہ بات درست تھی کہ وہ اللہ تعالےٰ کے حکم کے ماتحت کھاتے اور اسی کے حکم کے ماتحت پہنتے تھے اور اسی میں اللہ کی رضا ہوتی ہے کہ انسان اللہ تعالےٰ کے حکم کے ماتحت کھائے پیئے اور دوسرے کام کرے۔

حضرت مسیح ناصریؑ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ وہ ایک جگہ جارہے تھے۔ کچھ حواری بھی ساتھ تھے۔ روزوں کے دن تھے۔ ان کے روزے مسلمانوں جیسے روزے نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ معمولی کھانے پینے سے پرہیز ہوتا تھا۔ وہ جب جارہے تھے تو ان کے شاگردوں نے راستے سے سٹے توڑ کر کھائے۔[۸] اس میں کچھ شک نہیں کہ عیسائیوں کیلئے بھی روزوں کے دن آتے ہیں۔ مگر وہ روزے ایسے نہیں ہوتے جیسے مسلمانوں کے۔ سَو روزے بھی اگر ایک عیسائی رکھے تو بھی مسلمانوں کے ایک روزہ کے برابر نہیں ہوتے۔ تو باوجود اس کے کہ ان لوگوں کے لئے روزے بہت ہلکے تھے تاہم حضرت مسیحؑ کے شاگرد روزہ نہ رکھتے تھے۔ انجیل میں

لکھا ہے ان کے روزہ نہ رکھنے کی حالت کو دیکھکر یوحنا کے شاگردوں نے حضرت مسیحؑ کے پاس آکر اعتراض کیا کہ "تیرے شاگرد روزہ نہیں رکھتے"۔ حضرت مسیحؑ نے جواب دیا۔

"کیا براتی جب تک دولہا ان کے ساتھ ہے اُداس ہو سکتے ہیں۔ لیکن وے دن آوینگے کہ دولہا ان سے جدا کیا جائے گا۔ تب وے روزے رکھیں گے"۔[ال]

اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ گو ان کے روزے مقرر تھے مگر اس وقت رضاءِ الٰہی اسی میں تھی کہ حضرت مسیحؑ کے شاگرد کھائیں اور پئیں۔

جو لوگ اللہ تعالےٰ کی رضاء کے خواہاں ہوتے ہیں وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ اس کی رضاء اس کی اطاعت اور فرمانبرداری میں ہے۔ نہ کھانے میں اس کی رضاء ہے اور نہ فاقہ میں اور نہ اچھا پہننے میں ہے اور نہ ننگا رہنے میں۔ جس وقت اس کی رضاء ہو کہ انسان کھائے اس وقت اگر انسان نہ کھائے تو مجرم ہے اسی طرح پینے کے متعلق ہے اسی طرح پہننے کے متعلق ہے کہ اگر اس کی رضاء اس میں ہو کہ انسان فلاں کام کرے تو ایسا ہی کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے ہر شخص کو چاہیئے کہ دیکھے خدا تعالےٰ کیا چاہتا ہے۔ اور پھر اس کے مطابق کام کرے تا اس کی رضاء کا پانے والا بنے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ ایک جنگ کو جا رہے تھے بعض صحابہ نے روزے رکھے ہوئے تھے۔ جب موقعہ پر پہنچے تو جو روزہ دار تھے وہ تو پہنچتے ہی زمین پر جا پڑے اور کچھ کام نہ کر سکے۔ اور جو بے روزہ تھے وہ کام پر لگ گئے۔ اور انہوں نے فوراً تمام انتظام کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح بے روزہ، روزہ داروں سے بڑھ گئے۔[ال] تو ہر ایک چیز کا مقام ہوتا ہے۔ جس موقع پر جس رنگ میں خدا کی رضاء حاصل ہو سکتی ہو اسی رنگ میں حاصل کرنی چاہیئے۔ اگر آج کوئی شخص روزہ رکھ لے اور بال بچوں کو بھی رکھا دے تو وہ مجرم ہوگا۔ یا اگر باوجود استطاعت رکھنے کے بجائے عمدہ کھانوں کے صرف دال پکائے تو وہ بھی مجرم ہے۔ پس ایک سبق یہ ہے کہ انسان خدا کی رضاء کے موقعہ و محل کو دیکھے اور پھر اس کے مطابق عمل کرے۔ اگر وہ موقعہ عمدہ کھانے اور عمدہ پہننے کا ہے تو عمدہ کھائے اور عمدہ پہنے کہ اس میں ہی رضاء الٰہی ہے۔ اور اگر وہ وقت فاقہ کا ہے تو اس وقت فاقہ کرے کہ رضاء الٰہی اس وقت اسی میں ہے۔

دوسرا ایک اَور سبق بھی ان عیدین سے ملتا ہے۔ مگر اس سبق سے پیشتر ان ہردو کے مابہ الامتیاز کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔ ایک عید کو قربانی کی عید کہتے ہیں۔ جو آج ہم پر گذر رہی ہے۔ یہ عید قربانی سے پہلے ہے اور دوسری عید جو ہے وہ قربانی کے بعد ہے۔ وہ روزوں کی عید کہلاتی ہے۔ روزوں کی عید قربانی کے بعد آتی ہے کیونکہ روزہ رکھنا قربانی ہی ہے مگر جو آج کی عید ہے یہ

قربانی سے پہلے ہوتی ہے نہ کہ قربانی کے بعد یا پھر قربانی کے ساتھ یعنی اسی دن عید اور اسی دن قربانی ہوتی ہے۔ اور نماز کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ عید پہلے ہے اور وہ پیچھے۔ تو یہ اختلاف بھی ایک نکتہ ہے اور اس میں بھی ایک سبق ہے۔

ان عیدوں میں جو فرق ہے وہ یونہی نہیں۔ اس نکتہ پر جو اس فرق میں ہے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت اس کے اندر نبوت کا ایک انکشاف کیا گیا ہے۔ اگر ہم اس بات کو مدِنظر رکھیں کہ ایک میں عبادت بعد میں آتی ہے اور ایک میں ساتھ ہی یا پہلے تو اس میں نکتہ یہ ہے کہ پہلی عید میں جو روزوں کی عید ہے آہستہ آہستہ نفس کی قربانی ہوتی ہے اور ایک شخص برابر یہ قربانی کئے جاتا ہے اور اس کے بعد اس کو عبادت کی توفیق ملتی ہے ۔مگر اس عید میں نفس کی قربانی آہستہ آہستہ نہیں ہوتی۔ بلکہ یکدم ہوتی ہے اور عبادت اس قربانی سے پہلے کی جاتی ہے۔ روزوں کی عید میں روزوں کے ذریعہ اپنے نفس کی قربانی کی جاتی ہے مگر اس عید میں بکرے کی قربانی ہوتی ہے اور بکرے کی قربانی کو اپنی جان کی قربانی کے برابر سمجھنا چاہیئے۔ اس میں یہ نکتہ بتایا گیا ہے کہ انسانی اعمال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک عمل ایسا ہوتا ہے کہ عبادت کی توفیق قربانی کے ساتھ ملتی ہے اور ایک ایسا عمل ہوتا ہے کہ قربانی کی توفیق عبادت کے ساتھ ملتی ہے۔ پہلی قسم کے اعمال میں قربانی پہلے کرنی پڑتی ہے۔ اور تزکیہ نفس پیچھے حاصل ہوتا ہے اور دوسری قسم کے اعمال میں پہلے تزکیہ نفس حاصل ہوتا ہے اور پھر قربانی کرنی پڑتی ہے۔

ان دونوں قسم کے اعمال کے نمونوں میں ایک فرق واضح ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ پہلی قسم کے اعمال میں تزکیہ نفس سے پہلے جو قربانی کی جاتی ہے اس کا کرنے والا قربانی کی خواہش آہستہ آہستہ کرتا ہے۔ اور دوسری قسم کے اعمال میں جن میں تزکیہ نفس یعنی عبادت پہلے کی جاتی ہے۔ قربانی کرنے والا شخص قربانی کی خواہش یکدم کرتا ہے جس عمل میں قربانی کی خواہش آہستہ آہستہ کی جاتی ہے اس میں تزکیہ نفس دیر کے بعد ہوتا ہے۔ چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی قومیں جن کو آہستہ آہستہ قربانی کے موقعے ملے ہیں، ان کا تزکیہ نفس بھی آہستہ آہستہ ہوا۔ اور وہ قومیں جنہیں یکدم قربانی کرنے کے موقعے ملے، ان کا تزکیہ نفس بھی فوری طور پر ہوا۔ چنانچہ جو انبیاء مثیلِ موسیٰ کہلاتے ہیں ان میں تزکیہ نفس اور قربانی ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ ان کے لئے سامان ہی ایسے کئے جاتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں اکٹھی ہی ہوتی ہیں۔ اور وہ انبیاء جو مثیلِ عیسیٰ کہلاتے ہیں۔ ان میں قربانی آہستہ آہستہ ہے اور ان کا تزکیہ بھی دیر سے ہوتا ہے۔ روزوں والی مثال کا مطلب یہ ہے کہ آہستہ آہستہ قربانی کی جاتی ہے اور چونکہ قربانی آہستہ آہستہ کی جاتی ہے اس لئے تزکیہ بھی آہستہ آہستہ ہوتا ہے اور ان کی تربیت بھی آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں لوگ تزکیہ میں یکدم ترقی کر گئے لیکن حضرت عیسےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقت چونکہ قربانی آہستہ آہستہ تھی، تزکیہ بھی آہستہ آہستہ ہوا۔

حضرت موسیٰؑ کے وقت ایسا نہیں ہوا۔ ان کے وقت یہ باتیں معًا ہوئیں اور لوگ تربیت میں تیزی کے ساتھ بڑھ گئے تزکیہ میں بھی سرعت کے ساتھ ترقی کرلی۔ اور عام ترقی میں بھی اس وقت کے لوگوں پر فوقیت حاصل کرلی۔ حتیٰ کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں لوگوں کو اس قدر الہام ہوتے تھے کہ لوگوں کو شبہ پڑگیا تھا کہ شاید یہ بھی نبی ہو جائیں گے۔ قرآن کریم میں جو واقعات ان کے بیان کئے گئے ہیں وہ ان کی عام حالت نہیں وہ یہود پر حجت پکڑنے کے لئے لائے گئے ہیں۔ اور اگر ان واقعات کو ان کی عام حالت سمجھ لیا جائے تو یہ درست نہ ہوگا۔ کیونکہ جو مثالیں بیان کی گئی ہیں وہ جرم کی مثالیں ہیں۔ ورنہ عام حالت معًا روحانی ترقی کرتی چلی گئی ہے۔ توریت میں آتا ہے لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آکر شکایت کی کہ آپ کے ماننے والے کثرت سے الہام پانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہا کہ میں تو چاہتا ہوں سب نبی ہو جائیں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوم درحقیقت روحانی ترقی کے منازل کو بہت جلدی طے کر گئی تھی لیکن اس کے بالمقابل عیسائی قوم کی ترقی آہستگی سے ہوئی۔ وہ بہت جلدی اور فوراً روحانیت کے اعلیٰ مدارج پر نہ پہنچ گئی تھی بلکہ آہستگی سے روحانی مدارج پر چڑھی کیونکہ اس کی قربانی بھی آہستگی کے ساتھ ہوئی۔ سو جہاں قربانی فوری اور یکدم ہوگی وہاں ترقی تزکیہ اور روحانیت بھی فوری طور پر ترقی کرے گی۔ اور جہاں قربانی آہستگی کے ساتھ ہوگی وہاں ترقی۔ تزکیہ اور روحانیت بھی آہستگی کے ساتھ بڑھے گی۔ چونکہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقت میں قربانی فوری ہوئی۔ اس لئے ان کی ترقی بھی فوری ہوئی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جتنے بھی مثیل ہوں گے ان میں جلدی طہارت۔ تزکیہ نفس۔ روحانیت اور ترقی پیدا ہوگی اور چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقت میں قربانی آہستگی کے ساتھ ہوئی اس لئے عیسوی مماثلت کے سلسلے میں جتنے سلسلے ہوں گے۔ ان میں طہارت۔ تزکیہ نفس۔ روحانیت اور عام ترقی آہستگی کے ساتھ ہوگی۔

چند دن ہوئے میں نے سنا بعض لوگ کہتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو لکھا ہے تین ماہ میں اگر ایک پیسہ بھی چندہ دیدو تو کافی ہے مگر یہاں آپ منظر بلحاظ اسے بڑھا رہے ہیں۔ ایک آنہ فی روپیہ ماہوار آمد پر چندہ کر دیا گیا ہے اور ابھی اور بھی بڑھانے کا خیال ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ بعد میں آنے والوں نے چندہ کی شرح بڑھا دی۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ایسا کیوں

کیا جاتا ہے۔ مَیں پہلے بتا چکا ہوں کہ مثیلِ موسیٰؑ کی ترقی جلد ہوتی ہے اور مثیلِ عیسٰیؑ کی بتدریج۔ اور چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مثیلِ عیسیٰؑ ہیں، اس لئے آپ کے سلسلہ کی ترقی بھی آہستگی کے ساتھ ہونی ہے اور جب ترقی آہستگی کے ساتھ ہونی ہے تو عیسوی سلسلے کی طرح اس کی قربانی بھی آہستہ آہستہ ہوگی جو آہستہ آہستہ بڑھتی رہے گی۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ مالی قربانی میں دن بدن اضافہ ہو۔ اسی طرح وصیت کا حصہ ہے۔ اس کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ یونہی اس کی شرح بڑھائی جا رہی ہے۔ مگر اس کے متعلق بھی سوچنا چاہیئے کہ اگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقت وہ شرح نہیں تھی جواب ہے اور جس پر لوگ وصیتیں کر رہے ہیں تو یہ بھی اسی اصل کے ماتحت ہے کہ یہ ترقی آہستگی کے ساتھ ہونی تھی۔ اور جوں جوں قربانیاں بڑھ رہی ہیں تزکیہ اور طہارت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے اور ایمانی حالت میں ترقی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جو پھر الٹ کر زیادہ قربانی کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ مجھے اگر سلسلے کی ترقی کے لئے مال زیادہ جمع کرنے کا شوق ہے تو اس سے ہماری جماعت ہی کی شان بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کیونکہ قربانی میں ترقی کرنے سے ہماری ایمانی حالت اور اخلاص لوگوں کے سامنے آتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں اس درجہ پر جماعت کی حالت نہیں آئی تھی جس درجہ پر اب ہے اور جس درجہ پر کھڑے ہو کے جماعت کے عام افراد یکدم بڑی بڑی قربانیاں کر سکتے۔ مگر اب جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے ایمان اس رنگ میں آتا جاتا ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور گو یہ حالت قربانیوں سے ہی پیدا ہو رہی ہے جو آہستہ آہستہ ہو رہی ہیں۔

مگر جب یہ حالت پیدا ہو رہی ہے تو اس کا یہ بھی تو تقاضا ہے کہ پہلے سے بڑھ کر قربانیوں کی تحریک کرے پس چندہ اور وصیت وغیرہ کی شرح کا بڑھتا چلا جانا ایمانی حالت کے ترقی یافتہ ہونے کے نتیجے میں ہے گو یہ ترقی قربانیوں سے حاصل ہو رہی ہے مگر یہ ترقی قربانیوں کے لئے بھی ہمت دلا رہی ہے۔ کہنے والے یہ تو کہہ دیتے ہیں کہ شرح چندہ بڑھائی جا رہی ہے مگر یہ نہیں دیکھتے کہ اس طرح ان کی ایمانی حالتوں کی تصدیق کی جا رہی ہے۔ آخر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کثرت سے مال آنے کے متعلق بھی تو ارشاد فرمایا ہے۔ کیا اگر جماعت نے اسی حالت پر رہنا ہوتا جس حالت میں وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقت میں تھی تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کہہ سکتے تھے کہ کثرت سے مال آئیں گے۔ حضرت صاحب کا یہ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ جماعت آہستہ آہستہ ترقی کرتی چلی جائے گی اور آخر اس مقام تک پہنچ جائے گی کہ مالوں کی قربانیوں کی ان کے سامنے کوئی حقیقت نہ رہے گی۔

قرآن شریف میں آتا ہے کہ دس کافروں کے مقابلہ میں ایک مسلمان کافی ہے اور مسلمانوں کو

کہا بھی گیا ہے کہ تم میں سے ایک ایک کو دس دس کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ مگر باوجود اس کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی غزوہ میں بھی یہ حالت نہیں ہوئی کہ ایک مسلمان کو دس کافروں کا مقابلہ کرنا پڑا ہو۔ زیادہ سے زیادہ ایک مسلمان کو ۱/۲ ۳ کافروں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقت میں دس سے بھی زیادہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ چنانچہ مسلمان ایک جنگ پر گئے ہوئے تھے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جرنیل تھے۔ مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ مدد بھیجی جائے۔ انہوں نے کہلا بھیجا۔ مَیں عقبہؓ کو بھیجتا ہوں۔ عقبہؓ ہزار آدمی کے برابر ہے۔ سمجھ لو کہ ہزار آدمی بھیجدیا۔ تو حضرت عمرؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھکر قربانی نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ بات یہ تھی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت میں وہ حالات پیدا نہیں ہوئے تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقت میں پیدا ہو گئے تھے اور ادھر مسلمان بھی ترقی کر گئے۔

بعض وقت ایک عمل ہوتا ہے جو دوسرے دل میں رعب ڈال دیتا ہے اگر انسان خطرہ کے وقت اپنے حواس بجا رکھے اور اپنی ACCUMULATIVE POWER کا بجا استعمال کرے تو ایسا کام بھی کر لیتا ہے جو اس کی دھاک بٹھا دیتا ہے، خواہ وہ کمزور ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت مسیح موعودؑ فرماتے تھے۔ رستم کے گھر میں ایک دفعہ چور آیا وہ رستم سے زیادہ طاقتور تھا۔ لیکن رستم کا نام چونکہ طاقت میں مشہور تھا۔ چور کو اس سے کبھی طاقت آزمائی کا موقعہ نہ ملا تھا۔ اس دن جب رستم نے پکڑا تو اس نے رستم کو گرا لیا۔ اور اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اس پر رستم نے چلّا کر کہا۔ آگیا رستم! آگیا رستم!! یہ سُنکر چور بھاگ گیا۔ یہ رستم کے نام کا اثر تھا کہ اس نے ایسے طاقتور کو بھگا دیا جس نے رستم کو گرایا ہوا تھا۔ تو عقبہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ بھی ایک طرح پر اسی رنگ کا ہے۔ عقبہؓ بڑا بہادر تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے یہ کہلا بھیجنے پر کہ یہ ہزار آدمی کے برابر ہے مسلمانوں کے دل میں تسلّی پیدا ہو گئی۔

دنیا میں جب کوئی انسان کوئی کام کرتا ہے تو اسے اس کے لئے طاقت بھی مل جاتی ہے یہی حال یہاں بھی ہے۔ لیکن کام کرنے کا عزم ہونا چاہیئے۔ پس ہماری جماعت جو کام کرنے کے لئے خدا نے قائم کی ہے کیونکر ہو سکتا ہے کہ اگر وہ کوئی کام کرنا چاہے تو اسے اس کی طاقت نہ ملے لیکن کام حالات کے لحاظ سے کئے جاتے ہیں۔ چونکہ ابتدائی حالات کمزور ہوتے ہیں اس لئے ابتدائی کام بھی ہلکے ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ابتدائی مطالبوں اور آجکل کے مطالبوں میں فرق نظر آتا ہے۔ پہلے جو مطالبہ کیا گیا وہ اس کی پہلی حالت کے مطابق تھا۔ پھر جو کیا گیا تو وہ اسکی دوسری حالت کے مطابق تھا۔ اسی طرح جیسے جیسے حالت ترقی کرتی چلی گئی، مطالبے بھی بڑھتے چلے گئے

پس یہ تو صحیح نہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بڑھکر مجھے اشاعت کا شوق ہے اور ان سے بڑھکر مجھے دین کی خدمت کرنے کا خیال ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بڑھ کر اشاعت اور خدمت دین کا شوق کیسے ہو سکتا ہے؟ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں جاہلیت زیادہ تھی، لوگ بالکل ابتدائی حالت میں تھے۔ لیکن میرے زمانہ میں جو لوگ ہیں وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے تربیت یافتہ ہیں اس لئے اگر ان سے کوئی زیادہ مطالبات کئے جاتے ہیں تو وہ ان کی ترقی یافتہ حالت کے لحاظ سے ہیں اور پھر ان کو اور بھی ترقی دینے کے لئے ہیں۔ دیکھو اگر ایک مالک بیمار خادم سے تھوڑا سا کام لے کر اسے چھوڑ دے اور ایک داروغہ اس سے سارا دن کام لے جبکہ وہ تندرست ہے تو کوئی یہ اعتراض نہیں کر سکتا کہ دیکھو جی مالک تو تھوڑا سا کام لے کر چھوڑ دیتا تھا۔ لیکن داروغہ اس سے سارا دن کام لیتا ہے۔ اس کا یہ جواب ہے کہ اس وقت وہ بیمار تھا اور زیادہ کام نہیں کر سکتا تھا لیکن اس وقت تندرست ہے اور سارا دن کام کرنے کے قابل ہے۔ یہی حال ہماری جماعت کا ہے کہ ابتداء میں وہ ایسی قربانیاں نہیں کر سکتی تھی جیسی اب کر سکتی ہے۔ اور ایک زمانہ آ رہا ہے کہ اس میں جو قربانیاں ہماری جماعت کر سکے گی آج نہیں کر سکتی۔ پس جن دوستوں نے یہ خیال کیا ہے کہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ خدمتِ دین کا شوق رکھتا ہوں یا میں نے آپ کی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز کیا ہے یا میں نے چندوں اور وصیتوں کی شرح میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے، انہوں نے غلطی کی ہے۔ جو اس قسم کے خیال کو دل میں جگہ دیتا ہے ایسے خیالات ترقی کے راستے میں روک ہو جاتے ہیں۔ پس اگر میں اللہ تعالیٰ کی اس منشاء کو دیکھتے ہوئے کہ ان سلسلوں کی ترقی ان کی قربانیوں کی طرح آہستہ آہستہ ہوتی ہے جو عیسوی مماثلت رکھتے ہیں اس تدریجی ترقی کے ساتھ ساتھ قدم نہ بڑھاؤں تو یہ ایک خلافِ قدرت فعل ہوگا۔ اور ہر وہ فعل جو خلافِ قدرت ہو خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہوتا ہے۔ اور اس کے کرنے سے کوئی شخص خدا کو خوش نہیں کر سکتا۔

حضرت صاحب نے جو کچھ کیا وہ تمہاری ابتدائی حالت کو مدنظر رکھ کر کیا مگر اب وہ تمہاری ابتداء نہیں۔ اب خالی ایمان ہی نہیں بلکہ دس یا بیس یا تیس سال کی مجموعی طاقت بھی ساتھ ہے۔ اس لئے آج جس قربانی کی امید تم سے کی جا سکتی ہے اس وقت نہیں کی جا سکتی تھی۔ اور جیسا کہ میں نے بتایا جو مثیل موسٰے نبی تھے ان میں پہلے تزکیہ اور طہارت اور بعد میں قربانیاں ہوتی ہیں۔ اور جو مثیل مسیح ہیں ان میں تزکیہ قربانیوں کے بعد ہوتا ہے۔ یہی اصول یہاں بھی جاری ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت صاحب مثیلِ مسیح ہیں۔ پس ہمارا تزکیہ قربانیوں کے بعد ہے۔ جوں جوں ہم قربانیاں کرتے چلے جائیں گے توں توں ہمیں تزکیہ اور طہارت حاصل ہوتی جائے گی۔ اور جتنی دیر ہم قربانیوں

میں لگائیں گے اتنی دیر ہمیں تزکیہ حاصل کرنے میں ہوگی۔ پس اگر تزکیہ چاہتے ہو تو قربانی میں جلدی کرو۔
دونوں عیدیں مقررہ مہینوں کے بعد آتی ہیں اور ان دونوں میں یہ تمیز ہے کہ ایک عید تو مقررہ قربانیوں کے بعد آتی ہے اور ایک کے ساتھ یا بعد قربانی کی جاتی ہے۔ اسی طرح عیسوی سلسلوں میں قربانی پہلے ہوتی ہے اور تزکیہ پیچھے اور موسوی سلسلوں میں تزکیہ پہلے اور قربانی بعد میں۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام اپنی زندگی میں ہی بادشاہ ہو گئے لیکن حضرت عیسےٰ علیہ السلام اپنی زندگی میں بادشاہ نہ ہو سکے۔ بلکہ ان کے بعد ان کے پیروؤں کو بادشاہت ملی۔ یہی حال حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہے۔ پس نادان ہیں وہ جو کہتے ہیں ترقی نہیں کی۔ ہم کہتے ہیں ترقی بعد میں آتی ہے پہلے قربانیوں کو تو اس حد تک پہنچاؤ جس حد پر پہنچ کر کھلی کھلی ترقیاں حاصل ہوتی ہیں۔

اس سے دونوں قسم کے سلسلوں کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہ ہمارے لئے سبق ہے لیکن بڑا سبق اصلی واقعہ سے نکلتا ہے اور وہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قربانی ہے۔

دنیا میں مختلف طبائع ہوتی ہیں، بعض لوگ ماں باپ سے محبت کرتے ہیں اور دوستوں یاروں کی پرواہ نہیں کرتے۔ بعض ماں باپ کے احکام کی اتنی قدر نہیں کرتے جتنی دوستوں کی خواہشات کی قدر کرتے ہیں۔ بعض دوستوں سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور رشتہ داروں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ بعض رشتہ داروں کی دلداری کرتے ہیں اور دوستوں کا خیال نہیں کرتے۔ پھر بعض ایسے ہوتے ہیں جن کے تعلقات بچوں سے زیادہ ہوتے ہیں اور بڑوں کی طرف وہ کبھی دیکھتے نہیں۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خدا تعالےٰ کے لئے ان تینوں قسم کے تعلقات کی قربانی کی جب آپ نے دعویٰ کیا تو رشتہ داروں اور دوستوں نے مقابلہ کیا، آپ نے ان کی پرواہ نہ کی۔ آپ نے اپنے اَبْ سے خدا کے لئے مقابلہ کیا۔ دوسرے اقران قوم سے محبتیں ہوتی ہیں آپ نے ان کا بھی مقابلہ کیا۔ دوستوں نے مخالفت کی دوستوں کا بھی مقابلہ کیا۔
شاید کوئی کہے ان کے ساتھ محبت نہ ہوگی۔ اس لئے ان کی محبت کو قربان کر دیا اور ان کا مقابلہ کیا۔ ان کے بالمقابل شاید اولاد سے زیادہ محبت ہوگی، کیونکہ عام طور پر ماں باپ کو بچوں سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ میں نے ایسے ماں باپ کو دیکھا ہے جو بچوں کی خاطر سب محلے سے لڑتے رہتے ہیں۔ تو دنیا میں مختلف طبائع ہوتی ہیں۔ کوئی کہہ سکتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ماں باپ دوست یار چھوڑ دیئے۔ ممکن ہے ان کے ساتھ زیادہ محبت نہ ہو اور بچوں کے ساتھ زیادہ محبت ہو، ان کو نہ چھوڑ سکتے۔ خدا نے کہا۔ اچھا لڑکے کی قربانی کر۔

لڑکا بھی اکلوتا لڑکا اور وہ بھی جو بڑھاپے میں ہؤا۔ یہ تو خدا کا فضل تھا کہ اس کے بعد اسحٰقؑ بھی پیدا ہو گیا ورنہ امید نہیں تھی۔ اس وقت ایک ہی لڑکا تھا اور وہ اسمٰعیلؑ تھا۔ خدا نے جب اس کی قربانی کرنے کو کہا تو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اب نہ اولاد، نہ دوست نہ ماں باپ تھے جو قربان کرنے سے رہ گئے۔ انہوں نے خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کے لئے ان میں سے کسی کی پرواہ نہ کی۔ وہ سب کو قربان کرنے کے لئے تیار تھے۔ دوست بھی، ماں باپ بھی، اولاد بھی اور ساری اولاد، اس وقت اسمٰعیلؑ ساری اولاد ہی تھی۔ ماں باپ اور دوستوں کو قربان کر دیا۔ وطن کو چھوڑ دیا۔ اب کوئی رشتہ دار بھی نہیں مل سکتا تھا تو اس ساری قربانی کی یادگار میں اس عید کو قائم کیا گیا۔

اس قربانی کی حقیقت بتانے میں بائیبل اور قرآن میں فرق ہے۔ بائیبل جس رنگ میں اسے بیان کرتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تحریف ہو گئی ہے۔ لیکن قرآن کریم اسے جس عمدگی کے ساتھ بیان کرتا ہے اس سے اس واقعہ کی اصل حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ بائیبل کہتی ہے کہ خدا نے ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ اپنے اکلوتے اسحٰقؑ کو قربان کر۔[1] ابراہیمؑ نے کہا۔ قربانی کے لئے سامان نہیں۔ خدا نے کہا۔ یہ قربانی ضرور کرنی چاہیئے۔ تب ابراہیمؑ اسحٰقؑ کو باہر لے گئے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اور قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ابھی چھری پکڑی ہی تھی کہ خدا تعالےٰ کے فرشتے نے آواز دی۔ اس کو مت قربان کر اور ایک مینڈھا اس کے عوض قربان کرنے کے لئے وہاں موجود کر دیا گیا۔[2] مگر قرآن شریف کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ لڑکے کو قربان کریں۔ بلکہ آپ نے رؤیا دیکھی تھی کہ وہ اپنے لڑکے کو خدا تعالےٰ کی راہ میں ذبح کر رہے ہیں۔ اور اس رؤیا کی بناء پر وہ اپنے لڑکے کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ بائیبل کہتی ہے بیشک قربان نہیں کیا گیا مگر یہ ایک آزمائش تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کی گئی۔[3] لیکن ہم کہتے ہیں آزمائش کس طرح ہو گئی کیونکہ آزمائش دو طرح ہوتی ہے۔ یا تو جس کی آزمائش کی جائے اسے بتانے کے لئے کہ تیرا ایمان پختہ ہے۔ یا دوسرے لوگوں کو بتانے کے لئے کہ یہ خدا تعالےٰ پر ایمان رکھنے میں اتنا مضبوط ہے لیکن جو آزمائش ابتلاء ہوتی ہے وہ نبی پر نہیں آتی۔ رہی قربانی، بائیبل کہتی ہے کہ یہ پوشیدہ قربانی ہوئی ہے کیونکہ عملاً ہوئی نہیں۔ اور اگر فی الواقع ہوتی نہیں تو یہ بات ہی لغو ہو جاتی ہے۔ رہی تیسری قسم کہ علی الاعلان قربانی ہو۔ مگر علی الاعلان ہوئی نہیں تو ان صورتوں میں اگر اس پر غور کیا جائے تو یہ الہام اگر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہؤا کہ لڑکے کی قربانی کر تو بے وجہ ہؤا تھا کیونکہ جب وہ قربانی فی الواقع ہوتی نہیں تھی تو ایک ایسی بات کے لئے کسی کو کچھ کہنا جو کچھ کرنی ہی نہیں بالکل بے وجہ ہے مگر قرآن شریف ان سب باتوں کے

بالمقابل اسے خواب بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں جسے انہوں نے چاہا کہ پورا کریں۔

قرآن شریف کے بیان کے مطابق یہ سب کچھ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خواب کا نظارہ تھا اور قرآن شریف کے بیان سے بڑھکر صحیح اور سچا بیان اور کس کا ہو سکتا ہے پس جبکہ یہ ایک خواب تھا تو یہ ضروری ہے کہ اس کی کوئی تعبیر ہو اور جب ہم واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو اس خواب کی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ جب دیکھا کہ بیٹا قربان کر رہے ہیں تو یہ پیشگوئی تھی کہ وہ ایک دن اسے جنگل میں اپنے ہاتھ سے چھوڑ آئیں گے۔ قرآن شریف میں یہ الفاظ ہیں۔ یٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ اے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ اب حضرت ابراہیمؑ خود اپنے ہاتھ سے اسے جنگل میں چھوڑ آئے۔ اور جنگل بیابان میں چھوڑ آنے سے خواب پوری ہوگئی۔ مگر بائیبل جس رنگ میں یہ پیشگوئی بیان کرتی ہے وہ پوری نہیں ہوتی۔ تو جنگل میں چھوڑ آنا چھری پھیر دینے کے برابر ہوگیا۔ مجنونوں پر چھری اسی طرح پھرا کرتی ہے کہ محبت کو قطع کر دیا جائے۔ دوستوں کی محبت اور رنگ میں انہوں نے قطع کی۔ ماں باپ کی اور رنگ میں اور اولاد کی اور رنگ میں۔ تو قرآن کے بیان میں حکمت ہے اور بائیبل میں ظالمانہ قربانی بتائی جاتی ہے۔

رہی یہ بات کہ کس کو قربانی کرنے کا حکم ہوا تھا۔ عیسائی کہتے ہیں اسحٰقؑ کو لیکن ہم کہتے ہیں اسمٰعیلؑ کو۔ کیونکہ جب یہ خواب دیکھی گئی تب ایک ہی ان کا بیٹا تھا اور وہ اسمٰعیلؑ تھا پس اسحٰقؑ کو قربان کرتے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نہیں دیکھا تھا بلکہ اسمٰعیلؑ کو دیکھا تھا۔ کہ آپ اسے قربان کر رہے ہیں۔ پھر یہ قربانی صرف حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کی نہیں تھی بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ کی بھی تھی۔ کیونکہ درحقیقت وہی تھے جو قربان ہو رہے تھے اور بائیبل میں تو جس کی قربانی ہے اس سے پوچھا بھی نہیں گیا کہ کیا تو بھی قربان کئے جانے پر راضی ہے یا نہیں اور صرف اتنا بیان کیا گیا ہے کہ اسحٰقؑ نے جب سوختنی قربانی کے سامان دیکھے تو باپ سے سوال کیا

”آگ اور لکڑیاں تو ہیں پر سوختنی قربانی کے لئے برہ کہاں؟“

جس کا جواب باپ کی طرف سے صرف یہ دیا گیا۔

”خدا آپ ہی اپنے واسطے سوختنی قربانی کے لئے برہ کی تدبیر کرے گا۔“[۲۴]

پس یہاں سے اگر کچھ نتیجہ نکلتا ہے تو یہی کہ صرف حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قربانی کا ذکر ہے۔ اور جس کی قربانی کی جانی ہے اس کی آمادگی کا کوئی ذکر نہیں اور نہ ہی اس سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا ہے۔ حالانکہ مرنے والے کی قربانی بڑی ہوتی ہے تو بائیبل میں تو صرف حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قربانی کا ذکر آتا ہے۔ لیکن قرآن شریف بتاتا ہے

کہ جب حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے اسمٰعیلؑ کو ذبح کر رہے ہیں تو انہوں نے بعد میں اسمٰعیلؑ سے اس کے متعلق پوچھا۔ چنانچہ قرآن شریف میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی یعنی اے بیٹے! مَیں خواب میں دیکھ تو رہا ہوں کہ تمھیں ذبح کر رہا ہوں۔ اب تمہاری کیا منشاء ہے، کیا تم چاہتے ہو کہ فی الواقع تم ذبح کر دیے جاؤ۔ اگر تیری مرضی ہو تو مَیں اس کام کو کروں۔ گو یہ کام میرے ہاتھوں ہونا ہے مگر ہے درحقیقت قربانی تیری۔ کیونکہ تم نے قربان ہونا ہے۔ بائیبل تو اپنے بیان سے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نعوذ باللہ دھوکہ باز قرار دیتی ہے۔ مگر قرآن میں ایسا نہیں ہے بلکہ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی کے الفاظ اس میں موجود ہیں جن میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت اسمٰعیلؑ سے پوچھتے ہیں۔ آیا تو تیار ہے۔ اگر تو تیار ہے تو پھر یہ کام کیا جائے۔ ان دونوں بیانات میں کتنا عظیم الشان فرق ہے اور واقعہ کی نوعیت بتاتی ہے کہ قرآن کریم کا بیان سچا ہے۔ بائیبل تو کہتی ہے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت اسحٰقؑ کو بتاتے ہی نہیں کہ مَیں تمھیں قربان کرنے کے لئے جاتا ہوں مگر قرآن صاف بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے صاف صاف حضرت اسمٰعیلؑ کو بتا دیا کہ مَیں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ پھر بائیبل اپنے بیان کو یہیں تک چھوڑ دیتی ہے۔ لیکن قرآن آگے اس بات کو بھی بیان کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے ان کی مرضی بھی دریافت کی۔ پھر یہی نہیں کہ صرف یہ سوال کر دیا ہو کہ تیری اس کے متعلق کیا مرضی ہے بلکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے جواب کو بھی بیان کر دیا۔ کہ اے باپ! جو کچھ تجھے حکم دیا گیا ہے بلا تامّل اسے پورا کر۔ انشاء اللہ تعالیٰ تو مجھے صابرین میں سے پائے گا۔ اس سارے واقعہ کو قرآن شریف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى۔ قَالَ يٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ۔ سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ۔ یعنی جب اسمٰعیلؑ سیانے ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا خواب ان کے سامنے بیان کیا اور ان کی مرضی دریافت کی۔ جس کا جواب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام يٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ دیتے ہیں۔ یعنی اے باپ! آپ اس کے متعلق اپنا حصہ ادا کریں۔ مَیں اپنا حصہ ادا کروں گا۔ یہ سچی قربانی تھی جس میں قربان ہونے والے کی رضامندی بھی شامل تھی۔

رہی یہ بات کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے کیوں آمادگی ظاہر کی۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء پہلے دستوروں کو قائم رکھتے ہیں اور اس وقت تک ان کو قائم رکھتے ہیں جب تک وہ دائمی صداقتوں کے خلاف نہ ہو جائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں انسانی قربانی ہوتی تھی۔

وہ جانتے تھے کہ خدا تعالیٰ مجھ سے ناجائز کام نہیں کرائے گا۔ اس کے ہاتھ میں میرا ہاتھ ہے اگر وہ اس کی منشاء کے خلاف چلنے لگے گا تو اسے روک لے گا۔ اور ادھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں انسانی قربانی کے خلاف کوئی نص نہ تھی۔ پس یہ اس زمانہ میں شرعی حکم تھا جس کے سامنے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنے آپ کو جھکا دیا۔ اور ذبح کئے جانے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس انسانی قربانی کا رواج حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیانی زمانہ میں ہوا۔ پس حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اس بات کا کوئی الزام نہیں آسکتا۔ کیونکہ آپ انسانی قربانی کے لئے آمادہ ہوئے اور ایسا ہی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پر بھی کوئی الزام نہیں آسکتا کہ کیوں آپ نے اپنے آپ کو اس قربانی کے لئے پیش کر دیا اور آمادگی ظاہر کر دی۔

بعض کام خدا تعالیٰ بعض خاص خاص لوگوں کے ہاتھ سے اس لئے کراتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے سبق ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ قربانی درحقیقت اولاد کی محبت کی قربانی تھی۔ جیسا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بیٹا کہلانے والے شخص کی بیوی سے نکاح پڑھایا گیا۔ جس سے یہ بات بتانی مقصود تھی کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں بن سکتا۔ کیونکہ اس وقت عرب میں یہ دستور تھا کہ جس کو بیٹا کہہ دیتے وہ بیٹا ہو جاتا۔ اور پھر اس کی بیوی سے وہ شخص جس کا کہ وہ بیٹا کہلاتا نکاح نہ پڑھا سکتا۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ سے خدا تعالیٰ نے یہ کام کرا کر بتا دیا کہ یہ دستور غلط ہے اور آئندہ اس سے بچا جائے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ سے اولاد کی محبت کو خدا کی محبت کے لئے قربان کر دینے کا فعل کرا کے بتا دیا کہ خدا کی محبت کے سامنے کسی اور کی محبت دل میں نہیں ہونی چاہیئے اور اگر ہو تو اسے قربان کر دینا چاہیئے۔ غرض حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ظاہر طور پر اس خواب کو پورا کرنے کے لئے جونہی حضرت اسمٰعیلؑ کو لٹایا۔ آواز آئی کہ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا۔ اے ابراہیمؑ تو ضرور ہی اپنی خواب کو پورا کرے گا۔ جب تو نے اس کو ظاہری صورت میں پورا کرنے کے لئے تیاری کر دی تو جو معنے اس کے فی الواقع ہیں۔ وہ بھی ضرور پورے کرے گا۔ صَدَّقَ کے معنے ہیں سچا سمجھنا یعنی تجھے اپنی خواب پر بڑا ہی یقین ہے تو نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ شائد اس کے کچھ اور معنے ہوں اور اس کو پورا کرنے پر تُل گیا۔ قَدْ وقوعہ پر دلالت کرتا ہے کہ ہو چکا ہے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خواب کے مطابق پورے یقین اور ایمان کے ساتھ اس رنگ میں اس کام کے کرنے کا تہیہ کیا کہ گویا وہ کر ہی لیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ کو اپنے خواب پر پورا پورا بھروسہ تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ خدا تعالیٰ میرا ہاتھ ناجائز بات پر نہیں اُٹھنے دے گا۔ اسی بناء پر انہوں نے یہ کام کیا۔ چنانچہ ان کے ایمان اور یقین اور آمادگی کو دیکھ کر خدا تعالیٰ نے کہا کہ تو نے گویا

اس کام کو کر ہی لیا۔ غرض حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس فرمانبرداری کا یہی نتیجہ ہے کہ بائیبل میں ان کے متعلق آتا ہے۔ اے ابراہیم! میں تیری نسل کو ریت کے ذروں کی طرح بڑھاؤنگا اور وہ کمیّت اور تعداد اور زمانہ اور مکان کے لحاظ سے بھی بڑھے گی اور دنیا کے پھیلاؤ کے لحاظ سے وہ پھیلے گی اور ہر زمانہ کے لحاظ سے اسے برکت دی جائے گی۔ یہ سب ابراہیمی قربانی تھی جو اس قدر پھل لائی۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ ابراہیمی قربانی کیا تھی۔ وہ قربانی بالیقین ترقیوں کا ذریعہ تھی جس کے ذریعہ ان کی نسل بڑھی پھلی اور پھولی۔ آج ہمیں بھی یہی دیکھنا چاہیئے اور ہمیں بھی کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم بھی خدا کی محبت کے سامنے سب محبتوں کو قربان کر سکیں تا ہم بھی ترقی حاصل کرنے والے بنیں۔ اگر کوئی قوم ضائع ہوتی ہے تو اسے دیکھنا چاہیئے کہ کس طرح وہ بچ سکتی ہے اس کا ضائع ہونے سے بچنا اور غالب آنا اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ ابراہیمی قربانی کرے۔ ابراہیمی قربانی کیا ہے۔ خاندان کے تمام افراد کی قربانی ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ آپ نے خواب میں دیکھا میں قربانی کر رہا ہوں۔ اور اس کے مطابق قربانی کرنے کی آپ نے کوشش بھی کی۔ مگر چونکہ خدا تعالےٰ کی یہ منشاء نہ تھی اس لئے وہ اس رنگ میں نہ ہوئی بلکہ اس رنگ میں ہوئی جو خدا تعالےٰ کی منشاء کے مطابق تھا۔ اور خدا تعالےٰ کی منشاء یہ تھی کہ وہ اپنی اولاد کی محبت کو قربان کر دیں اور اسے دُور جنگل میں چھوڑ آئیں۔ خاندان کا مجموعہ مرد بیوی اور اولاد ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کا بھی یہی مجموعہ تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود، حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ۔ یہ تینوں تھے جن سے یہ خاندان تھا۔ مگر خدا کے لئے آپ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی ماں ہاجرہ کو دور جنگل میں چھوڑ دیا اور یوں ان کی محبتوں کو قربان کر دیا۔ وہ چھری جو خواب میں اولاد کو ذبح کر رہی تھی، وہ یہی تھی جو اس رنگ میں چلی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہ صرف اپنی اولاد کی قربانی کی بلکہ خدا کے لئے اپنی اولاد کے ساتھ اپنی بیوی کی بھی قربانی کر دی۔ پس یہ قربانی اکیلے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہی نہ تھی بلکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ کی بھی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تو اس طرح کہ وہ خدا کے لئے اپنے لڑکے کو جنگل میں چھوڑ آئے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اس طرح کہ انہوں نے خدا کے لئے جنگل میں چلے جانا منظور کر لیا۔ اور حضرت ہاجرہ کی اس طرح کہ وہ خدا کے لئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو لے کر جنگل میں چلی گئیں۔ اس وقت اسحٰق نہ تھے، وہ بعد میں پیدا ہوئے تھے یہ قربانی صرف ان تینوں کی تھی۔ اور ان تینوں کی ہی قربانی مکمل ہوگئی اور یہ اس قربانی کا مکمل ہونا ہی تھا جس کے بعد خدا تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ وعدہ کیا کہ تیری اولاد

ستاروں کی طرح بے شمار ہوگی اور جہاں کہیں وہ جائے گی برکت دی جائے گی۔ تو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ قربانی ترقیات کا باعث ہوگئی۔

اب بھی ترقی پانے کا یہی راستہ ہے۔ کوئی قوم ترقی نہیں پا سکتی جب تک اس قوم کے تمام مرد تمام عورتیں اور تمام بچے قربانیاں نہیں کرتے۔ دنیا میں وہی قومیں بڑھیں جن کے مرد بھی اور عورتیں بھی اور بچے بھی قربانیاں کرتے رہے۔ پس یہ جو عید ہے یہ درحقیقت ہمیں قربانیوں کا سبق دیتی ہے اور اس بڑی قربانی کو یاد کراتی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کی اور جس کے سبب وہ ترقی پا گئے۔ یہ قربانیوں کی عید ہے۔ بے شک ہم اس موقع پر جانوروں کی قربانیاں کرتے ہیں لیکن یہ قربانیاں ہمیں دوسری قربانیاں کرنے کا سبق پڑھانے والی بنیں تب حقیقی قربانیاں ہیں۔ اس لئے مَیں پھر کہتا ہوں کہ ان قربانیوں کی طرف بھی توجہ کرو، چھوٹا ہو یا بڑا، عورت ہو یا مرد، ہر ایک اس قسم کی قربانیوں کے لئے تیار ہو کیونکہ ان کے بغیر ترقی نہیں ہوسکتی۔ لیکن مَیں دیکھتا ہوں کہ بعض مرد تو قربانیاں کرتے ہیں مگر ان کی بیویاں اور بچے نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ترقی نہیں ہوتی۔ پس چاہیئے کہ سب کے سب دین کے لئے قربانیوں میں لگ جائیں۔ اگر مرد قربانیاں کرنے والے ہوں اور عورتیں اور بچے نہ ہوں تو یہ بھی کوئی عمدہ بات نہیں۔ اور اگر مرد اور عورتیں قربانیاں کرتے ہوں اور بچے نہ کرتے ہوں تو پھر بھی ترقی نہیں ہوسکتی۔ پھر اگر مرد اور بچے قربانیاں کرتے ہوں اور عورتیں نہ کرتی ہوں تو یہ بات بھی ترقی کے لئے مضر ہے۔ ترقی صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ مرد بھی قربانیوں میں لگے ہوئے ہوں۔ عورتیں بھی قربانیوں میں لگی ہوئی ہوں اور بچے بھی قربانیوں میں لگے ہوئے ہوں۔ ان قربانیوں کے ساتھ ساتھ اولاد کی تربیت بھی ہے۔ ایک عورت اگر اپنی اولاد کی تربیت عمدہ کرتی ہے تو یہ بھی اس کی ایک قربانی ہے کیونکہ وہ ایسے مرد تیار کر رہی ہے جو قوم کے لئے مفید ہوسکتے ہیں لیکن اگر عورتیں تربیت نہیں کرتیں اور اولاد کی تربیت ایسی نہیں ہوئی جو وقت پر قوم کے لئے مفید ثابت ہو تو وہ کوئی نقش پائیدار نہیں چھوڑ رہیں۔ پس عورتوں کو بالخصوص چاہیئے کہ وہ ان قربانیوں کے ساتھ ساتھ اپنی اولاد کی تربیت کو بھی اچھا بنائیں۔ یہ عید ہمیں قربانی سکھاتی ہے، ہمیں چاہیئے کہ جو کچھ یہ سکھاتی ہے اس پر عمل کریں۔ اگر ہم اپنے آپ کو تو قربان کرتے ہیں اور اپنی عورتوں اور بچوں کو قربان نہیں کرتے تو یہ بھی ہمارے لئے مفید نہیں۔ ہمارے لئے مفید یہی ہے کہ ہم اپنے آپ کو بھی قربان کردیں اور بیوی بچوں کو بھی قربان کردیں اور نہ صرف یہ بلکہ ان میں خود قربان ہونے کی روح پیدا کریں۔ تب جا کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ابراہیم جیسی قربانی کی۔ پس یہ ایک عظیم الشان سبق ہے جو اس قربانی سے ہمیں ملتا ہے اور جس کی یاد کے لئے

ہر سال یہ عید کا دن آتا ہے۔ اگر ہم اس بات کو مدنظر رکھیں کہ یہ دن ہمیں اپنی قربانیوں کا اپنی عورتوں کی قربانیوں کا اور اپنے بچوں کی قربانیوں کا سبق سکھاتا ہے تو یہ دن ہمارے لئے ایسا ہی ہوگا جیسے اور دن۔ پس ہمیں اس سبق کو جو اِن قربانیوں سے ملتا ہے اور جس کی یاد کے لئے یہ دن ہر سال ہم پہ آتا ہے ہر وقت یاد رکھنا چاہیئے۔

بعض لوگ خود تو قربانی کرتے ہیں مگر اپنے بیوی بچوں کی قربانیاں نہیں کر سکتے۔ حضرت صاحب کے ایک مرید تھے جو بڑی قربانیاں کرتے رہتے تھے۔ لیکن ایک دفعہ ان کی بیوی سے کوئی حرکت سرزد ہوئی، حضرت صاحب اس پر ناراض ہوئے تو اس شخص نے کہا کہ میں تو قادیان چھوڑ دوں گا۔ اب اس سے بالکل ہی قادیان چھٹ گئی ہے۔ اسی طرح ایک لڑکے نے ایک مہمان کو تکلیف دی جس پہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے تھپڑ مارا۔ اس سے اس کا باپ بہت بگڑا مگر جلد ہی اس نے معافی مانگ لی۔ تو بعض آدمی اپنی تو قربانی کر لیتے ہیں مگر اپنی بیوی اور بچوں کی نہیں کرتے، اس لئے وہ ترقی کرنے سے بھی رہ جاتے ہیں، اسی لئے قوموں کی ترقی کا اندازہ لگانا چاہیئے جو قومیں یہ تینوں قسم کی قربانیاں کرتی ہیں، وہی ترقی کرتی ہیں۔ پس میں دوستوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ اگر ترقی کے خواہشمند ہیں تو ان قربانیوں کو کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔ جب تک یہ قربانیاں نہیں ہوتیں کوئی قوم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آگے بڑھنا تو کجا اپنے اصل مقام پر بھی قائم نہیں رہ سکتی بلکہ پیچھے گرنے لگ جاتی ہے۔ بعض لوگ تھوڑی سی قربانی کر کے متٰی نصر اللہ کہہ اٹھتے ہیں؛ میں کہتا ہوں نصر اللہ انسان کے اپنے اعمال پر آتی ہے۔ انسان اعمال اس قسم کے بنائے کہ نصر اللہ لانے والے ہوں پھر اگر نصر اللہ نہ آئے تو کہہ سکتا ہے متٰی نصر اللہ۔ لیکن اگر وہ اعمال تو اس رنگ میں نہ کرے کہ نصر اللہ آئے لیکن متٰی نصر اللہ کی پکار لگاتا رہے تو یہ اس کی نادانی ہوگی۔ خدا اس عید کے ذریعہ بھی یہ بتانا چاہتا ہے کہ مرد بچے اور عورتیں جب تک ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ اور ہاجرہ کی طرح قربانیاں نہ کریں متٰی نصر اللہ نہیں کہہ سکتے۔ ہاں اگر وہ اپنی قربانیوں کو ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ اور ہاجرہ کی قربانیوں جیسا بنا لیں اور پھر نصر اللہ میں دیر ہو تو کہہ سکتے ہیں متٰی نصر اللہ۔ پس اگر تم نصر اللہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنی اور اپنی بیوی اور بچوں کی قربانیوں کو ابراہیمؑ۔ اسمٰعیلؑ اور ہاجرہ کی قربانیوں جیسا بناؤ۔

مَیں ابھی اور باتیں بھی کہنا چاہتا تھا۔ مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ خطبہ لمبا ہو گیا ہے اس لئے مَیں اس کو اسی جگہ بند کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالےٰ ہم سب میں ایسا اخلاص تقویٰ اور طہارت پیدا کرے کہ سچے طور پر اپنی اولاد اور اپنے بچوں اور اپنی بیویوں کی قربانیاں کر سکیں

اور ہم اپنے اعمال سے وہ نقش دائم و قائم رکھ سکیں جس کے متعلق اس نے فرمایا ہے کہ اگر انسان کوشش کرے تو وہ ہمیشہ رہ سکتا ہے۔ وہ ہماری کمزوریوں کو دُور کرے اور ان کی وجہ سے ترقیوں میں روک نہ ڈالے اور ہم وہ عہد پورا کرنے والے ہوں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باندھا اور پورا کیا۔ مَیں اپنے لئے بھی اور یہاں کے دوستوں کے لئے بھی اور باہر کے لوگوں کیواسطے بھی اور تمام مخلوق کے لئے بھی دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالےٰ سب کی مدد کرے اور انہیں ہر قسم کی قربانیاں کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین "

(الفضل ۱۳ر جولائی ۱۹۲۶ء صفحہ ۵ تا ۱۲)

۱؎۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۱ تا ۱۰۸

۲؎۔ انسائیکلوپیڈیا ریلیجس اینڈ ایتھکس جلد ۱۱ صفحہ ۳۳

۳؎۔ البقرہ ۲ : ۱۴۴

۴؎۔

۵؎۔ صحیح بخاری کتاب الاضاحی باب قسمۃ الامام الاضاحی بین الناس
سنن ابی داؤد کتاب الضحایا باب حبس لحوم الاضاحی۔ نیل الاوطار ۵/۱۳۶

۶؎۔ صحیح بخاری کتاب المناقب باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم للانصار اصبروا حتّٰی تلقونی علی الحوض۔

۷؎۔ صحیح بخاری کتاب الاشربۃ باب ھل یستأذن الرجل من عن یمینہ فی الشرب لیعطی الاکبر۔

۸؎۔ سفینۃ الاولیاء مصنفہ داراشکوہ صفحہ ۴۲

۹؎۔ نیا تذکرۃ الاولیاء مؤلفہ رئیس احمد جعفری صفحہ ۲۴۵ و صفحہ ۲۴۹ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء۔ گلدستہ کرامات صفحہ ۱۷ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء

۱۰؎۔ مرقس باب ۲ آیت ۲۳

۱۱؎۔ متی باب ۹ آیت ۱۵

۱۲؎۔ صحیح مسلم کتاب الصیام باب اجر المفطر فی السفر اذا تولّی العمل

۱۳؎۔ گنتی باب ۱۱ آیت ۲۶

۱۴؎۔ گنتی باب ۱۱ آیت ۲۹

۱۵؎۔ ملفوظات جلد ۶ صفحہ ۱۴ (حاشیہ)

۱۶؎ ۔ الوصیت صفحہ ۲۹ ۔ ۳۰ مطبوعہ سنہ ۱۹۶۱ء

۱۷؎ ۔ الانفال ۸ : ۶۶

۱۸؎ ۔ روی انہ لما اجتمعت الروم یوم الیرموک استغاث ابو عبیدۃ عمرؓ فامدہ بسعید بن عامر (اسد الغابہ ۲/۳۱۱)

۱۹؎ ۔ رستم کسریٰ ایران کا ایک مشہور و رطاقتور جرنیل تھا ۔

۲۰؎ ۔ اس قسم کی روایت حضرت سعید بن عامر کے بارے میں بیان ہوئی ہے (فتوح الشام واقدی جزء اصفحہ ۱۱۵ ، ۱۱۷ ، ۱۱۸ و الفاروق مؤلفہ شبلی نعمانی صفحہ ۱۲۹)

۲۱؎ ۔ پیدائش باب ۲۲ آیت ۲

۲۲؎ ۔ پیدائش باب ۲۲ آیات ۱۰ تا ۱۳

۲۳؎ ۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۳

۲۴؎ ۔ پیدائش باب ۲۲ آیت ۷ ۔ ۸

۲۵؎ ۔ الاحزاب ۳۳ : ۳۸ ۔ تفسیر درمنثور جلد ۵ صفحہ ۲۰۱

۲۶؎ ۔ پیدائش باب ۲۲ آیات ۱۵ تا ۱۷

۲۷؎ ۔ حیات النبیؐ ۔ مصنفہ شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی حصہ سوم صفحہ ۳۲۹ مطبوعہ نومبر سنہ ۱۹۲۷ء

۲۸؎ ۔ یہ واقعہ حضور رضی اللہ عنہ کے سامنے رونما ہوا (واللہ اعلم بالصواب) اس کے لئے کوئی حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ۔

۱۵

(فرمودہ ۱۱ر جون ۱۹۲۶ء بمقام باغ حضرت مسیح موعود علیہ السلام قادیان)

آج کچھ آواز قدرتاً نیچی ہے کیونکہ طبیعت اچھی نہیں اور کچھ لوگوں کی آواز اُونچی ہے (مجمع میں عورتوں اور بچوں کا شور تھا) اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ سب دوستوں تک آواز پہنچا سکوں گا یا نہیں لیکن چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت ہے کہ عید کی نماز کے بعد خطبہ پڑھا جائے، اس لئے اس سنت کی اِتباع میں مجھے خطبہ پڑھنا چاہیئے خواہ آواز سب تک پہنچے یا نہ پہنچے۔

آج کا دن اپنے اندر ایک خصوصیت رکھتا ہے۔ یہ دن یادگار ہے ایک نئے دَور کی جو دنیا پر آیا۔ یہ دن یادگار ہے ایک نئے دَور کی جس نے پہلے دَور کو ختم کر دیا۔ یہ دن یادگار ہے ایک نئے آدم کی جس نے نئی قسم کی نسل جاری کی۔ یہ دن یادگار ہے اس آدم کی جس کے ذریعہ اہلی اصلاح کا کام شروع ہوا۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دَور اہلی اصلاح کا دَور ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دو بڑی خصوصیتیں حاصل ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ان کے ذریعہ خدا تعالےٰ نے اس جماعت کا نام رکھا جس کے سپرد آخری اصلاح دنیا کی رکھی گئی ہے۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ نے اسلام کی بشارت کے لئے چُنا اور ان کے ذریعہ بتایا کہ آئندہ اسلام کا دَور ہوگا۔[1] اس طرح ایک تو خدا تعالےٰ نے حضرت ابراھیم علیہ السلام کو ذاتی قربانی کے لئے چنا اور دوسری یہ خصوصیت ان کے لئے مقدر فرمائی کہ ان کو اہلی قربانی کے لئے چنا۔ ان کو رؤیا میں دکھایا گیا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کرتے ہیں اور اکلوتے بیٹے کو ذبح کر کے خدا تعالےٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس رؤیا کو عملاً پورا کرنا چاہا کیونکہ اس زمانہ میں انسانوں کی قربانی عام تھی۔ اور جب تک نبی کوئی خاص حکم نہیں پاتا۔ اس وقت تک عام مروّجہ باتوں کو ہی قبول کرتا ہے چونکہ مذہب کے نام پر اس وقت تمام کے تمام مذاہب انسانی قربانی کے عادی تھے اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمجھا کہ اللہ تعالےٰ اس قربانی کو قائم کرنا چاہتا ہے اور مجھ سے بھی یہی چاہتا ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے یہ نظر انداز کر دیا کہ ۹۰ سال کی عمر میں ان کو بیٹا ملا تھا[2] انہوں نے چاہا کہ اس بیٹے کو بھی خدا کی رضا کے لئے قربان کر دیں۔ مگر اللہ تعالےٰ انہیں اور سبق دینا چاہتا تھا اور وہ عظیم الشان سبق تھا جس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے اب بھی مسلمان تباہ ہو رہے ہیں۔ لوگ اٹھتے

ہیں اور بکرے کی قربانی کر دیتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ بکرے کی قربانی کس بات کی علامت ہے اور خدا تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا چاہا تھا۔

مَیں نے اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو قربانیوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے پہلے اس قربانی کو لیتا ہوں جس میں خدا تعالےٰ نے چاہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ اپنی قدرت دکھائے اور ایک عظیم الشان نشان قائم کرے۔ اس وقت بالکل ممکن تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ ملک چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں چلے جاتے اور اس طرح اپنی جان بچا لیتے مگر انہوں نے ایسا نہ کیا۔ اور خدا تعالےٰ کے حکم کے ماتحت اپنی جان دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ اس وقت ہوا جب عراق میں ان کی قوم نے فیصلہ کیا کہ ان کو جلا دیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بچپن سے ہی ایسی فطرت رکھتے تھے جو توحید کی تائید میں اور شرک کے خلاف تھی۔ چنانچہ جب ان کے رشتہ داروں نے ان سے شرک کے متعلق مباحثہ کیا تو انہوں نے سختی سے اس کا ردّ کیا۔ ان کا ایک خاندانی بُت خانہ تھا اس سے عملی طور پر نفرت اور شرک سے بیزاری کے اظہار کے لئے انہوں نے اس طرح کیا کہ بتوں کو توڑ دیا[1]۔ یہ بُت جس بُتخانہ کے توڑے گئے وہ کسی دوسرے کا نہ تھا۔ اگر دوسروں کا ہوتا تو اس کا توڑنا جائز نہ ہوتا۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کا تھا اور انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ اور چونکہ پتھر پتھر ہی ہوتا ہے۔ اس لئے انسان کی ملک تھا انہوں نے اس بُت خانہ کو کہ جو اُن کے لئے آمدنی کا ذریعہ اور عزّت کا باعث تھا توڑ دیا۔ جب انہوں نے بتوں کو توڑا تو سارے مُلک میں جوش پیدا ہو گیا۔ اور بادشاہ کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا۔ ملک کے دستور اور بادشاہ کے قوانین کے مطابق اس فعل کی سزا جلا دینا تھا[2] اور اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے موقع تھا کہ بتوں کو توڑنے کے بعد اس ملک سے باہر چلے جاتے مگر وہ نہ گئے حالانکہ جانتے تھے کہ مُلک کے قانون کے مطابق اس کی سزا جلا دینا ہے۔ یہ ایک پرانی رسم تھی کہ جو بتوں کی ہتک کرتا اسے جلا دیا جاتا۔ کیونکہ بتوں کی ہتک کرنے کو ارتداد سمجھا جاتا اور ارتداد کی سزا پرانے زمانہ میں یا تو جلانا تھی یا سنگسار کرنا[3]۔ چنانچہ یورپ میں جب پروٹسٹنٹ عقیدہ کے عیسائی پیدا ہوئے تو انہیں مرتد قرار دے کر آگ میں جلا دیا جاتا تھا[4] اس کے مقابلہ میں ایشیا میں سنگسار کرنے کا رواج تھا[5]۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معلوم تھا کہ بتوں کو توڑنے کی وجہ سے کیا سزا ہو گی۔ اور وہ وہاں سے بھاگ سکتے تھے مگر خدا تعالےٰ چاہتا تھا کہ نشان دکھائے اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا، ٹھہرو اور وہ ٹھہرے رہے اور اس طرح اپنے نفس کی قربانی کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ آخر ان لوگوں نے آگ جلائی اور اس کے اندر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ڈال دیا لیکن عین اس موقع پر بادل آیا جس نے

آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام صحیح سلامت نکل آئے۔ چونکہ بُت پرست بہت وہمی ہوتے ہیں اس لئے جب اِدھر انہوں نے آگ جلائی اُدھر بادل آگیا اور آگ بجھ گئی تو انہوں نے سمجھا خدا کی مشیت یہی ہوگی اس لئے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چھوڑ دیا۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذاتی قربانی تھی۔ اس کے بدلہ میں اللہ تعالےٰ نے انہیں ذاتی کمال بخشے اور وہ مقام عطا کیا جس کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام قیامت تک مٹ نہیں سکتا۔ اس کے بعد دوسری قربانی اولاد کی قربانی تھی اس میں بھی حکمت تھی اور وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل تمدّن قائم نہ ہُوا تھا اور اہلی زندگی کمال کو نہ پہنچی تھی انسان کا کمال ذاتی اور شخصی زندگی تک تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ اہلی زندگی کا دَور قائم کیا گیا۔ اس کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رُویا دکھائی گئی جو یہ تھی کہ وہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ جانتا تھا کہ ابراہیمؑ اس کا وفادار بندہ ہے جو کچھ اس نے دیکھا ہے، اسے پورا کر دے گا۔ مگر اس طرح وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک سبق دینا چاہتا تھا جب انہوں نے لوگوں کے دستور کے مطابق اپنے بیٹے سے کہا کہ مَیں تمھیں قربان کرنا چاہتا ہوں اور بیٹا بھی اس کے لئے تیار ہوگیا تو خدا تعالےٰ نے کہا: یہ نہیں دُنبہ لو اور اسے ذبح کرو، وہ بیٹے کی قربانی کا قائم مقام ہوگا۔ اب یہ سیدھی بات ہے کہ بیٹا اور دُنبہ برابر نہیں ہوسکتے۔ اگر کسی کو توفیق ہو تو وہ ہزار دُنبہ بھی قربان کر دے گا مگر بیٹا قربان نہ کرے گا۔ پس دُنبہ بیٹے کا قائم مقام نہیں۔ نہ ایک نہ دس نہ ہزار نہ لاکھ نہ دس لاکھ۔ ممکن ہے کسی کو توفیق نہ ہو اور وہ ایک دنبہ بھی اپنے بیٹے کی بجائے نہ دے سکے۔ لیکن اگر توفیق ہو تو مال کا آخری حبّہ تک دے دیگا مگر بیٹے کو ذبح نہ ہونے دے گا۔ اگر ایک شخص دس لاکھ دنبہ ذبح کرنے کی طاقت رکھتا ہے تو وہ اسے اپنے لئے بہت آسان سمجھے گا بہ نسبت اس کے کہ اپنے بیٹے کو ذبح ہونے دے۔ پھر ایک دنبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے کس طرح ان کے بیٹے کا قائم مقام بن گیا۔ وہ مالدار انسان تھے ان کی ہزارہا بھیڑ بکریاں اور گائیں تھیں اور ان کے مال کا یہ حال تھا کہ ان کے ہاں اجنبی آتے ہیں ان کے آگے بغیر پوچھے بچھڑا ذبح کر کے رکھ دیتے ہیں اور وہ کھاتے ہی نہیں۔ ایسے انسان کے لئے ایک دنبہ کیا ہستی رکھتا ہے۔ وہ تو کتّے کے پلّے کے لئے بھی دُنبہ ذبح کر سکتے تھے۔ پھر ان کے لئے اسمٰعیل کی خاطر دنبہ ذبح کرنے میں کونسی مشکل تھی۔ اور اگر کوئی مشکل نہ تھی تو اسمٰعیلؑ کے بدلے ایک دنبہ کس طرح قبول ہُوا۔ بات یہ ہے دُنبہ اسمٰعیلؑ کے بدلے ذبح نہیں ہوُا۔ بلکہ اس میں اور حکمت تھی اور وہ حکمت یہی تھی جس سے اصلی اور حقیقی زندگی کا دَور شروع ہوا۔

عام طور پر انسان اولاد کو خوب کھلاتا پلاتا اور اس کی خاطر کرتا ہے۔ جتنی زیادہ ناجائز

محبت کرنے والے ماں باپ ہوتے ہیں، اتنی ہی زیادہ انہیں یہ فکر ہوتی ہے کہ ان کے بچے خوب کھائیں پئیں۔ مگر یہ حیوانوں والی زندگی ہوتی ہے، اس طرح وہ گویا اولاد نہیں پالتے۔ بلکہ دُنبہ پالتے ہیں۔ کیونکہ دنبہ کے لئے صرف کھانے پینے اور رہائش ہی کی فکر کرنی پڑتی ہے اور بہت لوگ اپنی اولاد کی بھی اتنی ہی فکر کرتے ہیں کہ اسے اچھا کھلائیں، اچھا پلائیں اچھی رہائش ہو، اچھا پڑا پہنائیں، یہ دنبہ کی نسبت زائد بات ہوگی۔ کیونکہ دنبہ کپڑے نہیں پہن سکتا۔ لیکن دیکھا ہے بعض لوگ دنبوں کو بھی جھولیں پہناتے ہیں۔ اللہ تعالٰے نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رؤیا میں یہ دکھایا کہ اسمٰعیلؑ کو ذبح کر دو تو اس کا یہ مطلب تھا کہ اسمٰعیلؑ میں جو دُنبہ کی خصلت ہے اسے ذبح کر دو۔ یہ نہیں کہ اس کی انسانیت کی خصلت کو ذبح کر دو۔ خدا تعالٰے نے بتایا۔ اے ابراہیمؑ! ۹۰ سال کی عمر میں تمہارے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے اس لئے تمہاری خواہش ہوگی کہ اسے اچھا کھلاؤ پلاؤ، ہر طرح اسے آرام پہنچاؤ۔ لیکن اس طرح تو یہی ہوگا جیسے دُنبہ پالا، اس سے کیا فائدہ ہوگا دنیا کو اور اس سے کیا نفع ہوگا تمہارے خاندان کو۔ یہ ایک دُنبہ ہوگا اور بس۔ اس لئے آج ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ دنبہ کو ذبح کر دو۔ گویا انسانیت باقی رہے اور دنبہ پن ذبح ہو جائے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے اس حکم کو عملی جامہ اس طرح پہنایا کہ دنیا سے الگ تھلگ ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں جہاں دنبہ نہ بن سکے، حضرت اسمٰعیلؑ کو چھوڑ آئے۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ اہلی زندگی کی اصلاح کی بنیاد رکھی گئی اور بتایا گیا کہ بیٹوں کو دنبوں کی طرح نہ پالو بلکہ ان کی روحانی تربیت کا خیال رکھو چنانچہ جب اللہ تعالٰی نے یہ فرمایا کہ اسمٰعیلؑ کی قربانی کر دو اور اس کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام تیار ہو گئے تو منع کر دیا اس لئے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی نہ ہوئی بلکہ دُنبہ کی قربانی کی۔ اور جب خدا تعالٰے نے یہ فرمایا کہ اسمٰعیلؑ کی نسل میں نبوت رہے گی تو یہ نتیجہ تھا دنبہ کی قربانی کا۔ مطلب یہ کہ اگر اولاد کی اصلاح اور تربیت کا خیال رکھا جائے گا اور اسے دُنبہ کی طرح نہ پالو گے بلکہ دُنبہ پن کو قربان کر دو گے تو اس کے نتیجہ میں اس اولاد میں نبوت رہے گی۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں نبوت رہنے کا وعدہ تھا ورنہ یہ ظالمانہ وعدہ بن جاتا۔ اور اس طرح لحاظ بن جاتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد خواہ کیسی ہی ہو اس میں نبوت رہے گی۔ اور دوسروں کو اس سے محروم رکھا جائے گا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اگر اولاد کی تربیت کے وقت تم محبت کے احساسات کو قربان کر دو گے۔ اس کے اندر اچھے اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرو گے اس کے آرام و آسائش کو اس لئے قربان کر دو گے کہ خدا تعالٰے کی محبت اس کے دل میں

پیدا کرو تو اس کے بدلے میں ہمیشہ اس میں نبوت رکھی جائے گی۔ اور اس میں کیا شبہ ہے کہ جس قوم کی نسل پاک ہو اس پر خدا کے فضل نازل ہوتے ہیں۔

پس اگر تم بھی چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے فیوض تم پر اور تمہاری اولاد پر ہمیشہ نازل ہوتے رہیں تو اپنی اولاد کو دنبہ کی طرح نہ پالو بلکہ اس کی روحانی اصلاح کی فکر کرو۔ خدا تعالیٰ کی محبت اس کے دل میں پیدا کرو۔ خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی تڑپ اس میں پیدا کرو۔ اگر تم اولاد کی اصلاح کی طرف اس طرح توجہ کرو گے اور حیوانوں کی طرح اس کی پرورش نہ کرو گے بلکہ انسانوں کی طرح کرو گے تو انسانیت اس میں مذہب کے طور پر قائم ہو جائیگی۔ اور جب یہ قائم ہو جائے گی تو خدا تعالیٰ کے فضل بھی نازل ہوں گے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بچہ کی قربانی کی اور اسے وادیٔ غیر ذی زرع میں رکھا اور اپنی طرف سے اس کی تربیت کی پوری پوری تدبیر کی تو خدا تعالیٰ نے اس کے بدلہ میں آخری نبوت جس کے بعد اور کوئی شرعی نبوت نہ تھی اس کی نسل میں رکھی یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل میں سے پیدا ہوئے جن کے بعد آپ کے خاندان سے باہر نبوت نہیں جا سکتی۔ پس جب خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ تمہاری اولاد میں نبوت رہے گی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ تیری نسل میں سے وہ نبی آئیگا جو ساری دنیا کی طرف بھیجا جائے گا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی آمد سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں جو نبوت تھی وہ چند خاندانوں میں تھی اور باقی سب اس سے محروم تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ سب کو خدا تعالیٰ نے نبوت کے انعام سے اس لئے محروم رکھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں نبوت رہے۔ بلکہ اس کا یہی مطلب تھا کہ آخری شرعی نبی جو ساری دنیا کی طرف آئے گا وہ ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہوگا۔ اور اس طرح سب کو نبوت کا فیض پہنچ جائے گا۔

پس یہ جسے قربانی کی عید کہا جاتا ہے یہ دراصل اولاد کی قربانی کی عید ہے۔ جب بکرے اور دنبے کی قربانی کی جاتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ہماری اولاد جوان ہو کر دُنبے نہ بنے گی بلکہ خدا تعالیٰ کی محبت اور الفت میں اپنے دنبہ پن کو ذبح کر چکی ہوگی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اولاد کو کھانا اچھا نہ دیں۔ کپڑا اچھا نہ دیں بلکہ یہ ہے کہ ان کی زندگی کھانے پینے کے لئے نہیں بنائیں گے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ[1] کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو نعمت ملے اس کا اظہار کرو۔ پس اظہارِ نعمت منع نہیں۔ یہ منع ہے کہ اپنی زندگی اور اولاد کی زندگی ایسی نہ ہو کہ اس میں انسانیت نہ رہے اور حیوانیت ہی حیوانیت

رہ جائے۔ مدنظر یہ بات ہونی چاہیئے کہ جہاں اخلاق اور دینی تربیت کا سوال ہوگا، وہاں اولاد کے آرام و آسائش کا خیال نہیں کریں گے۔ اور خداتعالیٰ کی شان اور عظمت ان کے دلوں میں بٹھانے کی پُوری پُوری کوشش کریں گے۔ جو لوگ ایسا کریں ان کی اولاد نہیں بگڑتی۔ بدصحبت سے ہی بگڑے تو بگڑے ورنہ نہیں بگڑ سکتی۔ اور اگر سارے مسلمان اپنی اولاد کی اصلاح کریں تو پھر بُری صحبت ہی نہ رہے گی۔

مَیں نہایت اختصار کے ساتھ اس بات کی طرف اپنی جماعت کے لوگوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ اس اہلی اصلاح کی طرف توجہ کریں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ قائم ہوئی۔ اس کے بعد محمدی دَور شروع ہوتا ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دَور شروع ہوا اور پھر محمدیت کا دَور آیا۔ مگر ابھی تک لوگ آدمیت کا دَور ہی طے کر رہے ہیں۔ حضرت آدمؑ کے وقت آدمیت کا دَور شروع ہوا تھا یعنی انسان کی ذاتی اصلاح کا دَور۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دَور آیا جو اہلی اصلاح کا دَور تھا یعنی اپنے اہل کی اصلاح کی فکر کرنا۔ پھر محمدی دَور آیا جو ساری دنیا کی اصلاح کا دَور ہے۔ مگر افسوس ہے۔ ابھی تک اہلی دَور بھی طے نہیں ہوا۔ بہت لوگ ہیں جو اپنے بچوں کی دینی اصلاح کو مدنظر نہیں رکھتے۔ ایسے بچوں کی پھر ضرورت ہی کیا ہے! ان کی بجائے دُنبے پال چھوڑو۔

پس مَیں اپنی جماعت کے دوستوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ اپنی اولادوں میں اخلاقِ حسنہ اور قومی روح پیدا کریں اور انہیں دین کے خادم بنائیں۔ اِس وقت سے زیادہ کبھی اسلام کو خادموں کی ضرورت نہیں پڑی۔ آج بہت نازک حالت ہے، تمام دنیا اسلام کے خلاف کھڑی ہے۔ اگر ہماری اولاد کے دلوں میں اسلام کی محبت اور الفت نہ ہوگی وہ اسلام کی شیدائی نہ ہوگی تو ہماری ساری کوششیں ضائع ہوجائیں گی۔ اور دشمن اپنے انتظام کی قوت اور زور سے مسلمانوں کو اس طرح اُڑا دے گا جس طرح آندھی خس و خاشاک کو اُڑا لے جاتی ہے ایسی حالت میں اسلام کی حفاظت کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنی اولاد میں اسلام کی محبت پیدا کریں۔ پہلے زمانہ میں انسانوں کی جو قربانی کی جاتی تھی، وہ غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔ اُس وقت اس سے مراد یہ تھی کہ انسانی جذبات کی قربانی کی جائے، ان کو مار دیا جائے۔ اس طرح انسانوں کی تربیت کی جاتی تھی۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت خداتعالیٰ نے اس طریق کو بدل دیا اور پھر یہ رکھا کہ ہیمیت بھی کچھ قائم رکھی جائے اور باوجود اس کے اخلاق کی نگرانی کی جائے۔ یہ اعلیٰ درجہ کی ترقی کا دَور تھا۔ مگر افسوس ہے ہماری جماعت کے لوگ اولاد کی

تربیت کی طرف ابھی تک پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے حالانکہ دشمن کا مقابلہ کرنے اور اس کو شکست دینے کا یہی ایک مستقل ذریعہ ہے اگر اس کی طرف توجہ نہ کی گئی تو عارضی کوششوں سے ہم دشمن کو زیر نہ کر سکیں گے۔ اس وقت میں قادیان کے دوستوں کو اور باہر کے دوستوں کو یہی توجہ دلاتا ہوں کہ وہ اپنی اولاد میں ایسی روح پیدا کریں کہ اسلام کی محبت اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اس کے ذرّے ذرّے سے ظاہر ہو۔ وہ اسلام کے لئے اس قدر مضبوط ہو کہ دشمن کے وار اس پر اس طرح پڑیں جس طرح پہاڑ سے لہر ٹکراتی ہے۔

میں جوش سے اتنا بول گیا ہوں، ورنہ آج صبح سے یہ حالت تھی کہ اسہال کی وجہ سے اُٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ ہماری جماعت کو توفیق دے تا کہ وہ اللہ تعالےٰ کی منشاء کے ماتحت اولاد کی قربانی کر کے ان فیوض کو حاصل کریں جو ایسی قربانی کے نتیجہ میں مل سکتے ہیں اور آئندہ کے تمام فیوض مسلمانوں کے لئے مخصوص ہو جائیں۔ ہماری نسلیں عام اخلاق بھی ایسے اعلیٰ دکھائیں کہ لوگ محسوس کریں سوائے اسلام کے کہیں نجات نہیں ہے۔"

(الفضل ۲۱ر جون ۱۹۲۶ء صہ ۶ تا ۸)

۱۔ البقرہ ۲ : ۱۲۶ - رُوحانی خزائن (تریاق القلوب) ص ۲۷۶/۱۵

۲۔ پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۶ کی رو سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۸۶ برس کی تھی۔ اور باب ۱۷ آیت ۱۸ کے مطابق حضرت اسحٰق علیہ السلام کی ولادت کے وقت حضرت سارہ کی عمر ۸۶ برس تھی۔

۳۔ الانبیاء ۲۱ : ۵۹

۴۔ الانبیاء ۲۱ : ۶۹

۵۔ "ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام" مصنفہ علامہ عباس محمود العقاد المصری۔ ترجمہ مولانا راغب رحمانی صہ ۲۸

۶۔ F.H. MARTENS: THE STORY OF RELIGION & PHILOSOPHIC THOUGHT. V. II P. 293. جیوش انسائیکلوپیڈیا ۵۵۴/۳

۷۔ انسائیکلوپیڈیا ریلیجس اینڈ ایتھکس ۲۸۹/۴ زیر لفظ کرائمز وغیرہ۔ ۸۔ الانبیاء ۲۱ : ۶۹-۷۰

۹۔ قدسی العرفان تفسیر سورۃ النجم من القرآن صہ ۲ پر درج حضرت ابن عباس کی ایک رُوایت سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے جس میں لکھا ہے کہ آگ ٹھنڈی ہو گئی اور درخت سرسبز ہو گئے جو جل گئے تھے ظاہر ہے ماحول کی سرسبزی و شادابی بارش ہی سے ہو سکتی ہے۔

۱۰۔ ہود ۱۱ : ۷۰ - پیدائش باب ۱۳ آیت ۲ - باب ۱۸ آیت ۲ تا ۷

۱۱۔ الضحیٰ ۹۳ : ۱۲

---

(۱۶)

(فرمودہ ۲۰ رمئی ۱۹۲۸ء بمقام باغ حضرت مسیح موعود علیہ السلام قادیان)

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت تھی اور آپ کا یہ طریق تھا کہ اس عید کے موقعہ پر آپ نماز جلدی پڑھایا کرتے تھے اور خطبہ بھی مختصر فرماتے تھے۔ تا کہ جن لوگوں نے قربانی کرنی ہو وہ نماز سے فارغ ہو کر یا اگر خطبہ سننا چاہیں تو خطبہ سنکر قربانی کر سکیں۔ ہمارے ملک میں چونکہ اسلامی عادات اور طریق کی بہت کمی ہے اس لئے عام طور پر اس عید اور اس سے پہلی عید کی نمازوں کے وقت میں زیادہ فرق نہیں کیا جاتا۔ میرا منشاء ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو جاری کیا جائے لیکن اگر یکدم تغیر کیا جائے تو خطرہ ہے کہ بہت سے لوگ نماز سے محروم رہ جائیں اس لئے آہستہ آہستہ اس سنت کو جاری کیا جائے اور لوگوں کو عادت ڈالی جائے کہ اس عید کی تیاری صبح ہی سے شروع کر دیا کریں۔ اور وقت پر نماز کے لئے پہنچ جایا کریں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں اس لئے عید کی نمازوں کے متعلق انتظار کیا جاتا تھا کہ یہاں جماعت کم تھی اور باہر سے بہت سے دوست آیا کرتے تھے۔ ان کے آنے پر عید کی نماز ہوتی تھی۔ لیکن اب حالات متغیر ہو رہے ہیں باہر سے آنے والے دوستوں کی تعداد نسبتاً کم ہوتی جا رہی ہے۔ اور مقامی دوستوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ارد گرد کے گاؤں کے لوگوں کو شامل کر کے جو عید کی نماز کے لئے قادیان میں آتے ہیں میرے نزدیک یہاں کی تعداد ڈیڑھ دو ہزار کے قریب ہو جاتی ہے۔ اور باہر سے آنے والے دوست ۱۰۔۲۰ سے زیادہ نہیں ہوتے۔ اس طرح یہاں کے اور باہر سے آنیوالے دوستوں میں اس قدر فرق ہو گیا ہے کہ باہر سے آنے والوں کی خاطر ہم اس حکم سے ہمیشہ کے لئے دستبردار نہیں ہو سکتے جس کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد موجود ہے۔ باہر کے جو دوست نماز میں شامل ہو سکیں اور خدا تعالیٰ نے اس مقام کو برکت دی ہے اس لئے جس قدر بھی آسکیں آئیں۔ ان کو آئندہ یا تو شام کو ہی یا زیادہ سے زیادہ صبح سویرے یہاں پہنچ جانا چاہیئے۔ بہر حال اس عید کی نماز کو سنت کے مطابق ادا کرنے کی ہمیں آہستہ آہستہ کوشش کرنی چاہیئے۔

اس کے بعد میں اس عید کے ہی ایک حکم کے متعلق مختصراً ایک بات کہنی چاہتا ہوں۔ یہ عید قربانی کی عید ہے۔ اس موقعہ پر قربانیاں کی جاتی ہیں اور یہ عید یادگار ہے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے ایک فعل کی۔ جب انہوں نے خدا کے حکم کے ماتحت اپنے بچے کو قربان کر دیا۔ میں نے جیسا کہ

پہلے کئی دفعہ بیان کیا ہے۔ میرے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فعل کہ انہوں نے اپنے بچے کو چھری لے کر ذبح کرنا چاہا، یہ عید درحقیقت اس کی یادگار نہیں ہے۔ اگر یہ اس کی یادگار ہوتی تو یہ واقعہ چونکہ شام کا ہے اس کی یادگار کے طور پر حج شام میں ہوتا۔ کسی فعل کی یادگار قائم رکھنے کا بہترین ذریعہ یہی ہوتا ہے کہ اس جگہ جہاں واقعہ ہوا ہو یادگار بنائی جائے باقی علاقوں میں بھی بے شک ہو مگر اصل اور بڑا مقام وہی ہو جہاں واقعہ ہوا ہے۔

پس اگر یہ عید اس عملی طور پر چھری پھیرنے کے لئے تیار ہو جانے کے نتیجہ میں ہوتی جو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے بچے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی گردن پر شام کے علاقہ میں رکھی تھی تو اس عید کا اصل مقام اور حج کا مقام شام ہوتا نہ کہ حجاز۔ لوگ اکناف عالم سے وہاں جمع ہوتے اور اس جگہ جہاں یہ واقعہ ہوا تھا اکٹھے ہو کر خدا کی یاد کرتے اور کہتے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کس قدر عظیم الشان قربانی کی۔ لیکن خدا تعالیٰ نے حج کے لئے مکہ قرار دیا۔ منیٰ کو قرار دیا۔ مزدلفہ اور عرفات کو قرار دیا لیکن شام کے کسی مقام کو قرار نہیں دیا۔

پس میرے نزدیک اس کا تعلق اس قربانی سے نہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی گردن پر عملی طور پر چھری پھیرنے پر آمادگی سے کی۔ پھر چھری پھیرنے کے لئے بیٹھ جانا۔ اور چھری پھیر دینا ان دونوں باتوں میں بھی بڑا فرق ہے جس وقت تک انسان عملی قربانی کر نہیں دیتا اس کے دل کا حال اور ہوتا ہے۔ ممکن ہے آج بھی کوئی انسان اپنے بیٹے کی گردن پر چھری پھیرنے کے لئے آمادہ ہو۔ اور چھری پھیرنے کے لئے اسے لٹا بھی دے۔ پھر چھری اس کی گردن تک بھی لے جائے۔ مگر ممکن ہے اس کا ہاتھ کانپ جائے اور وہ رک کر ہٹ جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھری لی، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو لٹایا مگر الہام ہوا کہ تیرا خواب پورا ہو گیا، جانے دے۔ چونکہ آپ نے چھری پھیری نہیں اس لئے اس مقام کو عملی قربانی کے مقام سے نسبت نہیں ہو سکتی۔ پس جیسا کہ میں نے پہلے بھی کئی دفعہ بیان کیا ہے۔ اس عید اور رؤیا کا تعلق اس واقعہ سے نہیں بلکہ اس سے ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ایسی وادئ غیر ذی زرع میں پھینک دیا ہے جہاں نہ پانی ہے نہ کھانا اور چھری پھیرنے سے مراد ایسی وادی غیر ذی زرع میں ہی پھینکنا ہے۔ ان کی رؤیا کے یہی معنے تھے۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا تعالیٰ کی محبت کے جوش میں واقعی چھری پھیرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اگر خدا تعالیٰ کے ارشاد کا یہ مطلب ہوتا کہ چھری پھیرو اور پھر روک دیتا تو اس کے تو یہ معنے ہوتے کہ وہ خود ہی اپنے حکم کی نافرمانی سکھاتا ہے وہ ایک کام کا حکم

دیتا ہے مگر اس کا منشاء وہ نہیں ہوتا۔ اور خدا تعالیٰ جیسی حکیم ہستی کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ ایک ایسا حکم دے جس کے متعلق وہ خود جانتا ہو کہ اسے پورا نہیں کراؤں گا منشاء احکام خداوندی کے خلاف ہے۔ دراصل بات یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے ابتدائی ایام میں جب زمین دنیا سے مٹ چکا تھا اس وقت انسانی قربانی ہوتی تھی۔ اور انبیاء کا یہ طریق ہے کہ جب تک کسی امر کے متعلق خدا تعالیٰ کی طرف سے علم نہ آئے وہ قومی دستور کو جاری رکھتے ہیں اور چونکہ اس وقت کثرت سے انسانی قربانی ہوتی تھی اس لئے آپ نے اپنی رؤیا کا یہی مفہوم سمجھا کہ اسمٰعیلؑ کو ذبح کر کے قربان کرنا چاہیئے۔ مگر منشاء الٰہی یہ نہ تھا بلکہ کچھ اور تھا۔ اور وہ یہ کہ آپ ان کو ایک دن ایک ایسی جگہ چھوڑ آئیں گے جہاں چھوڑنا موت کے مُنہ میں دینے کے برابر ہو گا۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ خواب اس وقت پورا ہوا جب وہ حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کو اس جگہ چھوڑ آئے جہاں مکّہ آباد ہؤا۔ اور جہاں آج لوگ اس واقعہ کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کے خواب کا اصل منشاء تھا اور یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کرنا تھا کہ انہیں ایسی جگہ چھوڑ آئے جہاں ایک مشکیزہ پانی اور تھوڑی سی کھجوروں کے سوا کھانے پینے کا کوئی سامان نہ تھا۔ کئی کئی میل تک کوئی آبادی نہ تھی۔ ایسی حالت میں چھوڑ آنا سو فیصدی موت کے منہ میں پھینک آنا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ تھوڑا سا کھانا اور پانی ختم ہونے پر کچھ اور میسّر آ سکے گا۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں ذبح کرنے میں کوئی دریغ نہیں کیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ خدا نے انہیں پھر زندہ کر دیا۔

واقعہ اس طرح ہؤا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فیصلہ کر لیا کہ حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ آئیں تو وہ ایک مشکیزہ پانی کا اور کچھ کھجوریں ساتھ لے کر حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کو خدا کے حکم کے ماتحت وہاں چھوڑ گئے لیکن محبتِ پدری اور خاوند بیوی کی محبت تو نہیں چھوڑی جا سکتی تھی۔ جب آپ واپس چلے تو مُڑ مُڑ کر پیچھے دیکھتے جاتے تھے۔ کیونکہ آپ بخوبی جانتے تھے کہ اس پانی اور ان کھجوروں کے ختم ہونے کے بعد ان کی بیوی اور ان کے بچہ کے لئے کھانے پینے کا کوئی سامان نہ ہو گا۔ حضرت ہاجرہ نے جب یہ دیکھا تو خیال کیا ضرور کوئی بات ہے انہوں نے پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں اور ہمیں کہاں چھوڑے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ ایک دردناک موقعہ تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے منہ سے بات نہ نکل سکی اور آپ نے تیز تیز چلنا شروع کیا۔ آخر حضرت ہاجرہ نے دریافت کیا آپ ہمیں یہاں کس کے حکم سے چھوڑے جاتے ہیں؟ تب انہوں نے کہا۔ خدا تعالیٰ کے حکم سے۔ اس پر حضرت ہاجرہ نے کہا۔ اگر خدا کے حکم سے چھوڑے جاتے ہیں تو وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا اور خدا تعالیٰ کی راہ

میں اپنی اور اپنے بچہ کی قربانی کو قبول کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی آزمائش کرنا چاہتا تھا۔ پانی اور کھجوریں ختم ہوگئیں۔ نزدیک نہ کوئی بستی تھی اور نہ ہی ادھر سے کسی قافلے کے گذرنے کا امکان تھا۔ حضرت اسمٰعیلؑ بچے تھے، کوئی آٹھ برس کی عمر ہوگی، پیاس کے مارے تڑپنے لگے۔ حضرت ہاجرہ سے اپنے لختِ جگر کی یہ حالت نہ دیکھی گئی اور بیقرار ہو کر صفا و مروہ پہاڑیوں پر دوڑنے لگیں۔ کبھی ایک پر چڑھ جاتیں اور کبھی دوسری پر چڑھ کر دیکھنے لگتیں کہ شائد کوئی قافلہ آرہا ہو لیکن کوئی نظر نہ آتا۔ ایک پہاڑی سے اُتر کر دوسری پر جانے تک چونکہ راستہ میں نیچی جگہ تھی۔ اور وہاں حضرت اسمٰعیل نظر نہ آسکتے تھے۔ اس لئے وہ فاصلہ دوڑ کر طے کرلیتیں۔ تاکہ اونچی جگہ پر جا کر بچہ کو بھی دیکھ سکیں۔ کئی بار متواتر انہوں نے اسی طرح کیا مگر کوئی صورت پانی ملنے کی نظر نہ آئی۔ آخر جب بہت بے قرار ہوگئیں تو آواز آئی ہاجرہ! جا اسمٰعیلؑ کے پاس جا۔ جب وہ حضرت اسمٰعیلؑ کے پاس آئیں تو دیکھا کہ چشمہ پھوٹا ہوا ہے۔ اس سے انہوں نے پانی پلایا۔ پانی ملنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے سامان پیدا ہوگئے کہ عرب کا ایک قافلہ رستہ بھول کر وہاں آگیا۔ اس نے پانی پا کر آرام پایا تو حضرت ہاجرہ کو کچھ تحائف دیئے اور پھر اجازت لے کر وہاں ڈیرے ڈال دیئے اور معاہدہ کیا کہ آپ کی رعایا ہو کر یہاں رہینگے۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو گویا وہاں کا بادشاہ بنا دیا۔ یہ ہے اصل واقعہ اور یہ تھا قربانی اور عملی طور پر چھری پھیرنے کا مفہوم اور اسی واقعہ کی یادگار میں آج کی عید ہے اور لوگ وہاں جاتے ہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ خدا تعالیٰ نے مزدلفہ، منیٰ اور عرفات کو کیوں اس شرف کے لئے چنا۔ میرا خیال ہے کہ عرفات ساحلِ سمندر کی طرف ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اس راستہ سے ان کو چھوڑنے کے لئے شام سے آئے۔ اور عرفات وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی تجلّی ظاہر ہوتی۔ اور مزدلفہ وہ مقام ہے جہاں آپ سے وعدہ کیا گیا کہ اس قربانی کے بدلہ میں بہت بلند درجات عطا ہوں گے۔ مزدلفہ قرب پر دلالت کرتا ہے۔ اور عرفات عرفان پر۔ منیٰ وہ مقام ہے جہاں حضرت ہاجرہ گھبرائی ہوئی پہنچیں۔ اس جگہ شیطان کو روڑے مارے جاتے ہیں چونکہ آپ گھبرائی ہوئی تھیں۔ مگر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ خدا کے حکم سے تم کو یہاں چھوڑے جاتا ہوں اور انہوں نے کہا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ تو گویا شیطان ہمیشہ کے لئے مار دیا گیا۔ یہ ساری جگہیں قربانی سے تعلق رکھتی ہیں۔ پس آج کے دن درحقیقت ہم اس بات کی یاد تازہ کرتے ہیں کہ حضرت ابرہیم علیہ السلام نے خدا کے لئے اپنے بیٹے کو ذبح کر دیا۔ لیکن خدا نے اس کو زندہ کیا اور ہمیشہ کیلئے اسے زندہ کر دیا اور دنیا میں اس کا نام روشن کر دیا۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ دنیا میں

وہی قومیں ترقی کرسکتی ہیں جو عملاً قربانی کرنے کی عادی ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو قربان کیا۔ خدا تعالےٰ نے ان سے وعدہ کیا کہ مَیں ہمیشہ کے لئے تیری ذرّیت کو قائم رکھوں گا۔ اور جس طرح آسمان کے ستارے گنے نہیں جا سکتے، اسی طرح تیری اولاد بھی گنی نہیں جائے گی۔ پھر جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو اس وادیٔ غیر ذی زرع میں پھینک دیا، خدا تعالےٰ نے اس کے بدلہ میں ان کی اولاد میں سے ایک شخص کو جنّت کا آخری وارث بنایا۔ وادیٔ غیر ذی زرع اس کو کہتے ہیں جہاں سبزی نہ ہو۔ اور جنّت اس مقام کا نام ہے جہاں سبزی ہی سبزی ہو۔ گویا مکّہ اور جنّت دو متضاد مقام ہیں۔ مکّہ کی زمین ایسی شور ہے کہ بعض لوگوں نے وہاں باغ لگانے کی کوششیں کی ہیں اور اس کے لئے لاکھوں روپے خرچ کئے ہیں اور دوسرے ملکوں سے مٹی لا کر ڈالی ہے۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ تو مکّہ کی حالت ہے اور جنّت وہ جگہ ہے جہاں سایہ کی اتنی کثرت ہو کہ کبھی دھوپ نہ ہو۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو ایسی جگہ ڈال دیا جہاں سایہ تک نہ تھا تو خدا تعالےٰ نے کہا کہ مَیں تیری اولاد کو ایسی جگہ کا وارث کرونگا جہاں کبھی دھوپ نہ ہوگی۔ اور اب کوئی شخص جنّت میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کی غلامی نہ کرے اور ان سے جنّت کی چابی نہ مانگے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو وادیٔ غیر ذی زرع میں رہنے کے نتیجہ میں اس جگہ کی وراثت عطا ہوئی جہاں نہ کبھی دھوپ ہوتی ہے نہ خشکی۔ اور یہ قربانی ہے جس کی یاد ہمیں دلائی گئی ہے اور جس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ہم بکرے قربان کرتے ہیں۔ یہ قربانیاں عظیم الشان نشان ہیں جن کے اندر بڑی بڑی حقیقتیں مخفی ہیں۔ جب تک ان کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ دیکھو جس شخص سے محبت ہو اس سے مصافحہ کیا جاتا ہے جو محبت کے اظہار کا نشان ہے اور اس کے معنی ہیں کہ دلوں میں باہمی کوئی کدورت نہیں۔ یہ سچی محبّت کا اقرار ہوتا ہے لیکن اگر کوئی شخص ہاتھ تو ملائے مگر دل میں کدورت رکھے تو اس سے مصافحہ کا کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔ جو شخص محبت کے جذبات تو اپنے اندر پیدا نہ کرے لیکن مصافحہ کرے وہ بیہودہ حرکت کرتا ہے۔ پس جس طرح محبت اور عفو کی علامت مصافحہ ہے۔ اسی طرح خدا تعالےٰ سے محبّت اور حقیقی قربانی کی ظاہری نشانی یہ بکرے کی قربانی ہے۔ یاد رکھنا چاہئیے کہ قربانی بھی اسی شخص کی مفید ہوسکتی ہے جو خدا کے لئے اور اس کی رضا کے حصول کے لئے اپنے جان ومال اور اولاد کی قربانی کرنے پر بھی آمادہ ہو۔ اور جو خدا تعالےٰ کے لئے اس قربانی پر آمادہ نہیں ہوتا اس کے لئے کوئی عید نہیں وہ محض ظاہری شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے جو قربانی کی یہ عید اس قربانی کی یادگار ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک بیوی نے کہا کہ اسمٰعیلؑ کے یہاں رہنے سے فساد کا خطرہ ہے[۱۳] اور حضرت اسمٰعیلؑ نے اس کو مٹانے کے لئے قربانی کو قبول کیا تو اللہ تعالےٰ نے ہمیشہ کے لئے اس کو امن قائم کرنے والا بنا دیا۔ اور اس کی اولاد کے ذریعہ دنیا میں مذہب اسلام نازل کر کے اس کو ہمیشہ کے لئے امن قائم کرنے والا قرار دیا۔ اسلام کے معنے ہیں سلامتی۔ اور اسلام سے تعلق رکھنے کا نام ایمان ہے جس کے معنے امن کے ہیں[۱۴]۔ چونکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے ایک گھر کا فساد دور کرنے کے لئے قربانی کی اللہ تعالےٰ نے انہیں ساری دنیا کا امن قائم کرنیوالا بنا دیا۔

یہ حقیقت ہے اس قربانی کی اور جب تک اس کو نہیں سمجھا جاتا اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ بعض لوگ قربانی پر اعتراض کرتے ہیں اور اس کو اسراف قرار دیتے ہیں۔ اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ کیوں نہ یہ روپیہ خدمتِ دین اور اشاعتِ اسلام کے لئے خرچ کیا جائے۔ ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ خواہ یہ سوال نیک نیتی سے ہی کیوں نہ کیا جائے پھر بھی یہ وسوسہ شیطانی ہے اور شیطان بعض اوقات دین کے معاملہ میں اچھی صورت سے بھی وسوسے ڈالتا ہے۔

ایک جگہ ایک بزرگ کی دعوت تھی۔ جب کھانا چنا گیا تو انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا اور کھانے سے انکار کر دیا۔ جب وجہ دریافت کی گئی تو کہا کہ چونکہ اس کھانے کی طرف بہت زیادہ رغبت ہو رہی ہے اس لئے میں نے اسے کھانا پسند نہیں کیا۔ اب گو دعوت قبول کرنا سنت ہے مگر انہوں نے کہا کہ نفس کی اس قدر رغبت شک ڈالتی ہے کہ ضرور اس کھانے میں کوئی نقص ہے۔ میزبان نے کہا۔ اس میں کوئی نقص تو نہیں ہے یہ حلال مال ہے۔ مگر انہوں نے کہا۔ ضرور کوئی نقص ہوگا، تحقیق کی جائے۔ غرض قصائی سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ میرا اونٹ مر گیا تھا میں نے سمجھا بہت نقصان ہوگا۔ اس لئے اسے کاٹ کر بیچ ڈالا[۱۵]۔ تو شیطان بعض اوقات کسی کام کی زیادہ رغبت دلا کر بھی وسوسہ پیدا کرتا ہے۔ بظاہر تو دین کے رستہ میں مال خرچ کرنا بہت اچھی بات ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں دین زیادہ غریب تھا، صحابہ کئی کئی وقت تک بھوک کی وجہ سے پیٹوں پر پتھر باندھ رکھتے[۱۶]۔ مگر باوجود اس غربت و افلاس کے وہ قربانی کرتے تھے تو اب اسلام کی خدمت کے خیال سے قربانی چھوڑنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ اسلام اور روحانیت کسی ایک چیز کا نام نہیں بلکہ کئی چیزوں کا نام ہے۔ جس طرح آنکھ، کان، ناک غرضنکہ تمام اعضاء مل کر ایک خوبصورت اور مکمل انسان بنتا ہے اسی طرح روحانیت کے لئے کئی ایک چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب اگر کوئی شخص کہے کہ کسی کے تھوڑے تھوڑے کان کاٹ ڈالے جائیں تو کیا ہرج ہے۔ اس کی سماعت میں تو بے شک بہت تھوڑا فرق آئے گا۔ مگر اس کی زینت میں فرق ضرور آجائے گا۔ پس کسی چیز کو کامل بنانے کے لئے بعض باتیں اس کی زینت کے لئے ہوتی ہیں اور یہ قربانی ایسی حکمتوں کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی بھی ہمیں یاد دلاتی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس عید کو کھانے پینے کا دن کہا ہے۔ یہ بظاہر اسراف ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ بلکہ قوموں میں زندگی کا احساس اور امنگ پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تحفہ تحائف تقسیم کرنے کے لئے دن مقرر کئے جائیں اور عید کے دن بھی گوشت بانٹا جاتا ہے۔

مکہ میں آج کے دن اس قدر بکرے ذبح کئے جاتے ہیں کہ گوشت کھانے والا کوئی نہیں ملتا مگر پھر بھی قربانیاں کی جاتی ہیں۔ گوشت سکھایا بھی جا سکتا ہے۔ سکھانا بھی جائز رکھا گیا ہے اس لئے سکھا کر اپنے لئے رکھنا بھی جائز ہے اور غرباء میں تقسیم بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ضائع بھی ہو جائے تو بھی قربانی ضروری ہے روحانی امور سے تعلق رکھنے والے اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ میں بعض صحابی دن رات مسجد میں بیٹھے رہتے تھے کہ شاید حضور باہر تشریف لے آئیں اور وہ کسی بات کے سننے سے محروم رہ جائیں۔ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ وہ وقت ضائع کرتے تھے لیکن نہیں وہ بہت بڑی خدمت کر رہے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کے بھائی ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی حضور ابوہریرہؓ تمام دن مسجد میں بیٹھا رہتا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا۔ مجھے تمام دن محنت کرنی پڑتی ہے آپ اسے سمجھائیں کہ کام کیا کرے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تمہیں کیا معلوم خدا اسی کے طفیل تمہیں بھی رزق دے رہا ہے۔ تو اصل میں وہ لوگ وقت ضائع نہیں کرتے تھے بلکہ بہت بڑے ثواب کا کام کرتے تھے۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص مسجد میں آکر امام کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے تو وہ بھی گویا عبادت میں ہی ہوتا ہے۔ اصل میں خدا تعالیٰ دیکھتا ہے کہ انسان میری راہ میں کس قدر قربانی کے لئے آمادہ ہے۔ اگر معمولی قربانی کے لئے تیار رہے تو بڑی کے لئے بھی تیار ہو سکے گا۔

اگر تمام بکرے ذبح کر کے گوشت پھینک دیا جائے تو بھی ثواب ہے۔ مگر یہ گوشت تو غرباء میں تقسیم کیا جاتا ہے اور اگر بچ رہے تو پرندوں کو ڈال دیا جائے جن کا حق قرآن کریم نے بھی رکھا ہے یعنی جانوروں کا۔ پس اگر گوشت پھینک دیا جائے اور کتے اور چیلیں اُسے کھا جائیں تو بھی یہ ثواب کا موجب ہے۔

اس قدر فوائد قربانی کے اندر ہیں کہ خواہ اسلام پر کس قدر بھی مصیبت کے دن آئیں تو بھی

قربانی جائز اور ضروری ہوگی ہاں اگر انسان پر خود کوئی مصیبت ہو تو وہ نہ کرے لیکن اگر توفیق ہو تو ضروری ہے۔

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک شخص ۳۶۰ دن گوشت کھاتا ہے یا کھانے کی کوشش کرتا ہے مگر اسے اسلام کی حالت اور غربت اور خدمتِ دین اور اس روپیہ کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوتا لیکن ایک دن خدا کے لئے اسے کھانا پڑتا ہے تو اسے دین کے راستہ میں خرچ کرنے کا خیال آتا ہے۔ جب اپنی خواہش سے کھاتا تھا اس وقت تو اسلام کی مصیبت بھولے ہوئے تھا لیکن خدا کے حکم سے کھانا پڑا تو خدمتِ اسلام یاد آگئی۔ جب اپنا نفس کہتا ہے کہ گوشت کھاؤ تو یہ ضرور کھاتا ہے لیکن جب خدا تعالےٰ حکم دیتا ہے تو کہتا ہے یہ اسراف ہے اسے کس طرح نیک خیال کیا جاسکتا ہے۔ یقیناً یہ وسوسہ شیطانی ہے۔

پس جس کو توفیق ہو وہ قربانی ضرور کرے اور لوگ عید کے دن کھائیں پئیں تاکہ ان کے دلوں سے مایوسیاں دُور ہوں اور امنگیں پیدا ہوں اور خیال ہو کہ خدا تعالےٰ نے ان کے کھانے پینے کے دن بھی مقرر کئے ہیں۔ خدا تعالےٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اس عید کی حقیقت کو سمجھیں اور ہمیں ایسی قربانیاں کرنے کی توفیق دے جس کے نتیجہ میں یہ عید حضرت ابراھیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قربانی کی یادگار ہے۔" (الفضل ۵ / جون ۱۹۲۸ء صفحہ ۱۰)

۱؎ ۔ سنن نسائی کتاب صلوٰۃ العیدین باب القصد فی الخطبۃ۔

۲؎ ۔ یہ جزیرہ نمائے عرب کا قدیمی شہر ہے جو بیت اللہ شریف کی وجہ سے مرجع خلائق ہے۔ ۸۰/۷ درجے طول بلد اور ۲۲/۳ درجے عرض بلد پر واقع یہی وہ مقدس بستی ہے جہاں فخر موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کثرتِ ازدحام کی وجہ سے مکّہ کا نام بکّہ بھی ہے (معجم البلدان ۸/۱۳۲) اسے ام القریٰ بھی کہا گیا ہے (الانعام ۶ : ۹۳) اس کا ایک نام البلد الامین (التّین ۹۵ : ۴) بھی رکھا گیا ہے۔ اس میں خانہ کعبہ وہ پہلا گھر ہے جو عبادت حج کے لئے تعمیر کیا گیا ہے (آل عمران ۳ : ۹۷) اسے ۲۔ بیت العتیق (الحج ۲۲ : ۳۰) ۳۔ بیت الحرام (مائدہ ۵ : ۹۸) اور ۴۔ بیت المعمور (الطور ۵۲ : ۵) بھی کہا گیا ہے۔

۳؎ ۔ مکّہ سے عرفات کی جانب قریباً ۳ میل کے فاصلہ پر پہاڑیوں میں گھری ہوئی ایک بستی ہے۔ جہاں حاجی قربانیاں کرتے اور جمرات پر کنکریاں پھینکتے ہیں۔

۴؎ ۔ ایک کشادہ میدان جو منیٰ سے شرقی جانب تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے اس میں بطن محسّر ایک خاص مقام ہے جہاں اصحاب فیل ہلاک ہوئے تھے۔ ۹ ذوالحجہ غروب آفتاب کے بعد حاجی یہاں (مشعر الحرام میں) قیام کرتے اور صبح کی نماز کے بعد منیٰ چلے جاتے ہیں۔

ﷺ۔ ایک وسیع میدان ہے جہاں حاجی ۹ ذوالحجہ زوال آفتاب سے پہلے پہلے پہنچ جاتے ہیں۔ اسے یوم عرفہ یا عرفات کے میدان میں وقوف کرنا کہتے ہیں اور یہ ارکان حج میں سے اہم رکن ہے۔ یہاں حاجی ظہر اور عصر کی نمازیں ادا کرتے، امام کا خطبہ سنتے اور گریہ وزاری سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔

ﷺ۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی

ﷺ۔ معجم البلدان جلد ۸ صفحہ ۴۵

ﷺ۔ المنجد زیر لفظ عرف

۹ﷺ۔ معجم البلدان جلد ۸ صفحہ ۱۵۹ (سمی منی لان الکبش مُنِیَ بہ ای ذُبِحَ)

۱۰ﷺ۔ صحیح بخاری کتاب المناسک باب التلبیۃ والتکبیر غداۃ النحر حین یرمی جمرۃ العقبۃ

۱۱ﷺ۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی۔ ۱۲ﷺ۔ المنجد زیر لفظ حدیقۃ

۱۳ﷺ۔ پیدائش باب ۲۱ آیت ۹-۱۰ ۱۴ﷺ۔ المنجد زیر لفظ امن۔

۱۵ﷺ اس سے ملتا جلتا واقعہ حضرت شیخ عبد اللہ حنیف کے بارہ میں خیر المجالس مرتبہ حمید شاعر القلندر صفحہ ۱۷۵ پر بیان کیا گیا ہے۔

۱۶ﷺ۔ جامع ترمذی ابواب الزہد باب ماجاء فی معیشۃ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔ عن ابی طلحۃ قال شکونا الی رسول اللہ الجوع ورفعنا عن بطوننا عن حجر حجر فرفع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجرین۔

۱۷ﷺ۔ صحیح بخاری کتاب الاضاحی باب ما یؤکل من لحوم الاضاحی۔ صحیح مسلم کتاب الصیام باب تحریم صوم ایام التشریق۔

۱۸ﷺ۔ صحیح بخاری کتاب الاضاحی باب ما یؤکل من لحوم الاضاحی وما یتزوّد منھا۔

۱۹ﷺ (۱) جامع ترمذی ابواب الزہد باب ماجاء فی معیشۃ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
(۲) مجمع بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۲۵۳ زیر لفظ صفف۔

۲۰ﷺ۔ جامع ترمذی ابواب الزہد باب ماجاء فی الزُّھادۃ فی الدنیا۔

۲۱ﷺ صحیح بخاری کتاب الاذان باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلوٰۃ

۲۲ﷺ۔

۱۷

(فرمودہ ۲۰ مئی ۱۹۲۹ء بمقام باغ حضرت مرزا سلطان احمد صاحب قادیان)

مَیں صحت کی خرابی کی وجہ سے اس وقت کچھ زیادہ تو نہیں بول سکتا۔ کیونکہ جمعہ کے دن خطبہ پڑھنے کی وجہ سے جو کھانسی کی شدت ہوگئی تھی، اس میں تخفیف نہیں ہوئی۔ لیکن چونکہ اس تقریب پر کچھ نہ کچھ خطبہ کہنا سنّت ہے اور قرآن کریم کی آیات سے بھی اس کا استدلال ہوتا ہے اس لئے میں اختصار سے موقعہ کی مناسبت کے لحاظ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

یہ عید ایک بہت بڑی قربانی کی یاد میں ہے اور یہ عید اس واقعہ کو یاد رکھنے کے لئے ہے کہ خدا کی قائم کردہ جماعتوں اور اس کے بنائے ہوئے سلسلوں میں کچھ افراد ایسے ہوں جو اپنی زندگیوں کو کلّی طور پر دین کے لئے وقف کر دیں۔ جیسا کہ میں نے کئی دفعہ بیان کیا ہے ہرگز یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ فرمایا کہ واقعہ میں اپنے بچہ کو ذبح کر دو۔ انسانی قربانی کبھی بھی شریعت اسلامیہ سے ثابت نہیں[۱] کہ دنیا میں جائز قرار دی گئی ہے۔ قرآن شریف نے حضرت آدمؑ کے زمانہ کی قربانی کا ذکر کیا ہے[۲] اس سے بھی پتہ لگتا ہے کہ انسان کی قربانی نہیں بلکہ دوسرے جانوروں کی قربانی کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کی قربانی کا بکرے کی قربانی کو قائم مقام قرار دیا گیا[۳] یہ بات ان معنوں میں تو صحیح ہے کہ ایک انسان کی قربانی کا نشان قائم رکھنے کے لئے بکرے وغیرہ کی قربانی کا حکم دیا گیا ہے مگر یہ کہنا کہ پہلے انسان کی قربانی کا حکم تھا جسے بدلا گیا، یہ غلط ہے۔ کیونکہ حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں کی قربانی کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے۔ مگر انہوں نے انسانی جانوں کی قربانی نہیں کی بلکہ دوسرے جانور کی کی۔ ان کے متعلق جو روایات آتی ہیں وہ سچی ہوں یا جھوٹی، ان سے پتہ لگتا ہے کہ ایک نے بکرے کی قربانی کی اور دوسرے نے اور چیزوں کی۔ پس اگر وہ روایات صحیح ہوں یا ان کا کوئی حصہ صحیح ہو تو یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر اب تک جانوروں کی قربانی کا رواج رہا ہے[۴] ایسی حالت میں یہ کہنا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک انسانوں کی قربانی کی جاتی تھی۔ پھر بکرے کی قربانی مقرر ہوئی، یہ درست نہیں جبکہ ابتداء سے ہی یہی ثابت ہوتا ہے کہ الٰہی سلسلوں میں انسان کی قربانی کبھی نہیں دی گئی۔ بلکہ اور جانوروں کی دی جاتی تھی۔ کبھی بچوں کو قربان کرنے کا حکم نہ دیا گیا تو پھر یہ خیال کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی قربانی کو موقوف کرنے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے بچے کی قربانی کا

حکم دیا اور پھر اسے بدل دیا، یہ صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رؤیا میں دکھایا گیا کہ وہ بچہ کو ذبح کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ تھا کہ بچہ کو ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑ آئیں۔ تا کہ وہ کلی طور پر خدمت میں لگ جائے گویا دنیوی لحاظ سے اسے قربان کر دیا گیا۔ یہ ایک پیشگوئی تھی جو رؤیا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دکھائی گئی۔ مگر حضرت ابراہیمؑ نے دنو محبّت میں بیٹے کو خدا کے لئے ذبح کرنا چاہا یعنی اپنی قوم کے رواج کے ماتحت جو خدا تعالیٰ کا قائم کردہ نہ تھا بلکہ لوگوں کا اپنا بنایا ہوا تھا بیٹے کو قربان کرنا چاہا۔ خدا تعالیٰ ان کے اخلاص اور محبت کو دیکھکر اور بھی ان پر خوش ہوا اور کہا۔ اے ابراہیمؑ! جس طرح تُو ظاہری قربانی کرنے کے لئے تیار ہو گیا ہے، مَیں ظاہری لحاظ سے بھی اسے بچاؤں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خدا تعالیٰ نے اس وادیٔ غیر ذی زرع میں رزق پہنچانے کے ایسے سامان پیدا کر دیئے کہ وہاں کے رہنے والے رزق کی وجہ سے ہلاک نہ ہوں۔

پھر جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ عظیم الشان کام کسی اور کے سپرد نہ کیا تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ مَیں اپنے بیٹے کا ذبح ہونا دیکھ نہیں سکتا۔ کوئی زید یا بکر چھری چلا دے۔ بلکہ خود چھری چلانے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے ان کے بچے کو بچانے کے لئے بھی انہیں کسی انسان کا ممنون نہیں بنایا بلکہ اس کے لئے خود چشمہ پھوڑا جس سے اس بچہ نے پانی پیا۔ اس طرح کسی انسان کی مدد اور دستگیری سے اُسے بچا لیا۔ یہ ایک زبردست نشان ہے اس بات کا کہ قوم کے بعض افراد کو خدمتِ دین کے لئے اپنی زندگی وقف کر دینی چاہیئے گویا ظاہری طور پر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دینا چاہیئے تاکہ دوسرے ہلاکت سے بچ جائیں۔ یہ نشان ہے جو خدا تعالیٰ نے اس رؤیا سے قائم کیا۔ ہماری جماعت کو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ کوئی سلسلہ اور کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کے افراد کلی طور پر اپنے آپ کو قربان کرنے کے لئے تیار نہ ہوں اور بعض جزوی طور پر قربانی نہ کریں۔ کلی طور پر تو اس طرح کہ اپنے تمام اوقات خدمتِ دین میں صرف کریں اور جزوی طور پر اس طرح کہ کچھ اوقات دین کے لئے خرچ کریں اور کچھ دنیا کمانے کے لئے خرچ کریں۔ چنانچہ قرآن کریم سے یہ دونوں قسم کی قربانیاں معلوم ہوتی ہیں۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام والی قربانی بھی اور حضرت اسحاق علیہ السلام والی قربانی بھی۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی کلی طور پر قربانی کی گئی کہ کلی طور پر خدمتِ دین کے لئے وقف کر دیئے گئے اور حضرت اسحٰقؑ کو اپنے ملک میں رہنے دیا گیا تاکہ کاروبار کریں اور کچھ حصہ دین کی خدمت میں لگائیں[۵]۔ جزوی قربانی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ[۶]۔ ہر ایک مومن اپنے اموال میں سے کچھ دین کے لئے خرچ کرے

یہ حضرت اسحاق علیہ السلام والی قربانی ہے۔ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کلی طور پر اپنے آپ کو خدمت میں لگا دینا۔ اور اس کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینا ہے۔ جب تک کسی قوم میں دونوں قسم کی قربانیاں کرنے والے نہ ہوں۔ وہ قوم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر سارے کے سارے افراد کلی طور پر خدمتِ دین میں لگ جائیں اور دنیوی کام چھوڑ دیں تو یہ سوال پیدا ہو گا کہ دین کی مالی ضرورتیں کس طرح پوری ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ کا یہ منشاء نہیں کہ تمام کے تمام لوگ سب کاموں کو چھوڑ کر خدمتِ دین میں لگ جائیں۔ دین کی خدمت کے لئے مال کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اگر مال نہ ہو تو کام چل نہیں سکتا۔ لیکن اگر قوم کے سارے کے سارے افراد مبلغ بن جائیں اور اپنا سارا وقت تبلیغِ دین میں صرف کریں تو ٹریکٹ اور کتابیں کس طرح شائع ہوں۔ ان کے لئے اخراجات کہاں سے آئیں۔ بات یہ ہے کہ دین کے بعض کام ایسے ہیں جن کے لئے مال کی ضرورت ہے، رعب کی ضرورت ہے۔ جتھہ اور دبدبہ کی ضرورت ہے اور یہ باتیں دنیوی کاموں سے حاصل ہوتی ہیں۔ پس جماعت کا ایک حصّہ اور بڑا حصّہ ایسا ہونا ضروری ہے جو دنیوی مال کمائے اور اس میں سے دین کے لئے خرچ کرے۔ ایک حصّہ اور ہو اور وہ تھوڑا حصّہ ہو جو دین کے لئے وقف ہو۔ یہی کام دن رات کرے اور اسی میں لگا رہے۔ جماعت کو دشمنوں کے جوڑ توڑ سے واقف کرتا رہے، ان کے مقابلے میں مصروف رہے۔ یہ دو سلسلے ہیں جن سے مل کر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اسی کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ڈالی اور اسی کی یاد کے لئے یہ عید ہے۔ بہت لوگ کہتے ہیں قربانی کی کیا ضرورت ہے۔ جان ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ حالانکہ قربانی کرنا بھی مشق چاہتا ہے کوئی کام بغیر مشق کے نہیں ہو سکتا۔ مجھے خوب یاد ہے بچپن میں نجار ہمارے گھر کام پر لگے ہوئے تھے۔ جب ہم سکول سے پڑھ کر آتے تو وہ اپنے اوزار کو ہاتھ نہ لگانے دیتے۔ ایک دن ایک نجار اپنے اوزار یوں ہی چھوڑ کر چلا گیا، اس لئے مجھے موقعہ مل گیا۔ مَیں اور دوسرے ساتھ کھیلنے والے لڑکے بہت خوش ہوئے۔ مَیں نے تیشہ پکڑ کر ایک ہی ضرب لگائی کہ وہ میرے ہاتھ کے انگوٹھے پر لگی جس کا اب بھی نشان ہے۔ تو بغیر مشق معمولی ضرب بھی نہیں لگائی جا سکتی۔ حالانکہ ہم انہیں تیشہ چلاتے دیکھ کر سمجھا کرتے ان سے اچھا ہم چلالیں گے۔ چونکہ انسان کو ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ خدا کی یاد میں جان کی قربانی کرنے کے لئے تیار رہے۔ اور جب تک ظاہری قربانی نہ ہو یہ ہو نہیں سکتا۔ جب تک خون بہانے کی مشق نہ ہو جان دینے کے لئے انسان تیار نہیں ہو سکتا۔ پھل اور سبزیاں کھانے والے بہادری کے ساتھ خون بہانے کے لئے کبھی تیار نہ ہوں گے۔ کہا جائے گا کہ گائے کے لئے ہندو

مسلمانوں کو مار ڈالتے ہیں۔ مگر یہ ان کی قربانی نہیں ہوتی بلکہ بزدلی ہوتی ہے جن میں طاقت اور قوت کے ساتھ بہادری ہوتی ہے، وہ کسی کو تباہ کرنے پر دلیری نہیں کیا کرتے۔ بلکہ وہ موقعہ دیتے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ بلّی چوہے کی مثال سنائی ہے۔ بلّی چوہے کو پکڑ کر چھوڑ دیتی ہے۔ جب بھاگنا چاہتا ہے تو پھر پکڑ لیتی ہے۔ وہ اسے یہ بتانا چاہتی ہے کہ چوہا اس کے ہاتھ سے نکل نہیں سکتا، تو فنا کر دینے پر آمادہ ہو جانا بزدلی کی علامت ہے۔ بہادر انسان انتہائی نقصان پہنچاتے ہیں جس قدر بقا کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ جتنے بڑے بڑے بہادر ہوئے ہیں اتنے ہی زیادہ عفو کرنے والے ہوئے ہیں اور جتنے ایسے بزدل ہوئے ہیں جنہیں دوسروں کو تباہ کرنے کے سامان ہاتھ آ گئے وہ فنا کرتے گئے۔ سچی بہادری یہی ہوتی ہے کہ دشمن پر قابو پانے کے بعد اتنی ہی تکلیف پہنچائے جو اس کے لئے اور اس کی قوم کے لئے ضروری ہو اور پھر عفو کر دیا جائے۔ غرض قربانی کے لئے انسان سوائے مشق کے تیار نہیں ہو سکتا۔ اور یہ مشق اس عید کے موقعہ پر اس طرح کرائی جاتی ہے کہ انسان اپنے ہاتھ سے جانور ذبح کرے تاکہ جب خدا کے لئے خون بہانے کی ضرورت ہو تو خون بہائے اور جب رک جانے کا حکم ہو تو رک جائے چنانچہ ان دنوں خون بہایا بھی گیا ہے اور خون بہانے سے روکا بھی گیا ہے۔ مسلمان آج خون بہا رہے ہیں۔ مگر آج سے دس بارہ دن پہلے مکّے کی سرزمین میں شکار کرنے سے منع کر دیا گیا تھا غرض خدا تعالیٰ نے اس تقریب پر یہ مشق کرائی ہے کہ جب خون بہانے کے لئے کہا جائے تو خون بہاؤ اور جب کہا جائے مت بہاؤ تو رک جاؤ۔ پس اس عید میں دونوں قسم کے نظارے رکھے گئے ہیں اور یہ تمثیلی زبان میں دلیری اور جرأت پیدا کرنے کے لئے مشق کا سامان ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر حقیقی قربانی کے لئے تیاری کرنی چاہیئے۔ اور ہماری جماعت میں دونوں قسم کی قربانی کرنے والے ہونے چاہئیں۔ وہ بھی جو دنیا میں ترقی کریں اور اپنے اموال کو خدا کے دین کے لئے صرف کریں۔ اور وہ بھی جو کلّی طور پر خدمت دین میں اپنے آپ کو لگا دیں اور دن رات اسی کام میں لگے رہیں۔

خدا تعالیٰ ہماری جماعت میں دونوں قسم کے لوگ پیدا کرے۔ جو نیک نیتی سے اپنا اپنا کام کریں۔ انہیں اپنے کام پر استقلال حاصل ہو۔ اور وہ اسے اپنے لئے نعمت سمجھیں۔ نہ وہ ہوں جو دنیوی ترقی کریں اور پھر اس پر فخر کریں کہ انہوں نے کوئی دین کا بڑا کام کیا ہے نہ وہ ہوں جو دین کے لئے اپنے آپ کو وقف کریں اور پھر کہیں ان کی قربانی کی قدر نہیں کی گئی۔ ان کی قربانیاں خدا کے لئے ہی ہوں اور اسی سے بدلہ چاہیں۔

(الفضل ۲۸ رمئی ۱۹۲۹ء صفحہ ۵-۶)

۱ - طبقات الشافعیۃ الکبریٰ مؤلفہ شیخ الاسلام تاج الدین السبکی جزء ثانی ص۶۵ مطبوعہ مصر۔

۲ - المائدہ ۵ : ۲۸

۳ - پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۳

۴ - "ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام" مصنفہ علامہ عباس محمود العقاد المصری ترجمہ مولانا راغب رحمانی ص۱۵۳ - ص۲۶۰

۵ - پیدائش باب ۲۵ آیت ۵ - ۶ ، جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۶ ص۶۱۶

۶ - البقرہ ۲ : ۴

۷ - صحیح بخاری کتاب الاضاحی باب من ذبح الاضاحی بیدہٖ۔

۸ - جامع ترمذی ابواب الحج باب ماجاء فی حرمۃ مکۃ۔

۱۸

(فرمودہ ۱۰ر مئی ۱۹۳۰ء بمقام قادیان)

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا افتراق اس حد تک نمایاں اور ایسا دل شکن ہے کہ اسے دیکھتے ہوئے اس زمانہ میں کسی کو یہ جرأت ہی نہیں ہو سکتی کہ مسلمانوں کے اتحاد کے متعلق امید اور وثوق سے کوئی بات کہہ سکے۔ جس طرح ایک ایسے جنگل میں جہاں سینکڑوں میل تک کوئی آبادی نہ ہو کسی کو امداد کے لئے پکارنا یا کسی سے جواب کی امید رکھنا ایک فضول اور عبث فعل ہے اور اگر کوئی ایسی حالت میں پکارے گا بھی تو اس کی آواز یقین اور وثوق سے خالی ہو گی۔ ایک رسم اور عادت کے ماتحت ضرورت کے وقت ایک مصیبت زدہ چیخ پڑے گا۔ لیکن حقیقتاً اس کا دل امید سے خالی ہو گا اور وہ جانتا ہو گا کہ میری آواز بالکل بے اثر اور بے فائدہ ہے۔ اس کی نگاہیں اس عادت کے ماتحت جو بچپن سے اسے پڑ چکی ہے اُوپر کو اُٹھیں گی اور وہ اس طرح دیکھے گا جس طرح مصیبت کے وقت ایک انسان اپنے دوستوں اور پیاروں کی طرف دیکھتا ہے لیکن اس کی نگاہ امید اور تاثیر سے خالی ہو گی۔ اسی طرح اس زمانہ میں مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دینا یا ایک بات پر جمع ہونے کی تلقین کرنا ایک غیر ممکن فعل اور بے فائدہ کام نظر آتا ہے۔ ایسا کرنا ایک ایسی آواز سے مشابہ ہے جو صحرا میں اٹھتی اور وہیں فنا ہو جاتی ہے۔ اور ایک ایسے شخص کی نگاہ ہے جو جنگل میں ایسے درختوں پر پڑتی ہے جو اس کی خواہش اور التجا کا جواب نہیں دے سکتے اور خود اس کے قلب میں بھی کوئی امید یا یقین نہیں ہوتا۔ مگر باوجود اس حالت کے جس میں مسلمان اس وقت مبتلا ہیں اور باوجود اس مایوسی کے جو اس وقت ان کے خیر خواہوں کے دلوں میں پیدا ہو چکی ہے ہمارا ایمان ہے کہ بعض اوقات ایسے آجاتے ہیں جب خدا تعالیٰ مایوسی کو امید سے اور غم کو خوشی سے تبدیل کر دیتا ہے۔ اگر ہمیشہ کے لئے انسان پر مایوسی ہی مایوسی طاری رہے تو وہ تمام اعلیٰ کاموں سے محروم رہ جائے اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے امید کی گھڑیاں بھی پیدا کی ہیں اور خوشی کی ساعتیں بھی رکھی ہیں تا مایوسیوں کی غیر متزلزل اور لمبی کڑی اسے ہمیشہ کے لئے قوتِ عمل سے محروم نہ کر دے۔ ہم سے مسلمانوں کو جو مخالفت ہے وہ ظاہر ہے اور بعض تو ہماری مخالفت میں اس حد تک بڑھے ہوتے ہیں کہ ان کے نزدیک ہماری مخالفت میں وہ جو کچھ بھی کر سکتے ہیں، جائز اور صحیح سمجھتے ہیں۔ اور ان کی ساری طاقت ہماری طاقت کو توڑنے کے لئے صرف ہو رہی ہے۔ خدا تعالیٰ انہیں بار بار ناکام کر کے بتاتا ہے کہ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن

ان کے دل ہماری طرف سے خطرات سے اس قدر پُر ہیں کہ باوجود متواتر ناکامیوں کے باز نہیں آتے۔ ذلّت کے بعد ذلت، رسوائی کے بعد رسوائی، شکست کے بعد شکست اور ہزیمت کے بعد ہزیمت اُٹھاتے ہیں حتیٰ کہ خود ان کے ہم خیال ان کے طریق کار کی مذمت کرتے اور انہیں سمجھاتے ہیں کہ اس قسم کی شرارت اور دنایت قومی مفاد کے منافی اور اسلامی تعلیم کے مخالف ہے۔ مگر باں ہمہ وہ باز نہیں آتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر میدان میں بتا دیا ہے کہ جو لوگ اس کی مدد اور نصرت کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، انہیں تباہ کرنا کسی انسان کا کام نہیں اور احمدیت اسی طرح قائم کی گئی ہے بلکہ ہر نبوت اور ماموریت اس طرح قائم کی جاتی ہے جس طرح اسماعیلی درخت کو خدا تعالیٰ نے مکہ کی سرزمین میں لگایا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی صداقت اور راستبازی ایسے حالات میں کبھی دُنیا میں نہیں آتی کہ اس کے نشوونما پانے کے لئے میدان خالی ہو۔ صداقت ہمیشہ اسی وقت آتی ہے جب اس کے پنپنے اور نشوونما پانے کے لئے میدان خالی نہیں ہوتا۔

صداقت کا بیج خدا تعالیٰ اپنے ہاتھ سے ویران مقام پر ڈالتا ہے تا وہ دوسرے بڑے درختوں کے سایہ سے محفوظ رہ کر ترقی کر سکے۔ اور اس وجہ سے انبیاء کی جماعتیں الگ قائم کی جاتی ہیں۔ نادان خیال کرتے ہیں کہ فلاں مدعیٔ نبوت نے آکر لوگوں میں شقاق اور تفرقہ ڈال دیا۔ باپ کو بیٹے سے، بھائی کو بھائی سے جُدا کر دیا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک ہوشیار مالی نئے پودے کو ہمیشہ الگ لگاتا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا بیوقوف مالی نہیں ہوگا جو کسی نئے اور قیمتی پودے کو کسی بڑے درخت کی جڑ کے پاس لگا دے کیونکہ وہ جانتا ہے اس طرح پودا ضائع ہو جائے گا۔ وہ ہمیشہ اسے ایسی جگہ لگائے گا۔ جہاں طاقت پکڑ سکے اور جہاں اسے پوری غذا مل سکے۔ اور اگر نئی جماعتوں کا الگ قائم کرنا بُری چیز ہے تو اس کی بنیاد نمایاں طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھی جنہوں نے اپنے بیٹے کو تمام رشتہ داروں، عزیزو اقارب اور ملک و وطن سے علیحدہ کر کے وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑ دیا۔ کیا اس کے یہ معنے لئے جائیں گے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عرب و شام اور عبرانیوں و شامیوں میں جدائی ڈال کر شقاق پیدا کرنا چاہتے تھے؟ نہیں ہرگز نہیں، وہ جانتے تھے کہ اس ہونہار پودے کے نشوونما اور ارتقاء کے لئے وادیٔ غیر ذی زرع ہی کی ضرورت ہے۔ خدا تعالیٰ کی مشیّت یہی تھی کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کو پہلے ترقی دی جائے اور اسماعیلی پودا ایک دور مقام پر چھوٹی حالت میں رکھا جائے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چھوٹے پودے بڑے درخت کے زیر سایہ نہیں بڑھ سکتے اور ہمیشہ ضائع ہو جایا کرتے ہیں۔ اور چونکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کو بعد میں خدا تعالیٰ نے ترقی دینی تھی، اس لئے اس کا پودا ایک سنسان جگہ میں لگایا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد نے ترقی کی مگر اسے کبھی یہ خیال بھی نہ آیا کہ مکہ فتح کرے کیونکہ وہ لوگ جانتے تھے اسے فتح کرنا کسی فائدہ کا موجب

نہیں ہو سکتا بلکہ اُلٹا اس پہ خرچ ہی آئے گا۔ مکہ نہ صرف متمدن دنیا سے الگ تھلگ مقام تھا۔ بلکہ غیر ذی زرع بھی تھا اور اسی مقام کو خدا تعالیٰ نے اسماعیلی پودے کے لئے اس لئے منتخب کیا۔ تا دوسرے لالچ کی نظر سے اسے نہ دیکھیں۔

پس یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ نیا پودا ہمیشہ علیحدہ لگایا جاتا ہے۔ نادان اسے شقاق اور تفرقہ قرار دیتا ہے، حالانکہ یہ قانونِ قدرت کے عین مطابق ہے۔ اگر نئے پودے پُرانے درختوں کے نیچے لگانے شروع کر دیئے جائیں تو نیا بہت جلد باغوں سے محروم ہو جائے کیونکہ پُرانا درخت تو اپنی عمر کو پہنچ کر ضائع ہو جائے گا اور نیا پودا اس کی وجہ سے غذا حاصل نہ کر سکے گا اور اس وجہ سے وہ بھی ضائع ہو جائے گا دنیا میں ہر ایک جو غذا کھاتا ہے ترقی نہیں کرتا۔ بوڑھے آدمی کو خواہ کتنی ہی غذا کیوں نہ دی جائے پھر بھی وہ انحطاط کی طرف ہی جائے گا۔ لیکن ایک بچہ کو اس سے چوتھائی حصہ بھی دی جائے تو وہ جلد جلد بڑھے گا۔ پس محض غذا کھانا ترقی کی علامت نہیں ہوا کرتی بلکہ ترقی میں عمر کا بھی دخل ہوتا ہے۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ جو قومیں اپنی عمر کو پہنچ جاتی ہیں اور جن کی اجل آجاتی ہے اور جو اس بات کی انتظار میں ہوتی ہیں کہ خدا تعالیٰ کا ہاتھ بڑھے اور ان کو جڑھ سے کاٹ دے ان کے لئے خواہ کتنی غذا کیوں نہ مہیا کی جائے وہ بچ نہیں سکتیں۔ بوڑھے آدمی کو مغزیات اور مقویات وغیرہ دینے سے ممکن ہے اس کی موت میں چند روز کا التوا ہو جائے لیکن وہ کسی کام کا نہیں بن سکتا۔ ایک نوّے سالہ بوڑھے کو کتنی غذائیں کھلاؤ اور مالشیں کرو۔ اگر اس میں کوئی تغیّر ہوگا تو وہ زیادہ سے زیادہ یہی کہ اگر لیٹا ہی رہتا ہوگا تو کسی وقت بیٹھنے لگ جائے گا لیکن دوبارہ پہلوان نہیں بن سکے گا۔ لیکن ایک بچے سے یہ امید کی جاتی ہے کہ اگر اسے مقویات کھلائی جائیں تو وہ ترقی کر جائے۔ جو گھی اور مغزیات بوڑھے کو کھلائی جاتی ہیں وہ ضائع جاتی ہیں لیکن جو سوکھی روٹی بچہ کو دی جائے وہ کام آتی ہے کیونکہ بچہ اس سے بھی طاقت حاصل کرتا ہے۔ جو غذائیں بوڑھے کو دی جائیں وہ زیادہ سے زیادہ ایک دیوار بن سکتی ہیں جس سے وہ سہارا لے سکے۔ لیکن جو کچھ بچہ کو کھلایا جائے وہ ایک گھوڑا ہوتا ہے جو اسے ترقی کی منزل پر پہنچاتا ہے۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ جب قومیں اپنی عمر گذار لیتی ہیں اس وقت ان میں اتحاد اور ان کی ترقی کے لئے خواہ کتنی کوشش کرو، وہ زیادہ سے زیادہ ایک سہارے کی دیوار ثابت ہوگی۔ لیکن جو نئی جماعت خدا تعالیٰ کی طرف سے قائم کی گئی ہو اس کی ترقی کی کوشش سواریاں ہوں گی جو اسے لے کر دور دور لے جائیں گی اور دنیا پر مسلط کر دینگی۔

پس یاد رکھو کہ جب کوئی قوم اپنی اجل کو پہنچ جاتی ہے تو اسے قائم اور زندہ رکھنے کے لئے کوشش کرنا اپنے زور اور طاقت کو ضائع کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ شخص نادان ہے جو یہ کہتا ہے

کہ ایسی قوم کی موجودگی میں نئی بنیاد ڈالنا فضول ہے۔ جب خدا تعالےٰ کی طرف سے ایک قوم کے متعلق فیصلہ ہو گیا کہ وہ اپنی عمر کو پہنچ گئی تو اس پر قوت کو ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھو اگر ایک بچہ اور بوڑھا ہو اور دونوں کے لئے غذا میسّر نہ آتی ہو لیکن اتفاقاً کوئی چیز کھانے کو مل جائے اور یہ سوال پیدا ہو کہ کسے دی جائے تو ضرور پہلے بچہ کو ہی دی جائے گی تاکہ اس کی زندگی قائم رہے اور یہ ایک فطری احساس ہے جو ہر ماں باپ میں پایا جاتا ہے۔ ماں باپ خود قربان ہو جائیں گے لیکن بچہ کو تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ اور یہ بات کسی عقل کے ماتحت نہیں بلکہ فطرت کے ماتحت ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دراصل عقل کے عین مطابق ہے۔ ماں باپ اپنی عمر کا بہترین حصّہ گذار چکے ہوتے ہیں لیکن بچہ کے لئے ابھی کام کرنے کا میدان کھلا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ماں باپ اپنے آپ کو اپنی اولاد پر قربان کر دیتے ہیں۔ تو خدا تعالےٰ جب کوئی نئی جماعت قائم کرتا ہے، اسے دوسروں سے الگ کر دیتا ہے تا اسے ترقی کرنے کے لئے کافی غذا مل سکے۔ بلکہ اگر دوسروں کی غذا بند کر کے بھی اسے دینی پڑے تو دیتا ہے۔

ہماری جماعت بھی وہ نیا پودا ہے جسے خدا تعالےٰ نے اس زمانہ میں لگایا[1]۔ خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو الہام کیا۔ غَرَسْتُ لَکَ بِیَدِیْ دَوْحَۃَ اِسْمٰعِیْلَ[2]۔ اس کے یہی معنے ہیں کہ جس طرح اسماعیلؑ کو علیحدہ کر کے بسایا تھا۔ اسی طرح احمدیت کو بھی دوسروں سے علیحدہ قائم کروں گا۔ چونکہ لوگوں نے اعتراض کرنا تھا کہ ان لوگوں نے اپنی نمازیں، شادی بیاہ۔ جنازہ وغیرہ کیوں علیحدہ کر لئے؟ اس لئے اس الہام میں خدا تعالےٰ نے اس کا ایک جواب دیا ہے کہ اسمٰعیلؑ کو بھی ابراہیمؑ نے دوسروں سے بالکل علیحدہ کر دیا تھا۔ اور یہ ظلم، فساد اور تفرقہ نہیں تھا بلکہ ضروری تھا تا محمدی نور ترقی کر سکے۔ اس زمانہ میں بھی محمدی نور مدھم ہو رہا تھا، اس لئے خدا تعالےٰ نے پھر احمدیت کے پودے کو علیحدہ کر کے لگایا اور اسماعیلی پودے کی طرح اسے بھی وادیٔ غیر ذرع میں لگایا یعنی قادیان میں جو ترقی یافتہ اور متمدّن دنیا سے بالکل الگ اور علیحدہ مقام ہے۔ پھر اس کی حفاظت بھی ایک بے کس اور ناتوان جماعت کے سپرد کی تا دنیا اس کی طرف لالچ کی نگاہ سے نہ دیکھے اور محمدی نور پھر دنیا میں ترقی کرے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک نادان بوڑھا مالی جو اپنے پرانے درختوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے نئے درخت لگائے جانے کو اپنی ہتک سمجھتا ہے لیکن اسے کیا معلوم کہ اس کا باغ تباہ ہونے والا ہے اور اگر پھل کو دنیا میں قائم رکھنا ہے تو ضروری ہے کہ نئے نئے درخت لگائے جائیں۔

ہماری جماعت کے بعض دوست دنیا کی مخالفت کو دیکھ کر گھبراتے ہیں۔ حالانکہ ساری دنیا ہماری مخالف نہیں۔ فطرت صحیحہ ہماری تائید میں ہے[3]۔ مخالفت ہمیشہ شیطانی وساوس سے ہوتی ہے

انسانیت کی طرف سے نہیں اور اشد ترین مخالفوں پر بھی جب کبھی انسانیت کا دَور آتا ہے تو ان کا دل ہماری تائید ہی کرتا ہے ۔ اگرچہ وہ اسے ظاہر نہ کر سکیں۔ دنیا میں جتنے بھی شریف لوگ ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا عیسائی، یہودی یا کسی اور قوم سے تعلق رکھتے ہوں، وہ ضرور ہماری تائید کرتے ہیں ۔چند دن ہوئے ایک ڈچ کانسل* یہاں آیا۔ وہ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتا ہے لیکن یہاں کی زندگی کے متعلق اس نے کہا۔ میں بائیبل میں حواریوں کی زندگی کے حالات پڑھ کر حیران ہوا کرتا تھا کہ کیا ایسی زندگی ممکن ہے لیکن یہاں آکر ان کی زندگی کا عملی نمونہ نظر آگیا۔ وُہ عیسائی تھا اور سیاسیات سے تعلق رکھتا تھا لیکن یہاں جس چیز نے اسے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ تھی کہ یہاں اسے حضرت مسیح علیہ السلام اور آپ کے حواریوں کی زندگی کے متعلق بائیبل کے بیانات کی جنہیں وہ ناممکن سمجھا کرتا تھا تصدیق ہوگئی تو ایک شریف انسان خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو وہ اس جدوجہد کو جو دنیا کی اصلاح کے لئے ہم کر رہے ہیں قدر کی نگاہ سے دیکھیگا۔ ہاں جن کے دلوں پر زنگ لگ چکا ہے اور جن کی آنکھیں بیمار ہیں وہ مجبور ہیں انہیں ہمارے اندر کوئی خوبی نظر نہیں آتی ۔جس طرح یرقان کا مریض ہر چیز کو زرد ہی دیکھتا ہے یا اور مختلف بیماریوں میں مختلف رنگ نظر آتے ہیں یا بعض وقت بیماری کی وجہ سے ایک کے دو دو نظر آتے ہیں ۔اسی طرح جن کی روحانی آنکھیں بیمار اور دل مُردہ ہوں ان کو بہرحال ہماری جماعت بھی بُری ہی نظر آئے گی جس شخص کی ناک میں پھوڑا ہو اسے ہر چیز اور ہر مقام سے بُو ہی آئے گی حالانکہ بُو اس کی اپنی ناک میں ہوتی ہے اسی طرح جن کی ناک اور دل و دماغ میں بیماری ہے، انہیں قرآن، توریت، انجیل ہر جگہ بُرائی ہی برائی نظر آئے گی۔ ممکن ہے مذہب کی پیچ یا لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے وہ اس کا اظہار نہ کریں لیکن اگر انہیں کریدا جائے تو ایسا مسلمان قرآن پر، عیسائی انجیل پر، یہودی توریت پر اور سکھ گرنتھ پر معترض نظر آئے گا۔ اور جب وہ اپنی کتاب پر ہی معترض ہو تو اس کی طرف سے دوسرے پر اعتراض تعجب انگیز نہیں۔ ایسے لوگوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کرنی چاہیئے۔ صداقت ضرور لوگوں کے دلوں میں گھر کر کے رہتی ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ صداقت پر چلنے کا دعویٰ کرنے والے دنیا کو اپنا پھل دکھائیں۔ دُنیا میں کوئی درخت بغیر پھل کے قیمت نہیں پاتا۔ اللہ تعالےٰ نے ہماری جماعت کا نیا پودا اسی لئے علیحدہ لگایا ہے کہ دُنیا کو ہم اپنے شیریں ثمرات دیں۔ اور اگر نئے پودے پھل نہ دیں تو مالی انہیں کاٹ کر نیا باغ لگاتا ہے ۔پس جہاں یہ اعتراض غلط ہے کہ ساری دنیا ہماری مخالف ہے وہاں اگر واقعہ میں ہماری جماعت دنیا میں راحت و آسائش کے لئے مفید نہ ہو تو ناجائز سے ناجائز اعتراض بھی جائز ہی ہوگا۔ اس لئے ہماری جماعت کے لوگ اپنے وجودوں کو دنیا کے لئے مفید بنائیں اور اگر وہ ایسا

---

* DUTCH COUNSEL

نہیں کرتے تو گویا باغ کی اہمیت کو گرانے کے ساتھ ہی اپنے وجود کی ضرورت کو بھی کھوتے ہیں۔ اگر کوئی پودا پھل نہیں دیتا تو اس کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی احمدی کا وجود دنیا کے لئے فائدہ رساں نہیں اور اگر وہ دنیا کی بھلائی کی خاطر ہر قربانی کے لئے آمادہ نہیں تو پھر اس کے علیحدہ وجود کی بھی ضرورت نہیں۔

یہ عید جہاں ہمیں یہ سبق سکھاتی ہے کہ خدا تعالیٰ جب کسی قوم کو ترقی دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے علیحدہ کر کے ایسے مقام پر کھڑا کرتا ہے جہاں دوسرے اس سے نہ مل سکیں۔ اور جہاں کھڑا رہنا بظاہر اس کی تباہی کے مترادف ہو لیکن خدا تعالیٰ کی نصرت اسے بڑھاتی ہے وہاں ہمیں اس عید سے یہ سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ بغیر قربانی کے اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اس عید کے موقعہ پر تمام دنیا کے مسلمان ایک مقام پر جمع ہوتے ہیں تا خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل کریں۔ اور اس کے یہ معنے ہیں کہ قربانی کے بغیر نہ باہمی اتحاد ہو سکتا ہے اور نہ ہی خدا تعالیٰ سے وصال۔ آج کے دن بکرے کھانے کے لئے ذبح نہیں کئے جاتے بلکہ کھلانے کے لئے کئے جاتے ہیں جس کے یہ معنے ہیں کہ ہم دوسروں کے لئے اپنا خون اور گوشت قربان کرنے کو تیار ہیں۔ ہم نے کئی دفعہ ایسے لطیفے دیکھے ہیں۔ کہ ایک شخص نے دوسرے کے ہاں گوشت بھیجا اس نے آگے کسی اور کے ہاں بھیج دیا۔ اور اس طرح دس بارہ گھروں میں پھر پھرا کر وہی گوشت اسی کے گھر آگیا جس نے بھیجا تھا۔ اور اس نے اپنا بھیجا ہوا گوشت پہچان لیا۔ ہم اسے بے فائدہ کام نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس گوشت نے دس بارہ آدمیوں سے اس بات کا اقرار لے لیا ہے کہ ہم اپنا خون اور گوشت پوست ایک دوسرے کے لئے قربان کرنے کو تیار ہیں وہ اپنے ساتھ دس بارہ برکتیں لے کر آیا، اب اگر وہی گوشت بھیجنے والے کے گھر میں پکے تو وہ اس کے لئے برکت کا موجب ہوگا کیونکہ وہ دس گھرانوں سے اتحاد کا اقرار کرا چکا ہے۔

آج کے دن جو قربانی کی جاتی ہے وہ اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ ہم دُنیا کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار ہیں۔ اور پھر یہ خدا کے سامنے اقرار ہوتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو تیرے لئے قربان کرنے کو تیار ہیں، نیز یہ اتحاد کا دن ہے اور اس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ پس اپنے دل میں عہد کرو کہ ہم اپنے بھائی کے لئے ہر قربانی کرنے کے لئے تیار ہیں اگر کسی کو تباہ ہوتا دیکھو تو ہر ممکن قربانی کر کے اسے بچاؤ۔

مَیں دیکھتا ہوں کچھ عرصہ سے ہماری جماعت کے بعض دوستوں میں یہ احساس ترقی کرتا جا رہا ہے کہ ہم نے اپنا حق ضرور لینا ہے۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جو اپنا انتہائی حق لینے کے لئے کھڑا ہوتا ہے وہ دوسرے کا حق ضرور مارتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ ہر بادشاہ کی رکھ ہوتی

ہے جس کے کنارے مویشی چرانا خطرہ سے خالی نہیں ہوتا ۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ کی بھی کچھ رکھیں ہیں ان کی حدود پر نہ جاؤ بلکہ پرے پرے رہو ۔ کیونکہ رکھ کے آخر سرے پر پہنچکر احتمال ہوتا ہے کہ اس کی حدود میں بھی گھس جاؤ ۔ اس لئے اس سے پرے پرے رہو تا تفرقہ کی صورت پیدا نہ ہو ۔ دنیا میں بھی قیام امن کا یہی طریق سمجھا جاتا ہے کہ سرحدوں پر فوجیں رکھنے کی بجائے دور رکھی جاتی ہیں پس انتہائی درجہ کے حقوق کا مطالبہ ضرور تباہ کر دیتا ہے ۔ اس لئے اگر تم قربانی کرتے ہو تو انتہائی حقوق حاصل کرنے کے لئے کبھی اصرار نہ کرو ۔ اپنا حق ثابت ضرور کر دو اور پھر اصرار نہ کرو بلکہ عفو سے کام لو ۔ یہ بات پوری طرح واضح کر دو کہ یہ ہمارا حق ہے لیکن تفرقہ سے بچنے کے لئے ہم اسے چھوڑتے ہیں ۔ انتہائی حقوق کا مطالبہ کرکے کئی ایک نے دیکھا ہوگا کہ تفرقہ بڑھا ۔ اب یہ تجربہ کرکے بھی دیکھ لو کہ اپنا حق ثابت کرنیکے بعد اسے چھوڑ دو ۔ پھر دیکھو باہمی اتحاد ترقی کرتا ہے یا نہیں اور جس طرح ایک بڑھیا پر دوبارہ جوانی آجائے اسی طرح تمہاری حالت میں نئی تبدیلی نظر آئے گی ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے ۔ دوزخ میں انسان جل کر کوئلہ کی طرح ہو جائے گا ۔ پھر خدا تعالےٰ کی رحمت کے پانی کا چھینٹا اس پر پڑے گا اور نئی روئیدگی اس کے اندر پیدا ہو جائے گی [۵] یہی حالت انسانی روح کی ہے جب وہ خدا تعالےٰ کے لئے قربانی کرتا ہے تو اس کے عفو کا پانی اسے شاداب کر دیتا ہے اور اس کے اندر ایک نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے ۔

پس میں دوستوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اس بات کا تجربہ کریں کہ اپنا حق ثابت کرنے کے بعد عفو اور درگذر سے کام لیں ۔ جس شخص کا حق ہو اسے چونکہ سوچنے سمجھنے کا کم موقعہ ملتا ہے اس لئے اس کے دوستوں کا فرض ہے کہ اس وقت اسے سمجھائیں ۔ جو دوست اسے نہیں سمجھاتا وہ بئس القرین ہے دوست کا فرض یہی ہے کہ جب اس کے دوست کی عقل ماری جائے تو اس کے کان میں ایسی بات ڈالے جو اس کے لئے برکت کا موجب ہو تا جب اس پر بھی کوئی ایسا موقعہ آئے کہ اس کی عقل ٹھکانے نہ رہے تو اسے بھی وہ آکر بھلائی کی بات سمجھائے ۔

عرصہ ہوا میں نے ایک رؤیا دیکھا تھا کہ قیامت کا دن ہے اور ہم سب اللہ کے حضور پیش ہیں اس کے بہت سے نظارے تھے مگر میں تفصیلاً بیان نہیں کرتا ۔ میں نے دیکھا کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ اپنی پیٹھوں کی طرف دیکھو جس کے پیچھے دیوا کچی ہوگی وہ دوزخی ہے اور جس کے پیچھے پکی وہ جنتی ۔ یہ سنکر ہم سب پر اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ بہت عرصہ تک سب چپ چاپ بیٹھے رہے اور کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھتا تھا ۔ میرے پاس حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ بیٹھے تھے ۔ انہوں نے مجھے کہا : تم میرے پیچھے دیکھو اور میں تمہارے پیچھے دیکھتا ہوں ۔ اس پر میں نے اُنکے

پیچھے دیکھا اور بے اختیار پکار اُٹھا ، آپ کے پیچھے کی دیوار پکی ہے ۔ اور انہوں نے کہا ۔ تمہارے پیچھے بھی پکی ہے اور ہم بڑے خوش ہو گئے تو خطرات کے موقع پر آپس میں تعاون کرنا بہت خیر و برکت کا موجب ہوا کرتا ہے ۔ جب تم اپنے بھائی کو اس وقت جبکہ اس کی عقل ماری جائے نصیحت نہیں کرتے تو تم پر ایسا وقت آنے پر وہ بھی نہیں کرے گا ۔ اور اگر تم اسے بُری راہ پر لگانے کی کوشش کرتے ہو تو وہ بھی ایسا ہی کرے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں تباہ ہو جاؤ گے ۔ پس جب تمہارے کسی بھائی پر ایسی مصیبت آئے کہ وہ اپنا انتہائی حق مانگنے پر مصر ہو ، کسی احمدی سے یہ تو امید ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ حق کے سوا بھی کچھ مانگے ، لیکن جب وہ اپنا حق لینے پر مصر ہو تو اسے سمجھاؤ کہ وہ تفرقہ سے بچنے کے لئے قربانی کرے تا تم پر اگر ایسی حالت آئے تو تمہارا دوست یہ سوچ کر کہ اس نے مجھے جنّت کا راستہ دکھایا تھا میں بھی اسے دکھاؤں تمہاری مدد کو آئے ۔ اور کہے مجھ پر بھی ایک وقت ایسا آیا تھا جیسا اب تم پر ہے اس وقت تم نے میری دستگیری کی تھی اور صحیح راستہ دکھایا تھا اب تم پر یہی مصیبت ہے اس لئے میں تمہیں بھی نصیحت کرتا ہوں کہ بھائی کی رعایت کرو ۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے قربانی کی رُوح پیدا ہو سکتی ہے ۔

پس یاد رکھو کہ حقیقی ترقی کی راہ یہی ہے کہ بھائی کو مصیبت کے وقت قربانی کی تلقین کرو ۔ مَیں اللہ تعالےٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں ایسا کرنے کی توفیق دے ۔ حقیقی قربانی وہی ہے جو تقویٰ اللہ کی وجہ سے کی جائے اور جو اللہ تعالےٰ کی رضا اور باہمی اتحاد کے لئے ہو ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے تا وہ مقام جو ایک طرف اس سے ملتا ہے اور دوسری طرف تمام دنیا کو بھائی بھائی بنانا ہے ، ہمیں حاصل ہو جائے ۔

(الفضل ۱۶ ؍ مئی ۱۹۳۰ء صفحہ ۵ تا ۸)

۱؎ ۔ رُوحانی خزائن جلد ۱۷ ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۴۹ ۔ ملفوظات جلد ۴ صفحہ ۱۸۶ حاشیہ

۲؎ ۔ تذکرہ طبع سوم صفحہ ۹۱ و صفحہ ۵۹۵

۳؎ ۔ "ہر طرف آواز دینا ہے ہمارا کام آج ؛ جس کی فطرت نیک ہے آئیگا وہ انجام کار" (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱)

۴؎ ۔ مسٹر سی اینڈریاساجو سماٹرا میں ڈچ آفیسر تھے ، جنہیں ڈچ قونصل مقرر ہوئے تو وہاں جاتے ہوئے ۵ اپریل ۱۹۳۰ء کو قادیان بھی تشریف لیگئے (الفضل ۸ اپریل ۔ ۹ مئی ۱۹۳۰ء)

۵؎ ۔ "علم الامراض" مصنفہ میر اشرف علی صفحہ ۲۷۶

۶؎ ۔ فتح اسلام صفحہ ۱۴ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۱ء

۷؎ ۔ جامع ترمذی ابواب البیوع باب ما جاء فی ترک الشبہات

۸؎ ۔ سنن دارمی الجزء الثانی صفحہ ۳۳۲ مطبوعہ دمشق ۱۳۴۹ھ ۔

۱۹

عید الاضحی ۲۹ر اپریل ۱۹۳۱ء کو منائی گئی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان دنوں منصوری میں قیام فرما تھے اور بعارضہ بخار، پیٹ درد اور اسہال بیمار تھے جس کی وجہ سے غالباً عید کی نماز بھی نہ پڑھا سکے۔ سلسلہ کے کسی اخبار میں حضور کے اس سفر میں نماز عید پڑھانے کا ذکر نہیں ملتا۔ (مرتب)

۲۰

(فرمودہ ۱۷ اپریل ۱۹۳۲ء بمقام باغ حضرت مسیح موعود علیہ السلام قادیان)

گلے کی خرابی اور بعض دیگر تکالیف کے باعث مَیں زیادہ دیر نہیں بول سکتا اور اسی طرح اونچی آواز سے بھی نہیں بول سکتا۔ لیکن عید کا خطبہ چونکہ عبادت کا ایک جزو ہے[۱] اس وقت بولنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے مَیں اختصار کے ساتھ دوستوں کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ شریعت کے بعض احکام بظاہر چھوٹے ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر بڑی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ ایک شخص اس بات پر مجھ سے گفتگو کر رہا تھا کہ داڑھی رکھنا ضروری ہے یا نہیں مختلف دلائل سننے کے بعد اس نے کہا۔ میں نہیں سمجھ سکتا روحانیت کی بنیاد چند بالوں کے رکھنے یا نہ رکھنے پر کیونکر ہو سکتی ہے۔ بظاہر یہ نہایت ہی دھوکہ دینے والا فقرہ تھا۔ ہم اس وقت علیحدہ گفتگو کر رہے تھے۔ ممکن ہے اگر مجلس میں یہ کہا جاتا۔ تو بعض کو اس سے ٹھوکر بھی لگتی۔ مَیں نے اس وقت اسی رنگ میں ایک ہی فقرہ میں اسے جواب دیا۔ مَیں نے کہا میں تسلیم کرتا ہوں کہ روحانیت کی بنیاد چند بالوں کے رکھنے یا نہ رکھنے پر نہیں لیکن روحانیت کی بنیاد رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت پر ضرور ہے جس سے میرا مطلب یہ تھا کہ داڑھی کا تعلق براہ راست روحانیت سے بے شک نہیں لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا تعلق براہ راست روحانیت سے ہے اور جب آپ کا ارشاد ہے کہ داڑھی رکھو[۲] تو گو داڑھی اپنی ذات میں روحانیت کا موجب نہ ہو لیکن جب آپ کا حکم توڑا جائیگا تو یقیناً ایسا انسان روحانیت سے محروم ہو جائے گا۔ اگر اس اعتراض کا میں تفصیلاً جواب دوں تو معلوم ہو گا کہ یہ نہایت ہی بودا ہے لیکن میں نے صرف یہاں اسے بطور مثال پیش کیا ہے کہ بعض چھوٹی باتیں بڑے اثرات پیدا کرتی ہیں۔ نمازوں میں صفوں کی درستی بظاہر معمولی بات ہے اور یہ کوئی اہم بات نظر نہیں آتی کہ ایک آدمی کچھ آگے کھڑا ہو جائے یا کچھ پیچھے لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ صفوں کو درست کرو ورنہ تمہارے دل ٹیڑھے ہو جائیں گے[۳] بات کتنی معمولی تھی لیکن نتیجہ کیسا عظیم الشان نکلا۔

مجھے اس کے متعلق ایک واقعہ یاد آیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے زمانہ میں کچھ لوگوں میں روزوں کے متعلق بحث ہو رہی تھی کہ کس وقت روزہ رکھنا اور کس وقت افطار کرنا چاہیئے۔ ایک شخص کا خیال تھا کہ جب ایک شخص خدا تعالےٰ کے لئے سارا دن بھوکا رہتا ہے تو اگر اس نے

پَو پھٹنے کے بعد کھانا کھالیا بلکہ اگر رویت آفتاب کے بعد بھی چند گھونٹ پانی پی لیا یا کچھ کھانا کھالیا تو اس میں کونسا حرج ہے۔ یہ کہنے والے کسی زمانہ میں جولاہوں کا کام کیا کرتے تھے۔ انہوں نے خواب دیکھا کہ تانی کو خشک کرنے کے لئے ایک کیلے کے ساتھ باندھا اور دوسری طرف دوسرے کیلے سے باندھنے گیا لیکن تانی کیلے سے دو انگل کے قریب کم رہ گئی لیکن کیلا کچھ دُور تھا وہ بیان کرتے ہیں کہ مَیں نے ہزار کوشش کی کہ کسی طرح تانی کیلے تک پہنچ جائے۔ مگر سب بے سود آخر گھبرا کر میں نے رشتہ داروں کو آواز دی کہ دوڑ کر آؤ، دو انگل کی وجہ سے میری تانی خراب ہوجائے گی اس پر آنکھ کھل گئی اور سمجھ آگئی کہ چند منٹ آگے پیچھے روزہ رکھنے یا افطار کرنے کے متعلق مَیں جو کچھ بیان کر رہا تھا اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے متعلق آگاہ کیا ہے۔ تو بعض باتیں بظاہر چھوٹی ہوتی ہیں لیکن بلحاظ نتائج نہایت اہم ہوتی ہیں۔ انہی باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اوقات کے لحاظ سے عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں فرق کیا ہے۔ وہ دیر سے پڑھائی جاتی ہے اور یہ جلدی کیونکہ اس کے متعلق حکم ہے کہ نماز کے بعد قربانی کی جائے۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اپنا دستور یہ تھا کہ آپ قربانی کے گوشت سے ہی کھانا شروع فرماتے تھے اس دن روزہ تو نہیں ہوتا تھا لیکن نیم روزہ ضرور ہوجاتا تھا آپ صبح کچھ نہیں کھاتے تھے اور پھر قربانی کے گوشت سے افطار کرتے تو عید الاضحیٰ کی نماز جلد ادا کی جاتی۔ لیکن میں دیکھتا ہوں ہماری جماعت میں اس حکم کے متعلق بہت کم توجہ ہے کمزوروں کا لحاظ کرنے کی وجہ سے گویا یہ ایک قاعدہ بن گیا ہے کہ عید کی نماز ایسے وقت پر ہو جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے طریق کے مطابق نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ باتیں معمولی ہیں اور جماعت کی تربیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے امور میں ڈھیل دی جاسکتی ہے لیکن اس کا بھی ایک وقت اور ایک حد ہونی چاہیئے۔ ہماری جماعت کی عمر ۴۲ سال ہوگئی ہے اور متواتر بلاناغہ یہ ڈھیل چلی آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس وقت تک یہاں ایک نماز بھی اس وقت پر نہیں ہوئی ہوگی جو احادیث میں آتا ہے۔ آج ساڑھے آٹھ بجے کا وقت مقرر تھا مگر ۹ بجے نماز پڑھائی گئی۔ اور اب کہ مَیں خطبہ پڑھ رہا ہوں بلکہ خطبہ کا بھی ایک حصہ بیان کر چکا ہوں نہ صرف عورتیں بلکہ مرد بھی نماز پڑھنے کے لئے چلے آرہے ہیں اس اندازہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ۱۰ بجے وقت ہوا اور دس بجے سورج وسط کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔ حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سورج نیزہ بھر اونچا ہوتا تو عید الاضحیٰ کی نماز ادا کی جاتی۔ اور اس لحاظ سے اگر سوا چھ بجے سورج کا طلوع ہو تو نماز سات بجے تک ہوجانی چاہیئے۔ لیکن پرانی عادت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے نو بجے پڑھی اور اب بھی بعض لوگ عید پڑھنے کی خواہش سے برابر چلے آرہے ہیں۔

مَیں سمجھتا ہوں اب ضروری ہے کہ یک لخت تو نہیں، تھوڑا تھوڑا کم کرتے ہوئے ہمیں نماز کو ٹھیک وقت پر لانا چاہیئے۔ عید کے ایام آپس میں ملنے جُلنے کے لئے ہوتے ہیں۔ اگر عید کے دن صبح کی تیاری لمبی ہو جائے اور پھر نماز اور خطبہ ہو تو آدھا دن تو اسی میں خرچ ہو جائے گا۔ اور باقی وقت قربانی کرنے اور کھانے پینے میں لگ جائے گا۔ حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا منشاء یہ ہے کہ عید کے دن باہمی تعلقات بڑھائے جائیں[۸]۔

دوسری بات مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ عید درحقیقت اس بات کا نشان ہے کہ ہمیں اپنی قربانیاں کسی مقصد کو مدِّنظر رکھکر کرنی چاہئیں۔ اور پھر جب کوئی خاص مقصد سامنے ہو تو کسی قربانی سے دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ دوسری چیزوں کی طرح اسلام نے قربانی میں بھی اصلاح کی ہے۔ باقی مذاہب کی بعض قربانیاں بظاہر بہت خوبصورت نظر آئیں گی لیکن وہ درحقیقت بالکل لغو اور بے فائدہ ہونگی عبادت کے متعلق بعض قوموں میں ایسی قربانیاں پائی جاتی ہیں جن کا کوئی فائدہ نہیں مثلاً بعض لوگ اُلٹے لٹکے رہتے ہیں[۹]۔ مَیں نے خود ایک شخص کو دیکھا جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ گیارہ سال سے مسلسل چھت سے ٹانگیں باندھ کر لٹکا ہوا ہے رات کے وقت وہ ہاتھ زمین پر ٹیک لیتا تھا اور یہی اس کا سونا تھا۔ مَیں نے خود تو نہیں دیکھا لیکن کہتے تھے وہ اسی طرح آٹا گوندھتا اور روٹی پکاتا ہے۔ جب ہم گئے اس وقت وہ آٹا گوندھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ لوگ دُور دُور سے اس کی زیارت کو آتے تھے اور وہ بہت بزرگ سمجھا جاتا تھا۔ بظاہر تو یہ بہت بڑی قربانی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا فائدہ کیا۔ اسی طرح بعض لوگ سورج کی طرف دیکھنا شروع کرتے ہیں اور برابر دیکھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ غائب ہو جائے[۱۰] پھر بعض سردیوں کے موسم میں سرد پانی میں کھڑے رہتے ہیں[۱۱] اور بعض گرمیوں میں ارد گرد آگ جلا کر بیٹھے رہتے ہیں[۱۲] یہ سب کچھ کرتب اور تماشا تو بے شک ہے لیکن دنیا کو یا ایسی مشقت اٹھانے والے کی ذات کو اس سے کیا فائدہ ہوا۔ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ قربانی وہ ہے جس کا نفع تمہاری ذات کو یا دنیا کو پہنچے۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قربانی وہ ہے جس سے خدا کو نفع پہنچے اور اسی خیال کے ماتحت لوگ ایسی ایسی تکالیف اُٹھاتے اور سمجھتے تھے کہ اس طرح خدا کو مزا آتا ہے۔ وہ خدا کے مزے کو بھی ایسا ہی سمجھتے تھے جیسا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ ایک امیر زادہ کا قصہ سُنایا کرتے تھے کہ باپ کے مرنے کے بعد جب اسے تین لاکھ روپیہ ملا تو وہ دوستوں میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگا کہ اسے کس طرح خرچ کیا جائے۔ وہ بازار میں گیا اور بزاز کو کپڑا پھاڑتے دیکھا۔ اس کے کان میں چِر چِر کی آواز جو آئی تو اسے بہت بھلی معلوم ہوئی۔ اور اس نے دوستوں سے آکر کہا۔ مجھے روپیہ خرچ کرنے کا بہت اچھا مصرف معلوم ہو گیا ہے اور نوکروں کو حکم دے دیا کہ کپڑوں کے تھان لا لا کر انہیں پھاڑتے رہو۔ اور اس طرح ایک دن میں وہ چار پانچ سو کا کپڑا دھجیاں کر کرکے ضائع کر دیتا[۱۳]۔ ایسی تکالیف اُٹھانے

والوں نے خدا تعالیٰ کو بھی اس امیر زادہ کی طرح سمجھ رکھا تھا کہ انسان اگر اپنی دھجیاں اُڑاتے تو اُسے مزا آتا ہے۔ لیکن اسلام نے آکر بتایا کہ قربانی بندہ کے اپنے نفع کے لئے ہے۔ فنا دراصل بقاء کی کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے تم اس لئے فنا نہیں ہوتے کہ خدا کو مزا آئے بلکہ اس لئے کہ خود تمہارے اندر ایک نئی چیز پیدا ہو۔ اور اگر یہ نہیں ہوتی تو تم اپنے آپ کو ضائع کر رہے ہو بلکہ خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکاتے ہو۔ اسے تمہیں ترقی دینا مقصود ہے نہ کہ دُکھ دینا۔

اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ انسان ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ یہ عید دراصل اس بات کی یاد ہے کہ ہمیں لغو قربانیوں سے پرہیز کرنے کے ساتھ مفید قربانی سے کبھی بھی پہلوتہی نہ کرنی چاہئیے۔ ایک طرف یہ ہمیں سبق دیتی ہے کہ ہر ذرہ جو ضائع ہوتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ بتاتی ہے کہ اگر کسی مقصد کے لئے تمہیں اپنی قیمتی جان بھی دینی پڑے تو بلا تامل دیدو گویا ایک طرف یہ عید ہمیں اپنے ذرہ ذرہ کو بچانے کا سبق دیتی ہے۔ اور دوسری طرف بڑی سے بڑی چیز کی قربانی سکھاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اجتہادی غلطی کے ماتحت اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی خاطر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو قربان کرنا چاہا لیکن چونکہ یہ ایک ایسی قربانی تھی جو محض بے فائدہ تھی اور جس سے کوئی مقصد پُورا نہیں ہوتا تھا۔ اس سے نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات کو کوئی فائدہ تھا اور نہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ذات کو اور نہ ہی دنیا کو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس سے روک دیا۔ اور فرمایا۔ کہ یہ قربانی ہماری خوشی کا موجب نہیں۔ مانا تم رؤیا کے پُورا کرنے والے ہو لیکن یہ تخیل ہمارے حکم کے مطابق نہیں۔ گویا بتایا کہ لغو قربانی آج سے مٹائی جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور قربانی قائم کی اور وہ اس رؤیا کی تعبیر تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے لخت جگر اور اس کی والدہ کو ایک بے آب وگیاہ صحراء میں چھوڑ آئے اور اس غرض سے چھوڑ آئے کہ خدا تعالیٰ کا گھر آباد ہو اور لوگ اس کا ذکر کریں۔ تلوار سے اگر وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کر دیتے تو یہ اتنی بڑی قربانی نہ تھی اپنے ہاتھ سے اپنے بیٹے کو ذبح کرتے وقت اتنا تو لحاظ کرتے کہ تیز چھری سے یکدم کرتے۔ اور یہ کام ایک منٹ میں ہو جاتا لیکن اسے ایک ایسے جنگل میں چھوڑ آنا جہاں سو سو میل تک کھانا پانی نہ مل سکتا ہو اور جہاں حدِ نظر تک نہ کوئی قافلہ ہو اور نہ آبادی۔ گویا اسے ایسی موت میں مبتلا کرنا تھا جو چھری سے ذبح کر دینے کے مقابلہ میں بہت زیادہ تکلیف دہ تھی جس کے ساتھ بھوک اور پیاس بھی وابستہ تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس قربانی سے حضرت

ابراہیم علیہ السلام کو نہیں روکا۔ وہی خدا جس نے تیز چھری سے ذبح کرنے کے وقت کہا تھا یہ لغو ہے، فضول ہے، اس کی ضرورت نہیں۔ اس سے زیادہ خطرناک قربانی کرتے ہوئے دیکھ کر نہ صرف یہ کہ منع نہیں کرتا۔ بلکہ فرماتا ہے ہمارا منشا یہی ہے۔ وہ رحیم وکریم وشفیق ہستی ہے جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے گلے پہ چھری چلانے سے روک دیا اس نے اُسے مکہ میں چھوڑنے سے نہ روکا بلکہ خود اس کا حکم دیا۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ چھری سے ذبح کر دینے کے کوئی معنے نہ تھے اور اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ لیکن غیر ذی زرع جنگل میں چھوڑ آنے کے معنے تھے، اس سے خدا تعالیٰ کی عبادت کو قائم کرنا مقصود تھا۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو چھری سے ذبح کر دیتے تو اس کا کیا فائدہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایماندار لوگ مزے لے لیکر یہ حکایت بیان کرتے۔ اور جو کمزور ایمان والے ہوتے، وہ زیادہ سے زیادہ اسی نقطۂ نگاہ سے اسے دیکھتے جس سے فری تھنکر سوشائٹی کے بانی نے دیکھا۔ فرانس کا ایک لڑکا جو بعد میں دہریت کا بانی ہوا۔ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دس بارہ سال کی عمر میں وہ اپنے باپ کے ساتھ پہلی دفعہ گرجا میں گیا۔ وہ کہتا ہے خوش قسمتی سے (لیکن ہم تو اسے بدقسمتی ہی کہیں گے) پادری صاحب نے اس وقت اسحاقؑ کی قربانی پہ وعظ کیا۔ (عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت اسحٰقؑ کی قربانی کی گئی تھی نہ کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی)، اور بتایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کر دیا۔ جوں جوں پادری صاحب یہ بیان کرتے مجھے خیال ہوتا کہ مَیں بھی اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اگر میرا باپ بھی مجھے ذبح کر کے خدا کو خوش کرنا چاہے تو کیا ہو۔ اس خیال کا مجھ پر اس قدر غلبہ ہوا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ میرا باپ مجھے ضرور ذبح کر ڈالے گا۔ جونہی وعظ ختم ہوا، مَیں دوسرے دروازہ سے بھاگ گیا اور سمندر کے کنارے پہنچا۔ امریکہ کو ایک جہاز جا رہا تھا اس میں سوار ہو گیا۔ ماں باپ کے لئے میرے دل میں کوئی محبت نہ رہی اور مَیں نے خیال کیا کہ یہ ظالم ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی مجھے خدا سے بھی نفرت ہو گئی اور مَیں نے دوسروں کو بھی اپنا ہم خیال بنانا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ دہریوں کی ایک بڑی جماعت بن گئی۔ یہ لوگ لاکھوں کی تعداد میں اخبار اور رسالے شائع کر رہے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ دنیا خدا کا انکار کر دے۔ تو ممکن تھا کہ اگر حضرت ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کر دیتے تو اور بھی کئی لوگ کہہ اُٹھتے کہ ہم ایسی ظالمانہ تعلیم اور ایسے خدا کو نہیں مانتے۔ لیکن جس قربانی کا خدا نے حکم دیا وہ کتنی زبردست ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تک خدا تعالیٰ کی عبادت اس گھر سے وابستہ ہے جس کا قیام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذریعہ ہوا۔ مکہ کی آبادی اور اس بات کا علم کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا مرکز اور سرچشمہ مکہ ہے، یہ تمام باتیں حضرت اسمٰعیلؑ

کی قربانی سے ہی وابستہ ہیں۔

پس یہ عید کا دن ہمیں دو سبق دیتا ہے۔ ایک عدمِ قربانی کا اور دُوسرا قربانی کا۔ ایک تو یہ کہ کوئی ایسی قربانی نہ کرو جس کا کوئی نتیجہ نہ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ جب نتیجہ نکلنے والا ہو تو عزیز سے عزیز چیز کی قربانی سے بھی دریغ نہ کرو۔ اس زمانہ میں اس کی مثال یہ ہے کہ جان کی قربانی اگرچہ اعلیٰ درجے کی قربانی سمجھی جاتی ہے لیکن اللہ تعالےٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ اس سے روک دیا۔ اور دوسری طرف اموال اور اوقات کی قربانی کا حکم دیا اور فرمایا جو اس سے پیچھے ہٹتا ہے وہ راندۂ درگاہِ الٰہی ہے۔[۱۷] اور یہ بھی اسی عید کی تشریح ہے کہ جو قربانی لغو اور بے نتیجہ ہے، اس سے بچو اور مفید کو اختیار کرنے میں کسی قسم کا پس و پیش نہ کرو۔

پس مومن کو ہمیشہ یہ امر مدِنظر رکھنا چاہیئے کہ کوئی کام ایسا نہ کرے جس سے اُسے یا دُنیا کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو۔ اور جس سے کوئی فائدہ ہو اس سے ہرگز ہرگز دریغ نہ کرے یہی وہ رُوح ہے جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے اور جس کے بغیر ترقی نہیں ہو سکتی۔ (الفضل ۲۶ر اپریل ۱۹۳۲ء صفحہ ۵ تا ۷)

۱؎ زرقانی شرح موطا امام مالک جزاوّل صفحہ ۳۲۹۔ المنتقیٰ من اخبار المصطفےٰ صفحہ ۱۰۶۔ نیل الاوطار جزثالث صفحہ ۱۹۲، صفحہ ۱۹۷

۲؎ سنن ابی داؤد کتاب الترجّل باب فی اخذ الشارب۔ ۳؎ صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب تصویۃ الصفوف الخ

۴؎ اخبار بدر قادیان ۸ر اپریل ۱۹۰۹ء صفحہ ۳۲

۵؎ المصنف جزثالث صفحہ ۲۸۶ مطبوعہ بیروت ۱۹۷۱ء۔ نیل الاوطار جزثالث صفحہ ۱۷۱۔ ۶؎ سُنن کبریٰ جزثالث صفحہ ۲۸۳

۷؎ نیل الاوطار جزثالث صفحہ ۱۷۷۔ ۸؎ المغنی لابن قدامہ جلد ۲ صفحہ ۳۹۹ طبع دوم ۱۳۶۷ھ

۹؎ انسائیکلوپیڈیا ریلیجس اینڈ ایتھکس صفحہ $\frac{۳۳}{۱۱}$۔ ۱۰؎ الملل والنحل امام شہرستانی جلد ۳ صفحہ ۲۵ حاشیہ

۱۱؎ انسائیکلوپیڈیا ریلیجس اینڈ ایتھکس صفحہ $\frac{۳۳}{۱۱}$۔ ۱۲؎ الملل والنحل امام شہرستانی جلد ۳ صفحہ ۲۵۵-۵۶ حاشیہ

انسائیکلوپیڈیا ریلیجس اینڈ ایتھکس صفحہ $\frac{۳۳}{۱۱}$

۱۳؎۔

۱۴؎۔ ابراہیم ۱۴ : ۳۹

۱۵؎

۱۶؎

۱۷؎ تبلیغ رسالت جلد ۱۰ صفحہ $\frac{۵۳}{۵۵}$ پر مندرجہ عبارت سے یہ مفہوم مستنبط ہوتا ہے۔

(۲۱)

(فرمودہ ۶ ؍اپریل ۱۹۳۳ء بمقام باغ حضرت مسیح موعود علیہ السلام قادیان)

آج سے چار ہزار سال پہلے دنیا میں ایک انسانؑ نے سچے اخلاص کا نمونہ دکھایا تھا۔ اس سچے اخلاص کے نتائج آج تک دنیا کو مل رہے ہیں۔ اُور کی بستی میں، اُس علاقہ میں جو اِس زمانہ میں عراق کہلاتا ہے، ایک مشرک گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس نے ایسے لوگوں میں تربیت پائی جن کا رات دن کا مشغلہ خدا کے شریک بنانا اور ایسی چیزوں کی پرستش کرنا تھا جو اپنے اندر کوئی طاقت و قوت نہ رکھتی تھیں۔ وہ بچہ ایک نورانی دل لے کر پیدا ہوا۔

خدا کی جوہر شناس نگاہ نے دنیا کی بڑھتی ہوئی گمراہی اور اس کے طوفانِ ضلالت کو دیکھ کر چاہا کہ بنی نوعِ انسان میں سے کسی کو اپنا بنائے اور اس کی نگاہ نے اس کسدیوں کی بستی میں سے ابراہیم نامی بچہ کو چُنا اور اسے اپنے فضل سے ممسوح کیا۔ جس قسم کے خاندان میں اور جن حالات میں ابراہیم کی پرورش ہوئی اس سے ظاہر ہے کہ اسرائیلی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے جب ابراہیم بارہ تیرہ سال کے ہوئے تو ان کے چچا نے جن کے پاس وہ رہتے تھے (کیونکہ آپ کے والد بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے) انہیں اپنی دکان پر بٹھایا۔ وہ دکان کس چیز کی تھی وہ بُت فروشی کی دکان تھی۔ ابراہیمؑ نے اس دکان پر بیٹھتے ہی پہلی دفعہ یہ محسوس کیا کہ ان پتھروں اور مٹی کے بنے ہوئے بتوں میں بھی کوئی اہمیت سمجھی جاتی ہے۔ اپنے بچپن کے لحاظ سے انہیں اس وقت تک یہ احساس نہ تھا کہ ان کی قوم انہیں کس حد تک عظمت دیتی ہے۔ جب اس دکان پر بیٹھے اور انہوں نے اپنے بھائیوں سے پوچھا کہ ان بتوں کی کیا غرض ہے اور انہیں بتایا گیا کہ لوگ انہیں لے جاتے اور ان کی پوجا کرتے ہیں تو انہیں تعجب آیا۔ یہودی تاریخوں میں لکھا ہے کہ ایک بڈھا گاہک جس کی داڑھی سفید ہو چکی تھی ستر اسی سال کی عمر تک پہنچ چکا تھا ایک دن آیا اور بُت طلب کیا۔ اور آخر بڑی تلاش کے بعد اس کو ایک بُت پسند آیا۔ جب وہ قیمت ادا کرنے لگا تو حضرت ابراہیمؑ نے اس کا مونہہ تعجب سے تکتے ہوئے کہا۔ اتنی احتیاط سے یہ بُت کیوں لے رہے ہو۔ بڈھے نے جواب دیا۔ میں اسے اپنے گھر میں رکھوں گا اور اس کی پرستش کروں گا تب ابراہیمؑ نے جسے فطرت سے نیکی عطا ہوئی تھی حیرت سے کہا۔ یہ بُت تو کل بنا ہے اور تم ستر اسی سال کے بڈھے ہو۔ تمہاری داڑھی سفید ہو چکی ہے کیا تم اس کے سامنے جھکو گے یہ سُن کر اس پر ایسا اثر ہوا کہ لکھا ہے اس نے بُت وہیں پھینک دیا اور چلا گیا۔ تب آپ کے چچیرے بھائیوں نے چچا سے

شکایت کی کہ یہ ہمارے کاک خراب کرتا ہے اور چچا نے ابراہیمؑ کو خوب مارا۔

پُرانی تاریخیں کوئی ایسی محفوظ نہیں اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس واقعہ میں کہاں تک صداقت پائی جاتی ہے۔ لیکن یہودی تاریخیں یہی بیان کرتی ہیں اور تعجب نہیں کہ یہ واقعہ صحیح ہو۔ اور بغیر کسی قسم کی آمیزش کے ہو۔ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ یہودی قوم میں اس قوم میں جو ابراہیمؑ کی نسل سے چلی، یہ بات مسلمہ ہے کہ ابراہیمؑ کو بچپن سے ہی شرک کے خلاف جذبہ عطا کیا گیا تھا پیشتر اس کے کہ آپ نبی ہوتے پیشتر اس کے کہ آپ وحیٔ الٰہی سے برکت دیئے جاتے اور پیشتر اس کے کہ آپ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہدایت پاتے آپ کا نفس ہی ان باتوں سے متنفر تھا۔ اور دراصل ہر نبی خدا تعالےٰ کی اسی قسم کی برکت پایا کرتا ہے۔ ہمارے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل زندگی کا بھی ایک واقعہ تاریخوں میں بیان ہوا ہے۔ زیدؓ ایک شخص تھے حضرت عمرؓ کے رشتہ دار انہیں شرک کے خلاف توحید کے خیالات یہود سے سننے کا موقعہ ملا تھا اور وہ موحد ہو گئے تھے وہ جہاں جہاں جاتے توحید کی تائید میں لیکچر دیتے ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں بھی آئے اور جب ان کے سامنے کھانا رکھا گیا تو انہوں نے کہا میں شرک کرنے والوں کا کھانا نہیں کھایا کرتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا۔ میں نے کبھی شرک نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی نبوّت سے پہلے ہر قسم کے مشرکانہ باتوں سے محفوظ اور اللہ تعالےٰ کی حفاظت میں تھے۔ خیر حضرت ابراہیمؑ جن کا میں واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ بچپن سے ہی توحید کے مؤید اور شرک کے مخالف تھے۔ مگر ایسی قوم میں پیدا ہو کر جو رات دن شرک میں مبتلا رہتی اور ایسی قوم کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ان کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ کبھی یہ نہیں کہا کہ ان شرک میں مبتلا لوگوں کو بچایا نہیں جا سکتا۔ جب انہوں نے شرک کے خلاف اللہ تعالےٰ سے ہدایت پا کر تعلیم دینی شروع کی تو ان کی قوم نے ان کی باتوں کو تسلیم نہ کیا۔ بلکہ طرح طرح کے دکھ دیئے۔ آپ کی مخالفت کی یہاں تک کہ آگ جلائی اور اس میں آپ کو ڈالا۔ قرآن کریم سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ میں ان کے لئے آگ جلائی گئی اس میں ان کو پھینکا گیا۔ اور پھر وہ آگ آپ کے لئے ٹھنڈی کی گئی۔ ممکن ہے بارش ہو گئی ہو یا اور کوئی ایسے سامان پیدا ہو گئے ہوں۔ غرض انتہائی تکالیف کے ذریعہ آپ کو توحید سے روکنے کی کوشش کی گئی۔ مگر آپ نے کبھی یہ خیال نہ کیا کہ یہ دکھ دینے والے کہاں ہدایت پا سکتے ہیں، چلو ان کو چھوڑو۔

پس ابراہیمؑ کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ مومن کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے اور یہ کبھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ لوگوں کو ہدایت کس طرح اور کیونکر ہوگی حضرت ابراہیمؑ کے لئے اندرونی مشکلات

بھی تھیں اور بیرونی بھی۔ اندرونی یہ کہ آپ کے رشتہ دار تک آپ کے مخالف تھے اور بیرونی یہ کہ اس زمانہ کی سیاست اور حکومت آپ کی مخالف تھی۔ سوائے ان کے ایک رشتہ دار کے جو ان کا خالہ زاد بھائی تھا۔ یا بعض کہتے ہیں کہ وہ بھتیجا تھا اور کوئی ان پر ایمان نہ لایا تھا۔ اور اس قدر تکلیفیں دی گئیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح انہیں بھی ہجرت کرنی پڑی مگر باوجود اس کے ان کے ایمان کی حالت یہ تھی کہ انہوں نے کبھی یہ خیال نہ کیا کہ دنیا ہدایت کو قبول نہیں کرے گی بلکہ ان کے بھائی حضرت لوطؑ جو دوسری بستی میں تھے جب ان کے منکروں پر عذاب آیا تو بائیبل میں لکھا ہے حضرت ابراہیمؑ نے دعا کرنی شروع کی کہ خدایا! کیا تو اس قوم کو تباہ کردے گا جبکہ تیرے نیک بندے بھی اس میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا نہیں مگر وہ بستی تو گناہوں سے پُر ہوگئی۔ تب حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔ بے شک مگر اے خدا! اگر اس میں سو مومن ہوں گے تو کیا تو ان پر نظر نہیں کرے گا اور کیا ان کی وجہ سے باقیوں کو بھی نہیں بچائے گا اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ اے ابراہیمؑ! اگر اس میں سو مومن ہوں تو میں ان کی وجہ سے سب کو بچا لونگا مگر وہاں تو اس قدر بھی نہیں۔ تب ابراہیمؑ نے کہا اے خدا! اگر اس میں نوّے مومن رہتے ہوں تو کیا محض اس لئے کہ دس مومن کم ہیں تو سب کو تباہ کردے گا۔ اللہ تعالےٰ نے کہا نہیں اگر نوّے مومن بھی ہوں گے تب بھی میں ان سب کو بچا لونگا۔ تب حضرت ابراہیمؑ نے یہ سمجھ کر کہ وہاں نوّے مومن بھی نہیں کہا اے خدا! اگر وہاں اسّی مومن ہوں تو کیا اسّی مومنوں کی تو قدر نہیں کریگا اور ایسی بستی کو ہلاک کردے گا۔ خدا نے کہا: اگر وہاں اسی مومن بھی ہوں تب بھی میں بستی کو ہلاکت سے بچا لونگا۔ یہانتک کہ ہوتے ہوتے آخر حضرت ابراہیمؑ دس تک آگئے اور کہا۔ اے خدا اگر وہاں دس مومن ہوں تو کیا یہ کم ہیں۔ اور کیا ان کی وجہ سے تو باقیوں کو ہلاکت سے نہیں بچائے گا۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کیوں نہیں۔ اگر وہاں دس مومن بھی ہوں تب بھی وہ نیکی کا بیج ہوں گے اور اس بستی کی ترقی کی امید ہوسکتی ہے۔ مگر وہاں تو دس مومن بھی نہیں۔ تب حضرت ابراہیمؑ خاموش ہوگئے اور انہوں نے حضرت لوطؑ اور ان کے خاندان کے لئے دعا کی اور وہ بچائے گئے[۱۱] اس سے ان کے ایمان کا پتہ چلتا ہے۔ مشرکوں نے انہیں دکھ دیا، عزیز رشتہ داروں سے انہیں جدا ہونا پڑا، آگ میں انہیں ڈالا گیا، وطن سے بے وطن ہونا پڑا اور سینکڑوں میل دور جا کر انہیں رہنا پڑا[۱۲]۔ مگر پھر بھی بنی نوع انسان سے شفقت ان کے دل میں اتنی تھی کہ اپنی قوم نہیں بلکہ ایک اور قوم کی تباہی کا حکم آتا ہے اور آپ وہاں بھی شفاعت کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ دراصل حضرت ابراہیمؑ کا دل اس یقین سے پُر تھا کہ جو تعلیم انہیں دی گئی ہے وہ آخر

مشرکوں کو موحد بنا کر رہے گی اور یہ یقین توکل اور ایمان ہی تھا جو ان کو مایوس نہیں ہونے دیتا تھا۔ اور یہ بھی ان کے ایمان کا ثبوت ہے کہ جب خدا نے ان کا سوز و گداز دیکھا تو قرآن مجید میں ان کا ایک نام اوّاہ رکھا گیا۔ گویا وہ دنیا کی ہدایت کے غم میں مجسم سوز و گداز ہو گئے تھے اور ان کا یہ سوز و گداز اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ جب انہوں نے خدا کے حضور دعائیں کیں تو انہوں نے کہا۔ اے خدا میں یہی نہیں چاہتا کہ آج ہی گمراہ لوگوں کو ہدایت حاصل ہو۔ بلکہ میری یہ دعا ہے کہ جب بھی شریر دنیا میں شرارت کریں شیطان گمراہی اور ضلالت پھیلانا چاہے تیری طرف سے ہدایت دینے والے آتے رہیں۔ اور ہمیشہ ہمیش ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں جو نیکی کو پھیلانے والے اور توحید کو قائم رکھنے والے ہوں۔ خدا تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو قبول کیا اور فرمایا بہت اچھا لیکن بدوں میں رہ کر چونکہ نیکی کا بیج پنپ نہیں سکتا۔ میٹھے دودھ میں اگر لسی یا اور کوئی ترش چیز تھوڑی سی بھی ملائی جائے تو وہ خراب ہو جاتا ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ میں نے تیری دعائیں سنیں لیکن اگر واقعی تیری ہمدردی بنی نوع انسان سے اس قدر بڑھی ہوئی ہے تو تُو جا اور اپنے بیٹے کو قربان کر۔ لوگوں سے الگ اسے خاص میری حفاظت میں رکھ تاکہ علیحدہ ذخیرہ میں ایک پنیری لگائی جائے۔ نیکی اور تقویٰ کی پنیری۔ ایک چشمہ چھوڑا جائے، پاکیزگی اور طہارت کا چشمہ۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔ بہت اچھا میں تیار ہوں۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو اس بیٹے کو جو بڑھاپے میں نصیب ہوا، اس وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑا جس کے متعلق خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ اس میں کھانے کا کوئی سامان نہیں تھا اس میں پانی نہیں تھا یہاں تک کہ خدا نے زمزم کا چشمہ چھوڑا۔ اور کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ کیونکہ اس کا نام ہی وادیٔ غیر زرع تھا ایسی وادی میں حضرت ابراہیمؑ نے اس لئے اپنے بیٹے اور اس کی والدہ کو چھوڑا تاکہ خدا کا ذکر بلند ہو اور اللہ تعالیٰ کی کھوئی ہوئی عظمت دنیا میں پھر قائم ہو۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا بتاتی ہے کہ انہیں اسی لئے وادیٔ غیر ذی زرع میں رکھا گیا تھا تا وہ نیکی اور تقویٰ قائم کرنے والے بنیں چنانچہ وہ دعا کرتے ہیں۔ اے خدا میں نے انہیں اس لئے یہاں رکھا ہے کہ وہ نمازیں پڑھیں، اور تیرے ذکر کو دنیا میں قائم کرنے والے بنیں۔ پس ایسی جگہ اولاد رکھنے کے معنے یہ تھے کہ بُرے اثرات سے وہ اپنی اولاد کو محفوظ کر دیں اور نیکی کا بیج ہمیشہ قائم رکھیں۔ یہ کیا چیز تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم کی تم جانتے ہو؟ یہ وہ چیز تھی جس کے ذریعہ خدا نے کفر اور اسلام میں میں امتیاز قائم کیا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ ھو سمّٰکم المسلمین یعنی ابراہیمؑ وہ پہلا شخص ہے جس نے کفر و اسلام میں امتیاز قائم کیا۔ یوں تو ہر نبی کے ذریعہ کوئی نہ کوئی کام ہوا ہے، کسی تعلیم کی بنیاد حضرت آدمؑ نے رکھی کسی تعلیم کی بنیاد حضرت نوحؑ نے

رکھی - اور کسی تعلیم کی بنیا د حضرت ابراہیمؑ نے رکھی - اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ ہر نبی مسلم تھا کیونکہ جو فرمانبردار ہے وہ مسلم ہے اور جو منکر ہے وہ کافر - مگر مسلم و کافر میں امتیاز اور نیکی کے بیج کے متعلق یہ محسوس کرا دینا کہ وہ بعض دفعہ کفر کے بیج کے نیچے آکر خراب ہو جاتا ہے، یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں ہی قائم ہوئی اور یہی چیز ہے جس کے متعلق فرمایا۔ ھو سمّاکم المسلمین۔ ورنہ قرآن مجید کے بتلائے ہوئے اصل کے ماتحت حضرت آدمؑ حضرت نوحؑ حضرت داؤد - حضرت سلیمانؑ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام سب مسلم تھے - حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خصوصیت اس لئے دی گئی کہ آپ کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ آئندہ اسلام کو کفر سے جدا رہنا پڑیگا۔ ہدایت کو ضلالت سے علیحدگی اختیار کرنی پڑے گی، ورنہ اور کوئی صورت اشاعت ہدایت کی نہیں ہوگی - یہ معمولی بات نہیں کہ کوئی شخص کھڑا ہو کر کہہ دے کہ تم الگ اور میں الگ، تمہاری نمازیں الگ اور ہماری الگ، تمہاری شادیاں الگ اور ہماری الگ - تمہارے جنازے الگ اور ہمارے الگ - اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی تلواریں وہ اپنے خلاف کھڑی کرے اور یہی چیز ہے جس کے ماتحت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بائیبل میں کہا گیا کہ وہ اپنے بھائیوں کی تلواروں کے نیچے پلے گا - یعنی دنیا میں جب وہ یہ اعلان کرے گا کہ میں کفر و اسلام میں امتیاز قائم کرتا ہوں - میں کفر کو جُدا اور اسلام کو جُدا کرتا ہوں تو اس کے بھائی اس پر اعتراض کریں گے وہ اس سے جُدا ہو جائیں گے اس کی مخالفت میں متحد ہو جائیں گے تب اس پر اپنے بھائیوں کی تلواریں اُٹھیں گی، مگر خدا فرماتا ہے کہ وہ تلواریں بجائے اسے مٹانے کے اس کے نشوو ارتقاء کا موجب ہو جائیں گی۔

پس حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو دوسروں سے علیحدہ بسا کر اسلام اور کفر میں ایک امتیاز قائم کر دیا - اور آئندہ کے لئے یہ قانون بنا دیا کہ جو بھی مامور آئے اس کے ماننے والوں کو اس کے منکروں سے علیحدہ رہنا پڑے گا - وہ علیحدگی بظاہر موت ہوگی، اور یوں معلوم ہوگا کہ وہ ایک وادِ غیر ذی زرع میں پھینکے گئے - جب باپ بیٹے کو چھوڑ دیگا اور بیٹا باپ کو چھوڑ دے گا - بیوی خاوند کو چھوڑ دے گی اور خاوند بیوی کو چھوڑ دیگا - بھائی بہن کو چھوڑ دیگا اور بہن بھائی کو چھوڑ دے گی - ماں بچے کو چھوڑ دے گی اور بچہ ماں کو چھوڑ دے گا - اس وقت یوں معلوم ہوگا کہ باوجود دنیا میں رہنے کے وہ دنیا سے علیحدہ ہو گئے - وہ ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں چلے گئے - ایسے وقت میں جب مامور کے ماننے والے منکروں سے علیحدگی اختیار کریں گے تو ان کے بھائیوں کی تلواریں ان پر اُٹھیں گی - وہ تلواریں انہیں ہلاک کرنا چاہیں گی، تباہ و برباد کرنا چاہیں گی، مگر خدا فرماتا ہے کہ وہ جو خدا کے حکم کے

ماتحت اپنے بھائیوں اور عزیزوں سے یہ جُدائی اختیار کرے گا وہ اپنے بھائیوں کی تلوار کے سایہ میں پلے گا اور کوئی طاقت اسے مٹا نہیں سکے گی۔ نادان ہے وہ جو سمجھتا ہے کہ دشمنوں کی دشمنی اسے مٹا دے گی۔ نادان ہے وہ جو خیال کرتا ہے کہ اب جبکہ ان کے جنازے الگ، ان کی شادیاں علیحدہ اور ان کی نمازیں جُدا ہو گئیں تو یہ جمہور سے علیحدگی اختیار کر کے کامیابی حاصل کریں گے۔ خدا فرماتا ہے کہ اگر وہ خدا کے لئے یہ موت قبول کرنے کے لئے تیار ہو گئے تو وہ ایک نیکی کا ایک بیج ہیں جو کبھی ضائع نہیں ہو گا۔ بلکہ بڑھے گا اور پھولیگا اور ہر شخص جو اسے اُکھاڑنا چاہے گا اللہ تعالےٰ کا ہاتھ اسے برباد کر دے گا۔ کیا حضرت ابراہیمؑ نعوذ باللہ نادان تھے جنہوں نے اپنے بیٹے کو وادیٔ غیرذی زرع میں چھوڑا۔ پھر کیوں انہوں نے ایسا کیا؟ یا کیا خدا ان کا دشمن تھا جو کہہ دیا کہ جاؤ اور اس وادی میں بیوی بچہ کو چھوڑ آؤ۔ در اصل خدا اس طرح یہ نشان قائم کرنا چاہتا تھا کہ ایمان کی ترقی کے لئے پہلے موت برداشت کرو۔ اگر تم موت برداشت کرنے کے لئے تیار رہو۔ اگر تم لوگوں کی دشمنی برداشت کرنے کے لئے تیار ہو تو پھر ضروری ہے کہ تمہاری نیکی کے بیج کو محفوظ رکھا جائے اور یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ خراب زمین سے اسے علیحدہ کر لیا جائے۔ ایک بڑے درخت کے نیچے چھوٹا پودا کبھی پنپ نہیں سکتا۔ اسی طرح جب مامورین آتے ہیں تو ابتداء میں ان کی جماعت تھوڑی ہوتی ہے۔ وہ گنتی کے افراد دشمنوں کے نرغہ میں گھرے ہوتے ہیں۔ تب ضروری ہوتا ہے کہ انہیں دوسروں سے علیحدہ رکھا جائے۔ مخالفوں سے جُدا کیا جائے تا وہ اپنے اخلاص اور محبت کے بیج کو نشو و نما دے سکیں۔ اگر یہ جدائی نہ ہو تو لامحالہ آپس میں تعلقات رکھنے پڑیں گے۔ اور اس طرح ہر وقت نقصان پہنچنے کا احتمال رہے گا۔ پس خدا ایک وقت بظاہر بگاڑ پیدا کرتا ہے اور جدائی پیدا کر کے موقع دیتا ہے کہ مامور کے ماننے والے بڑھ جائیں۔ پس دشمن سے جدائی خرابی نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کی رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے۔

غرض یہ عید ہمارے لئے ایک سبق رکھتی ہے۔ یہ سبق کہ جو خدا تعالےٰ کے لئے ہو جاتا ہے وہ کبھی تباہ نہیں ہوتا۔ یہ سبق رکھتی ہے کہ جو شخص قربانی کرے اسے ہمیشہ ترقیات نصیب ہوتی ہیں۔ یہ سبق رکھتی ہے کہ جو جماعت ترقی کرنا چاہے اسے غیروں سے علیحدگی اختیار کرنی چاہیئے جب تک وہ جماعت وادیٔ غیرذی زرع میں رہنے کے لئے تیار نہ ہو، اس وقت تک اسے عروج بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ حضرت مسیح ناصریؑ نے بھی یہی کہا کہ "یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جُدا کر دوں اور آدمی

کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے"۔ یہ مقام ہے جو الٰہی جماعتوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ بے شک یہ ایک موت ہے اور بے شک ہر شخص ہمت نہیں کر سکتا کہ وہ ان شدائد کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اور بے شک انسان خیال کرتا ہے کہ آہ! میرا بھائی مجھ سے جدا ہو جائے گا۔ میری مصیبت میں کون میرے کام آئیگا۔ نوکر خیال کرتا ہے کہ اگر میں نے اپنے آقا سے علیحدگی اختیار کر لی تو میری ملازمت جاتی رہے گی۔ تاجر خیال کرتا ہے کہ اس کی تجارت کو ضعف پہنچ جائے گا۔ آقا خیال کرتا ہے کہ اس کے ماتحت اس سے بدظن ہو جائیں گے۔ بیوی سمجھتی ہے میرا خاوند مجھ سے چھٹ جائیگا اور خاوند خیال کرتا ہے کہ میری بیوی مجھ سے علیحدہ کر لی جائیگی۔ بے شک انسانی قلوب میں یہ خیالات پیدا ہوتے ہیں مگر انہیں خیالات کو خدا تعالےٰ نکالنا چاہتا ہے اور وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ مومن صرف مجھ پر ایمان رکھتا ہے اسے اپنے عزیز و اقارب میں سے کسی کی پرواہ نہیں ہو سکتی۔ یہ عید کیا ہے؟ یہ قربانی کی عید ہے یہ عید یہ بتلانے کے لئے آئی ہے کہ مومن کو اللہ تعالےٰ کے دین کے لئے اگر اپنی اولاد کو قربان کرنا پڑے تو وہ اس سے دریغ نہ کرے اگر اپنی عزت کو خطرہ میں ڈالنا چاہیے تو وہ اس سے دریغ نہ کرے۔ اگر اپنی جان کی قربانی دینی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے اگر وجاہت کی قربانی کرنی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے غرض ہر چیز خدا کے لئے قربان کرے۔ مگر جتنی بڑی یہ قربانی نظر آتی ہے انعام کے مقابلہ میں یہ کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وادیٔ غیر ذی زرع میں اپنے بیوی اور بچہ کو رکھا تو بے شک کہنے والے کہتے ہوں گے کہ یہ شخص کتنا پاگل ہے۔ ایک بے آب و گیاہ جنگل میں اپنے ہاتھوں اپنی اولاد کو ہلاک کر رہا ہے۔ لیکن اگر ان کو وہ ترقی نظر آجاتی جو آج حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کو حاصل ہے۔ اگر انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کا وہ پھیلاؤ نظر آجاتا جو آج نظر آرہا ہے۔ اور اگر انہیں حضرت ابراہیمؑ کی وہ عظمت دکھائی دیتی وہ نبوت کا سلسلہ انہیں نظر آجاتا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں چلا۔ پھر دنیوی فتوحات اور حکومتیں بھی دکھائی دیتیں تو میں سمجھتا ہوں ہر شخص ترلے کرتا اور کہتا مجھے بھی اجازت دیجئے کہ میں اپنی اولاد کو یہاں چھوڑ جاؤں۔ وہ نمرود جو اپنی بادشاہی پر گھمنڈ رکھتا تھا جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کا حکم دیا۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر اسے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ عظمت نظر آجاتی تو وہ اپنی ساری عمر سجدے میں گذار دیتا اور دعا کرتا رہتا کہ میری اولاد کو یہاں رہنے کی اجازت مل جائے۔ مگر اس وقت ہر شخص دوست ہو یا دشمن کہتا ہو گا بڈھا سٹھیا گیا، اس کی عقل میں فتور واقع ہو گیا۔ یہ اپنے بیٹے اور پلوٹھے بیٹے کو جو بڑھاپے میں اسے نصیب ہوا، ایسی جگہ پر چھوڑ رہا ہے جہاں نہ پانی ہے نہ آدمی۔

اور جو اس وقت کی کیفیت تھی وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زبان سے معلوم ہوتی ہے بائیبل میں بھی واقعات مذکور ہیں مگر اشارے کے طور پر کیونکہ بائبل والوں کو بنو اسمٰعیل سے دشمنی تھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بیان فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے ہاجرہ کو اس بیابان میں چھوڑا تو اس وقت ان کے پاس صرف ایک تھیلی کھجوروں کی اور ایک مشکیزہ پانی کا رکھ دیا اور کہا میں ذرا ادھر جاتا ہوں چونکہ نبی اور جھوٹ جمع نہیں ہو سکتے اس لئے وہ جھوٹ تو بول نہیں سکتے تھے اور سچ بولنے سے حضرت ہاجرہ کو جو صدمہ ہوتا تھا وہ بھی سامنے تھا اس لئے انہوں نے صرف اسی قدر کہا کہ میں فی الحال جاتا ہوں کیونکہ الہام کے ذریعہ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ پھر دوبارہ انہیں اس وادی میں آنا ہوگا۔ اس وقت قدرتی طور پر بیوی اور بچے کی محبت نے اثر دکھایا انہوں نے اس وادی کو چاروں طرف دیکھا مگر انہیں جھاڑی تک دکھائی نہ دی۔ پانی کا قطرہ تک نظر نہ آیا کھانے کی ایک چیز تک معلوم نہ ہوئی انہوں نے سوچا کہ ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجور ایک دو دن سے زیادہ کہاں کام دے سکتی ہے۔ پھر سوائے ریت کے ذروں اور آفتاب کی چمک کے اور کوئی چیز میری بیوی اور بچے کے لئے نہیں ہوگی یہ سوچتے ہی ان پر رقت طاری ہوگئی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ان کی آنکھوں کی نمی اور ہونٹوں کی پھڑپھڑاہٹ سے حضرت ہاجرہ سمجھ گئیں کہ بات کچھ زیادہ ہے وہ حضرت ابراہیمؑ کے پیچھے پیچھے چلیں اور کہا ابراہیمؑ کیا بات ہے، مگر حضرت ابراہیمؑ رقت کی وجہ سے جواب نہ دے سکے۔ حضرت ہاجرہ کے دل میں اس سے اور بھی شبہ پیدا ہوا۔ اور انہوں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ابراہیم تم ہمیں کہاں چھوڑے جاتے ہو یہاں تو پینے کے لئے پانی نہیں اور کھانے کے لئے غذا نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دینا چاہا کہ میں خدا کے حکم کے ماتحت ایسا کر رہا ہوں مگر رقت کی وجہ سے آواز نہ نکل سکی تب انہوں نے آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے جس کے معنے یہ تھے کہ میں خدا کے حکم کے ماتحت ایسا کر رہا ہوں۔ تب حضرت ہاجرہ یقین اور ایمان سے پر ہاجرہ جو اپنی جوانی کی عمر میں تھی اور جس کا ایک ہی بیٹا تھا جو اس وقت موت کی نذر ہو رہا تھا۔ فوراً حضرت ابراہیمؑ کا پیچھا کرنے سے رک گئی اور کہنے لگی اگر یہ بات ہے تو پھر خدا ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ آخر پانی ختم ہوا، غذا ختم ہوئی اور باوجود اس کے کہ اس علاقہ میں کوئی چیز نہ آتی تھی حضرت ہاجرہ اپنے بچہ کی تکلیف کو دیکھ کر جو پیاس سے تڑپ رہا تھا ایک ٹیلے پر چڑھ گئیں کہ شاید کوئی آدمی نظر آئے اور اس سے پانی مانگ لیں یا کوئی آبادی دکھائی دے۔ انہوں نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر جس حد تک انسانی نظر کام کر سکتی تھی دیکھا اور خوب دیکھا مگر انہیں کہیں پانی کا نشان تک نظر نہ آیا۔ تب وہ اسی گھبراہٹ میں اتریں اور دوڑتی ہوئی دوسرے ٹیلے پر چڑھ گئیں وہاں سے بھی دیکھا مگر پانی کے کوئی آثار نظر نہ آئے چونکہ ٹیلے کی چوٹی سے

انہیں اپنا بچہ تڑپتا ہوا دکھائی دیتا تھا اس لئے جب وہ ٹیلے سے نیچے اُترتیں تو اس خیال سے کہ معلوم بچے کا کیا حال ہو جائے دوڑ کر اُترتیں۔ آجتک حضرت ہاجرہ کے اس واقعہ کی یادگار کے طور پر حج کے ایام میں صفا اور مَروہ پر دوڑ کر چلا جاتا ہے اور یہ دوڑ کر چلنا اسی رسم کو قائم رکھنے کے لئے ہے۔ جب حضرت ہاجرہ نے اس کرب و اضطراب میں سات چکر کاٹے اور انہیں کوئی چیز نظر نہ آئی اور ان کا دل بیٹھنے لگا تو خدا تعالیٰ کا الہام نازل ہوا کہ اے ہاجرہ خدا نے تیرے بچہ کے لئے سامان کر دیا جا اور اپنے بچے کو دیکھ۔ حضرت ہاجرہ واپس آئیں تو انہوں نے دیکھا جہاں بچہ پیاس کی شدت سے تڑپ رہا تھا وہاں ایک پُرانا چشمہ ابل رہا ہے۔ جو لوگ پہاڑی مقامات کو جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ بعض دفعہ بہت پرانے چشمے مٹی وغیرہ سے اٹ جاتے ہیں۔ اور کسی کو یاد تک نہیں رہتا کہ اس سطح زمین کے نیچے چشمہ ہے۔ کشمیر میں بھی ایسے چشمے دیکھنے میں آتے ہیں حدیثوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ چشمہ پہلے سے تھا۔ بچے نے جب ایڑیاں رگڑیں تو وہ چشمہ پھوٹ پڑا۔ پانی کا تو اللہ تعالیٰ نے اس طرح انتظام کر دیا، اب غذا کی فکر تھی۔ اتفاقاً ایک قافلہ راستہ بھول گیا اور وہ اسی جگہ آپہنچا جہاں حضرت ہاجرہ بیٹھی تھیں۔ قافلہ والوں کو پانی کی سخت ضرورت تھی جب انہوں نے وہاں چشمہ دیکھا تو انہوں نے حضرت ہاجرہ کو بڑی بڑی رقوم دیں اور کہا کہ ہم آپ کی رعایا ہو کر یہاں رہیں گے۔ ہمیں اس جگہ بسنے کی اجازت دی جائے۔ حضرت ہاجرہ نے انہیں اجازت دیدی پس وہ حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کی رعایا ہو کر وہاں رہنے لگے اور پیشتر اس کے کہ حضرت اسمٰعیلؑ جوان ہو، خدا نے اسے بادشاہ بنا دیا۔ آج تک حج کے ایام میں حضرت ہاجرہ کے واقعہ کو یاد دلایا جاتا ہے جبکہ انہوں نے اپنے بیٹے کو وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑا۔ آج ہم میں سے جن کو اللہ تعالیٰ توفیق دیتا ہے جاتے ہیں اور اسی جگہ انہی پہاڑیوں کا طواف کرتے ہیں وہ وہاں اپنے بچے کو چھوڑ کر نہیں آتے حضرت ابراہیمؑ والی قربانی کا ان سے مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ صرف ان سے یہ اقرار لیا جاتا ہے کہ اگر تمھیں خدا کے لئے اپنے بچوں کی قربانی کرنی پڑے تو تم بشاشت کے ساتھ یہ قربانی کرو گے صرف اقرار لیا جاتا ہے کہ اگر تم کو خدا کے لئے کسی وقت اپنے عزیزوں کو چھوڑنا پڑے تو تم انہیں چھوڑ دو گے۔ آج ہر وہ شخص جو صفا و مَروہ کا طواف کرتا ہے وہ اسی عورت کے نقش قدم کا اتباع کرتا ہے جسے نَاقِصُ الْعَقْلِ وَالدِّیْنِ کہا جاتا ہے۔ اس طواف کے ذریعہ ہر مومن سے یہ اقرار لیا جاتا ہے کہ کم از کم نہیں ایک عورت سے اپنے ایمان میں زیادہ ہونا چاہیئے۔ ہم اس کے بعد عید کرتے ہیں، اس لئے کہ ہم نے اس عہد کو پورا کر دیا جو خدا نے ہم سے لیا اور یہ عید اس بات کی علامت ہے کہ ہم نے اس عہد کو نباہا۔ مگر کیا تم اپنے نفسوں کو ٹٹول کر اور سینوں پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہو کہ تم نے اس عہد کو

پورا کیا؟ کیا تمہارا ایمان صرف تمہاری زبانوں تک محدود نہیں۔ کیا واقعی وہ ایمان تمہارے قلوب پر حاوی ہو گیا۔ کیا واقعہ میں اس نے تمہارے جذبات پر تصرف حاصل کر لیا۔ اگر کر لیا تو پھر تمہاری سچی عید ہے۔ اور اگر نہیں بلکہ تمہارا ایمان صرف تمہارے دماغ اور فکر اور زبان تک محدود ہے تو پھر یہ عید تمہارے لئے عید نہیں بلکہ ایک ماتم کا دن ہے دیکھو ایک عورت نے، اُس عورت نے جس کی زندگی کا سہارا ایک ہی بچہ تھا اپنے وطن عزیز اور رشتہ داروں کو خدا تعالیٰ کے لئے چھوڑ کر کیسا نمونہ دکھایا۔ آج خدا اس نمونہ کو قائم کر کے عورتوں سے کہتا ہے کہ تم میں سے ہی ایک عورت تھی جس نے خدا کے لئے یہ نمونہ دکھایا۔ کیا تم اس سے نرالی ہو کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مصائب برداشت کرنا دوبھر معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ مردوں سے کہتا ہے کہ تمہیں شرم کرنی چاہیئے، ایک عورت نے نحیف ہو کر کمزور ہو کر بے بضاعت ہو کر جب یہ نمونہ دکھایا تو کیا تم مرد ہو کر جنہیں زیادہ قوتیں دی گئی ہیں۔ قربانی سے ہچکچاتے ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے خدا کے مسیح کو قبول کیا اور ہمیں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑنا پڑا۔ مگر مَیں کہتا ہوں تم سے کون ہے جس نے حضرت ہاجرہ سے زیادہ قربانی کی ہو۔ جس نے اپنے آپ کو ان حالات میں سے گزارا ہو جن کے ماتحت حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھا دیا۔ اور یقین سے پُر ہاجرہ نے کہا۔ اِذَنْ لَّا یُضَیِّعُنَا۔ ہم کو بھی خدا کے ایک مامور کی صحبت نصیب ہوئی۔ ہمیں بھی اس پر ایمان لانے کا موقعہ عطا ہوا۔ مگر کیا ہم جو اس مامور پر ایمان لائے دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے حضرت ہاجرہ جیسی قربانی کی؟ کیا ہمیں دشمنوں کی عداوت کو دیکھ کر یہ نہیں کہنا چاہیئے۔ اِذَنْ لَّا یُضَیِّعُنَا اگر حضرت ہاجرہ کے دل میں اسمٰعیلؑ کی اس تڑپ اور موت کی سی حالت کو دیکھ کر کرب و اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ بے تابانہ صفا و مروہ پر دوڑتی اور سات چکر لگاتی ہیں تو کیا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے لئے جبکہ ہم اس دین کو آج موت کی حالت میں دیکھ رہے ہیں ہمارے دلوں میں کرب و اضطراب پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم اس بات کے دعویدار ہیں کہ ہم حضرت مسیح موعودؑ پر ایمان لا کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہؓ میں داخل ہو گئے ہیں۔ مگر کیا ایمان اس بات کا نام نہیں کہ اپنی ہر چیز خدا کے مقابل پر ہماری نظروں میں ہیچ ہو جائے۔ اور جس طرح حضرت ہاجرہ نے اپنے بچہ کے لئے قربانی کی ہم اسلام کے لئے قربانی کریں۔ یقیناً اگر غور کرو گے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ آج دین کی نہایت ہی نازک حالت ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس حالت کو ایک بیمار بچہ سے تشبیہ دی ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

ہر طرف کفر است جوشاں ہمچو افواجِ یزید　　دینِ حق بیمار و بیکس ہمچو زین العابدین [۲۳]

آج کفر اسی طرح زور و طاقت میں ہے جس طرح یزید کی فوجیں زور و طاقت میں تھیں اور اسلام اسی طرح بیمار و بیکس ہے جس طرح زین العابدین جن کے باپ اور رشتہ دار جو دشمن کے مقابلہ کی طاقت رکھتے تھے مارے گئے تھے اور وہ خود بے کسی کی حالت میں تڑپ رہے تھے۔ آپ فرماتے ہیں۔ آج دین کی وہی حالت ہے جو زین العابدینؒ کی تھی اور کفر کی وہی حالت ہے، جو یزید کی افواج کی تھی۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لائے ہوئے دین کو ایک بچہ سے تشبیہ دی ہے اور ہمیں اس امر کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ دیکھو حضرت ہاجرہ نے اپنے بچہ کے لئے جو تڑپ دکھلائی کیا تم محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے لئے ایسی تڑپ دکھانے کے لئے تیار نہیں۔ اگر واقعہ میں ہمارے دلوں میں اسلام کی محبت ہے، قرآن کریم کی عظمت ہے، رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا عشق ہے تو پھر دنیا کی مخالفتیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں! ایک اور صرف ایک خیال تمہارے دلوں میں ہونا چاہیئے اور وہ یہ کہ اس وقت اسلام کو مٹانے کے لئے دنیا متحد ہو رہی ہے۔ آج لوگوں کے دلوں سے قرآن کا نور مٹ گیا، قلوب کی صفائی جاتی رہی۔ وہ تعلیم جو دنیا کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لئے آئی تھی، آج خود زمین پر مسلی جا رہی ہے۔ وہ نبی جو دنیا کو گناہوں سے پاک کرنے کے لئے آیا تھا۔ آج ہر قسم کے عیوب اور گناہ اس کی طرف منسوب کئے جا رہے ہیں۔ وہ دین جو دُنیا کو ترقی دینے اور مُردوں کو زندہ کرنے کے لئے آیا تھا، آج خود اس کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ کوئی نہیں جو اس کا درد رکھتا ہو، کوئی نہیں جو اس کی اشاعت کا خیال رکھتا ہو۔ دل مُردہ ہو چکے، آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور محبت مفقود ہو گئی۔ آج لوگوں کی تمام غیرتیں صرف اپنے نفوس کے لئے رہ گئی ہیں۔ آج ان کی تمام قوتیں صرف اپنی بڑائی اور شان و شوکت کے حصول کے لئے صرف ہو رہی ہیں۔ صرف ایک۔ ہاں صرف تم جو دنیا میں کمزور سمجھے جاتے ہو۔ تم جو دنیا میں حقیر سمجھے جاتے ہو، تمھیں خدا نے چُنا ہے تا تم سے وہ اپنے دین کی اشاعت کا کام لے جس طرح آج سے ہزارہا سال پہلے خدا نے حضرت اسمٰعیلؑ کو چُنا اور انہیں ایک وادی غیر ذی زرع میں رکھنے کا حکم دیا اسی طرح ہاں اسی طرح خدا نے تم کو چُن لیا اور تمھیں بھی اپنے عزیزوں سے جُدا ہونا پڑا۔ تمہاری مائیں بھی تڑپتی ہیں جب تمھیں تبلیغ کے لئے دور دراز ملکوں میں جانا پڑتا ہے۔ مگر انہیں کیا پتہ کہ حضرت ہاجرہ کا دل بھی اسی طرح تڑپتا تھا۔ مگر اس نے خدا کے لئے مصائب کو برداشت کیا۔ چند روز ہوئے مجھے ایک ماں نے واقعہ سُنایا اس کا ایک بچہ جو نہایت

ہی نیک تھا فوت ہو گیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے۔ اس نے بتایا کہ امرتسر میں جب ایک دفعہ جلسہ روک دیا گیا اور ارادہ ہوا کہ دوبارہ اسی جگہ جلسہ کیا جائے تو اس وقت مخالفت بہت زیادہ تھی اور لوگ کہتے تھے کہ اگر احمدی جلسہ کریں گے تو ہم انہیں ماریں گے۔ اس عورت نے سُنایا، میرا لڑکا آیا اور کہنے لگا۔ اماں جی مَیں امرتسر چلا ہوں۔ مَیں نے کہا بیٹا! میں نے تو سُنا ہے مخالفت بہت زیادہ ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ ہم احمدیوں کو ماریں گے۔ وہ کہنے لگا۔ باقی لوگ جو وہاں جائیں گے وہ بھی تو اپنی ماؤں کے بچے ہوں گے۔ اگر ساری مائیں یہی کہنے لگ جائیں تو پھر دین کی خدمت کون کرے گا۔ تو کئی مائیں ہیں جن کے دلوں میں یہ خیال آتا ہو گا کہ ان کے بچے دین کی خدمت کے لئے گئے ہوئے ہیں، نہ معلوم ان کا کیا حال ہو گا۔ اور کئی بچے ہیں جو خیال کرتے ہوں گے کہ اگر ہم دین کی خدمت کے لئے نکلے تو ہماری مائیں کیا کریں گی۔ مَیں ایسی ماؤں اور بچوں سے کہتا ہوں کہ حضرت ہاجرہ کا بھی ایک بچہ تھا اور حضرت اسمٰعیلؑ کی بھی ماں تھی اور حضرت ہاجرہ کے احساسات دوسروں کی ماؤں سے زیادہ تھے کیونکہ جتنی جتنی معرفت بڑھتی چلی جائے اتنے ہی احساسات تیز ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو موٹی عقل والے زیادہ تکالیف بغیر کسی قسم کے احساس کے برداشت کر لیں گے۔ مگر جیسے جیسے انسان تعلیم یافتہ ہوتا چلا جائے، اس کی حس بڑھتی جاتی ہے۔ اسی طرح جتنا زیادہ کوئی شخص خدا کا مقرب ہوتا جائے، اس کی حس بھی اسی نسبت سے ترقی کر جاتی ہے اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ[۱۱]۔ لوگوں کے مومن نہ ہونے کا ہمیں بھی صدمہ ہوتا ہے مگر محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدمہ کی کیفیت بالکل جداگانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تجھ پر اس صدمہ کا اتنا اثر ہے کہ گویا تجھ پر چھری چل رہی ہے جس سے گردن ہی کٹ جائے گی۔ بَاخِعٌ تلوار کے گردن کی پچھلی رگ تک پہنچ جانے کو کہتے ہیں[۱۲]۔ یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عرفان اور حس کی زیادتی کا ثبوت ہے۔ پس یاد رکھو ہم پر ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور ہماری عید اسی دن ہو گی جب ہم حقیقی طور پر اپنی ذمہ داری کو پورا کریں گے وہی دن ہمارے لئے عید کا دن ہو گا۔ اور اسی دن خوش ہونا ہمارے لئے حقیقی خوشی کا باعث ہو گا۔ اسی دن ہمارا حق ہو گا کہ ہم عرش کے کنگرے پکڑ کر کہیں کہ اے خدا! ہم نے اپنے فرائض کو پورا کر دیا۔ اب تو اپنے انعامات سے ہمیں سرفراز فرما۔ اور یقیناً خدا تمہیں اپنے انعامات دے گا۔ پس مومن وہی ہے جو اس عید کے لئے تیاری کرے۔ اس دن جو بھی وہ دُعا کرے گا خدا اسے قبول کرے گا۔ بلکہ خدا کہے گا کہ میرے بندے مانگ کہ مَیں تجھے دُوں۔ اس دن

خود خدا کو غیرت آئے گی اور کہے گا میرا بندہ مجھ سے کیوں نہیں مانگتا اس دن وہ اُجڑے ہوئے گھر جن کو آج دنیا ویران خیال کرتی ہے۔ آباد کر دیئے جائیں گے، وہ دنیا کا مرکز بن جائینگے۔ اور جس طرح حج کے لئے لوگ مکہ میں جاتے ہیں اسی طرح وہ لوگ جو دین کے لئے قربانی کرنے والے ہیں، ان کے گھر بھی لوگوں کا مرکز ہو جائیں گے۔ قربانی بے شک بڑی ہے مگر انعام اس سے بھی بڑے ہیں۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ اگر حضرت ابراہیم کی قربانی کے نتائج اس وقت دشمنوں کو معلوم ہو جاتے تو وہ بھی اپنی اولادوں کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتے اور بڑے بڑے دشمن تمنا کرتے کہ کاش ہم سے سب کچھ لے لیا جائے اور ہماری اولاد کو اس وادی میں رہنے کے لئے جگہ دی جائے۔ یہی حال آئندہ ہونے والا ہے۔ آج جو لوگ تم میں سے سچے طور پر اسلام کی خدمت کے لئے نکلیں گے خدا ان کے لئے وہی نمونہ دکھلائے گا جو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کے لئے دکھایا وہ اور اس کی اولاد ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے بے انتہا فضلوں کی وارث ہوگی۔ اور وہ کبھی نہ اس جہان میں ضائع کئے جائیں گے اور نہ اگلے جہان میں۔ پس آج ایک موقع ہے وہ شخص جو عقل رکھتا ہے اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ مگر وہ جو نادان ہے کاش وہ پیدا ہی نہ ہوتا کیونکہ اس قدر عظیم الشان موقع ملنے کے باوجود وہ اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہا۔

خطبہ ثانیہ میں فرمایا:۔

ہر دن کی کچھ نہ کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ عید کے دن جو ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے اس کے اظہار کے لئے اس دن اسلام نے عبادت زیادہ کر دی۔ اور اس طرح بتایا کہ ہر خوشی کے موقع پر اللہ تعالیٰ کے حضور جھکنا چاہیئے کیونکہ وہی تمام خوشیوں کا منبع ہے۔ عید کیا ہے۔ یہ ایک صفائی کا دن ہے اور اس دن ایک اور عبادت رکھکر سمجھایا کہ حقیقی صفائی عبادت سے ہی ہوتی ہے۔ مگر یہ صفائی انہی کو نصیب ہوتی ہے جو مایوس نہیں ہوتے۔ کئی لوگ ایسے ہیں جو اپنی زندگی کے گناہ دیکھکر کہہ دیا کرتے ہیں۔ کہ کیا خدا ہمیں بھی معاف کر سکتا ہے۔ حالانکہ اگر یہ سمجھا جائے کہ کوئی ایسا گناہ بھی ہے جسے خدا بخش نہیں سکتا۔ تو میرے نزدیک اس کا صاف طور پر یہ مطلب ہوگا کہ خدا بڑا نہیں بلکہ نعوذ باللہ شیطان بڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا۔ خدا تعالیٰ تمام قسم کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اور نہ صرف گناہ بخشتا ہے بلکہ وہ انسان کو اعلیٰ درجہ کی روحانی ترقیات بھی عطا کرتا ہے، صرف اپنے دل میں تبدیلی پیدا کرنی چاہیئے۔ جب ہم بچے تھے تو ہم سکول کی کتابوں میں ایک نہایت ہی لطیف حکایت پڑھا کرتے تھے۔ لکھا ہے کہ سید عبدالقادر جیلانیؒ جب بارہ تیرہ سال کے ہوئے

توان کی والدہ نے انہیں اپنے کسی عزیز کے پاس بھیجا کہ وہ انہیں کوئی پیشہ سکھادے یا تجارت کے کسی کام میں ان کی مدد کرے۔ ان کے پاس بیس پچیس اشرفیاں تھیں۔ ان کی والدہ نے کہا یہ تمہارے باپ کا ورثہ ہے میں انہیں گدڑی میں سی دیتی ہوں۔ جب منزل مقصود پر پہنچنا تو نکال لینا۔ جس قافلے کے ساتھ وہ جا رہے تھے اتفاقاً راستہ میں اس پر ڈاکہ پڑا۔ اور ڈاکو والوں نے سب کچھ لوٹ لیا۔ کسی ڈاکو نے گذرتے ہوئے ان سے بھی پوچھا کہ کیا تمہارے پاس بھی کوئی چیز ہے انہوں نے بیس پچیس جتنی اشرفیاں تھیں بتا دیں اس نے کہا چل بیوقوف، مجھ سے مخول کرتا ہے۔ تیرے پاس اشرفیاں کہاں سے آئیں۔ انہوں نے کہا نہیں میں مخول نہیں کرتا میرے پاس واقعی اشرفیاں ہیں۔ اس نے سمجھا یہ پاگل ہے اور چھوڑ کر چلا گیا۔ پھر کوئی دوسرا ڈاکو گذرا اور اس نے پوچھا تو اسے بھی انہوں نے سچ بتا دیا۔ آخر وہ ڈاکو انہیں پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لے گئے اور کہا۔ ہم سے پوچھتے ہیں تو یہ کہتا ہے کہ میرے پاس بیس پچیس اشرفیاں ہیں، ہمیں تو اعتبار نہیں آتا اب آپ کے پاس لائے ہیں جو حکم ہو اس طرح کیا جائے۔ اس نے کہا اس کی گدڑی پھاڑو۔ جب انہوں نے گدڑی پھاڑی تو اس میں سے اشرفیاں نکل آئیں۔ انہوں نے اس پر بڑی حیرت کا اظہار کیا اور کہا تیری گدڑی تو کسی نے دیکھنی نہیں تھی، پھر تو نے یہ راز کیوں افشا کر دیا؟ انہوں نے نہایت سادگی سے کہا پھر میں جھوٹ کس طرح بولتا۔ چوروں پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ وہ اسی وقت تائب ہو گئے اور سوانح والے لکھتے ہیں کہ وہی ڈاکو بعد میں بہت بڑا ولی بن گیا۔

اسی طرح شبلیؒ جو مشہور صوفی گذرے ہیں۔ اور تمام عالمِ اسلام ان کا ادب اور احترام کرتا ہے، وہ ایک علاقہ کے گورنر تھے مگر نہایت ہی ظالم وجابر۔ جس طرح حجاج بن یوسف اپنے ظلم کی وجہ سے بدنام ہے۔ اسی طرح وہ بھی اپنے ظلموں کی وجہ سے بدنام تھے بلکہ حجاج بن یوسف تو شاید ظالم تھا یا نہیں کیونکہ اس کے متعلق اختلاف ہے۔ شبلیؒ خود کہتے ہیں کہ میں نہایت ظالم وجابر گورنر تھا اور کوئی فتنہ نہیں تھا جس سے مجھے احتراز ہو۔ ہر گناہ کا میں مرتکب ہوا اور ہر ظلم میں میں نے حصہ لیا۔ ان کی ہدایت کا جو اللہ تعالیٰ نے ذریعہ بنایا وہ یہ تھا کہ ایک دفعہ وہ بادشاہ کے دربار میں بیٹھے تھے کہ ایک جرنیل پیش ہوا جس نے بہت بڑی جنگی خدمات سرانجام دی تھیں۔ بادشاہ نے اسے برسرِ دربار خلعت دیا لیکن بدقسمتی سے وہ رومال لانا بھول گیا تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اسے نزلہ تھا چھینک جو آئی تو نزلہ بہنے لگا۔ اب اگر نزلہ نہ پونچھتا تو یہ بدنما معلوم ہوتا۔ اور اگر پونچھتا تو کوئی چیز نہ تھی۔ آخر اس نے نظر بچا کر اسی خلعت سے ناک صاف کر لیا مگر بادشاہ کی نظر پڑ گئی۔ وہ اپنے عطا کردہ خلعت کی اس بے قدری کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے نہایت ہی غصہ میں کہا کہ اس کا خلعت اتار لو اور اس کی تمام جائداد ضبط کر لو

ہم نے ایک خلعت دیا مگر اس نے اس کی بے قدری کی۔ شبلیؒ نے جب یہ نظارہ دیکھا تو ایک دم ان کی چیخیں نکل گئیں۔ اللہ تعالیٰ ایک تغیّر کا وقت لاتا ہے۔ اس وقت خدا کے حضور یہی مقدر تھا کہ ہدایت دے۔ بادشاہ نے پوچھا شبلی تمہیں کیا ہو گیا مگر ان پر ایسی رقّت طاری تھی کہ کچھ دیر تک جواب نہ دے سکے۔ اور جب اصرار کیا گیا تو انہوں نے کہا بادشاہ سلامت میرا استعفیٰ منظور کیجئے۔ بادشاہ نے کہا: کیا تو پاگل ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا میں پاگل تو نہیں ہوا مگر اب مجھے وہ بات سمجھ آگئی ہے جو پہلے میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ میں نے آجتک ہر کام آپ کے خوش کرنے کے لئے کیا۔ مگر اب یہ نظارہ دیکھنے سے مجھے معاً خیال آیا کہ اس جرنیل نے کتنی بڑی خدمات سرانجام دی تھیں۔ یہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بیوی کو بیوہ ہونے کے خطرہ میں اور بچوں کو یتیم ہونے کے خطرہ میں ڈال کر سالہا سال تک تکالیف برداشت کرتا رہا۔ اس کے بدلہ میں آپ نے جو اسے خلعت دیا وہ اس کی خدمات کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھتا ہے مگر اس کی ایک معمولی سی فرد گذاشت پر آپ نے اس پر اتنا عتاب نازل کیا۔ اس کا خلعت اتار لیا۔ اس کی جائیداد ضبط کر لی اور اسے بر سرِ دربار ذلیل کرایا۔ مجھے بھی خدا نے ایک خلعت دی تھی مگر میں نے اپنے گناہوں کی وجہ سے اُسے سر سے پَیر تک خراب کر لیا ہے۔ اب مجھے اجازت دی جائے کہ مَیں اپنی باقی عمر ان گناہوں کے داغوں کو دھوتے میں صرف کر دوں۔ لکھا ہے وہ اتنے سخت ظالم تھے کہ وہ کئی صوفیا کے پاس گئے اور کہا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں مگر سب نے یہی کہا کہ تُو اتنے ظلم کر چکا ہے کہ اب تیری توبہ قبول ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ آخر حضرت جنیدؒ یا کسی اور بزرگ کے پاس (مجھے ٹھیک یاد نہیں) وہ گئے اور انہوں نے کہا کہ ہاں توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ مگر یہ شرط رکھی کہ جن جن پر تم نے ظلم کیا ہے ان تمام کے دروازوں پر جاؤ اور ہر ایک سے معافی مانگو۔ آخر وہ ہر شخص کے دروازہ پر گئے اور انہوں نے معافی مانگی۔[۲۹] اب وہی شبلیؒ روحانی ہادیوں میں شمار ہوتے ہیں اور انہیں روحانیات میں بہت بڑا درجہ اور مقام حاصل ہے پس انسان کے لئے ہر وقت مدارج کا دروازہ کھلا ہے اور اللہ تعالیٰ کے انبیاء اسی لئے آیا کرتے ہیں کہ تا وہ لوگوں کو گڑھوں سے نکالیں اور انہیں روشنی کے بلند مینار پر کھڑا کر دیں۔ پس یہ مت خیال کرو کہ تمہارے اندر کمزوریاں پائی جاتی ہیں اللہ تعالیٰ کے حضور جھکنے سے یہ تمام کمزوریاں دُور ہو سکتی ہیں اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ انسان کی توبہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ قبول کرتا ہے۔ مَا لَمْ یُغَرْغِرْ جب تک اس پر موت طاری نہیں ہوتی اور جب تک اس کا دماغ پراگندہ نہیں ہو جاتا۔ پس ان باتوں سے ڈرنا اور گھبرانا نہیں چاہیئے۔ بلکہ ہمیشہ ترقی کے لئے کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک نبی بھیجکر اب پھر

تمہیں موقع دیا ہے اس موقع کی قدر کرو اور اسے ضائع نہ ہونے دو۔ میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ اور نہ صرف ہمیں اپنے نفوس کی اصلاح کا موقعہ دے بلکہ ہمیں دوسروں کی اصلاح کا جذبہ بھی عطا فرمائے۔ اور اس عظیم الشان موقع سے جو بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوا کرتا ہے۔ فائدہ اٹھانے کی توفیق دے۔ یہ ایسا مبارک وقت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے کہ اس وقت ایمان لانے والے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں شامل ہونگے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس کا فضل ہمارے شاملِ حال ہو اور وہ ہماری ناچیز قربانیوں کو قبول فرما کر ہمیں اپنی ان نعمتوں کا وارث بنائے جو پہلے لوگوں کو حاصل ہو چکی ہیں۔

(الفضل ۱۶ اپریل ۱۹۳۳ء ص۵ تا ۱۱)

ھ۱ - مراد ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

ھ۲ - پیدائش باب ۱۱ آیت ۲۷ تا ۳۱

ھ۳ - الانعام ۶ : ۷۵ - تفسیر درمنثور ۲۵/۳ ، جیوش انسائیکلوپیڈیا ج ۸۵-۸۶/۱

ھ۴ - جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۱ ص۸۶ زیر لفظ ABRAHAM

ھ۵ - صحیح بخاری کتاب المناقب باب حدیث زید بن عمرو بن نفیلٍ

ھ۶ - الانبیاء ۲۱ : ۶۹-۷۰

ھ۷ - قدسی العرفان فی تفسیر سورہ النجم من القرآن ص۴۲

ھ۸ - غالباً سہوِ کتابت ہے ایک روایت کے مطابق حضرت لوطؑ ابوالانبیاء ابراہیم علیہ السلام کے چچازاد بھائی تھے (تفریح الاذکیا فی احوال الانبیاء جلد ۱ ص۲۰)

ھ۹ - پیدائش باب ۱۱ آیت ۲۷

ھ۱۰ - پیدائش باب ۱۸ آیت ۲۳ تا ۳۳

ھ۱۱ - حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے اُور میں رہتے تھے جو عراق کے علاقہ میں تھا۔ وہاں سے حاران کی طرف جو بالائی عراق میں واقع ہے تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کنعان کی طرف ہجرت کی۔ تاریخ طبری ۲۹۵/۱ کی رو سے آپ نے ارض شام کی طرف ہجرت کی تھی۔

ھ۱۲ - التوبہ ۹ : ۱۱۴ - ہود ۱۱ : ۷۶

ھ۱۳ - ابراہیم ۱۴ : ۳۸

ھ۱۴ - الحج ۲۲ : ۷۹

۱۵ ـ پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۲ ـ اصل عبارت یوں ہے :۔ "وہ گورخر کی طرح آزاد مرد ہوگا۔ اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا۔"

۱۶ ـ متی باب ۱۰ آیت ۳۴ تا ۳۶

۱۷ ـ تاریخ طبری ص ۲۵۴ مطبوعہ دار المعارف مصر

۱۸ ـ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی ـ پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۷

۱۹ ـ غالباً اس سے مراد بعثت نبویؐ سے متّا قبل حضرت عبدالمطلب کے ذریعہ زمزم کا دوبارہ ظہور ہے (تاریخ الخمیس جلد ۱ ص ۲۰۲)

۲۰ ـ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی۔

۲۱ ـ صحیح بخاری کتاب الحیض باب ترک الحائض، الصوم ـ سنن ابن ماجہ کتاب الفتن ـ باب فتنۃ النساء

۲۲ ـ "بشیر احمد ـ شریف احمد اور مبارکہ کی آمین" مطبوعہ ۱۹۰۱ء مندرجہ درثمین اردو ص ۵۹ مطبوعہ ۱۹۲۹ء

۲۳ ـ روحانی خزائن (فتح اسلام) جلد ۳ ص ۴۵

۲۴ ـ الشعراء ۲۶ : ۴

۲۵ ـ المنجد زیر لفظ بخعٌ ـ تفسیر الکشاف علامہ زمخشری ص ۳۳۵/۲ زیر آیت کریمہ۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔

۲۶ ـ الزمر ۳۹ : ۵۴

۲۷ ـ نیا تذکرۃ الاولیاء مؤلفہ رئیس احمد جعفری ص ۲۴۴ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء

۲۸ ـ حجاج بن یوسف (۴۱ھ/۶۶۱ء ـ ۹۵ھ/۷۱۴ء) بنو امیہ کے عہد سلطنت میں پہلے مکہ، یمن اور یمامہ اور پھر سارے حجاز اور عراق (بصرہ اور کوفہ) کا گورنر رہا۔

۲۹ ـ نیا تذکرۃ الاولیاء مؤلفہ رئیس احمد جعفری ص ۳۴-۳۵ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء۔

۳۰ ـ جامع ترمذی ابواب الدعوات باب فضل التوبۃ

۲۲

(فرمودہ ۲۶ مارچ ۱۹۳۴ء بمقام باغ حضرت مسیح موعود علیہ السلام قادیان)

عید اضحی اپنے نام سے ہی قربانی چاہتی ہے۔ قربانی کے متعلق ایک بات یاد رکھنے والی ہے اور وہ یہ ہے کہ قربانی اپنے نتائج کے مطابق اور اپنے احساس کے مطابق ہوا کرتی ہے جتنی جتنی حس کم ہوتی چلی جائے اتنی ہی قربانی کی قیمت گرتی جاتی ہے اور جتنی جتنی حس زیادہ ہوتی جائے اتنی ہی قیمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام نے کہا ہے کہ عوام کی نیکیاں خواص کی بدیاں ہوتی ہیں۔ ایک ایسا انسان جس کے دل کی حالت نہایت ہی تنگ ہے اور جس کے دل پر بخل نے قبضہ کر رکھا ہے اگر وہ دین کی خاطر قربانی کرتا ہے۔ ایک تھوڑی سی قربانی جو دوسروں کی نگاہ میں بالکل حقیر ہے مگر اس کا دل اسی سے خون ہوا جاتا ہے وہ اسے آفت سمجھتا ہے اور وہ بھی اسے پہاڑ نظر آتی ہے۔ مگر پھر بھی وہ کرتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے ایسے شخص کی قربانی یقیناً اسی کے طبقہ کے دوسرے آدمیوں کی نسبت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ بعض لوگ لاابالی ہوتے ہیں مُسرف ہوتے ہیں اور روپیہ کی قدر ان کے نزدیک کوئی نہیں ہوتی وہ جو کماتے ہیں اس سے زیادہ خرچ کر دیتے ہیں۔ ایسا آدمی اگر دین کے رستہ میں بھی بڑھ چڑھ کر خرچ کر دے تو گو دنیا کے نزدیک اس کی قربانی بڑی ہو، مگر خدا کے ہاں اس کے دل کی حالت کے مطابق ہی اس کی قیمت ہوگی۔ چونکہ عام حالات میں بھی وہ اسراف سے ہی کام لیتا ہے اس لئے اگرچہ وہ دین کے معاملہ میں بھی اپنے بھائی سے زیادہ دیتا ہے پھر بھی اس کے دل کی حالت اور اس کی نگاہ میں روپیہ کی قدر و قیمت کا موازنہ کر کے ہی اللہ تعالیٰ بھی اس کا بدلہ دیگا۔ اس نے اگرچہ زیادہ قربانی کی۔ اور دوسرے سے زیادہ رقم دی مگر یہ رقم کی زیادتی اس نے دین کے بارہ میں ہی نہیں کی بلکہ دنیا کے کاموں حتّٰی کہ لہو و لعب میں بھی وہ ایسا ہی کرنے کا عادی ہے۔ مگر جو شخص دنیوی معاملات میں بھی اپنے اُوپر تنگی برداشت کرتا ہے بلکہ ضرورتِ حقہ کو بھی پورا نہیں کرتا وہ اگر اتنی ہی رقم خدا کے رستہ میں دیدے جتنی ایک مُسرف نے دی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت زیادہ قیمت پائے گی۔ کیونکہ اس نے اپنے احساسات کو قربان کر دیا۔ اسی طرح ایک شخص جماعت میں نیا داخل ہوا ہے اور قربانی کے صحیح معنوں سے آگاہ نہیں وہ اپنے ایمان کے مطابق قربانی کرتا ہے۔ اور اپنے نفس میں خیال کرتا ہے کہ مَیں نے اپنی جان پر بڑا ظلم کیا ہے۔ مگر ایک پُرانا احمدی ہے جو قربانی کا

عادی ہوچکا ہے تو اللہ تعالےٰ کے ہاں ان دونوں کو ان کی قلبی کیفیات اور احساسات کے مطابق بدلہ ملے گا۔ نئے احمدی کی تھوڑی قربانی کی قیمت پُرانے کی زیادہ قربانی سے زیادہ ہوگی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ دوزخی جب ایک عرصہ تک عذاب اُٹھالیں گے تو پھر ہم ان کی جلدیں تبدیل کردیں گے۔ کیونکہ جتنی جتنی کسی چیز کی عادت ہوجائے اس کے متعلق حس اتنی ہی کم ہوجاتی ہے۔ باورچی خانے میں کام کرنے والے لوگ بڑی آسانی سے جلتی ہوئی دیگچی اُٹھالیتے ہیں لیکن ہم اگر اس سے آدھی گرم کو بھی ہاتھ لگائیں تو ہاتھ جل جائے۔ بعض لوگ گرم چائے پینے کے عادی ہوتے ہیں اتنی تیز کہ دوسرے اسے منہ کے قریب بھی نہ لاسکیں۔ اس کے متعلق مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ ۱۹۱۸ء میں جب مَیں بیمار ہوا۔ تو حکیم غلام محمد صاحب علیہ السلام جو حضرت خلیفہ اوّل کے شاگرد اور آپ کے مطب میں کام کیا کرتے تھے وہ اکثر میرے پاس ہی رہا کرتے تھے کیونکہ بیماری کی شدت تھی، وہ رات کو بھی وہیں سو رہتے۔ اسی طرح عبدالاحد خاں پٹھان بھی وہیں رہتے تھے۔ ایک دن یونہی ذکر آیا کہ کشمیری اور پٹھان دونوں بہت گرم چائے پینے کے عادی ہوتے ہیں اور یہ سوال پیدا ہوگیا کہ دونوں میں سے کون زیادہ گرم پی سکتا ہے۔ حکیم صاحب کہتے تھے کہ کشمیری بہت زیادہ گرم پی لیتے ہیں اور عبدالاحد خان کہتے تھے کہ پٹھان۔ بالآخر تجویز ہوئی کہ دونوں کو اُبلتی ہوئی چائے کی ایک ایک پیالی دی جائے۔ اور دیکھا جائے کہ کون جلدی ختم کرتا ہے۔ چنانچہ دونوں کو پیالیاں دی گئیں اور پینے لگے۔ حکیم صاحب پیالی کو مُنہ کے پاس لے جاتے اور جس طرح کوئی چیز انڈیلتا ہے اس طرح کرتے۔ مَیں سمجھ رہا تھا کہ بھلا اتنی تیز گرم اس طرح کہاں پی جاسکتی ہے۔ یہ عبدالاحد سے صرف مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن چند بار ایسا کرنے کے بعد جب انہوں نے پیالی رکھی تو وہ بالکل خالی تھی۔ اور عبدالاحد نے اس وقت تک ابھی پیالی کا چوتھائی حصہ بھی ختم نہ کیا تھا۔ میرے واہمہ میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ اتنی تیز گرم چائے منہ کے پاس بھی لے جائی جاسکتی ہے۔ مگر یہ عادت کی بات ہے۔ اب اگر فرض کرلیا جائے کہ یہ کوئی ثواب کا کام ہوتا تو مَیں سمجھتا ہوں وہ لوگ جو اس کے عادی نہیں، بہت زیادہ ثواب پاتے بہ نسبت ان لوگوں کے جنہیں کوئی احساس ہی نہیں ہوتا۔ کہ یہ گرم ہے کیونکہ قربانی اور اس کی قیمت احساس کے مطابق ہوتی ہے جس طرح دوزخ میں جلدیں بدلی جائینگی تا عذاب کا احساس ہو اسی طرح نیکی کا بھی حال ہے۔ اس میں بھی درجہ بدلنا پڑتا ہے ورنہ انسان کی نیکی نیکی نہیں رہتی۔ جب ایک نیکی کی عادت ہوجائے تو اس کا اتنا ثواب نہیں رہتا جب تک اس میں کوئی اضافہ نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے نیکیوں کے مدارج مقرر کئے ہیں۔ نماز کے فرض مقرر کئے مگر اس کے ساتھ نوافل اور سُنتیں بھی لگا دیں۔ اب ایک شخص خیال

کرسکتا ہے کہ جب فرض موجود ہیں تو پھر سنتوں اور نوافل کی کیا ضرورت تھی۔ اس میں یہی حکمت ہے کہ جب فرائض کی عادت ہو جائے تو مزید ترقی کے لئے رستہ کھلا رہے اللہ تعالےٰ نے نماز کا کوئی وقت مقرر نہیں کیا۔ مثلاً یہ نہیں کہا کہ ظہر کی نماز چار رکعت دس منٹ پر ادا کی جائے اور اس سے بھی اللہ تعالےٰ کا منشاء یہی ہے کہ اگر کوئی خلوصِ دل سے چاہے تو اس میں زیادتی کر سکے۔ پھر نماز میں توجہ کی بھی کوئی حد نہیں رکھی۔ ورنہ نچلے درجہ کے لوگ محروم رہ جاتے ایک شخص معمولی سی توجہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لیتا ہے مگر دوسرا اتنا نہیں اُٹھا سکتا جب تک پوری توجہ سے کام نہ لے۔ یہی حال صدقہ و خیرات کا ہے۔ ایک طرف زکوٰۃ رکھدی جس کی حد بندی کر دی مگر صدقہ و خیرات کی کوئی حد نہیں رکھی یعنی زکوٰۃ کے علاوہ نفلی صدقہ رکھا تا انسان جب زکوٰۃ کا عادی ہو جائے تو اس میں ترقی کر سکے۔ روزوں کا بھی یہی حال ہے رمضان کے روزے فرض کئے مگر ساتھ نفلی روزے بھی رکھے گویا ہر بات میں ترقی کی گنجائش رکھی تا جوں جوں ایک نیکی کی عادت ہوتی جائے اس میں اضافہ اور ترقی کی جا سکے۔

غرض شریعت نے احساس اور عادت پر بنیاد رکھی، چیز پر نہیں۔ یہ نہیں کہ دس روپے دینے والا نو روپے دینے والے سے اچھا ہے۔ بلکہ احساس کے لحاظ سے ممکن ہے کہ ایک روپیہ دینے والا نو روپے دینے والے سے اچھا ہو۔ ایک تنگ دل آٹھ آنہ دیتا ہے مگر اسے بھی ایک بڑی چیز خیال کرتا ہے لیکن دوسرا جو مُسرف ہے وہ دس روپے دے دیتا ہے لیکن اس کے دل میں اس کا قطعاً کوئی احساس تک نہیں ہوتا۔ اس سے اس کنجوس کی ایک روپیہ کی قربانی جسے کرتے ہوئے اس کی جان نکلتی ہے زیادہ قیمتی ہے۔ مَیں نے پہلے بھی ایک واقعہ سُنایا ہے جو میرے ایک عزیز سُنایا کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے طالب علم کے ساتھ مل کر رہا کرتے تھے جو احمدی ہے۔ ایک دن انہوں نے دیکھا کہ وہ بہت افسردہ خاطر بیٹھا ہے۔ دریافت کیا کہ کیا معاملہ ہے۔ اس نے جواب دیا کہ امتحان سر پر ہے مگر آج مَیں نے ٹھیک طور پر پڑھا نہیں اور بہت سا وقت ضائع کر دیا ہے اس لئے میں نے اپنے آپ پر دو آنے جرمانہ کیا ہے انہوں نے پوچھا کہ کیا دو آنے کسی فقیر کو دیدیئے۔ کہنے لگے کہ نہیں اگر کسی فقیر کو دے سکتا۔ تو خوشی نہ ہوتی۔ انہوں نے پوچھا کہ پھر کس طرح جرمانہ کیا۔ اس نے جواب دیا کہ دو آنہ کی ریوڑیاں لے کر کھالی ہیں۔

اب بعض طبائع روپیہ کی اتنی قدر کرتی ہیں کہ اپنی جان کے لئے بھی پیسہ خرچ کرنا پسند نہیں کرتیں اور سوائے اشد ضرورت کے کہیں خرچ نہیں کرتیں۔ ایسا شخص اگر دو آنہ بھی دیتا ہے تو وہ بہت قابلِ قدر ہیں۔ لیکن جس شخص کے دل میں روپیہ کی قدر ہی نہیں اس کا ثواب بھی کم ہوگا۔ اس گُر کے مطابق مومن کو ہمیشہ نیکی میں ترقی کرنی چاہیئے۔ اور یاد رکھنا چاہیئے کہ جس نیکی کی عادت ہو جائے

اس کا ثواب بھی کم ہوجاتا ہے اور وہ اسی صورت میں مفید ہوسکتی ہے جب عادت سے زیادہ کی جائے۔ پس مومن کا ہر دن ایمان اور قربانی اور احساس کے لحاظ سے پہلے سے زیادہ مضبوط ہونا چاہیئے۔ کیونکہ لازمی بات ہے کہ ہر قدم پر عادت ہوگی اور اس طرح ہر قدم پہلے سے زیادہ اٹھانا پڑے گا یہی چیز ہے جس سے قرب الٰہی حاصل ہوسکتا ہے۔ مومن کسی ایک جگہ کھڑا نہیں ہوسکتا اگر کھڑا ہوجائے گا تو اس کی قربانی ہیچ ہوجائے گی۔ اسی مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن نوافل کے ذریعہ قرب الٰہی میں ترقی کرتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ ہوجاتا ہے اور اس کے پاؤں ہوجاتا ہے اور اگر وہ اس کی طرف ایک قدم اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دو قدم اُٹھاتا ہے حتیٰ کہ اس کا وجود خدا کا وجود ہوجاتا ہے[۳] اس کے یہی معنی ہیں کہ نوافل کے ذریعہ ترقی غیر محدود ہوتی ہے تو یہ عید اضحیٰ ہے۔ اور ہمیں قربانی کی طرف توجہ دلاتی ہے اور قربانی بھی احساس والی۔

دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کے لئے قربانی کرنی چاہی اور اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کے لئے پیش کر دیا۔ اوّل تو منشاء الٰہی یہ نہ تھا۔ ان کے رؤیا کی تعبیر یہ تھی کہ حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ میں چھوڑ آئیں تا اس کی نسل دینِ الٰہی کی حامل رہے مگر آپ نے اس رؤیا کو ظاہری رنگ میں پورا کرنے کی کوشش کی اور خدا نے الہام کے ذریعہ اس سے روک[۴] دیا لیکن محض اس قربانی کے ارادہ کرنے کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے اس کی یادگار قائم کردی۔ اس کے برعکس ہندوؤں میں ہزاروں ایسے لوگ ہیں جو عملاً اپنی اولادوں کو دیوی دیوتاؤں پر قربان کر دیتے ہیں[۵]۔ اگرچہ انگریزی حکومت نے قانوناً اس کی ممانعت کر رکھی ہے[۶] پھر بھی سینکڑوں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں مگر ان قربانیوں کا ذکر عزت سے کرنے کی بجائے ہم ذلت سے کرتے ہیں اور یہی کہتے ہیں کہ یہ لوگ کیسے بیوقوف ہیں مگر ایسا ہی ایک فعل ابراہیمؑ نے کرنے کا ارادہ کیا اور اس کی ہم اتنی تعریف کرتے ہیں۔ سوچنا چاہیئے ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ ان میں ایک فرق تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ فعل اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کیا تھا اور یہ لوگ جہالت سے غیر ضروری موقعہ پر کرتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ باوجود قربان نہ کرسکنے کے حضرت ابراہیمؑ کے فعل کی عظمت ہمارے نزدیک اس وجہ سے ہے کہ ابراہیمی احساسات بہت بڑھے ہوئے تھے۔ قرآن کریم میں آپ کے متعلق اَوَّاہٌ حلیم[۷] کے لفظ آتے ہیں۔ یعنی اس کا دل پگھلا ہوا تھا خالص آہیں بنا ہوا تھا۔ جس طرح اُبلتے اور کھولتے ہوئے پانی سے گیس نکلتی ہے اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کا دل اللہ تعالیٰ کے سامنے ایسا جھکا ہوا تھا کہ ہوا بن بن کر اُڑ رہا تھا۔ احساسات کی نرمی ایسی تھی کہ دنیا میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے

ایسے انسان سے تو معمولی تکلیف بھی برداشت نہیں ہو سکتی۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی قربانی اس سنگدل کے مقابلہ میں جسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا بہت زیادہ قیمت رکھتی ہے مولوی سید محمد سرور شاہ صاحبؓ ایک نواب کا قصہ سنایا کرتے ہیں جن کی اولاد اب احمدی ہو چکی ہے۔ وہ پہلے نواب تھے مگر کشمیر کے راجہ نے انہیں شکست دیدی تھی وہ بہت خوبصورت انسان تھے ایک دفعہ ان کے ہاتھ کی ہڈی کسی طرح ٹوٹ گئی جو بعد میں جڑ گئی تھی۔ ایک دن وہ راجہ کے دربار میں بیٹھے تھے۔ راجہ نے کہا کہ نواب صاحب جوڑنے والا اچھا ماہر نہ ہوگا کیونکہ کچھ نقص رہ گیا ہے۔ اگر آپ اس شخص سے جڑواتے جو ہم نے اس غرض کے لئے ملازم رکھا ہوا ہے تو بہت اچھا جوڑ لگتا۔ اور آپ کی خوبصورتی میں اس قدر نقص بھی نہ آتا۔ اس پر انہوں نے بازو کو پاؤں کے نیچے دبایا اور کڑاک کر کے اسے توڑ دیا اور کہا لیجئے اب اپنے آدمی سے جڑوا دیجئے۔ تو ایک ایسے انسان بھی ہوتے ہیں۔ مگر دوسری طرف بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی حس بہت تیز ہوتی ہے اور وہ معمولی سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک واقعہ مجھے یاد آگیا ہے۔ ہم چھوٹے تھے ایک دن مرغی ذبح کرنی تھی۔ اور ڈیوڑھی پر اس وقت کوئی آدمی نہ تھا کوئی مہمان آئے ہوئے تھے اور جلدی تھی۔ آپ نے فرمایا۔ لاؤ میں ذبح کرتا ہوں۔ مرغی کو لٹا کر آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور چھری پھیر دی۔ مگر جب اس خیال سے کہ اب ذبح ہو چکی ہوگی اسے چھوڑا تو مرغی اٹھ کر بھاگ گئی اور آپ کی انگلی سے خون بہہ رہا تھا۔ تو ایک حس یہ ہے کہ مرغی کو ذبح کرتے وقت بھی ایک رعب دل پر پڑ جاتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ایک جان خواہ جائز ہی سہی لے رہے ہیں۔ ایسے احساس والا اگر کوئی جسمانی قربانی کرتا ہے تو اس کی قیمت اس شخص کی قربانی سے جو خود پاؤں کے نیچے دبا کر اپنی ہڈی توڑ سکتا ہے بہت زیادہ قیمت ہوگی اور دونوں میں یقیناً بہت بڑا فرق ہوگا۔ تو قربانی کی قیمت احساس کے مطابق ہوتی ہے۔ اسی بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگ خیال کر لیتے ہیں کہ بعض کی قربانی کم ہے اور بعض کی زیادہ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بھی بعض صحابہ کو یہ شک ہوا کہ آپؐ حضرت ابو بکرؓ کا لحاظ زیادہ کرتے ہیں۔ حالانکہ قربانی کے لحاظ سے ہم بھی آپ سے کم نہیں ہیں۔ گو یہ بات بھی غلط تھی مگر جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ ظاہری نمازوں پر نہ جاؤ۔ ابو بکر کی قیمت اس کی ظاہری نمازوں اور رکعتوں کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے دل کی حالت پر ہے۔ دلی احساس سے ایک شخص ایک دفعہ سبحان اللہ کہتا ہے مگر دوسرا ۲۵ مرتبہ کہتا ہے مگر محض زبان سے اس کے دل میں اس کا کوئی احساس بھی نہیں ہوتا تو گو بظاہر اس نے زیادہ عبادت کی مگر اللہ تعالیٰ

کے ہاں دل سے ایک بار کہنے والے کا درجہ زیادہ ہوگا۔ بعض لوگوں کے دل کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ وہ ایک بار کہتا ہے مگر جیسے بتاشہ توڑ دیا جاتا ہے اسی طرح اس کے دل کی کیفیت ہو جاتی ہے اس کا ایک دفعہ کہنا دوسرے کے ہزار دفعہ کہنے سے بھی زیادہ ہے۔ میں علمی طور پر دوسروں کے متعلق اور اپنے تجربہ کی بناء پر اپنے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ بعض دفعہ دس بیس دفعہ کی تسبیح سے اتنا اثر نہیں ہوتا اور بعض دفعہ ایک بار سے ہی بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ تو یہ دل کی کیفیات ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق مجھے یاد ہے کہ مولوی عبدالکریم صاحب کی وفات کے بعد آپ نے مسجد میں بیٹھنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ مجلس دینی اور روحانی لحاظ سے بہت مفید ہوتی تھی۔ اس لئے کسی نے عرض کیا کہ آپ بیٹھتے کیوں نہیں۔ تو آپ نے جواب دیا کہ جب میری نظر مولوی عبدالکریم صاحب کی جگہ پر پڑتی ہے تو دل گھٹنے لگتا ہے۔ مگر کئی ایسے ہوں گے جن پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا ہوگا۔ اب اگر کوئی کہے کہ دیکھیں میں کتنا صابر ہوں کہ اسی جگہ روز بیٹھتا ہوں اور حضرت مسیح موعودؑ صابر نہیں ہیں کیونکہ آپ نہیں بیٹھتے تو یہ اس کی غلطی ہے۔ ہم اسے سنگدل کہہ سکتے ہیں صابر نہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نواسہ بہت سخت بیمار تھا اور آپ خود بھی بیمار تھے اسے دیکھنے کے لئے گئے تو نزع کی حالت تھی۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے ایک صحابی پاس کھڑے تھے۔ کہنے لگے یا رسول اللہ! آپ بھی روتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ اللہ تعالےٰ نے تمہاری طرح مجھے سنگدل نہیں بنایا۔[۱۸] وہ صحابی بھی نیک تھے مگر ان کے دل میں ابھی سختی تھی اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ زیادہ صابر تھے بلکہ یہ ہیں کہ ان کے دل میں اتنی خشیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ پس قربانیوں کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ثواب کا درجہ احساس سے ہے۔ جُوں جُوں احساس کم ہوتا جائے گا۔ اتنا ہی قربانی زیادہ کرنے کی ضرورت پیدا ہوتی جائے گی۔ اس لئے مومن کو ہمیشہ قربانیوں میں ترقی کرنی چاہیئے۔ اور دوسرے کے درد کو محسوس کرنا چاہیئے۔ ایک شخص کسی مصیبت زدہ کو دیکھتا ہے مگر درد محسوس نہیں کرتا تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کے احساسات سخت ہیں۔

جنوری کے مہینہ میں بہار میں زلزلہ آیا ہے[۱۹]۔ اس نے لاکھوں کو تباہ کر دیا ہے اور مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ہماری جماعت نے اپنے مقام کے لحاظ سے ان مصیبت زدگان کے لئے وہ قربانی نہیں کی جو کرنی چاہیئے تھی۔ میں نے اس کے لئے تحریک کی[۲۰] مگر دو ہزار سے زیادہ چندہ نہ آیا حالانکہ جماعت لاکھوں کی ہے۔ اس زلزلہ سے جو تباہی آئی وہ بہت سخت ہے اور اس سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کا ایک زبردست نشان ظاہر ہوا ہے[۲۱]۔ ۲۰-۲۵ ہزار جانیں ضائع ہو چکی ہیں مگر میری تحریک کا بہت کم اثر ہوا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ حس بہت کم

لوگوں میں سے باقیوں نے یا تو توجہ نہیں کی یا کی ہے تو بہت قلیل۔ حالانکہ قربانی وہی ہے جو نفس کو دکھ میں ڈالتی ہے اور اس کے متعلق ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ وہ عادت سے آگے بڑھ کر کی جائے اور جب قربانی کرتے ہوئے کوئی احساس ہی نہ ہو تو انسان سمجھ لے کہ اس کا قدم تنزّل کی طرف جارہا ہے۔ پس اس عید سے جو قربانی کی عید ہے۔ ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ قربانی کی قیمت احساس کے مطابق ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے احساسات بہت زیادہ تھے اس لئے اگرچہ بظاہر ان کی قربانی بہت کم نظر آتی ہے۔ مگر خدا کے ہاں وہ بہت زیادہ ہے جس کا دل پہلے ہی انگاروں پر لوٹ رہا ہو اس کا اپنے بچہ کو ذبح کر دینا کوئی معمولی قربانی نہیں۔ پس خوب یاد رکھو کہ ترقی کا گر یہی ہے کہ جب قربانی کی حِس کم ہو جائے تو اسے بڑھایا جائے۔ اور کوئی ایسی قربانی نہیں جسے کرتے کرتے انسان کو عادت نہ ہو جائے۔ اس لئے مومن کو ہر قدم سے آگے بڑھنا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ اس کی راہ میں سچی قربانیاں کر سکیں اور ایسے رنگ میں کریں کہ ابراہیمی فضل کو جذب کرنے والے بن جائیں۔

خطبہ ثانیہ میں فرمایا۔

عید الفطر کے موقعہ پر مَیں نے تحریک کی تھی کہ عید اضحیٰ کے موقعہ پر احباب اپنی قربانیوں میں سے گوشت کا ایک حصہ مشترکہ انتظام میں غرباء کو تقسیم کرنے کے لئے دے دیں تا وہ گوشت چند احباب کے گھروں میں ہی چکر نہ کھاتا رہے اور غرباء و مستحقین کو بھی میسر آسکے۔ مجھے امید ہے کہ دوست اس پر عمل کریں گے۔ کوشش کی جائے کہ سب قربانیاں آج ہی ہو جائیں۔ اور اپنے کھانے اور اعزّہ کو تقسیم کرنے کے لئے جتنا ضروری ہو، اتنا گوشت رکھ کر باقی مشترکہ انتظام میں دے دیا جائے[۵۲] مثلاً ہمارے ہاں نو قربانیاں ہوں گی۔ اور مَیں نے کہہ دیا ہے کہ ان میں سے تین اپنے کھانے اور رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کے لئے رکھ کر باقی سب اسی انتظام میں دیدی جائیں۔ میرے رشتہ دار خدا کے فضل سے زیادہ ہیں۔ پانچ تو سسرال ہی ہیں۔ پھر ان کے بھی کئی کئی رشتہ دار ہیں۔ لیکن جن کے رشتہ دار کم ہوں وہ زیادہ دے سکتے ہیں اور اس طرح مواخاتِ سلسلہ کو کم سے کم عید کے روز ہی عمدہ طریق پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

(الفضل ۲؍ اپریل ۱۹۳۴ء صفحہ ۷ تا ۹)

---

۵۱ ۔ روحانی خزائن (خطبہ الہامیہ) جلد ۱۶ صفحہ ۳۳

۵۲ ۔ مجمع بحار الانوار جلد ۱ صفحہ ۱۳۱ ۔ خیر المجالس مرتبہ حمید شاعر القلندر ۱۸۶ ناشر دائرہ ادبیہ جونا مارکیٹ کراچی ۲

۵۳ ۔ النساء ۴ : ۵۷

۵۴ ۔ حکیم مولوی غلام محمد صاحب (وفات ۲۲ فروری ۱۹۲۶ء)

۵۵ ۔ خان عبدالاحد خان صاحب افغان درویش قادیان (وفات ۳ اگست ۱۹۶۰ء) افغانستان سے اوائل عمر میں ہجرت کرکے قادیان آ گئے۔ خلافت اولیٰ میں احمدی ہوئے اور پھر عرصہ دراز تک نہایت اخلاص سے حفاظتی خدمات انجام دیتے رہے۔

۵۶ ۔ صحیح بخاری کتاب الرقاق باب التواضع

۵۷ ۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۳ تا ۱۰۸ ۔ ابراہیم ۱۴ : ۳۸

۵۸ ۔ "ویدوں کی قربانیاں اور چڑھاوے" ص۸ مطبوعہ لدھیانہ مشن پریس ۱۹۰۳ء ۔ انسائیکلوپیڈیا ریلیجس اینڈ ایتھکس ۳۵/۱۲ ، ۶۱۱/۱۲

۵۹ ۔ انسائیکلوپیڈیا ریلیجس اینڈ ایتھکس ۳۵/۱۲

۶۰ ۔ التوبۃ ۹ : ۱۱۴

۶۱ ۔ حضرت مولانا سید محمد سرور شاہ صاحبؓ (وفات ۳ جون ۱۹۴۷ء) حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے قدیم خدام اور اصحاب میں سے تھے۔ علم و فضل، زہد و اتقاء اور صدق و وفا میں بے نظیر وجود تھے وقتاً فوقتاً کئی اہم انتظامی فرائض کے علاوہ مفتی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے بلند مقام پر فائز رہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں "اصحاب احمد" مؤلفہ ملک صلاح الدین صاحب ایم۔اے۔ جلد ۵ حصہ اول تا سوم)

۶۲ ۔

۶۳ ۔ سیرۃ المہدی حصہ دوم ص۷۴ مطبوعہ دسمبر ۱۹۲۷ء

۶۴ ۔ نزہۃ المجالس مصنفہ شیخ عبدالرحمٰن الصفوری جلد ۲ ص۱۵۳

۶۵ ۔ حضرت مولانا عبدالکریم صاحبؓ سیالکوٹی (۱۸۵۸ء-۱۹۰۵ء) حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے قدیم خدام اور اصحاب میں سے تھے۔ آپ کی وفات پر مسیح پاک علیہ السلام نے لکھا: "وہ دینِ اسلام کا حامی تھا اور جس کا خدا نے لیڈر نام رکھا تھا۔ وہ خدائی اسرار کا عارف تھا اور دینِ متین کا خزانہ"۔

۶۶ ۔ رسالہ "جامعہ احمدیہ" سالنامہ ۱۹۳۰ء ص۳ بحوالہ تاریخ احمدیت جلد ۳ ص۲۱۵

۶۷ ۔ صحیح بخاری کتاب المرضیٰ باب عیادۃ المریض

۶۸ ۔ یہ ہیبت ناک زلزلہ ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کو شمالی بہار اور اس کے گرد و نواح میں آیا۔ جس سے ہزاروں جانوں کا خاتمہ ہوگیا۔ اور لاکھوں افراد بے خانماں و برباد ہوگئے۔

۶۹ ۔ سیدنا حضرت المصلح الموعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے خطبہ جمعہ ۲/۲/۳۴ مندرجہ الفضل ۸/۲/۳۴ میں زلزلہ سے متاثر ہونے والوں کی امداد کے لئے چندہ کی اپیل کی۔

۳۰ے - اس زلزلہ کے بپا ہونے سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کا وہ نشان ظاہر ہوا۔ جو آپ نے حقیقۃ الوحی صـ۲۵۶ؔ پر الہاماً درج فرمایا ہے۔

۲۱ے - حضرت کے ارشاد کی تعمیل میں ایک خاص انتظام کے ماتحت قربانی کے گوشت کا ایک حصہ ہر محلہ میں ایک جگہ جمع کیا گیا۔ اور یہ ان لوگوں کے گھروں میں افراد کے لحاظ سے پہنچایا گیا۔ جو قربانی نہ دے سکے۔ اور اس طرح قادیان میں کوئی ایسا گھر نہ رہا۔ جہاں قربانی کا گوشت نہ پہنچا ہو۔ (الفضل، ۲ر مارچ ۱۹۳۲ء)

(۲۳)

(فرمودہ ۱۶؍ مارچ ۱۹۳۵ء بمقام عیدگاہ قادیان)

یہ عید تو اپنے نام سے ہی اپنے مفہوم کو واضح کردیتی ہے اور اپنی تشریح و تفسیر کے لئے کسی اور بیان کی محتاج نہیں۔ ہمارے ملک کے لوگوں نے بھی اردو میں اس کا نام عید قربانی رکھ کر اس کے مفہوم کو واضح کردیا ہے اور درواقعہ میں یہ عید ایک ایسی قربانی پر دلالت کرتی ہے جس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

قربانی کی قیمت کو سمجھنے کے لئے یہ بڑا ضروری ہوتا ہے کہ معلوم کیا جائے قربانی کرنیوالے کا علم اور فہم کس مقام کا ہے۔ مثلاً ایک جاہل اور بیوقوف انسان جو اپنی قربانی کی حقیقت کو نہیں سمجھتا۔ اپنے بچہ کو شاہ دولہ[۱] کے نام پر وقف کردیتا ہے اور وہ بچہ ساری عمر کے لئے پاگل ہوجاتا ہے۔ بظاہر یہ اولاد کی قربانی ہے۔ مگر اس کی کوئی قیمت نہیں کیونکہ وہ شخص خود شاہ دولہ کے چوہوں جیسا دماغ رکھتا ہے۔ اگر اس کے دماغ میں عقل اور سمجھ ہوتی تو وہ ایسی حرکت کبھی نہ کرتا جس سے اُس کا بچہ ہمیشہ کے لئے علم اور عرفان سے محروم ہوجاتا۔ صرف سر چھوٹا ہونے سے عقل چھوٹی نہیں ہوتی اور نہ ہی بڑا سر لازماً زیادہ عقلمندی پر دلالت کرتا ہے۔ بعض بڑے سروالے بیوقوف ہوتے ہیں۔ اور بعض چھوٹے سروالوں کی عقلیں بہت تیز ہوتی ہیں۔ افریقہ کے جنگلوں میں رہنے والا ایک قبیلہ ہاٹن ٹاٹ[۲] (HOTTENTOT) ہے ان لوگوں کے سر بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ دماغ کی بناوٹ کے بعض ماہرین نے شروع شروع میں اس امر پر تعجب کا اظہار کیا کہ ان میں عقل کیوں کم ہے لیکن آخر یہ نتیجہ نکالا کہ ان کے دماغ کی ہڈیاں موٹی ہیں اور مغز چھوٹا ہے۔

مجھے اپنے بچپن کی بات یاد ہے کہ ہماری والدہ صاحبہ کبھی ناراض ہوکر فرمایا کرتیں کہ اس کا سر بہت چھوٹا ہے تو مجھے یاد ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرمایا کرتے تھے یہ کوئی بات نہیں راٹیگن[۳] جو بہت مشہور وکیل تھا اور جس کی قابلیت کی دھوم سارے ملک میں تھی اس کا سر بھی بہت چھوٹا سا تھا۔ تو جو والدین اپنی اولاد کو شاہ دولہ کا چوہا بناتے ہیں ان کے بڑے سر اس بات پر دلالت نہیں کرتے کہ وہ بہت عقلمند ہیں۔ جو شخص اپنی اولاد کو علم اور عرفان سے محروم کرتا ہے اس کا سر اگرچہ بڑا ہی ہو تب بھی وہ بے عقل ہی ہے جس شخص کا اتنا دماغ ہی نہیں کہ سمجھ سکے۔ خدا اور رسُول کیا ہے۔ قرآن کیا ہے۔ وہ عرفان کیا حاصل کرسکتا ہے۔ اور جو

۳؎ (RATTIGAN)

باپ اپنی اولاد کو اس عرفان سے محروم رکھتا ہے اس کا دماغ یقیناً شاہ دولہ کے چوہوں سے بھی چھوٹا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی قربانی کی کیا قیمت ہو سکتی ہے کوئی شخص اگر کہے کہ اس نے اولاد کی قربانی کی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اولاد کی قربانی کی تھی تو ہم کہیں گے کہ یہ وہی بات ہے کہ کسی شخص نے کسی ماہر طبیب سے پوچھا تھا کہ آپ بھی علاج کرتے ہیں اور عطائی فقیر بھی۔ کچھ مریض آپ کے اچھے ہوجاتے ہیں اور کچھ مرجاتے ہیں اور کچھ ان کے اچھے ہوجاتے ہیں اور کچھ مرجاتے ہیں۔ پھر دونوں میں فرق کیا ہے؟ اس طبیب نے جواب دیا کہ میرے ہاتھ سے جو مرتا ہے وہ بھی علم کے ماتحت مرتا ہے اور ان کے ہاتھ سے جو بچ جاتا ہے وہ بھی جہالت سے بچ جاتا ہے۔ نادان طبیب سے جو شخص شفا پا لیتا ہے، وہ علم سے نہیں بلکہ اتفاق سے پاتا ہے اور ماہر طبیب کے علاج کے بعد جو مرتا ہے وہ اس لئے مرتا ہے کہ سب علاجوں کے بعد بھی اللہ تعالےٰ نے موت کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ پس قربانی وہی قابلِ قبول ہو سکتی ہے جو سمجھ کر کی جائے۔ ایک انسان چلا جا رہا ہے کسی اور چیز پر کوئی فائر کر رہا تھا اور یہ اتفاقاً سامنے آجاتا اور اس طرح مرجاتا ہے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس نے قربانی کی ہے قربانی وہی ہے جو علم اور سمجھ کے ماتحت کی جائے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی ایسی ہی تھی۔ آپ نے جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو بیت اللہ کے پاس چھوڑا تو آپ جانتے تھے کہ یہاں کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ بچہ مرےگا نہیں بلکہ اس کی اولاد ہوگی۔ آپ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ بستی ہزاروں سال تک دوسری دنیا کی محتاج رہے گی اور اس میں کوئی چیز پیدا نہ ہوگی۔ یہ نہیں کہ آپ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو وہاں رکھ دیا اور سمجھ لیا کہ یہ مرجائے گا۔ یہ نہیں کہ آپ اپنی ذمہ داری کو نہیں سمجھتے تھے آپ نے اس وقت جو دعا کی۔ وہ واضح کرتی ہے کہ آپ جانتے تھے کہ آپ کس غرض سے انہیں وہاں چھوڑ رہے ہیں اور یہ کہ ان کی اور ان کی اولاد کی آئندہ زندگی کیسے دکھوں اور تکلیفوں میں گذرے گی۔ وہ وقتی جوش کے ماتحت یہ کام نہ کر رہے تھے اور نہ ہی اسے کوئی خیالی بات سمجھتے تھے۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس کے تمام تعلقات پر انہوں نے اچھی طرح غور کر لیا تھا۔ آپ خوب سمجھتے تھے کہ اس کے اغراض کیا ہیں اور یہ کہ یہ خدا کے حکم کے ماتحت کیجارہی ہے اور اسی لئے آپ کی قربانی بہت ممتاز ہے۔ ورنہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاہ دولہ کے لئے بچہ کو وقف کرنے والے نے بھی بچہ کی قربانی کردی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی کردی حالانکہ دونوں میں عظیم الشان فرق ہے۔ شاہ دولہ کے چوہے کے باپ نے اپنی اولاد کے احساسات کو مار دیا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں بلند کر دیا۔ اور حقیقی قربانی یہی ہے کہ انسان یہ سمجھکر قربانی کرے کہ اس قربانی کے اثرات کیا نکلیں گے اور کتنے لمبے عرصہ تک رہیں گے۔ بعض لوگوں میں جس

نہیں ہوتی ۔کئی مریضوں کے متعلق سنا ہے کہ وہ کہتے ہیں کلوروفارم (CHLOROFORM) کی ضرورت نہیں یونہی اپریشن کر دیا جائے ۔ ڈاکٹر بازو یا ٹانگ کاٹ رہا ہے اور وہ آرام سے بیٹھے ہیں ۔ ڈاکٹر کا دل گھٹتا ہے مگر وہ کہتے ہیں کوئی حرج نہیں کاٹو ۔ ایک شخص کے متعلق مجھے بتایا گیا ہے ۔ اب تو ان کی اولاد احمدی ہے کشمیر کے قریب ان کی ایک ریاست تھی جسے راجہ کشمیر نے فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیا تھا ۔ وہ بہت خوبصورت جوان تھے ایک دفعہ ان کا بازو ٹوٹ گیا ۔ اس زمانہ میں کوئی اچھے ڈاکٹر نہ ہوتے تھے ۔ کسی جوڑنے والے نے علاج کیا ۔ ہڈی جڑ تو گئی مگر ذرا ٹیڑھی رہی ۔ جوڑ سیدھا نہ بیٹھا ۔ ایک دن وہ مہاراجہ گلاب سنگھ یا رنبیر سنگھ کے دربار میں بیٹھے تھے کہ مہاراجہ نے کہا ۔ آپ نے ہمیں کیوں نہ بتایا ہمارا ہڈی جوڑنے والا ملازم جوڑتا تو ٹیڑھی نہ ہوتی ۔ اب دیکھو کیسی بدنما معلوم ہوتی ہے ۔ انہوں نے بازو کو گھٹنے کے ساتھ دبایا اور پھر ہڈی توڑ کر کہا کہ مہاراج اب اپنے جراحوں سے جڑوا دیجئے ۔ راجہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ عجیب آدمی ہے اور اسے ایسی گھبراہٹ ہوئی کہ دربار چھوڑ کر چلا گیا ۔ تو بعض لوگوں کے احساسات باطل ہوتے ہیں اور بعض کے زندہ اور اس لحاظ سے دونوں کی قربانی میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے ۔ اور قربانی کی قیمت ان تمام باتوں کے ساتھ ہوتی ہے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ وہ بڑا درمند اور رقیق القلب تھا ۔ اس لئے اس کے مقابلہ میں کسی سنگدل انسان کی قربانی کی کیا قیمت ہو سکتی ہے جب کوئی مرتا ہے تو اس کے بیسیوں رشتہ دار موجود ہوتے ہیں مگر لوگ افسوس کے لئے اس کے ماں باپ کے پاس ہی جاتے ہیں ۔ دوسرے رشتہ داروں کے پاس نہیں جاتے ۔ اس لئے کہ جذبات زیادہ تر تو ماں باپ میں ہی پیدا ہوتے ہیں ۔ اس لئے ان کا نقصان زیادہ سمجھا جاتا ہے ۔ تو قربانی کی قیمت جذبات ، علم ، فہم ، عقل اور ارادہ کے ماتحت ہوا کرتی ہے ارادہ نہ ہو تب بھی قربانی کی قیمت نہیں ہوتی ۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ کسی پر کوئی فائر کر رہا ہے اور عین اس وقت ایک شخص سامنے آجاتا اور مر جاتا ہے ، تو یہ اس کی قربانی نہیں کہلا سکتی ۔ قربانی یہ ہے کہ کوئی ارادہ کے ساتھ دوسرے کے آگے ہو جائے ۔ یہ عید کی قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسے وقت اور ایسے حالات میں کی ہے کہ انسان کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ بہترین اور اعلیٰ درجہ کی قربانی تھی اور اللہ تعالیٰ کے فعل نے اس کی قیمت بتا دی کہ ہمیشہ کے لئے اس دن قربانی مقرر کر دی ۔ بظاہر یہ عجیب بات ہے کہ ایک موت ہے جس کے لئے ہم عید مناتے ہیں ۔ یہ عید علامت ہے اس بات کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بچے کو قربان کر دیا ۔ لوگ پیدائش کی خوشیاں مناتے ہیں مگر ہمارا خدا ہمیں کہتا ہے کہ جاؤ موت کی خوشیاں مناؤ کیونکہ ابراہیم نے بیٹے کو قربان کر دیا ۔

اس میں یہ سبق ہے کہ خدا کی راہ میں قربانی ہی حقیقی عزت ہوا کرتی ہے۔ اور حقیقی عزت میں قربانی ہوتی ہے۔ خدا تعالےٰ کے لئے قربانی کرنیوالا کبھی ناکام نہیں رہ سکتا اور جسے خدا تعالےٰ عزت دے اس کا مطلب یہ ہے کہ اب قربان ہو جاؤ۔

قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ بعض مسلمان جو منافق اور کمزور مسلمان تھے یہ احسان جتاتے تھے کہ ہم نے اسلام قبول کیا۔ لیکن اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ یہ ہمارا ان پر احسان ہے۔ کہ انہیں اسلام لانے کی توفیق دی۔ اور اس احسان کے بدلہ میں اللہ تعالےٰ کیا چاہتا ہے؟ یہی کہ جاؤ اور جاکر مرجاؤ۔ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ جاؤ اور اللہ تعالےٰ کے رستہ میں جانیں دیدو۔ یہ احسان کا بدلہ ہے۔ اسلام نے انعام کا نتیجہ قربانی رکھا ہے۔ جب تک قربانی نہیں انعام نہیں مل سکتا۔ اور جب انعام ملے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ قربانی کرو۔ پس خدا تعالےٰ سے کوئی شخص انعام نہیں پاسکتا جب تک کہ وہ قربانی نہ کرے۔ اور ہر انعام کے بعد اسلام امید کرتا ہے کہ پھر قربانی کی جائے۔ یہ ایک چکر ہے جو اسی طرح چلتا جاتا ہے۔ سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ یعنی سب کام رحمانیت اور رحیمیت سے شروع ہوتے ہیں۔ اور پھر اللہ تعالےٰ رحمانیت اور رحیمیت کا دور لاتا ہے۔ اسی طرح ہر انعام قربانی کا تقاضا کرتا ہے۔ اور ہر قربانی کا نتیجہ انعام ہے مشہور ہے کہ ایک بڑے بزرگ شبلی گذرے ہیں۔ وہ اپنے زمانہ کے اسلامی بادشاہ کی طرف سے کسی علاقہ کے گورنر تھے۔ اور ایسے ظالم اور جابر گورنر تھے کہ ان کے متعلق یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ انہیں بھی کبھی ہدایت ہوگی وہ ایک دفعہ بادشاہ کے دربار میں حاضر تھے کہ کوئی جرنیل بہت بڑی فتح کے بعد حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اسے خلعت دیا۔ جو اُسے پہنایا گیا۔ اور سب نے اسے مبارکباد دی کہ بڑی عزت افزائی ہوئی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس جرنیل کو نزلہ کی شکایت تھی۔ درباریوں میں رواج ہوتا ہے کہ وہ رومال ساتھ رکھتے ہیں مگر وہ جلدی میں یا خوشی میں گھر سے رومال لانا بھول گیا تھا۔ چھینک آئی تو ناک سے رطوبت نکلی وہ بہت گھبرایا کہ اب کیا کروں۔ اس نے ذرا نظر بچا کر اسی خلعت کے دامن سے پونچھ لیا۔ اتفاق سے بادشاہ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے حکم دیا کہ خلعت فوراً اتار لی جائے اور عہدے سے معزول کردیا جائے کہ اس نے ہماری ہتک کی ہے۔ جو خلعت اسے عزت کے لئے دیا گیا تھا اس سے ناک پونچھ لی ہے۔

شبلی بھی اس وقت کوئی رپورٹ دینے کے لئے بادشاہ کے دربار میں حاضر تھے یہ سُنکر ان کی چیخیں نکل گئیں اور گورنری کا پروانہ بادشاہ کے سامنے رکھ کر آپ نے کہا کہ میرا استعفیٰ

منظور کر لیا جائے۔ بادشاہ نے کہا کہ ناراض تو میں اس پر ہوا ہوں تم کیوں روتے اور استعفیٰ دے رہے ہو۔ شبلی نے کہا کہ اس پر آپ کی ناراضگی نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اس شخص نے اپنی جان کو قربان کر کے آپ کے لئے ملک فتح کیا۔ وہ ہر روز اپنی بیوی کو بیوگی، اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی جان کو ہلاکت کے خطرہ میں ڈالتا تھا۔ وہ ہر روز آپ کے لئے موت کے منہ میں جاتا اور اپنی جان کو موت کے لئے پیش کرتا تھا۔ مگر آپ نے اسے کپڑوں کا خلعت دیا جس کی بے حرمتی سے آپ اتنے ناراض ہوئے کہ اس کی سب خدمات کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن میرے رب نے مجھے کتنے خلعت دیئے ہیں۔ ناک، مونہہ، ہاتھ، پاؤں وغیرہ اور مَیں انہیں روز خراب کرتا ہوں۔ شبلی گورنری کے زمانہ میں اتنے ظالم اور جابر تھے۔ کہ اس کے بعد وہ جس بزرگ کے پاس بھی گئے کہ اس کے ہاتھ پر توبہ کریں اُس نے یہ کہکر واپس کر دیا کہ تمہاری توبہ نہیں قبول ہوسکتی۔ آخر وہ حضرت جنیدؒ کے پاس پہنچے جنہیں ابو الصوفیاء کہا جاتا ہے[۱۱] اور کہا کہ مَیں توبہ کرنا چاہتا ہوں مگر سب کہتے ہیں کہ میری توبہ قبول نہیں ہوسکتی۔ حضرت جنید نے فرمایا کہ جھوٹ کہتے ہیں۔ خدا سب کی توبہ قبول کرتا ہے مگر ایک شرط تمہارے واسطے یہ ہے کہ اپنے دارالحکومت میں جاؤ اور ہر دروازہ پر دستک دیکر مکینوں سے معافی مانگو۔ چنانچہ جہاں ایک عرصہ تک گورنری کرتے رہے تھے وہاں گئے اور ہر گھر سے معافی لی[۱۲] پھر آ کر بیعت کی اور ایسی سچی توبہ کی کہ آج وہ بھی جنید کی طرح ہی مشہور ہیں بلکہ عوام میں شبلی زیادہ مشہور ہیں۔ یہ وہی شبلی ہیں کہ منصورؒ کو جب دار پر چڑھایا گیا اور لوگ پتھر مارنے لگے تو انہوں نے بھی ایک پھول اٹھا کر مارا۔ آپ کا مطلب غالباً یہ تھا کہ خدا کی راہ میں پڑنے والے پتھر دراصل پھول ہوتے ہیں مگر منصور نے اس بات کو نہ سمجھا اور خیال کیا کہ شبلی نے بھی لوگوں کو دیکھکر پتھر کے بجائے مجھے پھول مار دیا تا لوگ سمجھیں کہ یہ بھی مار رہا ہے۔ اس پر منصور رو پڑے اور کہا کہ عوام کے پتھر مجھے نہیں لگتے مگر شبلی کا پھول بہت سخت لگا ہے[۱۳]۔ تو مَیں کہہ رہا تھا کہ ہر انعام کے لئے قربانی ضروری ہے بادشاہ نے اس جرنیل کو انعام دیا تھا اور اس سے یہ قربانی چاہی تھی کہ اس کی عزت کرے اور اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر اسے بچائے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک دفعہ ایک تلوار نکالی اور فرمایا یہ مَیں اس شخص کو دُونگا جو اس کا حق ادا کرے۔ ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے دیجئے۔ چنانچہ اسے دی گئی اور وہ جب شہید ہوا تو صحابہ کا بیان ہے کہ اس کے جسم کے ستر ٹکڑے تھے۔ اور وہ دشمنوں کے لئے ایک آفت بنا رہا تھا جہاں بھی کوئی خطرہ پیدا ہوا وہ فوراً پہنچا۔ ایک بازو کٹ گیا تو دوسرے میں تلوار پکڑ کر چلاتا رہا وہ کٹ گیا تو منہ میں لیکر چلاتا رہا[۱۴]۔ پس اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو انعام آتے ہیں وہ ہمیشہ قربانی کا تقاضا کرتے ہیں وہ

انعام دنیوی حکومتوں کی طرف سے نہیں ہوتے کہ کسی کونفشن پر بھیجنے لگے تو کپتان بنا دیا۔ اس کپتان کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ جاؤ اور لڑو۔ بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ جاؤ آرام سے گھر میں بیٹھو لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انعام آتے ہیں وہ جسم، روح، دل، دماغ غرضیکہ ہر چیز کی قربانی چاہتے ہیں اور جب تک انسان سب کچھ اس کے سامنے نہیں ڈال دیتا۔ اور اپنے آپ کو معدوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا اس وقت تک اللہ تعالیٰ یہ نہیں سمجھتا کہ اس نے انعام کا بدلہ دیدیا ہے۔

مجھے اس مضمون کی طرف ایک رؤیا سے بھی تحریک ہوئی ہے۔ جو چند روز ہوئے میں نے دیکھا تھا میں نے دیکھا کہ کوئی شخص باہر سے آیا ہے اور اس کی بیوی اور ملازم بھی ساتھ ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی آسودہ حال آدمی ہے۔ بعض مسائل پوچھتا اور اس کے بعد اطمینان حاصل کر کے سلسلہ میں داخل ہونا چاہتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ کچھ باتیں مجھ سے یا سلسلہ کے علماء کے ساتھ کر چکا ہے میں نے اسے بڑے کمرے میں جہاں میں ملاقاتیں کرتا ہوں بٹھایا اور جیسا کہ میرا قاعدہ ہے کہ سوائے اس وقت کے کہ ملنے والے پتلون وغیرہ پہنے ہوں فرش پر ہی بیٹھتا ہوں اس وقت بھی فرش پر ہی بیٹھا ہوں۔ ان کے دو ملازم آئے اور کوچ پر بیٹھ گئے ہیں اس کے بعد ان کی بیوی بھی آگئی جو مصری یا شامی آزاد تعلیم یافتہ عورتوں کی طرح سیاہ رنگ کا برقعہ اوڑھے ہے جس میں منہ ناک آنکھیں ننگی ہیں، سر بال اور گردن وغیرہ ڈھکی ہوئی ہے۔ پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرد پورے طور پر سمجھ چکا ہے اور عورت سمجھنا چاہتی ہے وہ آدمی کہتا ہے کہ میری بیوی بھی سوال کرنا چاہتی ہے۔ اور اس کی خواہش ہے کہ اُسے روحانی ترقی کے گُر بتائے جائیں۔ تصوّف کی طرف اس کا میلان معلوم ہوتا ہے۔ اور صوفیاء کا جیسا قاعدہ ہے کہ وہ بعض اصطلاحات بولتے ہیں۔ مثلاً مومن کو پرندہ کہتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت نے بھی کوئی ایسی اصطلاحیں بنائی ہیں۔ اس کا خاوند میرے کان میں کہتا ہے کہ اس کی خواہش ہے میں روحانی پٹواری بن جاؤں۔ چونکہ میں سمجھ گیا ہوں کہ اس کا میلان تصوّف کی طرف ہے اس لئے اس لفظ کے سننے سے مجھے تعجب نہیں ہوتا اور میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح پٹواری زمینوں کی پیمائش کرتا ہے، لوگوں کے حقوق کی نگرانی کرتا ہے، مالیہ مقرر کرتا ہے اسی طرح اس کی خواہش ہے کہ میں ایسے مقام پر پہنچ جاؤں کہ دوسروں کی نگران ہو جاؤں اور میں یہی مفہوم سمجھتا ہوں۔ عورت چونکہ کچھ فاصلہ پر ہے وہ بھی ذرا اونچی آواز سے کہتی ہے کہ میں چاہتی ہوں۔ میں پٹواری بن جاؤں اس پر اس کا خاوند جھک کر کہتا ہے کہ پیچھے جیون خاں بیٹھا ہے، یہ لفظ نہ بولو۔ گویا ان دو نوکروں میں سے ایک جو میری پشت کی طرف بیٹھا ہے جیون خاں ہے۔ دوسرا نوکر جیون خان کے پاس میرے پیچھے ذرا بائیں طرف کو بیٹھا ہے اس پر وہ آہستہ سے کہتی ہے کہ میں چاہتی ہوں کوئی روحانی مقام حاصل کروں اور پھر آہستہ سے پٹواری

کا لفظ بولتی ہے اور پھر وہ کہتی ہے کہ ذرا الگ میری بات سُن لیں۔ گویا وہ یہ نہیں چاہتی کہ اس کے ملازم سُن لیں اور مَیں ذرا پرے ہو کر اس کی بات سُنتا ہوں تو وہ کہتی ہے کہ عاشق کو انعام سے کیا تعلق ہے۔ اس کا کام تو قربانی کرنا ہے پھر اسے انعام سے کیا واسطہ۔ مَیں اسے کہتا ہوں کہ اپنی بات کو ذرا اور واضح کرو۔ اس پر وہ سُورۃ الرحمٰن کی کچھ آیات پڑھ کر کہتی ہے کہ مجھے ان پر کچھ شبہ پیدا ہوتا ہے مَیں سمجھتا ہوں کہ اسی لئے اس نے کہا تھا کہ الگ ہو کر بات سُن لیں کہ نا نوکر اسے بے دین نہ سمجھیں حالانکہ یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ سورۃ رحمٰن کی ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ذکر ہے۔ مَیں رؤیا میں سمجھتا ہوں کہ گو الفاظ عام ہیں مگر یہ انعامات سارے انسانوں کے لئے نہیں بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے لئے ہیں اور وہ پوچھتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تو عاشق تھے انہیں انعام سے کیا واسطہ ہے اس پر مَیں نے اسے ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھانا چاہا اور اس سے کہا کہ تم یہ بتاؤ کہ ایک بادشاہ ہے اس پر غنیم حملہ کرتا ہے وہ اپنے ایک وفادار جرنیل کو بُلاتا ہے اور کہتا ہے کہ مَیں تمہیں کمانڈر بنا کر اس غنیم کے مقابل پر بھیجتا ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ وہ کیا کہے کیا یہ کہے کہ نہیں حضور میں تو خادم اور عاشق ہوں مجھے انعام کی ضرورت نہیں یا یہ کہ بہت اچھا حضور۔ اس عورت نے جواب دیا کہ نہیں اسے چاہیئے اس عہدہ کو قبول کرلے۔ مَیں کہتا ہوں کہ بس یہی حال یہاں ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے جو انعام دینا ہے وہ حقیقت میں قربانی ہوتی ہے اس پر اس نے اپنی تسلّی کا اظہار کیا اور میری آنکھ کھُل گئی۔

یہ مضمون حقیقت پر مبنی ہے۔ دیکھو جنگ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد وہ لوگ کھڑے ہوتے تھے۔ جو سب سے زیادہ بہادر سمجھے جاتے تھے۔ کیونکہ آپ پر ہی دشمن کے تمام حملوں کا دور ہوتا تھا اور ظاہر ہے کہ آپ پر یہ حملے نبوت کی وجہ سے ہی ہوتے تھے۔ گویا نبوّت نے آپ کو بہت بڑی قربانی کے مقام پر کھڑا کر دیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے انعام آتے ہیں ان کے ساتھ قربانی کا تقاضا لازمی طور پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نبی سے فرماتا ہے کہ جاؤ ہم نے دنیا تیرے ماتحت کر دی۔ مگر پہلے وہ دنیا جو ماتحت کی جاتی ہے پتھر مارتی ہے، گند بکتی ہے، مقدمے چلاتی ہے، دُکھ دیتی ہے اور اس طرح نبوت جو دراصل انعام ہے۔ دنیوی نقطۂ نگاہ سے بَلا ہو جاتی ہے۔ کونسا نبی آیا ہے جسے گالیاں نہ دی گئیں تکالیف اور ایذائیں نہ پہنچائی گئیں۔ انبیاء کو تکالیف دینے والوں کا ذہن برائی کے متعلق اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ انسان خیال بھی نہیں کر سکتا کہ اتنی گندی گالیاں بھی دی جا سکتی ہیں جو گالیاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو دی گئیں اور آپ کو ایذا رسانی کی جو تدابیر اختیار کی گئیں کیا

کوئی بتا سکتا ہے کہ کسی بڑے سے بڑے چور اور ڈاکو کے متعلق اتنی گالیاں سوچی اور بکی گئی ہوں تو انبیاء کے دشمنوں کا دماغ گند کی ایجاد میں کمال کو پہنچ جاتا ہے اور اس طرح نبوت ایک رنگ میں انعام اور ایک رنگ میں ابتلاء ہو جاتی ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ساری عمر قربانی میں گزار دی۔ مگر جب بادشاہت کا وقت آیا تو حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ آگئے مگر ان کے زمانہ میں بھی خطرات ابھی باقی تھے اور انہوں نے کوئی ذاتی لذت بادشاہت سے نہیں اُٹھائی۔ ان کے بعد بنو امیہؓ اور بنو عباسؓ آگئے ان کے زمانہ میں ساری دنیا فتح ہوئی اور وہ امیر المؤمنین بن گئے۔ یہ سب انعام نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قربانیوں کے صلہ میں ملے۔ تو نبی اور خلفاء تو دُکھ ہی اٹھاتے ہیں مگر بعد میں آنیوالوں کو انعام ملتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو حالت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عرب میں چکی نہ ہوتی تھی اور پتھر پر کوٹ کر غلّہ کا آٹا بنا لیا جاتا جو بہت موٹا ہوتا تھا۔ بعد میں جب ایران فتح ہوا تو وہاں سے چکیاں آئیں۔ اور عرب میں بھی باریک آٹا ملنے لگا۔ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کے سامنے باریک آٹے کے نرم نرم پھلکے رکھے گئے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ آپ کی ایک سہیلی نے اس کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ ان پھلکوں کا ہر لقمہ میرے گلے میں پھنستا ہے۔ اس نے کہا یہ تو نرم ہیں۔ آپ نے کہا کہ میرے دل میں خیال آرہا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں یہ ہوتے تو آپؐ کو بھی کھلاتے۔ تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں یہ حالت تھی کہ کھانے کو موٹا آٹا ملتا تھا مگر آپ کے طفیل ہزاروں بادشاہ پیدا ہوئے۔

پس نبوت بے شک انعام ہے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری عمر قربانی ہی کرتے رہے۔ یہی حالت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ہم دیکھتے ہیں۔ آپ کی ساری عمر اسی طرح گذری کہ کہیں پتھر ہیں، کہیں گالیاں ہیں کہیں مقدمے دائر کئے جارہے ہیں۔ کہیں شورشیں بپا کی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ جس وقت آپ کی وفات ہوئی اس وقت بھی جبکہ ہمارے دل زخمی تھے اور دنیا ہماری آنکھوں میں تیرہ و تار تھی۔ ہزاروں لوگ مغلظ گالیاں بک رہے اور پتھر مار رہے تھے۔ حالانکہ کسی بڑے سے بڑے چور اور بدمعاش کی وفات پر بھی یہ سلوک کبھی نہیں ہوا ہوگا۔ ہمارے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہم نے اپنی حکومت بنا رکھی ہے لیکن کیا حکومت ایسی ہی ہوتی ہے؟ ان لوگوں میں سے کوئی ایسا شریف آدمی نہ تھا جو انہیں بتا سکتا کہ مرنے والے سے محبت کرنے والے لوگ اندر بیٹھے رو رہے ہیں۔ تم لوگ خدا تعالےٰ کا خوف کرو اور ان کے دل نہ دکھاؤ۔ پھر آپ کے بعد بھی یہی حال ہے۔ بے شک اللہ تعالےٰ نے

دنیا کو ہمارا غلام بنا دیا ہے مگر یہ بعد والے دیکھیں گے۔ وہ زمانہ آنے والا ہے جب وہ لوگ تختوں پر بیٹھے ہوں گے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا نام آتے ہی مؤدب کھڑے ہو جایا کریں گے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غلاموں کے آگے آجکل کے بڑے بڑے لوگوں کی اولادیں جوتیاں رکھنا باعثِ فخر سمجھیں گی۔ مگر ہم نے کیا لیا سوائے گالیوں اور پتھروں کے۔ ہماری زندگیاں اسی میں گذریں گی اور بادشاہتیں انہیں ملیں گی جو ان گالیوں کی لذت سے آشنا نہ ہوں گے ہمارے لئے مقدر بھی یہی ہے اور ہم چاہتے بھی یہی ہیں۔ ہاں اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہمیں خود بخود کچھ مل جائے تو اور بات ہے۔ مگر ہم چاہتے یہی ہیں کہ ہماری عمریں مخالفتیں اٹھانے اور گالیاں کھانے میں ہی گذریں۔ کیونکہ ان میں جو لذت اور سرور ہے وہ بادشاہتوں میں نہیں۔ یہی وہ انعام ہے جو انبیاء اور رسولوں کو ملا اور یہی ہم اپنے لئے چاہتے ہیں۔ یہی وہ عید ہے جو آج منائی جا رہی ہے۔ بقر عید نبیوں کے زمانہ کی عید ہوا کرتی ہے اور چھوٹی عید نبیوں کے بعد کے زمانہ کی۔ چھوٹی عید کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب بھوک کا زمانہ گذر گیا۔ لیکن اس عید کا مطلب یہ ہے کہ آؤ قربانی کریں۔ اس لئے یہ عید انبیاء اور ان کے خلفاء کے زمانہ کی عید ہے اور چھوٹی عید انبیاء کے بعد کے زمانہ کی ہوتی ہے۔ بڑی عید یہی ہے جو قربانیوں اور تکالیف کی ہے، وہ چھوٹی ہے جس میں بادشاہتیں اور حکومتیں ملتی ہیں۔ خدا کے انعام نام ہیں قربانی کا۔ ہمارے لئے تختِ حکومت سُولی کا تختہ ہے۔ وہی ہماری حکومت ہے اور وہ تمام تکالیف جو ہمیں دی جاتی ہیں انہیں میں ہمارے لئے فخر ہے۔ ہم اگر اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں تو اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے کرتے ہیں۔ اگر ہم مخالفوں سے کہتے ہیں کہ گالیاں مت دو تو اس لئے کہ ان کے اخلاق نہ بگڑ جائیں۔ اور اگر حکومت کو متوجہ کرتے ہیں تو اس لئے کہ حکومت خدا کی نظروں میں مغضوب ہو کر تباہ نہ ہو جائے ورنہ ہم تو لذت اسی میں محسوس کرتے ہیں اور مومن کی عید اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ جن لوگوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں جانیں دیں انہوں نے عید نہیں دیکھی۔ آج وہ سامنے نہیں ہیں ورنہ تم دیکھتے کہ ان کے چہروں پر ایسے آثار ہوتے تھے جو ظاہری عید منانے والوں کے چہروں پر ہو ہی نہیں سکتے۔ جو جان دے دیتا تھا وہ یہی سمجھتا تھا کہ میری عید آگئی۔ اسی لئے انہیں شہید کہا گیا ہے کہ وہ عید کا چاند دیکھتے ہوئے مرے۔ ہر مومن جو دین کے لئے فدا ہوتا ہے، وہ عید دیکھتا ہے یہی عید اضحیہ ہوتی ہے یہی انبیاء کے زمانہ کا نشان ہے، اور اسی کے لئے ہمیں پیدا کیا گیا ہے۔

پس آؤ ہم اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کریں اور اس کے نام کو بلند کریں کہ اس نے ہمیں

اس عید کی توفیق دی جو سب سے بڑی عید ہے اگر اللہ تعالیٰ کے فرشتے آسمان سے اترتے اور بادشاہوں کو تختوں سے اتار کر ہمیں ان کی جگہ بٹھا دیتے تو ان گالیوں کے مقابلہ میں ہمارے لئے وہ چیز بالکل حقیر ہوتی۔ جن شہداء نے افغانستان میں جانیں دیں ان کی عزت چین جاپان اور افغانستان وغیرہ کے بادشاہوں سے بہت زیادہ ہے۔ اور دنیا کی ہزاروں سال کی بادشاہتیں ان کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ آئندہ احمدی بادشاہ جو دنیا کو فتح کریں گے ان کی حیثیت ان شہداء کے مقابلہ میں وہی ہوگی جو پہلوان کے مقابلہ میں بچہ کی ہوتی ہے۔ یہ قربانیاں کرنے والے خدا تعالیٰ کے دائیں ہاتھ پر تخت پر بیٹھے ہوں گے اور بادشاہتیں کرنے والے مؤدب سامنے کھڑے ہوں گے۔

پس بڑے وہی ہیں جن کو بڑی قربانیاں کرنے کی توفیق ملی۔ چند روزہ زندگی کیا ہے؟ اصل زندگی وہی ہے جو آئندہ شروع ہوتی ہے اور وہی ہمیشہ کی زندگی ہوتی ہے اس لئے حقیقی عید وہی ہے جس میں سے ہم گذر رہے ہیں اور یہ عید محض کسی قربانی سے نہیں ملتی، اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتی ہے۔ نبیوں کا زمانہ پانا انسان کے اپنے اختیار میں نہیں اور لوگوں کے مانگنے سے نہیں مل سکتا۔ غور کرو اگر تم آج سے پچاس سال بعد پیدا ہوتے تو کس طرح یہ نعمت پا سکتے یا اگر ساٹھ سال پہلے مرجاتے تو ان نعمتوں سے محروم رہ جاتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہمیں اس زمانہ میں پیدا کیا اور پھر عید منانے کی توفیق دی۔ اس کے بدلہ میں وہ کہتا ہے کہ جاؤ دنیا میں پھیل جاؤ اور جدھر جاؤ اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد کہو۔ خدا کے نام کو بلند کرو، اس کی حمد کرو اور گم گشتہ راہ لوگوں کو اس کے حضور حاضر کرو تا وہ بھی اس نعمت سے حصہ پائیں۔ پس قدر کرو ان ابتلاؤں کی اور تکالیف کی جو تم پر آتی ہیں کیونکہ ہر ایک قربانی اور ابتلاء تمہارے درجہ کو بڑھاتا اور تمہیں خدا کے قریب کرتا ہے۔ یہ دکھ اور تکالیف تمہیں مایوس نہ کریں کیونکہ عید کے دن کوئی مایوس نہیں ہؤا کرتا۔ عید خوشی کا نام ہے جن لوگوں کو اپنی قوم سے محبت ہوتی ہے وہ کبھی قربانیوں پر رنج نہیں کیا کرتے۔ مَیں نے کسی جگہ پڑھا ہے کہ فرانس اور جرمنی کے جنگ کے ایام میں ایک جرمن بڑھیا کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس بڑھیا کی عمر اسّی برس کے قریب تھی۔ اس کا لڑکا مارا گیا اور وزیر جنگ نے حکم دیا کہ ایک بڑا افسر اس کو ملا کر یہ خبر سُنائے اور اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کرے۔ لکھا ہے کہ جب وہ بُڑھیا یہ خبر سُنکر دفتر جنگ سے باہر نکلی تو اس کی خمیدہ کمر غم کے مارے اور بھی ٹیڑھی ہوئی جاتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پھوٹ کر نکلنا چاہتے تھے مگر وہ جبر کرکے قہقہہ مارتی اور ہاتھ سے کمر کو سیدھا کرکے اونچی ہوتی تھی اور فخر سے کہتی تھی کہ کیا ہُوا

تیرا بچہ آخر ملک کے لئے ہی قربان ہوا ہے۔ غور کرو دنیا داروں کے لحاظ سے یہ کتنی بڑی قربانی ہے اس کی کمر ٹیڑھی تھی مگر وہ ہاتھ کا سہارا دیکر اسے سیدھا کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے مگر وہ مصنوعی قہقہہ لگاتی تھی۔ اور کیا تم خیال کرتے ہو کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا لایا ہوا پیغام اتنی بھی قیمت نہیں رکھتا اور اس کی اتنی بھی قدر نہیں جتنی اس بڑھیا کو جرمنی کی تھی۔ اگر واقعہ میں ہمارے جذبات اس عورت سے بھی کم ہیں تو ہم سے زیادہ ذلیل دنیا میں کوئی نہیں اور جتنی گالیاں ہمیں دی جارہی ہیں۔ ان سے ہزاروں گنا زیادہ کے ہم مستحق ہیں۔ اور اس قابل ہیں کہ کتوں سے پھڑوا دیئے جائیں اور درندے ہمیں کھا جائیں آسمان و زمین کا خدا اپنے سپاہیوں میں ہمیں بھرتی کرتا ہے اور مسیح موعودؑ کی جماعت میں جس کی تمام انبیاء خبر دیتے آئے ہیں ہمیں شامل ہونے کی توفیق عطا کرتا ہے مگر ہم کہتے ہیں کہ لڑائی میں زخم کیوں آئے۔ ہر شخص جو احمدی ہوا۔ اقرار کرتا ہے کہ وہ خدا کے لئے اپنی جان دینے کے لئے نکلتا ہے۔ اور اگر اس کے دل کے کسی گوشہ میں بھی کسی انسان کا ڈر ہے تو وہ دنیا کا ذلیل ترین انسان ہے اسے تو چاہیئے کہ ہر وقت سر ہتھیلی پر رکھ کر تیار رہے اور ہر قربانی جو اسے کرنی پڑے اس کے بعد مایوس نہ ہو بلکہ اس کے اندر نئی امنگ اور نیا جوش ہو کیونکہ ہماری تو عید ہی قربانی ہے۔ پس اے دوستو! لوگوں کے لئے تو سال میں ایک عید ہوتی ہے لیکن تمہارے لئے سال میں تین سو ساٹھ عیدیں ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی جماعت میں داخل ہو کر تمہارے لئے ہر روز عید ہے۔ پس خوش ہو جاؤ کہ اللہ تعالےٰ نے تمہیں قربانی کے لئے چُنا ہے اس لئے ان مصیبتوں تکلیفوں اذیتوں اور آفات کی قدر کرو کہ یہ رُتبہ بڑھانے والی چیزیں ہیں۔

خطبہ ثانیہ میں فرمایا:۔

مَیں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ ہمیں ان دنوں کی قدر کرنے کی سمجھ عطا فرمائے کیونکہ علم کے بغیر بھی کچھ نہیں ہوتا جو اس نکتہ کو نہیں سمجھ سکتے کہ جن مصیبتوں سے ہم گذر رہے ہیں یہ دراصل ہمارے لئے عید ہے۔ ان کے دماغ روشن کرے تا وہ سمجھ سکیں کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں عزّت کے کس مقام پر کھڑا کیا ہے۔ آج ہمیں جو قربانیاں کرنی پڑتی ہیں وہ دراصل انعام ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے جن قربانیوں کا مطالبہ ہو وہ انعام ہی ہوتی ہیں۔ جیسے کوئی شخص دیکھے کہ بیٹے کو ذبح کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بکرا ذبح کرے گا۔ اور جو دیکھے کہ بکرا ذبح کیا ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا بیٹا مر جائے گا۔ کاش دوست سمجھ لیں کہ ہر قربانی جو ہم سے کرائی جاتی ہے وہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے محبت اور پیار کا اظہار ہے۔

اس موقع پر مَیں پھر اعلان کرتا ہوں کہ سب دوست جو ان مشکلات کو دُور کرنا چاہتے ہیں اس لئے نہیں کہ ہم ان سے ڈرتے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ دین کی اشاعت میں روک پیدا کر رہی ہیں وہ آئندہ سات مفتوں تک ہر جمعرات کو روزہ رکھیں تا اللہ تعالےٰ ان مشکلات کے اس حصہ کو جو دین کی اشاعت کے رستہ میں روک ہے خواہ وہ افسروں کی طرف سے ہے یا رعایا کی طرف سے دُور کر دے جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے یہ دعا بکثرت پڑھنی چاہیئے۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ اے اللہ! جو ہم پر حملہ کرے تا سلسلہ کو نقصان پہنچائے خواہ افسروں میں سے ہو یا رعایا میں سے تُو اس کے مقابل پر ہماری طرف سے تلوار چلا اور ہمیں ان کے شرور سے محفوظ رکھ۔

یہ مت سمجھو کہ یہ کوئی معمولی سی دعا ہے اور تم بغیر ہتھیاروں کے ہو۔ یہ دعا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سکھائی ہے کہ جب کوئی قوم تم پر حملہ آور ہو تو یہ دعا کرو خدا اسے تباہ کر دے گا۔ اگر یہ دعا سچے دل سے کروگے تو اس کے ایسے اثرات دیکھوگے جو دنیا کے لئے عبرت کا موجب ہوں گے۔

پھر ایک اور دعا ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ نے سکھائی اور فرمایا کہ یہ اسمِ اعظم ہے جو دنیا کی شرارتوں سے محفوظ رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ رَبِّ کُلُّ شَیْءٍ خَادِمُكَ رَبِّ فَاحْفَظْنِیْ وَانْصُرْنِیْ وَارْحَمْنِیْ۔ اس کو بھی کثرت سے پڑھو اور اخلاص سے پڑھو کہ یہ بھی اس زمانہ کے آفات سے محفوظ رہنے کے لئے ہے۔ اگر یہ دعائیں پڑھتے رہوگے تو دشمن خواہ افسروں میں سے ہوں یا رعایا میں سے۔ خواہ چھوٹے ہوں خواہ بڑے یا تو ہدایت پا جائیں گے یا پھر اللہ تعالےٰ ان کو ایسی عبرت انگیز سزائیں دے گا کہ وہ محسوس کریں گے کہ ہم نے اس کے بندوں کو دُکھ دے کر اس کے غضب کو اپنے اوپر بھڑکا لیا ہے مَیں نے کبھی کسی کے لئے بد دعا نہیں کی اور نہ ہی اب کرنے کو تیار ہوں۔ مگر اب جو مشکلات دین کی اشاعت کے راستہ میں پیدا ہو رہی ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ضرور کہوں گا کہ خدا کرے یا تو یہ لوگ سمجھ جائیں اور اگر ان کے دلوں پر ازلی شقاوت کی مہر لگ چکی ہے تو اللہ تعالےٰ ان کے ہاتھوں کو پکڑے تا دنیا کو معلوم ہو جائے کہ خدا کے سلسلہ پر ہاتھ اٹھانا خود خدا پر ہاتھ اٹھانا ہے۔"

(الفضل ۱۴ر اپریل ۱۹۳۵ء صفحہ ۲ تا ۶)

۱۔ حضرت کبیر الدین شاہ دولہ دریائی گجراتی پنجابی (وفات ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۴ء) ان کے متعلق تذکرۂ اولیائے ہند جلد ۳ صفحہ ۴۹۱-۴۹۲ پر لکھا ہے کہ جب کسی شخص کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی دعا کرتے تو اس سے یہ اقرار لے لیتے کہ پہلا لڑکا میری نذر کیا جائیگا اور اسکی چند علامات ہوں گی۔ مثلاً کوتاہ سر۔ گنگ اور مسلوب الحواس۔ چنانچہ اس طرح کے سینکڑوں لڑکے دولہ شاہی چوہے مشہور ہوگئے۔"

۲۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۱ صفحہ ۲۷۲ زیر لفظ AFRICA

۳۔ RATTIGAN مشہور عیسائی وکیل تھا جس نے قانون کے موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔

۴۔ ابراہیم ۱۴ : ۳۶ تا ۳۸

۵۔ مہاراجہ کشمیر جس نے انگریزی عہدنامہ کے مطابق ۱۸۴۶ء میں جموں اور کشمیر میں ڈوگرہ راج کی بنیاد رکھی تھی۔ ۲۰ اگست ۱۸۵۷ء کو اس کی وفات پر اس کا بیٹا جانشین ہوا۔

۶۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کا جانشین تھا ایک ربع صدی سے زائد عرصہ تک حکومت کی۔ ۱۸۸۵ء میں فوت ہوا۔ اس کے عہد حکومت میں مسلمانوں کو اذان دینے کی ممانعت کردی گئی تھی۔

۷۔

۸۔ الحجرات ۴۹ : ۱۸

۹۔ آل عمران ۳ : ۱۶۸

۱۰۔ حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۳۳۴ ہجری)

۱۱۔ حضرت ابوالقاسم جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۲۹۷ ہجری)

۱۲۔ نیا تذکرۃ الاولیاء مؤلفہ رئیس احمد جعفری صفحہ ۳۵ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء

۱۳۔ حضرت حسین منصور حلاج (شہادت ۳۰۹ھ) مشہور اہل اللہ بزرگ تھے جنہیں عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانہ میں علماء کے فتویٰ کی بناء پر سنگسار کردیا گیا تھا۔

۱۴۔ تذکرۃ الاولیاء صفحہ ۲۶۴ ناشر ملک چنن دین تاجر کتب کشمیری بازار لاہور مطبوعہ بندے ماترم پریس لاہور

۱۵۔ حضرت ابودجانہ سماک بن خرشہ کو یہ شرف حاصل ہوا تھا (تاریخ طبری جلد ۷ صفحہ ۵۱۱-۵۱۵ دار المعارف مصر) شہادت کے وقت دیکھا گیا تو ان کے جسم کے ستر ٹکڑے تھے (اصابہ جلد ۹ صفحہ ۱۰۶)

۱۶۔ کتاب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب جلد ۲ صفحہ ۴۹۵ - صفحہ ۵۵۹

۱۷۔ حضرت معاویہ بن ابوسفیان (ـ ، ۶۰ھ) نے ۴۱ھ/۶۶۱ء میں دمشق کو پایہ تخت بنا کر بنو امیہ کی حکومت قائم کی۔ جو قریباً ۹۰ سال تک قائم رہی اور بالآخر مروان بن احمد بن مروان کی وفات ۱۳۲ھ/۷۵۰ء پر ختم ہوگئی۔

۱۸۔ عبداللہ السفاح بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس (ـ ۱۳۶ھ/۷۵۴ء) نے ۱۳۲ھ/۷۴۹ء میں بغداد کو دارالحکومت بنا کر بنو عباس کی حکومت کی بنیاد رکھی جو پانسو سال بعد ۶۵۱ھ/۱۲۵۸ء میں آخری عباسی خلیفہ معتصم

کی تاتاریوں کے ہاتھوں شکست کے ساتھ ختم ہوگئی۔

۱۹؎ - جامع ترمذی ابواب الزہد باب معیشۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم واصحابہ۔

۲۰؎ - یہ روایت بعینہٖ انہی الفاظ میں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف کے متعلق بیان ہوئی ہے۔ (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب جلد ۲ صفحہ ۳۹۴)

۲۱؎ - یہ پانچ شہدائے کابل کی طرف اشارہ ہے۔ جن میں پہلے حضرت مولوی عبدالرحمٰن صاحبؓ تھے جو ۱۹۰۱ء میں شہید ہوئے (روحانی خزائن (تذکرۃ الشہادتین) صفحہ ۴۷-۴۸ جلد ۲۰) دوسرے حضرت صاحبزادہ سید عبداللطیف صاحبؓ جو ۱۴؍جولائی ۱۹۰۳ء کو شہید ہوئے (روحانی خزائن۔ تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۵۹ جلد ۲۰) تیسرے حضرت مولوی نعمت اللہ خانصاحبؓ تھے جن کی تاریخ شہادت ۳۱؍اگست ۱۹۲۴ء ہے۔ (الفضل ۱۱ستمبر ۱۹۲۴ء) چوتھے اور پانچویں شہید مولوی عبدالحلیم صاحب اور قاری نور علی صاحب تھے جن کو ۱۱؍رجب ۱۳۴۳ھ کو شہید کیا گیا۔ (الفضل ۱۲؍فروری، ۳؍مارچ ۱۹۲۵ء)

۲۲؎ -

۲۳؎ - تفسیر روح البیان مؤلفہ شیخ اسمٰعیل حقی البروسوی جلد ۷ صفحہ ۳۷۷

۲۴؎ - تعبیر الرؤیا مصنفہ علامہ امام محمد بن سیرین مترجمہ سید حبیب احمد ہاشمی صفحہ ۱۵۹، ۱۶۰

۲۵؎ - مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۱۴-۴۱۵

۲۶؎ - سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ باب مایقول الرجل اذا خاف قومًا۔

۲۷؎ - ملفوظات جلد ۶ صفحہ ۱۳۵

۲۴

(فرمودہ ۴ مارچ ۱۹۳۶ء بمقام عیدگاہ۔ قادیان)

آج کی عید قربانی کی عید کہلاتی ہے عربی زبان میں بھی اس کو عید الاضحیہ کہتے ہیں یعنی ایسی عید جس میں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ یہ عید ایک قربانی کی یادگار کے طور پر ہے جو آج سے ہزاروں سال پہلے ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی۔

قربانی ایک عجیب لفظ ہے جو کئی ایک متضاد جذبات کا جامع ہے۔ عام طور پر متضاد جذبات جمع نہیں ہوا کرتے اور جو الفاظ محبت پر دلالت کرتے ہیں وہ ساتھ ہی راحت اور آرام پر بھی دلالت کرتے ہیں لیکن تکلیف اور دُکھ پر دلالت نہیں کرتے۔ اور جو الفاظ تکلیف اور دُکھ کے مفہوم پر دلالت کرتے ہیں وہ راحت، آرام اور محبت کے مفہوم پر دلالت نہیں کرتے۔ مگر قربانی ایک ایسا جامع لفظ ہے جو جدائی اور وصال، تکلیف اور راحت، خوشی اور غم ان سارے ہی متضاد جذبات کا جامع اور ان پر مشتمل ہے۔ یہ لفظ جس وقت ایک انسان کے قلب میں پیدا ہوتا ہے اور جس وقت اس کے دماغ پر اس کا اثر ہوتا ہے، وہ ایک ہی وقت میں یہ ساری باتیں محسوس کرتا ہے اور قربانی کا لفظ خود اپنی ذات میں اس کا ثبوت ہوتا ہے بلکہ اُردو میں جو لفظ استعمال ہوتا ہے وہ بھی وہی معنے رکھتا ہے جو عربی زبان کے لفظ کے ہیں۔ قربانی قرب پر بھی دلالت کرتی ہے اور ذبح ہونے پر بھی۔ ذبح ہو کر یعنی اپنی جان خدا تعالیٰ کے راستہ میں دیکر انسان بظاہر اپنے عزیزوں سے جُدا ہوتا ہے۔ مگر قربانی ایسی چیز ہے کہ وہ جدائی میں بھی وصال کے سامان پیدا کر دیتی ہے جس وقت ایک مسلمان سپاہی میدانِ جنگ میں مر کر بظاہر اپنے پیاروں سے جدا ہو رہا ہوتا ہے حقیقتاً وہ اپنے پیاروں کے قریب بھی ہو رہا ہوتا ہے۔ کیونکہ سب سے پیارا وجود تو خدا تعالیٰ کی ذات ہے اور جو شخص خدا تعالیٰ کی راہ میں جان دیتا ہے وہ اپنے خدا کے قریب ہو جاتا ہے۔ پھر انسان کے جتنے عزیز اور پیارے دنیا میں ہوتے ہیں ان سے زیادہ عزیز اور پیارے اگلے جہان میں جا چکے ہوتے ہیں۔ اگر دنیا میں کسی کا باپ زندہ ہے اور شہادت سے اس کے اور اس کے باپ کے درمیان جدائی ہو جاتی ہے۔ تو اس کے کئی دادے اور پڑدادے ایسے ہوتے ہیں۔ جو سینکڑوں اور ہزاروں سال سے اگلے جہان میں اس کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر دنیا میں اس کی والدہ زندہ ہے اور وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں جان دے کر اس سے جُدا ہوتا ہے تو اس کی کئی دادیاں اور نانیاں اس سے محبت کرنیوالی

اگلے جہان میں موجود ہوتی ہیں۔ اور اگر دنیا میں اس کی اولاد ہے تو خدا تعالیٰ کی مشیّت کے ماتحت اکثر لوگوں کی اولاد کچھ زندہ رہتی اور کچھ مر جاتی ہے۔ پس اگر اس دنیا میں اس کی کچھ زندہ اولاد موجود ہوتی ہے تو اس کی کچھ اولاد اگلے جہان میں بھی ہوتی ہے جس سے جا ملنا ہے۔ تو قربانی گو رنج اور درد کا جذبہ اپنے اندر رکھتی ہے مگر ساتھ ہی راحت اور آرام کا جذبہ بھی اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اور آج کا دن جو قربانی کا دن ہے، وہ اس قربانی کو یاد دلاتا ہے جو نہایت ہی کامل رنگ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ربّ کے حضور پیش کی۔ آج سے قریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے وہ قربانی پیش کی گئی تھی۔

ساڑھے چار ہزار سال کا عرصہ کوئی معمولی عرصہ نہیں ہوتا۔ بسا اوقات دس پندرہ دن کے بعد انسان اپنی تکالیف بھول جاتا ہے۔ جس کو سخت بخار چڑھا ہوا ہو، اس کی ہڈیوں میں درد ہو رہا ہو، وہ خیال کرتا ہے کہ ساری عمر مَیں اس تکلیف کو نہیں بھولوں گا۔ مگر بخار اترنے کے آٹھ دس دن بعد وہ ساری تکلیف بھول جاتا ہے۔ لوگوں کے عزیز مر جاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا اب ہمارے لئے تلخ ہو گئی۔ لیکن سال دو سال کے بعد وہ اسی طرح ہشاش بشاش ہوتے ہیں جس طرح پہلے اور مرنے والوں کی یاد دلوں سے محو ہو جاتی یا بہت حد تک کمزور ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ عجیب قربانی تھی کہ ساڑھے چار ہزار سال کا عرصہ اس پر گذر گیا مگر آج بھی اس کا خیال کر کے انسان کا دل اعلیٰ درجہ کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔ اب بھی جب ہم میں سے کوئی شخص اس نظارے کا خیال کرتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے اسمٰعیلؑ کو خدا تعالیٰ کے حکم کے ایک ظاہری معنے کرتے ہوئے اس لئے لٹایا کہ وہ اس کو ذبح کریں اور چھری لے کر وہ اس کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور اس بچے نے بھی اس بات کو تسلیم کر لیا کہ اگر خدا تعالیٰ کی یہی رضا ہے تو مَیں اس پر راضی ہوں تو اس کا دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ آج جبکہ اسلام نے اس قسم کی انسانی قربانی کرنے سے منع کر دیا ہے بوجہ اس کے کہ ہم اس کو ممنوع سمجھتے ہیں شاید ہم میں سے بہت اس کی پوری کیفیت نہیں سمجھ سکتے۔ مگر اُس زمانہ میں جب انسانی قربانی کا رواج تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ یقین رکھتے تھے کہ خدا تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ مَیں اپنا بچہ اس کی راہ میں قربان کر دوں۔ جب وہ بچہ بھی سمجھتا تھا کہ خدا تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ مجھے ذبح کر دیا جائے جب نوّے سال کی عمر کو پہنچ کر تمام جوانی کی عمر اور تمام ادھیڑ عمر اس امید اور تڑپ میں گذار کر کہ خدا تعالیٰ پاک اولاد دے جو ان کے نام کو قائم رکھنے والی ہو۔ خدا تعالیٰ نے انہیں جو بچہ دیا اس کے متعلق خدا تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ اسے میری راہ میں ذبح کر دیا جائے۔ تو اس لمبی عمر

کے بعد جب وہ اکلوتا بچہ اور بوڑھا باپ خدا تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کے لئے علیحدہ ہوئے ہونگے تو ان کے جذبات کا اندازہ لگانا ہر ایک کے لئے آسان کام نہیں، صرف اہلِ دل ہی پوری طرح ان جذبات کو سمجھ سکتے ہیں بہت سے لوگ شاید ان کے درد کے جذبات میں شامل ہو سکتے ہیں اور اسی لئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کا ذکر سنکر بہت سے مردوں اور بہت سی عورتوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درد میں شریک ہونے والے موجود ہیں۔ مگر وہ لوگ بہت ہی کم ہیں جو اس جذبۂ فخر کو محسوس کر سکتے ہیں جو اس وقت حضرت ابراہیمؑ کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے اس وقت زمین زمین نہیں رہی تھی بلکہ عرش بریں بن گئی تھی ان کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے بلکہ وہ ہوا میں اُڑتے تھے کیونکہ خدا تعالیٰ نے اپنی راہ میں انہیں وہ قربانی پیش کرنے کا حکم دیا تھا جسے کسی انسان نے پیش نہیں کیا تھا۔ بے شک بحیثیت انسان ان کے دل میں درد بھی تھا ضرور تھا خصوصاً وہ ابراہیمؑ جن کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ حلیمؑ اور اوّاہ تھا۔ بات بات پر اس کے دل سے آہیں نکلتی تھیں اور وہ نہایت رحمدل تھا۔ یقیناً اس کے دل میں درد بھی پیدا ہوا ہوگا مگر جو چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے اور جو چیز حضرت اسمٰعیل کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ جذبہ ہے کہ یہ قربانی ہماری ہی ترقی کا موجب ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے یہ حکم دے کر ہم پر احسان کیا ہے۔ تم میں سے بہت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے غم میں شریک ہو سکتے ہیں۔ تم میں سے بہت ان کے درد میں شریک ہو سکتے ہیں۔ تمہارے دماغ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دماغ کی نقل کر سکتے اور تمہاری آنکھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آنکھوں کی نقل کر کے آنسو بہا سکتی ہیں مگر تم میں سے بہت کم ان کے دل کی نقل کر سکیں گے جو اس امید اور یقین سے پُر تھا کہ میرے رب نے مجھے اپنے لئے چن لیا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے کے لئے چھری اُٹھائی تو اس وقت غالب خیال ان کے دل میں یہ نہ تھا کہ میرا بیٹا مجھ سے جُدا ہو رہا ہے بلکہ یہ خیال غالب تھا کہ میرا خدا میرے قریب ہو رہا ہے یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس قربانی کو یاد رکھا ورنہ قربانیاں دُنیا میں ہمیشہ ہوتی رہتی ہیں۔ اس قربانی میں ایک امتیازی نشان تھا اور وہ یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں درد اور غم کے جذبات غالب نہ تھے بلکہ یہ خیال غالب تھا کہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ وہ مجھ سے کام لے رہا ہے۔ پھر وہ جذبہ جو حضرت ابراہیمؑ کے دل میں تھا وہ انہوں نے دوسروں کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ گویا وہ اتنا غالب جذبہ تھا کہ ان کے پاس بیٹھنے والے لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے جس طرح آگ کے پاس بیٹھنے والا گرم

ہوجاتا ہے۔جس طرح برف کو ہاتھ میں پکڑنے والا ٹھنڈک محسوس کرتا ہے۔اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے پاس بیٹھنے والے بھی قربانی کے خیالات سے لبریز ہوجاتے تھے۔ چنانچہ اس کا ثبوت احادیث سے ملتا ہے۔جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پیشگوئی کو دوسرے معنوں میں پورا کرنے کے لئے کیونکہ چھری سے حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے کی ممانعت کرکے خدا تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتادیا تھا کہ اس حکم سے ہمارا منشاء اَور ہے اور وہ اسمٰعیلؑ اور اس کی والدہ کو وادی بے آب وگیاہ میں چھوڑنا ہے۔جب خدا تعالےٰ نے آپ پر یہ کشفِ حقیقت کردی اور آپ پیشگوئی کے حقیقی مفہوم کو پورا کرنے کے لئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اوران کی والدہ حضرت ہاجرہ کو لے کر مکہ کے میدان میں پہنچے تو میل ہا میل تک نہ کوئی ٹھکانا تھا نہ رہنے کی جگہ۔نہ پانی تھا نہ کھانے کا سامان۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مشکیزہ پانی کا اور ایک کھجور کی تھیلی ان کے پاس رکھ دی جن کے ختم ہونے کے بعد نہ انہیں پانی میسّر آسکتا تھا نہ غذا اور رکھ کر واپس لوٹے۔جس وقت وہ لوٹ رہے تھے حضرت ہاجرہ نےان کی شکل دیکھ کرمحسوس کرلیا کہ یہ جدائی عارضی جدائی نہیں بلکہ مستقل جُدائی ہے وہ ان کے پیچھے آئیں اور کہا۔ابراہیمؑ کہاں جارہے ہو۔اس وقت بوجہ اس جذبۂ طبعی کے جو اُن کے قلب میں تھا اور اواہٌ منیب ہونے کی وجہ سے ان پر رقت طاری ہوگئی اور وہ جواب نہ دے سکے۔حضرت ہاجرہ پھر آگے بڑھیں اور انہوں نے سوال کیا مجھے اور اسمٰعیلؑ کو چھوڑ کر کہاں جارہے ہو۔وہ پھر خاموش رہے جب حضرت ہاجرہ کے متواتر الحاح سے سوال کرنے کے باوجود وہ کوئی جواب نہ دے سکے تو پھر حضرت ہاجرہ نے پوچھا کیا خدا نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔اس وقت بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام بوجہ جذبات کے غالب ہونے کے جواب تو نہ دے سکے مگر انہوں نے آسمان کی طرف اپنا ہاتھ اٹھادیا۔جس کے معنے یہ تھے۔کہ خدا کا حکم یہی ہے اوراسی کے سپرد کرکے تمہیں چلا ہوں باوجود اس کے کہ کوئی انسانی عقل یہ تجویز نہیں کرسکتی تھی کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہ کو اس وادئ بے آب وگیاہ میں پانی کا مشکیزہ ختم ہونے کے بعد پانی مل سکے گا باوجود اس کے کہ کوئی انسانی عقل یہ تجویز نہیں کرسکتی تھی کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہ کو کھجوروں کی تھیلی ختم ہونے کے بعد اس وادئ بے آب وگیاہ میں کھانا مل سکے گا۔اور باوجود اس کے کہ کوئی انسانی عقل یہ تجویز نہیں کرسکتی تھی کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہ کو اس وادئ بے آب وگیاہ میں کوئی مونس وغمگسار مل جائے گا جو بیماری میں ان کی تیمارداری کرسکے اوران کی ضروریات کو پورا کرنے کا متکفل ہو۔لیکن چونکہ ابراہیمی ایمان حضرت ہاجرہ میں اسی طرح سرایت کرچکا تھا جس طرح آگ کے پاس بیٹھنے والا گرم ہوجاتا ہے اس لئے جب حضرت ہاجرہ کو معلوم ہوا کہ حضرت

ابراہیمؑ کا یہ فعل اپنی طرف سے نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے۔ تو انہوں نے وہیں حضرت ابراہیمؑ کو چھوڑ دیا اور کہا اِذًا لَّا یُضَیِّعُنَا۔ اگر یہ بات ہے تو پھر خدا ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ جہاں آپ کی مرضی ہو چلے جائیں۔

حضرت ہاجرہ نے یہ اپنے ایمان کا مظاہرہ کیا اور ایسی تکلیف کے وقت میں کوئی دوسرا لفظ زبان سے نہ نکالا۔ اگر حضرت ہاجرہ ایک کمزور عورت ہو کر خدا تعالےٰ پر اتنے اعتماد اور اور یقین کا اظہار کر سکتی تھیں تو کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ ہمارا طاقتور خدا اس کی قدر نہ کرتا۔ ہر شخص جسے روحانی آنکھ نصیب ہو وہ اپنی رُوحانی آنکھوں سے اس بات کو دیکھ سکتا، سمجھ سکتا، اور محسوس کر سکتا ہے کہ جس وقت حضرت ہاجرہ کے دل سے یہ آواز نکلی ہوگی کہ اِذًا لَّا یُضَیِّعُنَا خدا ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ تو اپنے عرش سے خدا تعالےٰ نے ان کو جواب دیا ہوگا کہ بے شک مَیں تجھے کبھی ضائع نہیں کروں گا۔ اور اس نے نہیں ضائع کیا۔ کونسی انسانی عقل سمجھ سکتی تھی کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہ کی وہاں جان بچ جائے گی۔ مگر جان بچنے کا تو کیا ذکر ہے خدا تعالےٰ نے ان کو ایک قوم بنایا ایسی زبردست قوم جو ساری دنیا پر چھا گئی اور وہ محمد صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے وجود میں داخل ہوتے ہوئے ساری دنیا کی حاکم اور بادشاہ بن گئی۔ ہمارے آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم ساری دنیا کے لئے مبعوث ہوئے ہیں۔ پس وہ ساری دنیا کے بادشاہ ہیں اور یقیناً آپ کی بادشاہت روحانی رنگ میں آپ کے آباء کی طرف یعنی ان کی طرف جو روحانی اور جسمانی طور پر آپ کے آباء ہیں منسوب ہوتی ہے۔ حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ نے ساری دنیا کو خدا تعالےٰ کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ خدا تعالیٰ نے ساری دنیا اسمٰعیل کی نسلوں کے قدموں میں ڈال دی۔ مکّہ کی وادیوں میں سوائے حضرت اسمٰعیلؑ کے کون ایسا تھا جو اپنی ماں کے ساتھ اکیلا چھوڑا گیا۔ گویا وہ سب دنیا سے خدا کے لئے جدا ہو گئے تھے پھر خدا تعالےٰ نے بھی اپنی خاطر دنیا کو چھوڑنے والوں کے قدموں میں ساری دنیا کو لا ڈالا کیونکہ ہم بھی اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے تعلق رکھتے ہیں تو خدا تعالےٰ کے لئے۔ پس انہوں نے دنیا سے خدا تعالےٰ کے لئے تعلق توڑا تھا دُنیا نے خدا تعالےٰ کے لئے ہی ان سے تعلق جوڑا۔ پس یہ قربانی کوئی معمولی قربانی نہیں اور نہ یہ دن کوئی معمولی دن ہے۔ یہ دن ہر شخص کو بتلاتا ہے کہ تمہارا خدا تمہارے قریب ہے۔ تم ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کی طرح بن جاؤ۔ تمہارا خدا ساری دنیا کو تمہارے قدموں میں ڈال دے گا۔ جو کچھ حضرت ہاجرہ نے کیا تھا وہ ہر مومن عورت کر سکتی ہے اور جو کچھ حضرت اسمٰعیلؑ نے کیا تھا وہ ہر مومن بچہ کر سکتا ہے۔ کوئی روک درمیان میں حائل نہیں۔ پس مت خیال کرو کہ اس وقت اس قربانی کا موقعہ تھا مگر

آج نہیں۔ آج بھی قربانی کا موقعہ ہے۔ آج بھی تم میں سے ہر شخص دین کے لئے اسمٰعیلؑ بن سکتا ہے آج بھی تم میں سے ہر عورت دین کے لئے ہاجرہ بن سکتی ہے کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں داخل ہو کر روحانی طور پر سب لوگ ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کی اولاد ہو چکے ہیں۔

پس میں ہاجرہ کی بچیوں سے کہتا ہوں کہ تم اپنی ماں کی صفات اپنے اندر پیدا کرو اور بنی اسمٰعیلؑ کی اولاد سے کہتا ہوں کہ تم اپنے باپ کی صفات اپنے اندر پیدا کرو۔ تمہارا رب آج بھی اسی طرح قربانی کا مطالبہ کرتا ہے جس طرح اس نے حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ سے مطالبہ کیا۔ کیونکہ اس زمانہ کے مامور کو بھی خدا تعالےٰ نے ابراہیمؑ کہا۔ اور اس نے لوگوں سے کہا ہے

میں کبھی آدم۔ کبھی موسیٰ کبھی یعقوب ہوں
نیز ابراہیم ہوں نسلیں ہیں میری بے شمار[1]

پس ہر شخص آج بھی اسمٰعیل بن سکتا۔ اور ہر عورت آج بھی ہاجرہ بن سکتی ہے کیونکہ اس زمانہ میں جس شخص کو خدا تعالےٰ نے ہمارا روحانی باپ قرار دیا ہے اس کا نام اس نے ابراہیم رکھا ہے۔ پس تمہارے لئے آج بھی موقعہ ہے کہ تم اپنے آپ کو اسمٰعیلی ثابت کرو۔ اور یاد رکھو جو لوگ خدا تعالیٰ کی راہ میں مرتے ہیں وہ مرتے نہیں بلکہ زندہ ہوا کرتے ہیں[2] اور اس زمانہ نے تو پہلی موت کی شکل بھی تبدیل کر دی ہے۔ پرانے زمانہ میں تلواروں اور چھریوں کے زخم کھا کر لوگ خدا تعالیٰ کی راہ میں جان دیتے تھے یا بندوقوں کا نشانہ بن کر مرتے تھے لیکن اب عام طور پر اس قسم کی موت نہیں بلکہ وہ موت ہے جو دین کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرتے ہوئے آتی ہے کبھی کبھار پہلی قسم کی موت بھی آجاتی ہے۔ جیسے کابل میں ہماری جماعت کے بعض افراد شہید کئے گئے[3] یا ہندوستان میں بعض لوگ پیٹے جاتے اور اس تکلیف کی وجہ سے مر جاتے ہیں[4] مگر زیادہ تر موت وہی ہے جو اسلام کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے اور اسلام کے مطابق اپنی زندگی بنانے میں آتی ہے۔

ہمارے سلسلہ کو خدا تعالےٰ نے اس لئے قائم کیا ہے کہ وہ تمام برکات واپس لائے جو اس سے پہلے دنیا میں موجود تھیں یہی اس سلسلہ کی غرض اور یہی اس کا مقصد ہے۔ خدا تعالےٰ دنیا میں نئی بادشاہتیں قائم کرنا نہیں چاہتا۔ خدا تعالےٰ دنیا میں نئی حکومتیں قائم کرنا نہیں چاہتا خدا تعالےٰ دنیا میں نئی قوموں کو غلبہ دینا نہیں چاہتا۔ بلکہ خدا اس وقت صداقت کو غلبہ دینا چاہتا ہے اور یہی ہمارے سلسلہ کے قائم ہونے کی غرض ہے۔ پس تم اپنے اندر سچائی اور دیانت پیدا کرو۔ اور ان تمام احکام پر قائم رہو جو اسلام نے دیئے۔ اور یاد رکھو سچائی بھی معمولی چیز نہیں ہوتی۔

آج ہمارے زمانہ میں عدالتوں کا رنگ ایسا ہے کہ ان میں جھوٹ خوب چلتا ہے اور جو شخص سچائی پر قائم رہے اسے ہر وقت یہ خطرہ رہتا ہے کہ وہ مشکلات میں پڑ جائے گا۔ پس اگر تم عہد کر لو کہ تم نے سچائی پر چلنا ہے تو تمہیں نظر آجائے گا کہ تمہارے لئے قربانی کے رستے کھل گئے ہیں۔ مگر اس کے علاوہ بھی قربانی کے کئی رستے ہیں۔ اخلاقی طور پر اپنے نفس امارہ کو مار دینا بھی قربانی ہے۔ دین کے مطالبات پورے کرنا بھی قربانی ہے۔ اور چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ابراہیمی فیضان کا عام چھینٹا دنیا پر پڑا ہے۔ اس لئے اب اپنے اپنے ظرف کے مطابق ہزاروں اسمٰعیل امتِ محمدیہ میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ پہلے ابراہیمؑ کی نسل سے صرف ایک اسمٰعیلؑ پیدا ہوا۔ مگر یہ ابراہیمؑ چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا بروز اور ساری دنیا کی طرف مامور ہے! اس لئے ہزار ہا اسمٰعیل اس کے ذریعہ پیدا ہو سکتے ہیں صرف ارادہ کی دیر ہے اسی طرح آج ہزاروں عورتیں ہاجرہ بن سکتی ہیں بشرطیکہ وہ اس بات پر یقین اور ایمان رکھیں کہ ہمارا پیشوا ایک ایسے آقا کا خادم ہے جس کے ساری دنیا کی طرف مبعوث ہونے کی وجہ سے اس کے فیضان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

پس میں جماعت کے نوجوانوں کو آج توجہ دلاتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو اسماعیلی رنگ میں رنگین کریں۔ اور ہر قسم کی قربانیوں کے لئے تیار رہیں۔ خواہ وہ اخلاقی ہوں یا جسمانی یا مالی۔ یاد رکھو اسلام کا درخت قربانی کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ اگر تمہاری خواہش ہے کہ اسلام ترقی کرے۔ تو اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کرو اور وہ تمام قسم کی قربانیاں کرو جو تم سے پہلے کسی امت نے دنیا میں کی ہوں۔ کیونکہ جس طرح اسلام جامع کمالات متفرقہ ہے اسی طرح ضروری ہے کہ اس کے متبعین کی قربانیاں بھی تمام امتوں کی متفرق قربانیوں کی جامع ہوں۔ پھر خدا تعالےٰ بھی اسی طرح ان قربانیوں کی یاد دنیا میں قائم رکھے گا جس طرح اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یاد قائم رکھی۔ جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قربانی کی تھی اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ ساری دنیا اسے یاد رکھے گی۔ مگر خدا تعالےٰ نے اسے قائم رکھا اور اس قربانی کی یاد دنیا سے مٹنے نہ دی۔ پس یہ مت سمجھو کہ تمہاری قربانیاں کون دیکھیگا تمہاری قربانیوں کو آسمان پر دیکھنے والا خدا موجود ہے اور وہ انہیں دنیا سے مٹنے نہیں دے گا۔ اول تو جس شخص کے دل میں قربانی کا صحیح جذبہ ہو وہ یہ نہیں دیکھا کرتا کہ مجھے کوئی دیکھنے والا ہے یا نہیں لیکن اگر کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو تو میں اسے کہتا ہوں۔ ابراہیم کی قربانی کس نے دیکھی تھی۔ کیا اس وقت وہاں کوئی مؤرخ موجود تھا یا الفضل تھا جس میں یہ واقعہ لکھا گیا۔ خدا نے آسمان پر اسے دیکھا اور کہا میں اس قربانی کو نہیں بھلاؤں گا اور

ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نہیں بھولی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص حقیقی طور پر اسماعیلی قربانی کرنے کے لئے تیار ہو تو اللہ تعالیٰ اُسے نہیں بھولے گا اور نہیں بھولنے دیگا بلکہ وہ ہمیشہ قائم رہے گی اور دنیا میں قائم رکھی جائے گی۔ پس اپنے اندر ابراہیمی جذبہ پیدا کرو اور اسماعیلی نمونہ دکھاؤ تب تم دیکھوگے کہ زمین تمہارے لئے بدل جائے گی آسمان تمہارے لئے بدل جائے گا۔ اور وہ دشمن جو تم پر حملہ کر رہے ہیں خدا تعالیٰ کا ہاتھ ان کے اور تمہارے درمیان حائل ہو جائے گا اور خدا تعالیٰ کے فرشتوں کی تلوار تمہاری حفاظت کرے گی لیکن ضرورت اس ایمان کی ہے جو عورتوں کو حضرت ہاجرہ کے مشابہ بنا دے اور ضرورت اس ایمان کی ہے جو مردوں کو حضرت ابراہیمؑ کے مشابہ بنا دے۔

مَیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمارے اندر حقیقی قربانی کا مادہ پیدا کرے اور ایسے رنگ میں قربانیوں کی توفیق دے کہ ہم ان تمام برکات اور فیوض کو حاصل کر سکیں جن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جذب کر کے ہماری طرف منتقل کیا۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ و السلام نے خدا تعالیٰ سے حکم پا کر انہیں دنیا میں پھیلا دیا۔" (الفضل ۸ مارچ ۱۹۳۶ء صا تا ۴)

۱۔ محیط المحیط جلد ۲ صفحہ ۱۶۹۲۔ مجمع بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۱۳۹

۲۔ مفردات امام راغب زیر لفظ قرب۔ روحانی خزائن (خطبہ الہامیہ) جلد ۱۶ صفحہ ۳۳

۳۔ التوبۃ ۹ : ۱۱۴

۴۔ الاعراف ۷ : ۱۵۹، سبا ۳۴ : ۲۹

۵۔ تذکرہ صفحہ ۱۸۴، ۳۴۰، ۳۹۲ مطبوعہ الشرکۃ الاسلامیہ ربوہ

۶۔ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۰۱

۷۔ البقرہ ۲ : ۱۵۵

۸۔ پانچ شہدائے کابل کی طرف اشارہ ان کے متعلق نوٹ صفحہ ۱۵۱ پر ملاحظہ ہو۔

۹۔ اسکے متعلق "بھارت کا بحران" مصنفہ رونلڈ سیگل مترجم حسن عابدی میں زیر عنوان ذات، مذہب اور تاریخ ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے

۱۰۔ الانبیاء ۲۱ : ۱۰۸۔ تفسیر ابن جریر جلد ۱۷ صفحہ ۸۳

۱۱۔ یہ جماعت احمدیہ کا داعدار دو روزنامہ ہے جسے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے خلافت اُولیٰ میں ۱۲ رجب المرجب ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۸ جون ۱۹۱۳ء کو قادیان سے جاری فرمایا تھا ابتداً ہفتہ وار تھا خلافت ثانیہ میں کبھی ہفتہ میں دو بار اور کبھی تین بار چھپتا رہا۔ ۸ مارچ ۱۹۳۵ء سے اس وقت تک روزنامہ اخبار ہونے کی حیثیت میں اسلام اور احمدیت کی اشاعت میں سرگرم عمل ہے۔

۲۵

(فرمودہ ۲۲؍ فروری ۱۹۳۷ء بمقام عیدگاہ۔ قادیان)

عیدالاضحیہ ہمیں ایسی قربانیوں کی یاد دلاتی ہے جو انسانی احساسات کے لحاظ سے نازک ترین جذبات کی قربانیاں کہلاتی ہیں۔ دنیا میں انسان ہر روز ہی قربانیاں کرتا ہے۔ اور قربانیاں کرنے پر مجبور رہتا ہے اس میں نیک اور بد کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ محنتی اور آوارہ گرد میں کوئی تمیز نہیں ہے۔ ایک با اصول اور عیاش انسان کی بھی کوئی تمیز نہیں ہے۔ صرف فرق یہ ہوتا ہے کہ کوئی اچھی چیز کے لئے قربانی کرتا ہے اور کوئی بُری چیز کے لئے قربانی کرتا ہے۔ ان تمام قربانیوں پر غور کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بھاری قربانی انسان کے لئے اپنی اولاد کی قربانی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض انسان جن کی فطرتیں مرجاتی ہیں اور جو انسانیت سے خارج ہو جاتے ہیں ان میں ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے عیش اور اپنی لذت کی خاطر قربان کر دیتے ہیں لیکن یہ استثنائی وجود ہوتے ہیں اور درحقیقت اپنی مردہ فطرت کے لحاظ سے انسانوں میں شمار ہونے کے قابل نہیں ہوتے۔

فطرت انسانی کا اصلی جوہر انسانوں کی اکثریت سے معلوم کیا جا سکتا ہے اور اگر ہم اپنے گردوپیش کے حالات پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ انسان کی دنیوی زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے ننانوے فیصدی آدمی بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ اپنی عمریں محض اپنی اولاد کی بہتری کی خاطر قربان کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ ایک عجیب قسم کا نظارہ دنیا میں نظر آتا ہے کہ دادا بیٹے کے لئے اور بیٹا پوتے کے لئے اور دادی بیٹی کے لئے اور بیٹی نواسی کے لئے اپنی جان قربان کر رہے ہیں۔ اور یہ اوپر سے نیچے اترنے والی قربانی نہ زمانے کی قید سے واقف ہے نہ مذہب کی قید سے واقف ہے نہ ملک کی قید سے واقف ہے، نہ علم کی قید سے واقف ہے، نہ زبان کی قید سے واقف ہے، نہ رنگوں کی قید سے واقف ہے۔ ایک مسلمان اور ایک عیسائی اور ایک ہندو، ایک کالا اور ایک گورا اور ایک زرد رنگ کا آدمی، ایک مرد اور ایک عورت، ایک ہندوستانی اور ایک انگریز اور ایک افریقی، ایک جاہل اور ایک پڑھا لکھا انسان، ایک سیدھا سادھا اور ایک فلاسفر اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں اور اپنے کاموں کی تمام شاخوں میں بس ایک ہی دُھن میں لگے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اپنے آپ کو قربان کر دیں اور اس قربانی کے نتیجہ میں کچھ

عزت یا کچھ جائیداد یا کچھ روپیہ یا کچھ رتبہ یا کچھ آرام حاصل کرکے اپنی اولادوں کو ورثہ میں دے دیں۔ نہ آج اس کے خلاف کوئی بات نظر آتی ہے نہ پچھلی صدی میں اس کے خلاف لوگوں کا دستور تھا۔ نہ اس سے پہلی صدی کے لوگ اس کے خلاف تھے۔ نہ اس سے پہلی صدی کے نہ اس سے پہلی کے ۔ آج سے لے کر آدمؑ تک ۔ آدم کا ہر بچہ اور حوّا کی ہر بیٹی سوائے اس کے جو انسانیت سے خارج ہو گیا ہو صرف ایک ہی کام میں مشغول نظر آتا ہے کہ اپنے آپ کو قربان کردے اور اپنی اولاد کو آرام اور راحت بخشے۔ یہ عجیب مسلسل۔ پیہم اور متواتر قربانی ہے جس کی مثال شاید کسی اور جذبے میں ملنی مشکل ہو۔

پس یہ ایسی چیز نہیں ہے جو انسانی نگاہ سے اوجھل ہو۔ چلے جاؤ فلاسفروں کے گھروں میں یا چلے جاؤ اجڈ اور جاہل لوگوں کے گھروں میں۔ چلے جاؤ شہریوں کے گھروں میں یا چلے جاؤ گنواروں اور دور دراز گاؤں میں رہنے والوں کے گھروں میں۔ وہاں اس بات کا مشاہدہ کرکے دیکھ لو۔ کہ ایک باپ اور ایک ماں اپنی جان کی قیمت زیادہ سمجھتے ہیں یا اپنی اولاد کی قیمت زیادہ سمجھتے ہیں۔ تمہیں یہی نظر آئے گا کہ وہ سب کے سب اِلّا ماشاءاللہ اپنے آپ کو بھولے ہوئے ہیں۔ اور پیدائشِ مخلوق کا ایک ہی مقصد ان کے سامنے ہے کہ وہ اپنی اولادوں کی راحت اور آرام اور ترقی کے سامان پیدا کریں اور اس امر میں غلطی کر سکتے ہیں کہ اولاد کو راحت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کوئی علم میں اس کی راحت سمجھتا ہو اور کوئی جہالت میں اور کوئی محنت میں ان کی راحت سمجھتا ہو اور کوئی آرام طلبی میں لیکن اپنے نقطۂ نگاہ کے ماتحت جس جس چیز کو وہ راحت اور آرام کا سبب سمجھتے ہیں اس چیز کو وہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنی اولادوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔

ایک تعلیم یافتہ ماں اگر اپنے بچے کی بہتری اس میں خیال کرتی ہے کہ اس کی بیماری کے ایام میں ڈاکٹر کی کڑوی کڑوی دوائیں اس کو پلائے۔ تو وہ تمہیں اپنے بچے کی لاتیں اپنی لاتوں میں دبائے ہوئے اور اس کا سر اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے چمچے سے اس کے منہ میں دوائی ڈالتی ہوئی نظر آئے گی۔ اس کے بچے کے آنسو اس کی آنکھوں میں آنسو لا رہے ہوں گے اور اس کی تکلیف اس کے دل میں درد پیدا کر رہی ہو گی لیکن وہ اپنے فعل سے باز نہیں آئے گی کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ اس کے بچہ کی راحت اس دوا کے پلانے میں ہے۔ اسی طرح ایک جاہل عورت جو اس عارضی تکلیف کو بیماری کی مستقل تکلیف سے زیادہ سمجھتی ہے یا جس کا یہ خیال ہے کہ صحت تو خدا ہی کی طرف سے آتی ہے، دوائیاں تو صرف ایک بہانہ ہیں۔ قضا و قدر جس طرح جاری ہوئی ہے جاری ہو کر رہے گی تم اسے دیکھو گے کہ اپنے خاوند کی لائی ہوئی دوائی کو

وہ اپنے ہاتھوں سے پرے پھینک دے گی اور اپنے بچے کو اپنے گلے سے لپٹا کر پیار کرتے ہوئے کہیگی کہ میرے پیارے بچے تو رو نہیں میں تجھے دوائی نہیں پلاتی۔ یہاں عمل مختلف ہے مگر جذبہ ایک ہے۔ وہ تعلیم یافتہ عورت دوائی پلاتے وقت اور وہ جاہل عورت دوائی پھینکتے وقت ایک ہی روح سے متاثر ہو رہی تھیں ایک دوائی کے پلانے میں اپنے بچے کا آرام دیکھتی تھی تو دوسری دوائی کے پھینکنے میں اس کی راحت پاتی تھی پس تم اس قسم کے فرق تو ضرور دیکھو گے لیکن جذبہ کا فرق کہیں نظر نہ آئے گا۔ کالے اور گورے، مشرقی اور مغربی، جاہل اور عالم، مذہبی اور غیر مذہبی، ہر ایک قسم کے انسان کو اسی جذبے سے متاثر پاؤ گے اور ان کو اسی جذبہ کے ماتحت اپنی زندگیاں بسر کرتے ہوئے دیکھو گے۔ پس اولاد کی محبت ایک ایسا طبعی جذبہ ہے جو صرف دیوانوں اور انسانیت سے خارج انسانوں کے دلوں سے ہی باہر ہوتا ہے ورنہ ہر انسان اس سے متاثر ہوتا ہے اور اس کے ماتحت اپنی زندگی کے اعمال بجالاتا ہے۔ خواہ خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے خواہ صرف حیوانی جذبہ سے متاثر ہو کر۔

پس آج کی عید ہمیں اس جذبے کی قربانی کی طرف راہنمائی کرتی ہے جو انسانی جذبات میں سے قوی تر اور وسیع تر ہے قوی ہے کہ اس سے زیادہ قوی کوئی اور انسانی جذبہ نہیں۔ اور وسیع ہے کہ اس سے زیادہ وسیع کوئی اور انسانی جذبہ نہیں۔ آج کے دن ہزاروں سال پہلے ابراہیمؑ نے خدا سے حکم پایا کہ وہ اس چیز کو جس کو دنیا سب سے زیادہ عزیز قرار دیتی ہے اور جس کی زندگی کے لئے دنیا بھر کے باپ اور ماں زندہ رہ رہے ہیں، وہ خدا کے لئے اسے قربان کر دے۔ ابراہیمؑ کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے رب سے یہ نہیں پوچھا کہ اے میرے خدا! یہ جذبۂ لطیف جو باپ کے دل میں اپنے بیٹے کی محبت کے متعلق پیدا ہوتا ہے یہ تو تیرا ہی پیدا کیا ہوا ہے اور ایک مقدس امانت ہے اس مقدس امانت کی قربانی کا مطالبہ کیا ایک غیر طبعی حکم نہیں ہے اور کیا اس ماں کے جذبات کو جس کی تمام امیدیں اس ایک نقطہ کے ساتھ وابستہ ہیں، ایک ایسی ٹھیس نہیں لگے گی جس کا ازالہ بالکل ناممکن ہو گا۔ ابراہیمؑ بھول گیا اپنے جذبات کو اور وہ بھول گیا ہاجرہ کے جذبات کو۔ وہ بھول گیا اپنے آباء کی ارواح کے جذبات کو جو ابراہیمؑ کے ذریعہ سے اپنی نسلوں کے دوام کی امیدوار تھیں اور ایک ایسی حالت میں جبکہ وہ بوڑھا تھا اور ایک ہی اس کی اولاد تھی وہ اس ایک ہی اولاد کو ایسے وقت میں جبکہ دوسری اولاد کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ قربان کرنے کے لئے تیار ہو گیا بغیر ہچکچاہٹ کے بغیر سوال کے بغیر تشریح طلب کرنے کے بے چون وچرا۔ گویا کہ یہ ایک ایسا عام واقعہ ہے جس میں کوئی بھی تعجب کی بات نہیں یا ایک ایسا فرض ہے

جیسے ہر انسان ہر روز ہی ادا کر رہا ہے اور اس میں کوئی اچنبھا نظر نہیں آتا۔ اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو زمین پر گرایا۔ اور چھری اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔ اور اس کام کو جو بظاہر خلافِ فطرت نظر آتا ہے۔ ایسے شوق سے کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ گویا انسان پیدا ہی اس کام کے لئے کیا گیا ہے۔ انسان ابراہیمؑ کے فعل کو دیکھکر حیران رہ جاتا ہے۔ اور چونکہ ابراہیمؑ کے زمانہ کو ایک لمبا عرصہ گذر چکا ہے۔ ایک مذہب سے ناواقف اور ابراہیمؑ کی خوبیوں سے جاہل انسان یہ خیال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاید ابراہیمؑ (نعوذ باللہ) دیوانہ تھا، شاید وہ انسانی جذبات سے عاری تھا شاید بنی نوع انسان میں وہ سب سے زیادہ سخت دل اور سب سے زیادہ شقی القلب تھا۔ کہ اس چیز کی قربانی کے لئے آمادہ ہو گیا جس چیز کی قربانی کے لئے ایک جاہل اور اجڈ انسان بھی تیار نہیں ہوتا۔ ایسے ہی لوگوں کے شک کو دُور کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاہٌ مُّنِیْبٌ ابراہیمؑ تو بہت ہی دانا بڑا ہی نرم دل اور خدا تعالےٰ کا عشق رکھنے والا انسان تھا یعنی ایک ذرا سی دُکھ درد کی بات دیکھکر اس کے دل کو ٹھیس لگ جاتی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو اور اس کے مونہہ سے آہیں نکلنے لگ جاتی تھیں۔ اور وہ تکلیف سے بے تاب ہو جاتا تھا۔

جب لوطؑ کی قوم پر عذاب آیا تو اللہ تعالےٰ نے وہ فرشتے جو اس عذاب کی تکمیل کے لئے ارسال فرمائے خواہ وہ انسان تھے یا حقیقی ملائکہ تھے، مَیں اس موقعہ پر اس بحث میں نہیں پڑتا وہ پہلے ابراہیمؑ ہی کے پاس آئے اور ان کو بتایا کہ اس اس طرح لوطؑ کی قوم پر عذاب آنیوالا ہے اس وقت ابراہیمؑ کے قلب کی جو حالت ہوئی اور ان کافروں کے مارے جانے کی خبر پر جو دکھ ان کو پہنچا۔ قرآن کریم میں اور بائیبل میں اس کا ذکر موجود ہے۔ شاید وہ مائیں بھی اس طرح بیتاب نہ ہوئی ہوں گی جن کے بچے اس عذاب میں تباہ ہوئے جس طرح ابراہیمؑ ان کی موت کی خبر سُنکر بے تاب ہؤا۔ اور وہ لوگ جو اس کے ہم مذہب اور بھائی اور پھر ساتھ ہی عَلّاتی بھائی یعنی ایک بنی کو دکھ دے رہے تھے اور ہر روز اسے ایذائیں پہنچا رہے تھے جب ان کی تباہی کی خبر ابراہیمؑ کو سنائی گئی تو وہ خوش نہیں ہؤا۔ اس نے بے پرواہی بھی ظاہر نہیں کی وہ گھبرا کر اٹھا اور اس نے اپنے خدا کے سامنے رو رو کر التجا شروع کی کہ اے میرے خدا۔ اے میرے خدا! کیا تو اس شہر کو ہلاک کر دے گا۔ جبکہ اس میں تیرے نیک بندے بھی موجود ہیں۔ اور اگر ہزاروں بد ہیں تو سینکڑوں نیک بھی ہوں گے۔ تب خدا نے ابراہیم کے رحم اور اس کے دکھ کو دیکھتے ہوئے فرمایا۔ اے ابراہیم! مَیں تیری خاطر اگر سینکڑوں نیک بندے وہاں ہونگے تو اس شہر کو بچا لوں گا۔ تب ابراہیمؑ نے سمجھا کہ شاید اس شہر میں سینکڑوں نیک بندے

موجود نہیں ہیں اور اس نے کہا۔ اے خدا! کیا اگر ایک سو نیک بندہ ہوگا تو تو اس کو تباہ ہونے دے گا۔ تب اللہ تعالیٰ نے کہا۔ نہیں اگر ایک سو نیک بندہ بھی ہوا تب بھی میں اس شہر کو تباہی سے بچا لوں گا تب ابراہیمؑ نے سوچا شاید سو نیک بندہ بھی اس شہر میں نہیں ہے اور اس نے دعا کی! اے میرے خدا۔ اے میرے خدا! جو سو نیک بندوں کے لئے اس شہر کو بچانے کے لئے آمادہ ہے اگر صرف دس اس میں سے کم ہوں اور نوّے نیک بندے اس جگہ پر موجود ہوں تو کیا تیری سی رحیم ہستی صرف دس آدمیوں کی کمی کی وجہ سے اس شہر کو تباہ ہونے دے گی تب خدا نے کہا۔ اے ابراہیم! اگر نوّے نیک بندے بھی اس شہر میں موجود ہوئے تو میں تیری خاطر اس کو تباہی سے بچا لوں گا تب ابراہیمؑ پھر نئے جوش سے دعا کے لئے کھڑا ہوا اور اس نے خدا تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے میرے رحیم خدا۔ جو نوّے نیک بندوں کی خاطر اس علاقے کو بچانے کے لئے تیار ہے اگر صرف دس نیک بندے اس میں سے کم ہوں اور صرف اسّی نیک بندے اس میں پائے جائیں۔ اے میرے رب کیا تو اُن اسّی کی خاطر اس شہر کو نہیں بچائیگا تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے ابراہیم! میں ان اسّی کی خاطر بھی اس شہر کو بچا لوں گا۔ اور ابراہیمؑ کی امید اور بھی کم ہو گئی اور وہ سمجھ گیا کہ اس شہر میں اسّی نیک بندے بھی موجود نہیں ہیں۔ مگر اس نے دعا نہ چھوڑی اور دس دس کے فرق کے ساتھ وہ خدا کی رحمت کو جوش میں لاتا گیا یہاں تک کہ آخری دعا اس کی یہ تھی کہ اے میرے خدا۔ اے میرے خدا۔ دس نیک بندے بھی تو بڑی چیز ہیں۔ اگر دس نیک بندے اس شہر میں پائے جاتے ہوں تو اے میرے رب کیا تو اس شہر کو ہلاک ہونے دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ ابراہیمؑ میں تیرے درد کی خاطر دس نیک بندوں کی موجودگی میں بھی اس شہر کو بچا لونگا لیکن ابراہیم اس میں تو دس نیک بندے بھی موجود نہیں۔ تب ابراہیمؑ نے سمجھ لیا کہ لوطؑ اور اس کی اولاد کے سوا اس شہر میں سے کوئی بچائے جانے کے قابل نہیں ہے اور اس نے جان لیا کہ ان کمزور اور گنہگار بندوں کے بچانے کے لئے جو لوطؑ کی بستیوں میں بستے تھے شفاعت کے تمام سامان ختم ہو گئے اور وہ اس بارے میں بالکل بے بس اور بے طاقت ہے اور وہ درد اور دُکھ کے ساتھ اپنی ہی جان کو ہلکان کرتا ہوا خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اور اس کے دل کا یہ درد اور اس کے جذبات کی یہ نزاکت اللہ تعالیٰ کو ایسی پسند آئی کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ۔ ابراہیمؑ کو دیکھو کہ یہ ہمارا بندہ کیسا دانا۔ پھر کیسا دردمند ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی تکلیف پر آہیں بھرنے لگ جاتا اور دُکھ اور تکلیف محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ اور ہمارا بھی کیسا عاشق ہے۔ یہ کیسے پیارے الفاظ ہیں جن میں خدا تعالیٰ ابراہیمؑ کو یاد کرتا ہے۔ اب اگر ہم تمثیل کی نگاہ سے

اس کو دیکھیں اور تمثیل کی زبان سے اس واقعہ کو بیان کریں۔ تو ہمیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک محبت کرنے والی ماں ہے اور ابراہیمؑ ایک کمزور دل بچہ ہے جس نے ایک دردناک واقعہ دیکھا اور بلک بلک کر اپنی ماں کو چمٹ گیا۔ ماں اس کو ممنون کرنا چاہتی تھی مگر حالات سے مجبور تھی وہ واقعات کو تبدیل نہیں کر سکتی تھی مگر وہ اس کے دکھ کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی اس موقعہ پر اس نے وہی کیا جو وہ کر سکتی تھی یعنی اس نے اس کو اپنے گلے سے لگا لیا اور پیار کرتے ہوئے بولی کہ ہائے میرا بچہ ہائے میرا بچہ! یہ کتنا نازک دل والا اور کتنا رحم والا ہے۔ لفظ مختصر ہیں مگر جذبات کا ایک وسیع سمندر پیچھے لہریں مار رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانی جذبات سے بالا ہے۔ اور ہم اس کی صفات کی کیفیات کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے۔ مگر اس موقعہ پر جب خدا نے ابراہیمؑ کے لئے حَلِیْمٌ اَوَّاہٌ مُّنِیْبٌ کے الفاظ استعمال کئے تو اس وقت اس کی صفتِ شفقت اور صفت رأفت جس جوش میں ظاہر ہو رہی ہوگی وہ ایسی کیف انگیز ہے کہ ہم گو الفاظ میں اس کو بیان نہ کر سکیں لیکن ہمارے دل اس کی لذت سے آشنا ہیں۔ اور ہمارے قلوب اس سے مزا لے رہے ہیں اور ہم پر ظاہر کرتے ہیں کہ وہ جو خدا کے لئے تکلیف اٹھاتا ہے خدا تعالیٰ بھی اس کے لئے ایک ایسی صفت کا اظہار فرماتا ہے۔ کہ گو الفاظ میں یہ کہنا بے ادبی ہوگی مگر وہ کچھ ایسی ہی چیز ہوتی ہے کہ جس طرح ماں کا دل اپنے بچہ کی تکلیف کو دیکھ کر خون ہو جاتا ہے۔ گویا خدا تعالیٰ کا دل بھی ابراہیمؑ کی تکلیف کو دیکھ کر درد سے بھر گیا۔ یہ تمثیلی زبان ہوگی اور حقیقت سے کوسوں دور۔ لیکن ہمارے پاس اور کوئی الفاظ بھی تو نہیں کہ جن سے اس حقیقت کا کوئی قریب تر نقشہ کھینچ سکیں۔ یہ تمثیل خواہ کوسوں دور ہو مگر اس حقیقت کے بیان کرنے کے لئے قریب ترین ہے۔ اور شاید انسانی ذہن اللہ تعالیٰ کی ایسی صفات کے سمجھنے کے لئے اس سے زیادہ اور الفاظ کے ذریعہ حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کو باپ کی صورت میں پیش کیا ہے[۵] اور بعض مذاہب نے ماں کی صورت میں[۶]۔ اسلام نے ایسی تمثیلوں سے اجتناب کیا ہے مگر پھر بھی وہ یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکا کہ خدا کا تعلق اس کے بندہ سے اپنے باپ اور اپنی ماں اور اپنے دوسرے رشتہ داروں سے زیادہ قریب کا ہے[۷]۔ شاید میں اپنے اصل مضمون سے کسی قدر دور ہو گیا ہوں۔ مگر جذباتی دنیا کا یہی حال ہوتا ہے۔ انسان جذبات کے تابع ہوتا ہے نہ کہ جذبات انسان کے۔ پس شاید جذبات مجھے بھی کہیں سے کہیں لے گئے۔ میں یہ مضمون بیان کر رہا تھا کہ ابراہیمؑ جس نے اپنے بیٹے کی قربانی خدا کے لئے پیش کی وہ دیوانہ نہیں تھا۔ کیونکہ خدا اس کو حَلِیْمٌ کہتا ہے جس کے معنے دانا کے ہیں[۸]۔ اور وہ جذبات سے عاری نہیں تھا اور سنگدل نہیں تھا کیونکہ خدا اسے اَوَّاہٌ

کہتا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اس کے جذبات نہایت ہی اُبھرے ہوئے اور نازک تھے[9]۔ اور یہی وہ سبب ہیں جن کے ماتحت انسان ان فطرتی تقاضوں کو بھول جاتا ہے جن کو پورا کرنا ہر انسان کی فطرت کا جزو ہے۔ پس جب ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی پیش کی تو اس کے دلی جذبات کا اندازہ بہترین محبت کرنے والے ماں باپ کے جذبات سے کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابراہیم ان محبت کرنے والے اور ان دُکھ اٹھانے والے ماں باپ سے جُدا قسم کا انسان تھا جو اپنے بچے کی ایک ذراسی تکلیف بھی نہیں دیکھ سکتے بلکہ لوطؑ کے واقعہ سے ظاہر ہے کہ اپنے تو الگ رہے وہ بیگانوں کا دُکھ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اب تم لوطؑ کے واقعہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے ہوئے اس حساس دل کا خیال کرو جو دشمن کی تکلیف بھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ اور اس کے آرام کے لئے بھی خدا سے جھگڑتا تھا کہ جبکہ اس نے شدید ترین دشمنانِ مذہب اور خود اپنے خاندان کے اشد ترین مخالفوں کی تباہی کی خبر سُنکر ساری رات خدا سے جھگڑے میں گذار دی اور قدم بقدم اس کے رحم سے اس اس طرح اپیل کی کہ خدا کے رحم کو ماننے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ اور وہ تب تک خاموش نہ ہوا جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو گیا کہ رحم کی اب کوئی بھی صورت باقی نہیں رہی۔ اس ابراہیمؑ کو جب اس کے بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تو جس ابراہیمؑ نے دشمنوں کی ہلاکت کے لئے ساری رات خدا سے بحث کی تھی اپنے بیٹے کے متعلق اس نے ایک لفظ بھی تو نہیں کہا اور فوراً لبیک کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی پیش کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ حج کے دن حاجی لبّیک لبّیک لاشریک لک لبّیک[10] کے نعرے لگاتے ہوئے خانۂ کعبہ اور وہاں سے منیٰ کی طرف جاتے ہیں وہ اسی نظارہ کی تمثیل ہوتی ہے گویا وہ ابراہیمؑ کی نقل کر رہے ہوتے ہیں۔ اور اپنے مونہہ سے اقرار کر رہے ہوتے ہیں کہ جس وقت خدا نے اس سے کہا اے ابراہیمؑ اپنے بیٹے کی قربانی کر تو اس نے قربانی کے وقت کا انتظار نہیں کیا بلکہ اس خیال سے کہ اس حکم کے سننے اور قربانی کے پیش کرنے میں جو دیر لگے گی۔ وہ میرے ربّ کو گراں نہ گذرے۔ اس نے اسی وقت سے پکارنا شروع کیا لبّیک لبّیک لاشریک لک لبّیک۔ اے میرے ربّ مَیں حاضر ہوں اے ربّ مَیں حاضر ہوں تیرا اور کوئی شریک نہیں ہے۔ اے خدا! مَیں پھر کہتا ہوں کہ مَیں حاضر ہوں اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ خدا تعالیٰ کے قربانی کے مطالبہ کو پورا کرنے میں اسی والہانہ رنگ سے کھڑا ہوتا ہے۔ جیسا ایک سخی انسان جو دردمند دل رکھتا ہے کسی پیاسے کی آواز سُنکر جو شدت پیاس سے کراہ رہا ہو دُور سے چلّاتا ہے کہ مَیں پانی لا رہا ہوں! پانی لا رہا ہوں! تا اسے انتظار کی مزید تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ یہ کیسا دردناک نظارہ اور عشق کا مظاہرہ ہے۔ پیش تو ایک لڑکے

کی جان کرنی ہے اور وہ بھی اکلوتا لڑکا۔ اور اکلوتا لڑکا بھی وہ جو بڑھاپے میں پیدا ہوا تھا اور جس کے بعد کسی اور لڑکے کے پیدا ہونے کی بظاہر کوئی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اسے پیش اس طرح کیا جاتا ہے جیسے ایک پیاسے کو پانی کا گلاس دیا جاتا ہے یا بھوکے کو کھانا دیا جاتا ہے۔ لوگ آجکل چھوٹی چھوٹی باتوں اور چھوٹی چھوٹی قربانیوں کے بعد جب ان قربانیوں کے پیش کرنیوالے اپنی قوم کی مجلسوں میں حاضر ہوتے ہیں تو بے اختیار ہو کر نعرے لگاتے ہیں کہ فلاں شخص زندہ باد مگر ابراہیم نے جو کام کیا اس کے مقابل پر یہ لوگ حیثیت ہی کیا رکھتے ہیں کہ ان کے لئے زندہ باد کے نعرے لگائے جائیں۔ اور تم جانتے ہو کہ یہ عید دوسرے لفظوں میں خدا تعالےٰ کی آواز ہے جو مسلمانوں کے ذریعہ سے تمام دنیا پر سے ایک وقت میں بلند کی جاتی ہے اور جس کا اگر تمثیلی زبان میں ترجمہ کیا جائے تو اُردو میں اس کے لئے یہی الفاظ ہوں گے کہ ابراہیمؑ زندہ باد۔

ہم جب اس عید کے موقع پر کپڑے بدلتے ہیں، نہاتے ہیں، ایک مجمع میں جمع ہونے کے لئے تیاری کرتے ہیں تو گویا روحانی طور پر ہم اس امر کی تیاری کرتے ہیں کہ ابراہیمؑ کی رُوح کا استقبال کریں گے اور جب ہم نماز میں کھڑے ہو کر تکبیریں کہتے ہیں[۱۱] تو دوسرے الفاظ میں ابراہیمؑ کی قربانی کے موقعہ پر اپنے ہدیۂ تبریک پیش کرنے کی تکبیریں ہوتی ہیں کیونکہ اسلامی طریق کے مطابق جب کوئی شاندار نظارہ نظر آئے جس میں خدا کا جلال ظاہر ہو تو اس وقت تکبیر کہی جاتی ہے[۱۲]

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں جنگِ احزاب[۱۳] کے موقعہ پر دشمنوں کی کثرت کی وجہ سے ایک خندق کے کھودنے کی ضرورت پیش آئی تھی تاکہ دشمن رات اور دن کسی وقت بھی چھاپہ نہ مار سکے۔ کیونکہ مسلمانوں کی فوج اتنی تھوڑی تھی کہ وہ چوبیس گھنٹے ہر مقام کا پہرہ نہیں دے سکتے تھے۔ تب آدمیوں کی کمی کو پورا کرنے کے لئے ایک خندق کھودی گئی تاکہ تھوڑے آدمیوں کے ذریعہ بہت آدمیوں کا کام لیا جا سکے۔ جب وہ خندق کھودی جارہی تھی تو ایک جگہ پر ایک پتھر نظر آیا جسے باوجود کوشش کے صحابہؓ نہ توڑ سکے۔ اور انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس شکایت کی کہ ایک چٹان ایسی آگئی ہے کہ اسے توڑا نہیں جا سکتا اور خندق مکمل نہیں ہو سکتی۔ تب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اس جگہ پر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ کدال میرے ہاتھ میں دو۔ اور آپؐ نے زور سے کدال اس چٹان پر ماری ایسے زور سے کہ لوہے اور پتھر کے آپس میں ٹکرانے کی وجہ سے ایک آگ کا شعلہ نکلا۔ آپؐ نے فرمایا اللہ اکبر اور سارے صحابہؓ نے ساتھ کہا اللہ اکبر۔ پھر آپؐ نے دوسری دفعہ کدال اُٹھائی اور اپنے پورے زور سے پھر وہ کدال چٹان پر ماری۔ اور پھر اس میں سے آگ کا ایک شعلہ نکلا اور

پھر آپؐ نے فرمایا اللہ اکبر۔ اور سب صحابہؓ نے ساتھ ہی کہا اللہ اکبر۔ پھر آپؐ نے تیسری دفعہ کدال اٹھائی اور اپنے پورے زور سے کدال پتھر پر ماری اور پھر اس میں سے ایک شعلہ نکلا اور پھر آپ نے فرمایا اللہ اکبر۔ اور صحابہؓ نے بھی اسی طرح زور سے آواز دی اللہ اکبر۔ اس تیسری ضرب سے وہ پتھر ٹوٹ گیا اور صحابہؓ نے خندق کو مکمل کر لیا۔ تب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ تم نے تین دفعہ تکبیر کے نعرے مارے ہیں، تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ! ہم نے آپؐ کی نقل کی۔ آپؐ نے بھی تین دفعہ اللہ اکبر کہا تھا، سو ہم نے بھی آپ کی نقل میں تین دفعہ تکبیر کے نعرے لگائے۔ آپؐ نے فرمایا۔ کیا تم کو معلوم ہے کہ میں نے تکبیر کیوں کہی تھی۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا جب میں نے پہلی دفعہ کدال ماری اور اس پتھر میں سے آگ کا شعلہ نکلا تو میں نے اس شعلہ میں یہ نظارہ دیکھا کہ اسلامی فوجوں کے سامنے روما کی حکومت کی فوجیں تہ و بالا کر دی گئیں۔ اور میں نے اس موقعہ کے مناسب حال اللہ اکبر کہا۔ پھر جب میں نے دوسری دفعہ کدال ماری اور پتھر کی چٹان میں سے آگ کا شعلہ نکلا تو مجھے یہ نظارہ دکھایا گیا کہ اسلامی سطوت کے سامنے کسرائے ایران کے قصر پر زلزلہ آگیا ہے اور اس کی شوکت توڑ دی گئی ہے۔ تب میں نے اس کے مناسب حال تکبیر کا نعرہ بلند کیا۔ اور جب میں نے تیسری دفعہ کدال پتھر پر ماری اور پھر اس میں سے ایک شعلہ نکلا تو مجھے یہ نظارہ دکھایا گیا کہ حمیر کی طاقت اور قوت اسلام کے مقابلہ میں برباد کر دی گئی۔ تب پھر میں نے خدائی بڑائی بیان کی اور تکبیر کا نعرہ لگایا صحابہؓ نے کہا۔ یا رسول اللہ! پھر جس بات پر آپؐ نے تکبیر کہی ہم نے بھی تکبیر کہی[۱۵]

اس مثال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلامی آداب ہیں کہ جب کوئی خدا کا جلال ظاہر ہو تو مومن اس پر بلند آواز سے اللہ اکبر کہتا ہے۔ سو ہم عید کی نماز میں جو بہت سی تکبیریں کرتے ہیں بلکہ ایام تشریق میں برابر تکبیر بلند کرتے رہتے ہیں[۱۶] تو گویا ابراہیمؑ کی قربانی کے لئے اپنے جذبات استحسان کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔ اور اپنے مونہوں سے اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے ابراہیمؑ کی قربانی میں خدا کی شوکت اور اس کے جلال کو دیکھا مگر کیا یہ ہمارے لئے افسوس کی بات نہیں کہ ہم ابراہیمؑ میں تو خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ہم اپنے نفس میں خدا کو دیکھنا نہیں چاہتے۔ ہم ابراہیمؑ کے ایک مستحسن فعل پر تو اللہ اکبر کہتے ہیں مگر ہمارے دل میں یہ تڑپ پیدا نہیں ہوتی کہ ہم سے بھی کچھ ایسے افعال ظاہر ہوں کہ جنہیں دیکھکر خدا کے بندے بیتاب ہو کر تکبیریں بلند کریں۔ اور زمین اور آسمان اسی طرح ہمارے افعال کی وجہ سے خدا کی بڑائی سے گونج جائیں جس طرح قانونِ قدرت کے ذریعہ سے وہ تسبیح کے ساتھ گونج رہے ہیں۔ اور یہ کوئی

ناممکن بات نہیں ہے کیونکہ ابراہیمؑ کوئی خدا کا سگا بیٹا نہ تھا اور ہم کوئی سوتیلے بیٹے نہیں ہیں۔ کمی خدا کی طرف سے نہیں ہے بلکہ کمی ہماری طرف سے ہے۔

دنیا میں عاشق ہاتھ پھیلائے بیٹھے رہتے ہیں اور معشوق مُنہ پھلائے بیٹھے رہتے ہیں۔ مگر روحانی دنیا نرالی ہے۔ ہمارا معشوق ہاتھ پھیلائے بیٹھا ہے اور ہم میں سے کچھ بدقسمت ہیں جو مونہہ پھیرے بیٹھے ہیں اگر سُوئے ادبی نہ ہوتی اور انسانی الفاظ خدا تعالےٰ کے لئے استعمال کرنے جائز ہوتے تو میں کہتا۔ اے نادان انسان دیکھ تو سہی، تیرا معشوق تیرا خدا کب سے تیری طرف ہاتھ پھیلائے بیٹھا ہے اتنی دیر سے کہ اتنی دیر میں انسان کی نور گوں کا خون بھی خشک ہو جاتا ہے۔ مگر وہ تمثیلوں سے بالا ہے، وُہ نقصوں سے پاک ہے، وہ عیبوں سے مبرّا ہے۔ وہ تمہارا منتظر ہے مگر تمہارا انتظار اس کی بادشاہت میں کمی نہیں پیدا کرتا۔ وہ تمہاری طرف بڑھتا ہے مگر تمہاری بے رغبتی اس کی شان میں کمی نہیں کرسکتی۔ کیونکہ وہ سب نقائص سے پاک ہے۔ اور تمام کمزوریوں سے بالا ہے۔ انسانی زبان اس کی صفات کی حقیقت کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ اور انسانی الفاظ اس کی محبت کی کیفیّت کو ادا ہی نہیں کرسکتے۔ وہ عاشقوں کے عشق سے زیادہ جوش والی، وہ ماں باپ کے جذبات سے زیادہ نازک، وہ دوستوں کی دوستی سے زیادہ گرم ہے لیکن پھر بھی وہ اس کی اذیت کا موجب نہیں ہوتی۔ اور اس کی شان کی کمی کا باعث نہیں ہوتی۔ وہ راغب ہو کر بھی بالا ہے اور انسان مستغنی ہو کر بھی ہیٹا ہے۔ وہ متوجہ ہو کر بھی بڑا ہے اور یہ مُنہ پھیر کر بھی چھوٹا ہے کیونکہ اس کی توجہ احتیاج کی توجہ نہیں ہے بلکہ رحم کی توجہ ہے اور اس کی تڑپ کمزوری کی تڑپ نہیں ہے بلکہ علم کی تڑپ اور حلم کی تڑپ ہے۔ مگر انسان ان باتوں کو نہیں دیکھتا۔ وہ قدم آگے اُٹھانے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ اس بات کا عادی ہو گیا ہے۔ کہ تھیٹروں میں جائے اور جھوٹے بادشاہوں کی شان و شوکت کو دیکھے اور بدبخت یہ نہیں سمجھتا کہ اس کے گھر میں اس وقت ایک خلعت شاہانہ اور ایک تاج اس کے پیدا کرنے والے کی طرف سے آیا ہوا ہے۔ اور ایک بادشاہت کا پروانہ اس کے لئے لکھا ہوا موجود ہے۔ وہ دوسروں کے ایکٹ دیکھنے پر فدا ہوتا ہے مگر اپنی بادشاہت سے مونہہ موڑ لیتا ہے۔

بدقسمت ہے ایسا انسان۔ کاش اس کی ماں اسے پیدا نہ کرتی کہ وہ اپنے وجود میں انسانیت کے لئے عار ہے بلکہ حیوانات کے لئے بھی باعثِ ننگ ہے کہ وہ بے عقل ہو کر خدا کی تسبیح کو بلند کرتے ہیں لیکن یہ عقلمند ہو کر بھی اس سے غافل رہتا ہے اُسے آنکھیں دی گئیں مگر اس نے ان سے فائدہ نہ اُٹھایا اسے کان دیئے گئے۔ مگر اس نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اسے ناک دیا گیا مگر اس نے

اس سے فائدہ نہ اٹھایا اسے چھونے والا جسم دیا گیا مگر اس نے اس سے فائدہ نہ اُٹھایا۔ خدا کی محبت کی شیرینی اس کے سامنے پیش کی گئی مگر یہ بدبخت دُنیا کا حنظل کھاتا رہا مگر اس شیرینی سے اس نے مونہہ پھیر لیا۔ مگر اس کا خدا اس سے پھر بھی مایُوس نہیں ہے۔ دیکھو وہ کس شان سے اپنے آخری کلام میں فرماتا ہے۔ کہ انسانوں نے میرے نبیوں کا انکار کیا لیکن ان کے انکار نے مجھے نبی بھیجنے سے باز نہیں رکھا۔ مَیں اب بھی نبی بھیجتا ہوں اور نبی بھیجتا رہوں گا۔ وہ ماننے سے انکار کرتے جائیں مَیں بلانے سے نہیں ہٹوں گا اور آخر ان کو کھینچ ہی لاؤں گا۔ کیونکہ مَیں نے ان کو اپنی عبودیت کے لئے پَیدا کیا ہے اور میری جنت کا گھر اپنے مکین کے بغیر ویران پڑا ہے۔ خواہ وہ براہ راست آکر اس گھر کو آباد کریں یا دوزخ کے ہسپتال میں سے گذر کر آئیں مگر بہرحال انہیں میرے ہی پاس آنا ہوگا۔ اور مَیں انہیں اپنے پاس لاکر رکھے بغیر نہیں رہوں گا۔ یہ ہے ہمارا محبت کرنے والا خدا۔ ابراہیمؑ نے بڑی نرم دلی دکھائی مگر ابراہیمؑ کے نرم دل کو پَیدا کرنے والا بھی ہمارا خدا ہی تھا۔ پس تمام رحم اسی سے ہے اور تمام خوبیاں اسی کی طرف سے ہیں۔ کوئی حُسن نہیں ہے جو اس کی طرف سے نہ آتا ہو۔ سب نیکی اسی سے ہے اور سب نیکی اسی کی طرف جاتی ہے۔ وہ ایک ہے اور باقی سب ایک افسانہ ہے اور کوئی افسانہ بغیر ایک مرکزی نقطہ کے قائم نہیں رہتا۔ پس جب تک ہمارا افسانہ اس نقطۂ مرکزی سے وابستہ ہے وہ ایک حقیقی اور تاریخی افسانہ ہے جب وہ اس سے جدا ہو جائے وہ ایک خیالی افسانہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ جس کے لئے کوئی دوام نہیں۔ پس کوشش کرو کہ تمہاری زندگیاں ایک حقیقی اور تاریخی افسانہ بنیں۔ جس طرح ابراہیمؑ کی زندگی ایک حقیقی اور تاریخی افسانہ بن گئی۔ اور اپنے آپ کو خدا سے دُور کرکے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے اپنی زندگیوں کو صرف کرکے ایک بے معنی اور لغو وجود مت بناؤ کیونکہ دائمی زندگی ہی اصل زندگی ہے! ورنہ وہ چیز جو آئی اور ختم ہوگئی محض ایک حیوانی زندگی کا مظاہرہ ہے جس طرح کتے کے مرنے سے دنیا میں کوئی تغیر نہیں ہوتا اسی طرح اس انسان کے مرنے سے بھی کوئی تغیر نہیں ہوتا جس کی زندگی ابراہیمؑ کی طرح خدا کے نور کے گرد پروانہ وار چکر نہیں لگا رہی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات کی توفیق دے کہ ہم اس عید سے سبق حاصل کریں اور ہمارے دل اس کے آستانہ محبت کے گرد لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ کہتے ہوئے اس وقت تک گھومتے رہیں جب تک کہ شمع پروانے کو جلا کر اپنے نور میں غائب نہ کردے اور ہمارا وجود لَا شَرِیْکَ لَکَ کی بیّن دلیل نہ ہو جائے۔

اس کے بعد میں دعا کرتا ہوں۔ دوست اس میں شامل ہو جائیں لیکن یہ یاد رہے کہ چونکہ

میں زیادہ بیٹھ نہیں سکتا، دعا کے بعد مصافحہ نہیں ہوگا۔ مجھے راستہ دے دیا جائے تاکہ میں گھر واپس جا سکوں۔"

(الفضل ۴ مارچ ۱۹۳۷ء)

۱؎ ۔ ہود ۱۱: ۷۶۔ ۲؎ ہود ۱۱: ۷۷۔ ۳؎ پیدائش باب ۱۸ آیت ۲۲

۴؎ ۔ پیدائش باب ۱۸ آیت ۲۳ تا ۳۲

۵؎ ۔ انسائیکلوپیڈیا ریلیجس اینڈ ایتھکس جلد ۶ ص۲۴۳ ۔ ص۲۵۸

۶؎ ۔ الملل والنحل مصنفہ امام شہرستانی جلد ۳ ص۲۵۴ حاشیہ۔ انسائیکلوپیڈیا ریلیجس اینڈ ایتھکس جلد ۶ ص۲۷۹، ص۲۸۷

۷؎ ۔ صحیح بخاری کتاب الایمان باب حب الرسول صلے اللہ علیہ وسلم من الایمان۔

۸؎ ۔ مفردات امام راغب زیر لفظ حلم۔ تاج العروس جلد ۸ ص۲۵۶

۹؎ ۔ تاج العروس جلد ۹ ص۳۷۷

۱۰؎ ۔ صحیح بخاری کتاب المناسک باب التلبیۃ میں پوری تلبیہ یوں درج ہے۔ لَبَّیْکَ! اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ! لَبَّیْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ! اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ لَکَ، وَالْمُلْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ۔

۱۱؎ ۔ تکبیر تحریمہ کے بعد اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت سے پہلے پہلی رکعت میں سات اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں کہی جاتی ہیں (جامع ترمذی باب فی التکبیر فی العیدین۔ نیل الاوطار جلد ۳ ص۱۸۴)

۱۲؎ ۔ زرقانی شرح المواہب اللدنیہ جلد ۲ ص۱۱۱ ۔ صحیح بخاری کتاب الدعوات باب الدعا اذا علا عقبۃ

۱۳؎ ۔ جنگ احزاب ۵ھ میں لڑی گئی۔ بنو قریش۔ غطفان اور ان کے حلیف اور یہود نے مل کر دس ہزار کے لشکر جرار کے ساتھ مدینہ پر حملہ کیا تھا۔ اس لئے یہ جنگ۔ جنگِ احزاب کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس موقعہ پر چونکہ مدینہ کے اردگرد ایک خندق کھودی گئی تھی اس لئے اس کا دوسرا نام جنگِ خندق بھی ہے۔ مدینہ کے اندر رہ کر دفاع کرنے کے لئے خندق کھودنے کا مشورہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دیا تھا۔

۱۴؎ ۔ الخصائص الکبریٰ جلد ۱ ص۲۲۹، زرقانی شرح المواہب اللدنیہ جلد ۲ ص۱۱۱

۱۵؎ ۔ ۱۱-۱۲-۱۳ ذی الحجہ کو ایام تشریق کہتے ہیں جن میں ہر فرض نماز کے بعد مندرجہ ذیل الفاظ پر مشتمل تکبیر و تحمید کا ورد کیا جاتا ہے۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَ لِلّٰہِ الْحَمْدُ۔ یہ تکبیرات صرف نمازوں کے بعد ہی نہیں بلکہ دوسرے اوقات میں کہنا بھی مستحب ہے۔ (نیل الاوطار جلد ۲ ص۲۳۵)

---

(۲۶)

(فرمودہ ۱۱ر فروری ۱۹۳۸ء بمقام عیدگاہ قادیان)

چونکہ اسی ہفتہ میں لاہور کے کالجوں کے احمدی طالب علموں* کے آنے کی وجہ سے مجھے گلے کی تکلیف کے باوجود ایک لمبی تقریر کرنی پڑی تھی اس لئے اس دن سے میرا گلا بہت ہی بیٹھا ہوا ہے اور جلسہ سالانہ کے بعد کی گلے کی تکلیف میں جو کمی ہوئی تھی اس میں پھر اضافہ ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے شاید مَیں اپنی آواز دوسروں تک اچھی طرح نہ پہنچا سکوں یا شاید ایک حصہ تک بالکل ہی نہ پہنچا سکوں اور پھر آج تو دو خطبوں کا دن ہے یعنی عید اور جمعہ دونوں جمع ہو گئے ہیں۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا جب جمعہ اور عید جمع ہو جائیں تو اجازت ہے کہ جو لوگ چاہیں جمعہ کی بجائے ظہر کی نماز ادا کر لیں۔ مگر فرمایا۔ ہم تو جمعہ ہی پڑھیں گے۔[1] کل بھی میرے پاس ایک مفتی صاحب کا فتویٰ آیا تھا کہ بعض دوست کہتے ہیں اگر جمعہ کی بجائے ظہر کی نماز ہو جائے تو قربانیوں میں ہم کو سہولت ہو جائے گی اور انہوں نے اس قسم کی حدیثیں لکھ کر ساتھ ہی بھجوا دی تھیں۔ مَیں نے ان کو یہی جواب دیا تھا کہ اس میں کوئی شُبہ نہیں، جمعہ اور عید جب جمع ہو جائیں تو جمعہ کی بجائے ظہر کی نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ مگر ہم تو وہی کریں گے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا اگر کوئی جمعہ کی بجائے ظہر پڑھنا چاہے تو اسے اجازت ہے مگر ہم تو جمعہ ہی پڑھیں گے۔ مَیں نے انہیں کہا۔ مَیں بھی یہی کہتا ہوں کہ جو شخص چاہے آج جمعہ کی بجائے ظہر پڑھ لے۔ مگر جو ظہر پڑھنا چاہتا ہے وہ مجھے کیوں مجبور کرتا ہے کہ مَیں بھی جمعہ نہ پڑھوں۔ مَیں تو وہی کہوں گا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہم جمعہ ہی پڑھیں گے۔

ایک دفعہ ہمارے نانا جان حضرت میر ناصر نواب صاحب مرحوم نے کہیں حدیث میں دیکھا کہ گوہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دسترخوان پر کھائی گئی تھی۔[2] چونکہ وہ احمدیت سے پہلے اہلِ حدیث میں شامل تھے اس لئے ان کے دل میں یہ جوش رہتا تھا کہ ہر حدیث پر عمل کیا جائے

---

*: احمدیہ انٹرکالجئیٹ ایسوسی ایشن لاہور کے ۷۰ طلباء کے علاوہ بعض غیر احمدی طلباء بھی تھے جن سے حضور رضی اللہ عنہ نے جامعہ احمدیہ کے ہوسٹل میں دعوتِ چائے کے موقعہ پر تین گھنٹے تک خطاب فرمایا تھا۔

چنانچہ انہوں نے لوگوں پر زور دینا شروع کر دیا کہ گوہ کھانی چاہیئے۔ اور انہوں نے اس پر اتنا زور دیا کہ اچھی خاصی تبلیغ ہو گئی۔ مجھے بھی ایک دفعہ انہوں نے پندرہ بیس منٹ تک خوب تبلیغ کی اور پھر ہماری نانی جان صاحبہ مرحومہ سے گھر میں گوہ پکوائی تو مجھے بھی کہا کہ کھاؤ۔ میں نے اس وقت ان کے اصرار پر ارادہ کیا کہ گوہ کا گوشت کھا کر دیکھوں، مگر اسے دیکھکر مجھے سخت کراہت آئی اور میں واپس لوٹ آیا۔ ان دنوں کچھ دن تک وہ حدیث کی کتاب نانا صاحب مرحوم اپنے ساتھ رکھتے تھے اور جو بھی ملتا اسے دکھاتے اور پھر پوچھتے کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دسترخوان پر یہ کھائی گئی ہے تو تم کیوں نہیں کھاتے۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے وہ حدیث کی کتاب دی اور حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا اور کہا کہ جب اس حدیث سے ثابت ہے کہ گوہ کا گوشت کھانا جائز ہے۔ تو آپ کو اس کے کھانے پر کوئی اعتراض تو نہیں یہ وہی حدیث تھی جس کے ایک حصہ میں یہ آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے جب وہ پیش کی گئی تو آپ نے فرمایا ہمارے ملک میں چونکہ اس کے کھانے کا رواج نہیں اس لئے میں نہیں کھاتا اگر اور کوئی کھانا چاہے تو بے شک کھالے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے پاس جب میں یہ حدیث لے کر گیا اور میر صاحب کی بات کا آپ سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا۔ میں اس حصے پر عمل کرتا ہوں میر صاحب دوسرے حصہ پر عمل کرلیں۔ یہی میں نے بھی انہیں جواب دیا۔ کہ میں اس حصہ پر عمل کرتا ہوں جس میں آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ہم جمعہ ہی پڑھیں گے اور اگر کوئی دوسرے حصہ پر عمل کرنا چاہتا ہے۔ تو وہ اس حصہ پر عمل کرلے۔ مگر وہ مجھے کیوں مجبور کرنا چاہتا ہے۔ کہ میں بھی اس دوسرے حصہ پر عمل کروں۔ تو آج دو عیدیں جمع ہیں۔ ہمارے ملک کی ایک پنجابی مثل ہے کہ "دو دو تے چوپڑیاں" چونکہ خدا تعالےٰ کی ذات کا بندہ قیاس بھی نہیں کرسکتا اور وہ اپنے بخل کو دوسرے کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ اس لئے ہمارے ملک میں یہ مثل ہے کہ "دو دو تے چوپڑیاں" یعنی ایک تو دو دو روٹیوں کی خواہش رکھنا اور پھر یہ بھی کہنا کہ ان پر گھی بھی لگا ہوا ہو۔ حالانکہ گھی والی تو ایک روٹی ہی کافی ہوا کرتی ہے۔ مگر دیکھو ہمارا رب کیسا سخی ہے کہ اس نے ہمیں دو دو دیں اور پھر چپڑی ہوئی دیں۔ یعنی جمعہ بھی آیا اور عید الاضحیہ بھی آئی اور اس طرح دو عیدیں خدا تعالےٰ نے ہمارے لئے جمع کر دیں۔ اب جس کو دو دو چپڑی ہوئی چپاتیاں ملیں وہ ایک کو رد کیوں کرے گا، وہ تو دونوں لے گا سوائے اس کے کہ اسے کوئی خاص مجبوری پیش آجائے۔ اور اسی لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت دی ہے۔ کہ اگر کوئی مجبور ہو کر ظہر کی نماز پڑھ لے جمعہ نہ پڑھے تو دوسرے کو نہیں چاہیئے کہ اس پر طعن کرے اور اگر بعض لوگ ایسے ہوں جنہیں

دونوں نمازیں ادا کرنے کی توفیق ہو تو دوسرے کو نہیں چاہیئے کہ ان پر اعتراض کرے اور کہے کہ انہوں نے رخصت سے فائدہ نہ اٹھایا[۵۶]

پس اللہ تعالیٰ کے فضل سے آج ہمارے لئے دو عیدیں جمع ہیں جن میں سے پہلی عید تو ہم پڑھ چکے ہیں اور اس کا تتمہ خطبہ کے ذریعہ ادا کر رہے ہیں۔

یہ عید ایک ایسی قربانی کی یادگار ہے جس نے ہم کو دو نہایت اعلیٰ درجہ کے سبق دیئے ہیں۔ اور بھی سبق دیئے ہیں مگر اس وقت میرے مضمون سے چونکہ ان دو سبقوں کا ہی تعلق ہے اس لئے میرے مضمون کے لحاظ سے اس عید نے ہمیں دو اعلیٰ درجہ کے سبق دیئے ہیں۔ ایک تو یہ سبق دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں بندہ کو قربانی کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ اور دوسرا سبق یہ دیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے راستہ میں کچی قربانی کرنے والا کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قربانی پیش کرنے کی جرأت اور اس میں فراخ حوصلگی کی مثال تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے کہ بڑھاپے کی عمر میں جبکہ آپ نوّے سال کے ہو چکے تھے آپ کو ایک بچہ ملتا ہے۔ یہ نہیں کہ آپ کو اس بچہ کی خواہش نہ تھی۔ اس لئے کہ آپ نے کئی شادیاں محض نرینہ اولاد کے حصول کے لئے کیں۔ چنانچہ دو تو حُر عورتوں سے شادی کی[۵۷] جن میں سے ایک حضرت سارہؓ اور ایک حضرت ہاجرہؓ تھیں۔ ان کے علاوہ بعض لونڈیوں سے بھی آپ نے شادی کی[۵۸]۔ اور اس نیت اور اس ارادہ سے کی کہ کوئی بچہ پیدا ہو۔ مَیں نے حضرت ہاجرہ کے متعلق کہا ہے کہ وہ حُر تھیں اور یہ عیسوی تاریخ اور بائیبل کے خلاف ہے۔ عیسائی تاریخ انہیں آزاد قرار نہیں دیتی بلکہ کہتی ہے کہ وہ لونڈی تھیں[۵۹]۔ لیکن خود بائبل کے ہی بعض واقعات اسے غلط قرار دے رہے ہیں۔ کیونکہ بائیبل نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد کا جو مقام تجویز کیا ہے۔ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری اولاد کو شامل نہیں کیا۔ اگر حضرت ہاجرہ لونڈی ہوتیں تو بائبل ان کی اولاد سے وہی سلوک کیوں نہ کرتی جو اس نے دوسری بیویوں کی اولاد سے کیا۔ درحقیقت عیسائی مورخین کو حضرت ہاجرہ سے بُغض تھا اور اس بُغض کی وجہ سے انہوں نے آپ کو لونڈی قرار دے دیا۔ اور چونکہ جھوٹے الزام ہمیشہ الزام لگانے والوں پر لوٹ پڑا کرتے ہیں اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے تو حضرت ہاجرہ پر یہ الزام لگایا کہ وہ مصر کی لونڈی تھیں اور خدا تعالیٰ نے اس کی پاداش میں اس قوم کو کئی سو سال تک حضرت ہاجرہ کی قوم کا غلام بنا دیا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت ان کی حالت بالکل غلاموں کی طرح تھی اور وہ حضرت ہاجرہ کی قوم کے ماتحت تھے۔ تو حضرت ہاجرہ اور حضرت سارہ دو بیویاں آزادوں میں سے تھیں اور حضرت ہاجرہ تو شہزادی تھیں[۶۰]۔ چنانچہ مصر کے شاہی خاندان کے افراد نے اس وجہ سے کہ انہوں نے حضرت

ابراہیم علیہ السلام کی نیکی اور بعض نشانات دیکھے اپنی لڑکی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بیاہ دی تھی۔ لیکن پرانے زمانہ میں قاعدہ تھا اور اب بھی ہندوؤں میں ہے کہ وہ پہلی بیوی کو اصلی بیوی قرار دیتے ہیں اور دوسری بیویوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ اس کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں میں اور ہندوؤں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ مسلمان تمام بیویوں کو یکساں قرار دیتے ہیں۔ مگر ہندو لوگ صرف پہلی بیوی کو بیوی سمجھتے ہیں اور دوسری بیویوں کو اس کا ماتحت قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی جہاں ہندووانہ رسوم کا اثر ہے جب کسی شخص کی دو بیویاں ہوں تو اس کے عزیز پہلی بیوی کے متعلق تو یہ کہتے ہیں کہ یہ بیاہی ہے اور دوسری بیوی کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ نکاحی ہے۔ حالانکہ جو بیاہی ہوئی ہوتی ہے وہ نکاحی بھی ہوتی ہے۔ اور جسے نکاحی کہتے ہیں وہ بھی بیاہی ہوتی ہے۔ مگر وہ ان الفاظ سے دونوں میں فرق کرتے اور یہ بتلاتے ہیں کہ ایک ان میں سے اصل بیوی ہے اور دوسری بعد کی بیوی ہے۔ مگر اسلام نے اس امتیاز کو بالکل مٹا دیا اور سب بیویوں کا حق برابر تسلیم کیا ہے۔ لیکن پہلے زمانہ میں بڑی بیوی کو فوقیت دی جاتی تھی یعنی گھر کی مالکہ صرف وہی سمجھی جاتی تھی۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باوجود بڑی خواہش، بڑے ارادوں اور بڑے چاؤ کے ساتھ شادی کرنے کے بچہ پیدا ہونے کے بعد جب دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں اس کو اس کی راہ میں قربان کر دوں تو وہ فوراً اس کو قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے رؤیا دیکھا تھا کہ میں اپنے بیٹے اسمٰعیل کو ذبح کر رہا ہوں۔ وہ یہ رؤیا دیکھتے ہی اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ میں اسمٰعیل کو ذبح کر دوں۔ حالانکہ ذبح کرنے سے مراد اسمٰعیل کو چھری سے ذبح کرنا نہیں تھا بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے مکّہ کی بے آب وگیاہ وادی میں جا کر چھوڑ آؤ۔ یہی ان کے خواب کی تعبیر تھی اور یہی بات اللہ تعالیٰ نے ان کو بتائی تھی مگر چونکہ تعبیر اپنے وقت پر ظاہر ہوا کرتی ہے۔ اس لئے ان کا ذہن اس وقت اس طرف نہیں گیا کہ اللہ تعالیٰ اس خواب کے ذریعہ مجھے یہ بتا رہا ہے۔ کہ ایک دن تم اپنے اکلوتے بیٹے سے وہ معاملہ کرو گے۔ جو ذبح کرنے کے مترادف ہے۔ اور ہمارے حکم کے ماتحت تمہیں اسے ایک ایسے علاقہ میں چھوڑ کر آنا پڑے گا جہاں میلوں میل تک نہ کھانے کا کوئی سامان ہو گا نہ پینے کا۔ انہوں نے اس خواب کو ظاہری رنگ میں پورا کرنے کے لئے اپنے بیٹے کو گرایا اور چاہا کہ اسے ذبح کر کے اللہ تعالیٰ کے منشاء کو پورا کر دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں الہاماً فرمایا کہ جانے دو، تم نے تو ظاہری شکل میں بھی خواب پوری کر دی۔ لیکن انسان دوسرے کی باتوں کو سُن کر ان جذبات اور احساسات کا قیاس نہیں کر سکتا جو دوسرے کے دل میں پیدا ہو رہے ہوتے ہیں۔ اگر کسی کی اپنی مرغی بھی مر جائے۔ تو اُسے جتنا درد ہوتا ہے اتنا درد اسے دوسرے

کے بیٹے کی وفات کی خبر سُنکر نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگ دوسرے کے غم کی نقل کرکے اس سے ہمدردی کرتے ہیں۔ ان کے دل میں کوئی رنج نہیں ہوتا۔ اگر وہ سامنے آجائیگا تو رونے والی شکل بنالیں گے اور ہمدردی کے چند الفاظ اپنے منہ سے نکال دیں گے لیکن ان کے دل غم کے جذبات سے بالکل خالی ہوں گے۔ اس کے مقابلہ میں اگر ان کی اپنی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ضائع ہوجائے تو وہ اس کے صدمہ کو برداشت نہیں کرسکتے۔ ہمارے ملک میں ایک قصہ مشہور ہے کہ کوئی چوڑھی تھی جو بادشاہ کے گھر میں صفائی کیا کرتی تھی۔ ایک دفعہ جب وہ شاہی محل سے باہر نکلی تو ڈیوڑھی کے اندر کھڑے ہوکر اس کی دیوار سے سر لگا کر اس نے رونا شروع کردیا اور اس درد اور کرب کے ساتھ روئی کہ باہر جو دربان کھڑے تھے انہوں نے سمجھا کہ شاہی خاندان میں کوئی موت واقع ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس خیال پر انہوں نے بھی بغیر سوچے سمجھے رونا شروع کردیا۔ اور دیوار سے لگ کر جھوٹی ہچکیاں لینی شروع کردیں تا ایسا نہ ہو کہ ان کے متعلق یہ سمجھا جائے۔ کہ وہ نمک حرام ہیں۔ ان کو روتے دیکھکر اوروں نے بھی رونا شروع کردیا۔ پھر اوروں نے یہاں تک کہ درباریوں تک یہ بات پہنچ گئی۔ چونکہ درباریوں کو یہ حکم ہوتا ہے کہ جب شاہی خاندان میں کوئی موت واقع ہو تو سیاہ لباس پہنکر آؤ، اس لئے وہ دوڑ دوڑ کر اپنے گھر گئے اور ہر ایک کالا لباس پہنکر دربار میں سر نیچے جھکا کر بیٹھ گیا اور آنکھوں کے آگے رومال رکھ لیا تا یہ معلوم ہو کہ وہ رو رہا ہے۔ مگر جو سب سے بڑا وزیر تھا وہ کچھ سمجھدار تھا وہ بغیر سیاہ لباس پہنے دربار میں آبیٹھا اور اس نے پاس والے سے پوچھا کہ کیا حادثہ ہُوا ہے۔ اس نے کہا مجھے تو پتہ نہیں ساتھ والے کو پتہ ہوگا۔ مَیں نے اسے ماتمی لباس میں بیٹھا دیکھا تھا۔ مَیں بھی پہنکر آگیا کہ شاید شاہی خاندان میں کوئی حادثہ ہُوا ہے۔ اس سے پوچھا گیا تو اس نے آگے سے اپنے پاس والے کا حوالہ دیا اور اس نے تیسرے کا اور اس نے چوتھے کا۔ آخر دربانوں تک بات پہنچی اور انہوں نے چوڑھی کا حوالہ دیا۔ جب اسے بُلا کر پوچھا گیا۔ تو اس نے بتایا کہ اللہ رکھے قلعہ میں تو ہر طرح خیریت ہے۔ بات یہ ہے کہ مَیں نے ایک سؤر کا بچہ پال رکھا تھا۔ آج صبح وہ مر گیا صفائی کا وقت قریب تھا اس لئے مَیں جلدی سے محلات میں آگئی اور جذبات کو دبائے رکھا۔ لیکن جب محل سے باہر آئی تو مجھ سے برداشت نہ ہوسکا اور ڈیوڑھی میں مجھے رونا آگیا۔

اب وہ جذبات جو اس چوڑھی کے دل میں دبے ہوئے تھے وہ چونکہ انہیں نکال نہیں سکی تھی اس لئے جب تک وہ صفائی میں مشغول رہی جذبات دبے رہے۔ مگر جب اس کا کام ختم ہوگیا اور اس کے اعصاب ڈھیلے پڑگئے تو اس نے بے تاب ہوکر رونا شروع کردیا۔ اور باقیوں نے اس کی بے تابی کو دیکھکر یہ قیاس کیا کہ اس قدر غم کسی بڑے حادثہ پر ہی ہوسکتا ہے اور

اس کی نقل میں رونی شکل بنا کر چیخنا شروع کر دیا۔ اور انہوں نے سمجھا کہ شاید بادشاہ یا اس کی بیگم مر گئی ہے۔ مگر بہرحال ان کا رونا مصنوعی رونا تھا اور اس چوڑھی کا رونا حقیقی رونا تھا۔ کیونکہ سؤرنی کا بچہ چوہڑی کا اپنا تھا اور اس کے مرنے پر اس نے حقیقی درد محسوس کیا۔ مگر درباق اور درباری گو بادشاہ یا اس کی ملکہ یا کسی شہزادہ کو رو رہے تھے مگر ان کا رونا مصنوعی تھا کیونکہ بادشاہ یا ملکہ سے ان کا حقیقی تعلق نہ تھا۔ تو اپنی قلیل سے قلیل تکلیف بھی بڑی معلوم ہوتی ہے اور دوسرے کی بڑی سے بڑی تکلیف بھی چھوٹی معلوم ہوتی ہے۔

ہمارے یہاں کی ایک مثال ہے۔ غالباً اب بھی وہ دوست یہاں بیٹھے ہوں گے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وہ پرانے صحابی ہیں۔ ایک دفعہ یہاں کسی قسم کا جھگڑا ہو گیا اور احمدیوں نے شکایت کی کہ بعض ہندوؤں نے ان پر آوازے کسے ہیں اور فساد کرانا چاہا ہے۔ مَیں نے اس کی تحقیق کرانی چاہی کہ آیا واقعہ میں ایسا ہوا ہے یا نہیں۔ تا اگر یہ بات درست ثابت ہو تو ان ہندوؤں کو سمجھا دیا جائے یا اپنے دوستوں کو سمجھایا جائے۔ اس وقت تک ابھی ہندوؤں سے ہمارے تعلقات اچھے تھے۔ اور میری غرض اس تحقیق سے یہ تھی کہ جس کا قصور ثابت ہو اسے سمجھایا جائے۔ چونکہ کسی دوست سے معلوم ہوا کہ وہ اس موقعہ پر موجود تھے اور وہ واقعہ کے عینی گواہ ہیں۔ مَیں نے انہیں بُلایا اور کہا کہ اس قسم کا واقعہ کیا آپ کے سامنے ہوا ہے۔ انہوں نے سمجھا شاید مَیں اس واقعہ کو سُنکر بہت گھبرا گیا ہوں اور ہندوؤں کے دو تین نعروں نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ کہنے لگے، ان باتوں کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے ہمارے ساتھ تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں اس سے بڑے بڑے واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ مَیں نے ان کی یہ بات سُن کر ان سے پوچھا کہ سُنایئے۔ کیا کیا واقعات آپ سے گذرے ہیں۔ اس پر انہوں نے مرزا نظام الدین صاحب کا جو ہمارے چچا تھے ایک واقعہ بیان کیا۔ مرزا نظام الدین صاحب چونکہ سلسلہ کے مخالف تھے اس لئے وہ اپنے جدّی حقوق کی حفاظت کے خیال سے احمدیوں سے بعض دفعہ معمولی معمولی باتوں پر لڑ جھگڑ لیتے تھے۔ مثلاً یہی کہ فلاں جگہ سے مٹی نہیں لینے دینی، فلاں جگہ چار پائیاں نہیں بچھانے دینی۔ خیر تو ان دوست نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ ہم کسی احمدی کے مکان کے لئے یا سلسلہ کے کسی مکان کے لئے تالاب سے مٹی کھود رہے تھے۔ گدھے کھڑے تھے اور ان پر مٹی لادی جا رہی تھی کہ ہم نے دیکھا مرزا نظام الدین صاحب چلے آرہے ہیں اور انہوں نے آتے ہی غصہ سے کہا کہ کون ہے جو یہاں سے مٹی اٹھا رہا ہے۔ بس ان کا یہ کہنا تھا کہ باقی تو سب بھاگ گئے مگر مَیں کھڑا رہا۔ اور مَیں نے اپنا نام لے کر کہا کہ اے فلاں شخص آج تیرے ایمان کی آزمائش کا وقت آگیا۔ چنانچہ مَیں ایک دیوار

کے نیچے بیٹھ گیا۔ اور مَیں نے خدا تعالےٰ سے کہا۔ اے خدا وہ جو تیرے رسول پر غارِ حرا میں وقت آیا تھا بس وہی وقت آج مجھ پر آگیا ہے۔ اب تُو اسی طرح میری مدد کر جس طرح اس دن ہمارے رسولؐ کی مدد کی تھی۔ اب کجا غارِ حرا کا واقعہ اور کجا یہ واقعہ۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہی کرنا تھا کہ کدالیں چھین لیتی تھیں۔ اور مٹی کھودنے سے روک دینا تھا۔ بھلا اس کا غارِ حراء کے واقعہ سے کیا تعلق۔ جہاں اسلام اور جماعت اسلام کی موت کا سوال تھا لوگ لہو لگا کر شہیدوں میں ملنا کتے ہیں۔ مگر یہاں تو اتنی بات بھی نہیں تھی۔ مگر اس بیچارے نے اپنے دل گُردہ کے مطابق اسے ہی غارِ حراء کا واقعہ سمجھا اور خدا تعالےٰ سے دعا کرنی شروع کر دی۔ کہ اے خدا! آج پھر وہی وقت آگیا ہے۔ جو تیرے رسول پر غارِ حرا میں آیا تھا۔ غرض یہ واقعہ سُنا کر وہ دوست کہنے لگے کہ بس جی اللہ تعالےٰ نے دعا سُن لی۔ اور وہی معجزہ غارِ حراء والا دکھا دیا (دراصل یہ تو واقعہ غارِ ثور کا ہے لیکن عوام میں غارِ حراء کے واقعہ سے مشہور ہے۔ اس لئے اس دوست نے اپنے علم کی بناء پر اسے غارِ حراء کا واقعہ ہی کہہ دیا) اور مرزا صاحب واپس چلے گئے اور مجھے کچھ نہ کہا۔ شاید اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر تصرف کیا اور انہیں میں نظر ہی نہیں آیا۔

اب دیکھو اپنی کتنی چھوٹی سی تکلیف رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غارِ ثور والے واقعہ کے برابر نظر آنے لگی۔ حالانکہ ان قربانیوں کے مقابلہ میں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیں اس بیچارے کی قربانی تو الگ رہی ہم میں سے جسے سب سے زیادہ قربانیاں کرنے کا موقعہ ملا ہے اس کی قربانیاں بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ لیکن چونکہ اپنی تکلیف ہمیشہ بڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی ایک معمولی سی تکلیف کو اتنی بڑی اہمیت دیدی۔ تو انسان اپنی چھوٹی سی تکلیف کو بھی بہت بڑا محسوس کرتا ہے اور دوسرے کی بہت بڑی تکلیف کو بھی معمولی خیال کرتا ہے۔ سوائے اس کے کہ دل میں عشق ہو اور محبت کے جذبات دل میں کام کر رہے ہوں۔ کیونکہ جہاں عشق ہو وہاں انسان اپنی تکلیف کو معمولی خیال کرتا مگر اپنے محبوب کی ایک معمولی بلکہ خیالی تکلیف کو بھی بہت بڑی تکلیف محسوس کرتا ہے۔

مجھے ہمیشہ حیرت ہُوا کرتی ہے اور مَیں اپنے دل میں کہا کرتا ہوں کہ الٰہی تیری بھی عجیب قدرت ہے کہ تُو نے کس طرح لوگوں کے دلوں میں میری نسبت محبت کے جذبات پیدا کر دیئے کہ جب کبھی سفر میں باہر جانے کا موقعہ ملے اور میں گھوڑے پر سوار ہوں تو ایک نہ ایک نوجوان حفاظت اور خدمت کے خیال سے میرے گھوڑے کے ساتھ ساتھ پیدل چلتا چلا جاتا ہے۔ اور جب میں گھوڑے سے اُترتا ہوں تو وہ فوراً آگے بڑھکر میرے پاؤں دبانے لگ جاتا ہے اور کہتا ہے حضور تھک گئے ہوں گے۔ مَیں خیال کیا کرتا ہوں کہ مَیں تو گھوڑے پر سوار آیا اور یہ گھوڑے کے ساتھ پیدل چلتا آیا

مگر اس محبت کی وجہ سے جو اسے میرے ساتھ ہے اس کو یہ خیال ہی نہیں آتا کہ یہ تو گھوڑے پر سوار تھے یہ کس طرح تھکے ہوں گے۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ گویا گھوڑے پر وہ سوار تھا اور پیدل مَیں چلتا آیا چنانچہ میرے اصرار کرنے کے باوجود کہ مَیں نہیں تھکا مَیں تو گھوڑے پر آرہا ہوں وہ یہی کہتا چلا جاتا ہے۔ کہ نہیں حضور تھک گئے ہوں گے مجھے خدمت کا موقعہ دیا جائے اور پاؤں دبانے لگ جاتا ہے تو جہاں محبت ہو وہاں اپنی تکلیف انسان کو کم نظر آتی ہے اور اپنے محبوب کی تکلیف بہت زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ لیکن عام حالات میں اپنی تکلیف زیادہ محسوس ہوتی ہے اور دوسرے کی تکلیف کم محسوس ہوتی ہے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ایک صحابی تھے ان کو فریب سے کفار نے گرفتار کر لیا اور چونکہ ان کے ہاتھ سے مکّہ والوں کا کوئی عزیز مارا گیا تھا اس لئے گرفتار کرکے انہیں مکّہ والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ انہوں نے چاہا کہ اپنے اس عزیز کے بدلے اس صحابی کو تکلیفیں دے دے کر ماردیں۔ چند دن انہیں قید میں رکھا اور جب ایک دن انہوں نے چاہا کہ آپ کو شہید کر دیں اور قتل کی تیاری کرنے لگے تو اس وقت انہوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ بہت ڈرا ہوا ہو گا۔ اس صحابی سے پوچھا کہ کیا تمہارا دل چاہتا ہے کہ اس وقت محمد (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) تمہاری جگہ ہوتے اور تم آرام سے مدینہ میں اپنے بیوی بچوں میں بیٹھے ہوئے ہوتے۔ انہوں نے کہا تم تو یہ کہتے ہو کہ کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم یہاں ہوں اور مَیں مدینہ میں اپنی بیوی بچوں میں آرام سے بیٹھا ہوا ہوں لیکن مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ مَیں اپنے گھر میں آرام سے بیٹھا ہوا ہوں اور محمد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو مدینہ کی گلیوں میں چلتے ہوئے کوئی کانٹا بھی چبھ جائے۔ اب دیکھو اس صحابی کو اپنی تکلیف اس وقت یاد نہ رہی بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی محبت اور آپؐ کے عشق میں مدہوش ہونے کی وجہ سے آپؐ کی ایک خیالی تکلیف نے اسے بے چین کر دیا۔

اسی طرح اَور ہزاروں واقعات صحابہ کی زندگی میں ملتے ہیں مثلاً مَیں نے کئی دفعہ سُنایا ہے کہ اُحد کی جنگ میں ایک صحابی سخت زخمی ہوئے یہاں تک کہ ان کی موت کا وقت بالکل قریب آگیا اتفاقاً ایک صحابی جو زخمیوں کی دیکھ بھال میں مشغول تھے ان کے پاس پہنچے اور پوچھا کہ گھر میں کوئی پیغام دینا ہے تو مجھے دیدو۔ تم خود ہی سوچو ایسی تکلیف کی گھڑی میں لوگ کس طرح کراہتے اور چیختے چلاتے ہیں ہائے میں مرگیا۔ ہائے کوئی دوائی دینے والا بھی نہیں۔ یہی الفاظ ہوتے ہیں جو اُن کے منہ سے نکل رہے ہوتے ہیں۔ مگر وہاں نہ مرہم پٹی کا کوئی سامان ہے نہ ڈاکٹر ہیں نہ دوائیاں ہیں نہ سٹریچر ہیں۔ نہ ہسپتال ہیں نہ پچکاریاں ہیں نہ مشک اور عنبر ہیں۔ پتھریلی زمین میں پڑا ہوا ایک انسان خاک و خون میں تڑپ رہا ہے وہ جانتا ہے کہ مَیں عنقریب مرنے والا ہوں اس کی تکلیف اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی ہے۔

جس کی شدت کا اس امر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک تندرست انسان بھی مٹی پر لیٹے تو اسے نیچے سے کنکر وغیرہ چبھتے ہیں مگر وہ زخمی تھا اور سر سے لے کر پیر تک زخمی تھا اور اس زمین میں تڑپ رہا تھا جو پتھریلی تھی اور جس پر جا بجا کنکر اور پتھر پڑے ہوئے تھے اس کا جسم اس وقت ٹکڑے ٹکڑے تھا اور اس کی روح عنقریب اپنے جسم خاکی سے پرواز کرنے والی تھی کہ ایسی نازک حالت میں ایک صحابی آتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے۔ بھائی! کوئی حاجت ہے تو بتادو۔ وہ اپنے ہاتھ آگے بڑھاتا اور اس سے مصافحہ کرتا ہے اور کہتا ہے۔ میں دل میں یہی خواہش کر رہا تھا کہ کاش! اس وقت کوئی مسلمان ملے جو میرا ایک پیغام میرے رشتہ داروں تک پہنچا دے۔ سو خدا کا شکر کہ تم آ گئے۔ تو سنو! میرا یہ پیغام میرے عزیزوں تک پہنچا دینا کہ اے میرے عزیزو! محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خدا تعالےٰ کی ایک بہترین امانت ہیں۔ جب تک ہم زندہ رہے ہم نے اس امانت کو سنبھال کر رکھنے کی کوشش کی۔ اب ہم چلے ہیں اور وہ امانت تمہارے سپرد ہو رہی ہے میں امید کرتا ہوں کہ تم اپنی جانیں قربان کر کے بھی اس امانت کی حفاظت کرو گے اور یہ کہہ کر ان کی جان نکل گئی۔[۱۷]

اب دیکھو سخت کنکریلی اور پتھریلی زمین پر ایک زخمی انسان پڑا ہے۔ وہ سر سے لیکر پیر تک زخمی ہے۔ وہ انتہائی تکلیف میں مبتلا ہے وہ موت کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اس کا تمام خون اس کے جسم سے نکل چکا ہے۔ مگر ایسی حالت میں بھی اُسے اپنی تکلیف کا خیال نہیں آتا۔ اگر آتا ہے تو یہی کہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو مدینہ میں اپنے دوستوں اور خیر خواہوں میں جا رہے ہیں ان کی حفاظت اور اطاعت میں کوئی کمی نہ ہو۔ تو عشق اور محبت میں انسان اپنی تکلیف کو بھی معمولی سمجھتا اور اپنے محبوب کی خیالی تکلیف کو بھی بہت بڑا سمجھتا ہے مگر جہاں عشق نہ ہو۔ وہاں انسان دوسرے کی بڑی سے بڑی تکلیف بھی محسوس نہیں کرتا۔ اسی لئے بہت سے لوگ دنیا میں ایسے ہیں جب وہ سنتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے کی گردن پر چھری رکھدی۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی اور اپنے اکلوتے بیٹے کو ایک بے آب وگیاہ جنگل میں خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت چھوڑ دیا تو ان کے دلوں میں کوئی احساس پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کیا ہُوا؟ اگر حضرت ابراہیمؑ نے یہ قربانی کر دی۔ وہ سمجھتے ہیں بے شک ابراہیمؑ ایک اچھا آدمی تھا اور اس نے نیکی کا ثبوت دیا۔ مگر ان کے جذبات کو اتنی بھی ٹھیس نہیں لگتی جتنی ٹھیس انہیں اس وقت لگتی ہے جب وہ اپنی مرغی کسی کے لئے ذبح کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کی اپنی چیز ہوتی ہے اور ان کے جذبات اور احساسات اس وقت اُبھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ ہم کہیں سیر کے لئے گئے اور رستہ میں ایک جگہ ٹھہرے۔ وہاں ایک

غیر احمدی ٹھیکیدار تھے ان کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق تو نہ تھا مگر چونکہ ہمارے ملک میں یہ طریق ہے کہ خواہ کسی سے کوئی تعلق نہ ہو مہمان نوازی کے طور پر کھانے کے متعلق پوچھ لیتے ہیں۔ اس لئے وہ ٹھیکیدار ہمارے پیچھے پڑ گیا اور کہنے لگا۔ مَیں آج آپ کی دعوت کروں گا۔ مفتی فضل الرحمن صاحبؓ اور شیخ یعقوب علی صاحبؓ ساتھ تھے مَیں نے انہیں کہا کہ ہمارے پاس کافی کھانا موجود ہے' اس کی دعوت قبول نہ کریں۔ کیونکہ جب ہمارا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تو ہمیں کھانا کھلانا اس پر گراں گذرے گا اور مجھ پر ان کا کھانا کھانا گراں گذرے گا۔ انہوں نے کہا نہیں یہ ہمارا واقف ہے اور جب یہ اس قدر اصرار کرتا ہے تو اس کی دعوت کو قبول کر لینا چاہیئے۔ مَیں اپنے ملکی اخلاق کو دیکھتے ہوئے جانتا تھا کہ جس کے ساتھ تعلق نہ ہو اس پر کسی کی دعوت کرنا گراں ہی گذرتا ہے مگر جب انہوں نے اصرار کیا تو مَیں نے کہا اچھا منظور کر لو۔ اس کے بعد اس نے چاہا کہ وہ ہمارے لئے مرغی ذبح کرے چنانچہ اس نے مرغی پکڑنے کے لئے ہاتھ جو مارا تو مرغی ذرا آگے نکل گئی۔ اُس نے آگے ہو کر پھر دوبارہ اس پر ہاتھ مارا تو وہ پھر ذرا آگے ہو گئی اس پر وہ کہنے لگا "ککڑی تے پھڑی نہیں جاندی چلو دال ہی پکا لو۔" ہم نے اسے کہا۔ آپ خواہ مخواہ کیوں تکلیف کرتے ہیں ہمارے پاس کھانا موجود ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ہم نے اپنا پکا ہوا کھانا ہی کھایا بلکہ اسے بھی ساتھ بٹھالیا اور چونکہ کھانا بچ رہا تھا۔ مَیں نے دوستوں سے کہا کہ یہ کھانا بھی ان کو ہی دے دو۔ ہمارے لئے خدا تعالیٰ آگے اور انتظام کر دے گا۔ اب وہ شخص ایک طرف اپنی مہمان نوازی جتانا چاہتا تھا۔ اور دوسری طرف چونکہ اس کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا اس لئے ایک مرغی کا ذبح کرنا بھی اس پر گراں گذر رہا تھا۔ غرض بغیر تعلق کے اپنی مرغی کی قربانی بھی بڑی نظر آتی ہے لیکن دوسرے کا اکلوتا بیٹا بھی اگر مر جائے تو اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔

بے شک وہ لوگ جنہیں حضرت ابراہیمؑ سے اُنس نہیں جنہیں یہ احساس نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ وہ شخص تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دادا لگتا تھا۔ اور وہ نبی ہوتا یا نہ ہوتا، پھر بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عشق کی وجہ سے ہم اس سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاتے، وہ اس قربانی کی قدر وقیمت کو نہ پہچانیں۔ مگر جن لوگوں کے دلوں میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا عشق ہے جو محبت کے جذبات اپنے اندر رکھتے ہیں جو اپنے محبوب کی ایک چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی اپنی قیمتی متاع تصوّر کرتے ہیں، ان کی حالت اس واقعہ کو سُن کر اَور ہی ہو جاتی ہے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دادا عبد المطلب چونکہ آپؐ کے زمانہ سے پہلے گذر چکے

٭ یہاں زمانہ سے مراد زمانہ نبوّت ہے۔ (مرتب)

تھے۔اس لئے ان پر کوئی الزام نہیں۔مگر آپؐ کے چچا ابو طالب جنھوں نے آپ کی بہت بڑی خدمات سرانجام دیں انہوں نے آپؐ کی نبوت کا زمانہ دیکھا لیکن آپ پر ایمان نہیں لائے۔اس لحاظ سے ابو طالب یقیناً اسلام کی موت نہیں مرے۔مگر کسی وقت اگر کوئی شخص پوچھے کہ ابو طالب کیسا تھا تو مونہہ سے انہیں کافر کہتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گلا گھونٹ رہا ہے اور یہی کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بڑی خدمت کی اور دل میں آپؐ پر ایمان بھی رکھتے تھے مگر ظاہر میں وہ ایمان نہیں لائے۔اس طرح سو سو پیچ دے کر بات مونہہ سے نکلتی ہے۔مگر آخر بات وہیں آکر رہ جاتی ہے کہ وہ آپؐ پر ایمان نہیں لائے۔ہماری جماعت میں ایسے کئی لوگ ہیں جنھوں نے مجھ سے یہ سوال کیا اور مجھے انہیں یہی جواب دینا پڑا کہ دیکھو فلاں موقعہ پر انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کی۔اور فلاں موقعہ پر یہ کہا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل میں وہ آپؐ پر ایمان رکھتے تھے گو ظاہر میں وہ ایمان نہیں لائے۔مگر ان کے متعلق کافر کا لفظ مونہہ سے نہیں نکلتا کیونکہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا تھے اور انہوں نے آپؐ کی بہت سی خدمت کی تھی۔تو جہاں سچی محبت ہوتی ہے وہاں انسانی جذبات بھی اُبھرے ہوئے ہوتے ہیں۔اس نقطۂ نگاہ کو مدنظر رکھتے ہوئے تم سوچو کہ ابراہیمؑ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا تھے انہوں نے اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کو کہ وہ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا تھے اور اپنی بیوی حضرت ہاجرہ کو جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دادی تھیں کس طرح اللہ تعالےٰ کے رستہ میں قربان کر دیا۔اور کس طرح انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے اسمٰعیل کو بغیر پانی اور بغیر کھانے اور اپنی بیوی حضرت ہاجرہ کو بغیر کھانے اور بغیر پانی کے مکہ میں اس لئے چھوڑ دیا تا وہ وہاں اللہ تعالےٰ کا نام بلند کریں۔وہ نظارہ کتنا دردناک نظارہ ہوگا۔مَیں نے ماؤں کو دیکھا ہے بعض دفعہ ہنسی سے وہ اپنے بچوں کو ڈراتی ہیں اور جب وہ رونے لگتا ہے تو اس کے ساتھ خود بھی رونے لگ جاتی ہیں۔حالانکہ وہ جانتی ہیں کہ انہوں نے بچے سے ہنسی کی مگر محض اس خیال سے کہ اس کے دل پر اس وقت کیا گذری ہوگی جب وہ روتا ہے تو خود بھی رو پڑتی ہیں۔مَیں نے ماؤں کو دیکھا ہے وہ اپنے بچہ پر ناراض ہوتی ہیں اور اسے کسی کمرہ میں اکیلا بند کر دیتی ہیں پھر جب وہ کمرے میں رونے لگتا ہے تو اس کے جھٹ کر رونے لگ جاتی ہیں اور کہتی ہیں میرے بچے کے دل پر اس وقت کیا گذر رہی ہوگی۔غرض ہم اپنے کئی بچوں میں سے کسی ایک بچے کی حقیقی تکلیف کا نہیں ایک خیالی تکلیف کا تصور کر کے ہی جبکہ ہم اسے کسی جنگل میں نہیں بلکہ اپنے گھر کے ایک کمرہ میں تھوڑی دیر کے لئے بند کر دیتے ہیں اتنی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔کہ اس کا اثر ایک لمبے عرصہ تک

ہماری طبیعت پر چھا جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے جب ہم چھوٹے بچے تھے تو ایک دفعہ ہماری ہمشیرہ مبارکہ کو لڑکیوں نے کھیلتے ہوئے ایک طاقچہ میں بند کر دیا اور خود ادھر کھیل میں مشغول ہو گئیں۔ اپنے آپ کو ایک طاقچہ میں بند دیکھ کر وہ رونے لگیں اور کافی دیر تک روتی رہیں مگر وہ لڑکیاں چلی گئی تھیں اس لئے کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ کچھ وقت گذرنے کے بعد اتفاقاً وہاں سے ایک شخص گذرا اور اسے جب معلوم ہوا کہ اندر کوئی لڑکی رو رہی ہے تو اس نے دروازہ کھولا اور یہ باہر نکل آئیں۔ مجھے یاد ہے اس واقعہ کا سالہا سال تک ہماری والدہ صاحبہ کے دل پر اثر رہا۔ بلکہ ایک دفعہ دس بارہ سال کے بعد میں نے والدہ سے سُنا کہ وہ کہہ رہی تھیں میرا دل گھٹ رہا ہے۔ اور جب میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے تو فرمانے لگیں مجھے اس واقعہ کا خیال آگیا ہے جب لڑکیوں نے مبارکہ کو طاقچہ میں بند کر دیا تھا۔ اب ہماری ہمشیرہ زندہ سلامت بھی نکل آئیں۔ مگر دس بارہ سال کے بعد بھی جب ہماری والدہ صاحبہ کو اس کا خیال آیا تو ان کا دل گھٹ گیا۔ اور فرمانے لگیں کہ مجھے یہ خیال آرہا ہے کہ اس وقت وہ اپنے دل میں کیا کہتی ہوگی کہ میں اندر ہی مر جاؤں گی اور مجھے کوئی نکالنے والا نہیں آئے گا۔ تو ہمارا بچہ اگر ایک معمولی مصیبت میں بھی گرفتار ہوتا ہے تو کئی سالوں کے بعد جب ہمیں اس کی یاد آتی ہے تو ہمارا دل گھٹ جاتا ہے۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو ایک ایسے جنگل میں چھوڑا جس کے گرد منزلوں تک کوئی پانی نہیں تھا جس کے گرد منزلوں تک کوئی کھیتی نہیں تھی۔ جس کے گرد منزلوں تک کوئی قافلہ نہیں گذرتا تھا۔ اور جس کے گرد منزلوں تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ وہاں حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ کو اور اپنے اکلوتے بیٹے کو جو بڑے چاؤ کے بعد بڑھاپے کی عمر میں پیدا ہوا تھا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اس بچے کو چھوڑ دیتے ہیں جس کے متعلق خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر دی گئی تھی کہ تیری آئندہ نسل کی برکت اور عظمت اس کے ذریعہ قائم ہوگی۔ پھر ان کے پاس کوئی کھانے کا ذخیرہ نہیں کوئی پانی کا ذخیرہ نہیں۔ ایک مشکیزہ پانی کا تھا جو چوبیس گھنٹے سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا اور ایک تھیلی کھجوروں کی حضرت ہاجرہ کے لئے تھی۔ جو دو تین دن سے زیادہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہ دو چیزیں انہوں نے حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیل کے پاس چھوڑیں اور انہیں اس بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑ کر واپس لوٹے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑے صابر تھے۔ انہوں نے صبر کیا۔ اور اپنے جذبات کو دبایا۔ مگر پھر بھی حضرت ہاجرہ کو ان کی بعض حرکات سے پتہ لگ گیا۔ کہ یہ اب ہمیشہ کے لئے ہمیں یہاں چھوڑ کر چلے ہیں۔ در اصل انہوں نے حضرت ہاجرہ کو بتایا نہیں تھا کہ میں تمہیں یہاں چھوڑ کر چلا ہوں تا انہیں صدمہ نہ ہو۔ جب وہ انہیں وہاں بٹھا کر جا رہے تھے تو حضرت ہاجرہ کو شبہ پیدا ہوا اور وہ

ان کے پیچھے آئیں اور کہا۔ ابراہیمؑ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا تم اب جا ہی رہے ہو، اور تمہارا واپس آنے کا ارادہ نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے جذبات کی شدت کی وجہ سے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ جب کسی نے اپنے جذبات کو دبایا ہوُا ہو اور وہ بات کرے تو اسے رونا آجاتا ہے۔ حضرت ہاجرہ نے جب دیکھا کہ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تو انہوں نے پھر کہا۔ ابراہیمؑ! تم تو کہیں جا رہے ہو۔ حضرت ابراہیمؑ نے پھر بھی جواب نہیں دیا۔ انہیں اس پر اَور زیادہ شُبہ پیدا ہوُا۔ اور وہ اَور زیادہ اصرار سے پوچھنے لگیں۔ ابراہیم تم ہمیں کہاں چھوڑ کر جا رہے ہو۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ چونکہ ابھی تک حضرت ہاجرہ کو یہ معلوم نہ تھا کہ انہیں خدا کے حکم کے ماتحت یہاں چھوڑا گیا ہے یا دوسری سَوت کی ناراضگی کی وجہ سے۔ اس لئے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جذباتِ رحم کو اپیل کرتے ہوئے کہا۔ کہ ابراہیمؑ بغیر کھانے اور پینے کے کسی سامان کے تم اس جنگل میں چھوڑ کر ہمیں کہاں جا رہے ہو۔ مگر انہوں نے پھر بھی جواب نہیں دیا۔ اس پر حضرت ہاجرہ کو خیال پیدا ہوُا کہ کہیں ابراہیمؑ کا یہ فعل خدائی حکم کے ماتحت نہ ہو۔ اس لئے انہوں نے پوچھا۔ اے ابراہیمؑ! کیا تم خدا کے حکم کے ماتحت ہمیں یہاں چھوڑے جا رہے ہو۔ حضرت ابراہیمؑ پھر بھی اپنے جذبات کی شدّت میں اس کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ مگر انہوں نے آسمان کی طرف اپنا سر اُٹھا کر اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ہاں خدا کے حکم کے ماتحت میں تمہیں یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تب حضرت ہاجرہ اسی وقت لوٹ آئیں اور کہنے لگیں اِذَنْ لَّا یُضَیِّعُنَا۔ اگر خدا نے یہ حکم دیا ہے تو پھر وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔

جب ابراہیم علیہ السلام ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ تو ان کے جذبات جوش میں آگئے اور انہوں نے خدا تعالےٰ کے حضور ہاتھ اُٹھا کر عرض کیا کہ اے میرے خدا! مَیں اپنی بیوی اور بچے کو تیرے سپرد کر چلا ہوں۔ اب تو خود ان کی حفاظت فرمائیو۔

ادھر کچھ دنوں کے بعد وہ پانی جو ایک مشکیزہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام دے گئے تھے۔ ختم ہو گیا۔ کھجوریں ختم ہوئیں یا نہیں اس کے متعلق اس وقت تاریخی شہادت یاد نہیں۔ جب پانی ختم ہوُا تو بچے نے پیاس کی شدّت میں رونا اور بلبلانا شروع کر دیا۔ ہاجرہ دوڑتی ہوئی کبھی اِدھر جاتیں اور کبھی اُدھر۔ اور نظر دوڑاتیں کہ شاید کوئی شخص ایسا نظر آجائے جس کے پاس پانی ہو مگر وہاں تو میلوں میل تک کوئی پانی نہ تھا۔ اور پانی کا خیال کرنا بھی ایک وہم تھا۔ حضرت ہاجرہ لوٹ کر آتیں تو اپنے بچے کو روتا تڑپتا دیکھ کر پھر اِدھر اُدھر بھاگتیں کہ شاید پانی مل جائے۔ مگر کہیں سے پانی دستیاب نہ ہوُا۔ آخر جب بچے کی حالت بہت ہی خراب ہو گئی اور انہوں نے سمجھا کہ اب شدّتِ پیاس سے دم توڑ رہا ہے تو وہ دو پہاڑیاں جن کے پاس انہوں نے اپنا ڈیرہ

لگایا تھا اور جن کا نام صفا اور مروہ تھا ان میں سے ایک پہاڑی پر دوڑ کر چڑھ گئیں کہ شاید کوئی دور سے قافلہ نظر آئے تو وہ اس سے پانی مانگ سکیں مگر انہیں کوئی قافلہ نظر نہ آیا۔ پھر وہ اس پہاڑی سے اتر کر دوسری پہاڑی پر دوڑتی ہوئی چڑھیں کہ شاید دوسری طرف سے کوئی قافلہ جاتا ہوا نظر آئے۔ مگر اس پہاڑی سے بھی انہیں کوئی قافلہ دکھائی نہ دیا۔ اور چونکہ وہ صفا سے جب نیچے اترتی تھیں تو انہیں اپنا بچہ نظر نہیں آتا تھا اس لئے دوڑ کر مروہ پر چڑھتیں تاکہ بچہ ان کی نظروں کے سامنے رہے ایسا نہ ہو کہ اسے کوئی بھیڑیا کھا جائے۔ پھر جب مروہ سے اترتیں تو اسی طرح دوڑ کر صفا پر چڑھ جاتیں تا دیکھیں کہ کوئی پانی والا تو وہاں نہیں۔ اس طرح انہوں نے صفا اور مروہ پر سات چکر لگائے مگر کہیں پانی میسر نہ آیا۔ تب جب کہ ان کی تکلیف اپنی انتہاء کو پہنچ گئی اللہ تعالےٰ نے اپنے ایک فرشتہ سے کہا کہ جا اور ہاجرہ کو کہہ کہ تیرے لئے پانی خدا تعالےٰ نے پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک فرشتہ آیا اور اس نے آواز دی۔ حضرت ہاجرہ نے اپنے جذبات کے دور میں پہلی دفعہ اس آواز کو پوری طرح نہیں سمجھا۔ اور انہوں نے کہا۔ اے خدا کے بندے تیرے پاس کچھ پانی ہے۔ تب اس فرشتہ نے دوبارہ کہا کہ اے ہاجرہ! جا اور دیکھ کہ خدا تعالےٰ نے تیرے بیٹے کے لئے چشمہ پھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ وہ واپس آئیں اور انہوں نے دیکھا کہ حضرت اسمٰعیلؑ جہاں شدتِ پیاس سے تڑپ رہے تھے وہاں پانی کا ایک چشمہ پھوٹ رہا ہے۔ یہ چشمہ دراصل عرصہ سے وہاں تھا مگر اس کا دہانہ مٹی سے بند ہو چکا تھا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے جب پیاس کی شدت میں ایڑیاں رگڑیں۔ تو اس کے دہانہ سے مٹی ہٹ گئی اور چشمہ پھوٹ پڑا۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے جلدی جلدی ہاتھوں سے اس کے دہانہ پر سے مٹی اٹھائی اور اس کا مونہہ کھول کر چلوؤں سے پانی نکالا۔ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو پلایا۔ گویا وہی ایڑیاں جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی موت کے قرب پر دلالت کر رہی تھیں اس کی حیات کا باعث ہو گئیں۔ اور انہیں سے وہ چشمہ پھوٹا جس نے ان کو زندہ کر دیا۔ جب وہاں چشمہ پھوٹ پڑا تو قافلے والوں نے وہاں آنا شروع کر دیا۔ اور انہوں نے حضرت ہاجرہ سے وہاں رہنے کی اجازت طلب کی اور کہا کہ ہم ٹیکس گذار ہو جائیں گے چنانچہ حضرت ہاجرہ نے انہیں اجازت دیدی اور وہ وہاں رہنے لگ گئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ مکہ ایک بہت بڑا شہر بن گیا۔ لیکن ہاجرہ کی عمر خواہ کتنی بھی لمبی ہوئی ہو اس عرصہ میں انہیں جب بھی وہ وقت یاد آجاتا ہو گا جب ان کا بچہ شدتِ پیاس سے تڑپ رہا تھا اور وہ پانی کی تلاش میں دیوانہ وار صفا اور مروہ کے چکر کاٹ رہی تھیں تو ان کا دل دھڑکنے لگ جاتا ہو گا۔

آج اسی کی یاد میں (آج سے میری مراد خاص آج کا دن نہیں بلکہ آجکل کے ایام مراد ہیں)

خدا تعالیٰ کے بندے مکہ میں جمع ہو کر صفا اور مروہ پر دوڑتے ہیں ان کا دوڑنا کتنا مصنوعی ہوتا ہے۔ ان میں سے بہتوں کا دوڑنا کتنا پُر تکلف یا بطور تماشہ اور ناٹک کے ہوتا ہے۔ وہ صفا پر چڑھتے ہیں، وہ مروہ پر چڑھتے ہیں۔ وہ صفا اور مروہ کے درمیان دوڑتے بھی ہیں۔ مگر ان کے دل جذبات سے کلیۃً خالی ہوتے ہیں انہیں یہ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ آج سے ۴۰۰۰ سو سال پہلے اسی مقام پر ایک ماں دوڑ رہی تھی۔ ایسے شدید جذبات کے ساتھ کہ دنیا میں شاید ہی کسی اولاد کے ایسے شدید جذبات ہوں۔ ایسی شدید تکلیف کی حالت میں کہ دنیا میں شاید ہی کسی ماں کو ایسی شدید تکلیف پہنچی ہو۔ وہ اور اس کا اکلوتا بچہ ایک بے آب وگیاہ جنگل میں جس میں منزلوں تک پانی کا کوئی نشان نہ تھا۔ پڑے تھے اور اس کا وہ اکلوتا بچہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنی جان دے رہا تھا سونے کے لئے نہیں۔ چاندی کے لئے نہیں۔ ہیروں اور جواہرات کے لئے نہیں بلکہ پانی کے ایک چُلّو کے لئے جو ایک چوہڑے کو بھی مل جاتا ہے۔ کون ہے جو ان جذبات کو سمجھے کون ہے جو اس حقیقت پر نگاہ ڈالے۔ دوڑنے والے دوڑتے ہیں حج کرنے والے حج کرتے ہیں۔ مگر وہ تہی دل ہوتے ہیں اور اسی لئے تہی دست واپس آجاتے ہیں۔ اگر کسی شخص کے دل میں صفا اور مروہ پر دوڑتے وقت وہی جذبات پیدا ہوں جو ہاجرہ کے دل میں پیدا ہوئے تھے تو اگر وہ یہاں سے مٹی ہو کر بھی گیا تھا تو سونا بن کر واپس آئے گا اور اگر تانبا ہو کر گیا تھا تو اکسیر بن کر واپس آئے گا کیونکہ صفا اور مروہ انسان کو پاک نہیں کرتے اور نہ صفا اور مروہ کی وجہ سے فرشتہ نازل ہوا تھا بلکہ ہاجرہ کے دل کی تکلیف کی وجہ سے جو اس نے خدا کے لئے برداشت کی فرشتہ نازل ہوا تھا۔

حضرت ہاجرہ نے موت کو سامنے کھڑے ہوئے دیکھا اور پھر بھی خدا تعالیٰ پر اعتبار کیا۔ اور حضرت ابراہیمؑ سے کہہ دیا کہ اگر خدا تعالیٰ نے ہمیں اس جگہ چھوڑ دینے کو کہا ہے تو وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ پس خدا تعالیٰ نے بھی نہ چاہا کہ اس کے اعتماد کو ضائع کرے۔ اگر وہی دل لیکر آج بھی کوئی صفا اور مروہ پر دوڑے تو وہ ہاجرہ کی صفات اپنے اندر لے لیگا۔ وہ اسماعیلی صفت انسان بن جائے گا۔ وہ حضرت ابراہیمؑ کی صفات کا مظہر ہو جائے گا۔ مگر ان قربانیوں کے مقابلہ میں کتنی حقیر قربانیاں ہیں جو لوگ کرتے ہیں اور پھر کس قدر بے حقیقت دعوے ہیں جو ان کی زبان پر آتے ہیں۔ آج اسلام کے لئے کس قدر نازک وقت ہے کتنی تاریک گھٹائیں ہیں جو اسلام پر چھائی ہوئی ہیں۔ اگر ہر مسلمان کی گردن آج تلوار کے نیچے ہوتی اگر ہر مسلمان کا سر آج جلاد کے چمڑے کے اوپر رکھا ہوا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اسلام ہرگز اس خطرہ میں نہیں جس خطرہ میں وہ آج گھرا ہوا ہے۔ کیونکہ ایک مسلمان کی گردن کا تلوار کے نیچے ہونا اتنی خطرناک بات نہیں جتنی خطرناک بات

ایک مسلمان کے دل کا شیطان کے قبضہ میں ہونا ہے۔ جب ہمارا دل آزاد ہوگا ہماری قربانی دوسرے کو موہ لے گی۔ کیونکہ گو ہماری گردنیں اس وقت کاٹی جا رہی ہوں گی مگر ہماری زبانوں سے لاالٰہ الاّ اللہ محمد رسُول اللہ کا کلمہ نکل رہا ہوگا۔ لیکن اگر ہمارے دل شیطان کے قبضہ میں ہوں اور ہم ظاہری طور پر تو مسلمان کہلاتے ہوں لیکن اندرونی طور پر ہمارا دل کفر کے آگے جھکا جا رہا ہو تو یہ موت دوسرے کے دل میں جذبۂ مؤدت کس طرح پیدا کر سکتی ہے یہ موت تو اسلام کے دشمن کے دل میں جذبۂ حقارت ہی پیدا کرے گی کیونکہ دشمن جانتا ہے کہ میرا مدمقابل میدان سے بھاگنے والا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ ذلیل ہو کر میدان سے پسپا ہونے والا ہے۔ پس اس کے دل میں حقارت اور نفرت کے جذبات پیدا ہوں گے لیکن اگر کوئی دشمن کا مقابلہ کرتا اور اس کے مقابلہ میں مردانہ وار اپنی جان دے دیتا ہے۔ تو اس کی نفرت کم ہو جاتی ہے۔ اور وہ باوجود دشمن ہونے کے اس کی عزت کرنے لگ جاتا ہے۔ غرض اسلام آج ایسی مصیبت میں مبتلا ہے جس مصیبت میں وہ آج سے پہلے کبھی مبتلا نہیں ہؤا۔ آج اسلام پر دشمن چاروں طرف سے حملہ آور ہے۔ مگر تلواروں سے نہیں بلکہ الحاد اور کفر اور بدعت کے ہتھیاروں سے۔ آج مسلمان کی جان خطرے میں نہیں مگر اس کا ایمان خطرے میں ہے آج اس کے دل اور اسکے دماغ اور اس کے تمام اعتقاد پر کفر مستولی ہو چکا ہے مگر مسلمان ہیں کہ مُردوں کی طرح ہو رہے ہیں۔ اور اسلام کے لئے ان کے دلوں میں کوئی درد پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اسلام کی اس بیکسی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ہر طرف کفر است جوشاں ہمچو افواجِ یزید

دینِ حق بیمار و بیکس ہمچو زین العابدینؑ

مگر زین العابدین پر تو لوگوں کو رحم آتا تھا کیونکہ وہ ظاہری مصیبت میں مبتلا تھے۔ اور ظاہری مصیبتیں انسان کے جذباتِ رحم کو اپیل کیا کرتی ہیں مگر اسلام پر تو رحم کھانے والا بھی کوئی نہیں پھر امام زین العابدین کو وہ مصیبت نہیں پہنچی جو اسلام کو پہنچ رہی ہے۔ جس مصیبت میں آج احمدیت مبتلا ہے جب امام حسین کے لشکر کو شکست دے کر ان کا سر یزید کے سامنے پیش کیا گیا تو اس وقت یزید کتنے غرور اور گھمنڈ میں تھا۔ اور کس طرح لوگ اس سے مرعوب ہو رہے تھے کہ وہ ایک ہی کانٹا جو اس کے دل میں کھٹک رہا تھا اس کو بھی اس نے نکال کر باہر پھینک دیا۔ لوگ اس وقت یزید کی ہیبت سے کس قدر خوفزدہ ہوں گے۔ اور وہ خود اپنے دل میں کس قدر خوش ہوتا ہوگا کہ میں نے امام حسین کو قتل کر دیا اور آج کوئی نہیں جو میرا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ جب اس کے دربار میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا سر کاٹ کر لایا گیا تو چونکہ مرنے والے کے پٹھے کھنچ جاتے ہیں اس لئے ان کے ہونٹ بھی پیچھے کو کھنچے ہوئے تھے۔ یزید نے اس وقت اپنی سوٹی لی اور حضرت امام حسینؓ کے دانتوں پر

یہ کہتے ہوئے مارنی شروع کر دی کہ دیکھو تو اس کے دانت کیسے چمکیلے ہیں۔[۲۵] یہ ایک ظاہری حقارت کی چیز تھی۔ امام حسینؓ کو اس سے کیا نقصان ہو سکتا تھا مگر اس کی اس حرکت پر اسی وقت اس کے دربار میں ایسے لوگ کھڑے ہو گئے جنہوں نے یزید کے اس فعل کو نہایت بُرا محسوس کیا۔ چنانچہ ایک شخص نے اسی وقت یزید کی سوٹی پر ہاتھ مارا اور کہا اسے پیچھے ہٹاؤ۔ میں نے ان دانتوں پر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بوسہ دیتے دیکھا ہے اور باوجود اس کے کہ وہ بادشاہ تھا اور ایسا مغرور بادشاہ تھا اسے یہ جرأت نہیں ہوئی کہ اس کے مقابلہ میں کوئی لفظ کہہ سکے اس نے اپنی نظر نیچے کر لی اور سوٹی کو پرے ہٹا لیا۔[۲۶]

زین العابدین اس وقت بچے تھے اور ان کی تکلیف بھی لوگوں پر اثر ڈالتی تھی۔ مگر یزید نے اپنا رعب جمانے کے لئے چاہا کہ ان کو بھی لوگوں کے سامنے ذلیل کرے۔ چنانچہ کسی نے اُسے یہ تجویز بتائی کہ اس بچے سے تقریر کراؤ جب یہ تقریر نہیں کر سکے گا تو لوگ ہنسیں گے اور یہ ذلیل ہوگا۔ چنانچہ یزید نے پہلے اپنے خاندان میں سے ایک شخص کو کھڑا کیا اور کہا کہ تم تقریر کرو۔ وہ کھڑا ہوا اور اس نے یزید کے خاندان کی تعریف کرنی شروع کر دی کہ یہ خاندان کس عزت وعظمت کا مالک ہے۔ اس کے بعد زین العابدین کو کھڑا کیا گیا وہ اس وقت بارہ تیرہ[۲۷] سال عمر کے بچے تھے ان کی تقریر بالکل بچگانہ ہے اور اسے پڑھ کر خیال آتا ہے کہ ایک بچہ ہے جو صرف دعویٰ بیان کر رہا ہے انہوں نے کہا میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پوتا ہوں*۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم وہ تھے جنہوں نے مکہ فتح کیا جن کے احسانات تمام دنیا پر ہیں اور جن کی غلامی پر ہر شخص کو فخر ہے یہ وہ وقت تھا کہ اِدھر لوگوں نے ان مصیبتوں کو دیکھا۔ جو حضرت امام حسینؓ اور ان کے خاندان پر آئیں اور اُدھر اس بچے کے مونہہ سے یہ سُنا کہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پوتا ہوں نتیجہ یہ ہوا کہ یکدم لوگوں میں جوش پیدا ہو گیا۔ اور یزید کو اس کے مشیروں نے کہا۔ کہ اس مباحثہ کو بند کرو۔ ورنہ تمہاری حکومت خطرہ میں پڑ جائے گی اور لوگ بغاوت کر دیں گے۔[۲۸] یہ ظاہری مصیبتیں تھیں جنہوں نے لوگوں کے دلوں پر اثر کیا۔ بلکہ اَوروں کا کیا ذکر ہے یزید کے اپنے بیٹے پر اس کا اثر ہوا۔ اور وہ اپنے باپ کا سخت مخالف ہو گیا۔ لوگ یزید کو گالیاں دیتے اور اسے بُرا بھلا کہتے ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ اسی کے خاندان میں دو قیمتی جوہر پوشیدہ ہیں۔ جن میں سے ایک جوہر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ہیں اور دوسرا جوہر یزید کا بیٹا ہے۔ جس کا نام بھی جہاں تک مجھے یاد ہے اپنے دادا کے نام پر معاویہ[۲۹] ہی تھا۔ اس نے ان مظالم کو دیکھا اور اندر ہی اندر ان سے متاثر ہوتا چلا گیا۔ مگر چونکہ وہ اپنے باپ کے خلاف بول نہیں سکتا تھا اس لئے خاموش رہا مگر آخر وہ دن آیا کہ اس کا باپ مر گیا۔ باپ نے اپنی زندگی میں ہی اس کے

---

* اس سے مراد اولاد ہے وجہ یہ اصل رشتہ پڑنواسا ہونے کا تھا۔

ہاتھ پر لوگوں کی بیعت کرادی تھی اس لئے یزید کے بعد وہی بادشاہ بنا اور اس نے دوبارہ لوگوں سے بیعت لی۔ بیعت لینے کے بعد وہ اپنے گھر چلا گیا اور چالیس دن یا اس سے کم وبیش اپنے گھر سے باہر نہیں نکلا۔ پھر ایک دن وہ باہر آیا۔ منبر پر کھڑا ہوا اور لوگوں سے کہنے لگا۔ لوگو! میں نے تم سے اپنے ہاتھوں پر بیعت لی ہے مگر اس لئے نہیں کہ میں اپنے آپ کو تم سے بیعت لینے کا اہل سمجھتا ہوں بلکہ اس لئے کہ میں چاہتا تھا تم میں تفرقہ پیدا نہ ہو۔ ورنہ میں اپنے دل میں اُس وقت بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص لوگوں سے بیعت لینے کا اہل ہو تو میں یہ امارت اس کے سپرد کردوں اور خود بری الذمہ ہوجاؤں۔ چنانچہ اس کے بعد میں اپنے گھر چلا گیا۔ اور اتنے دن جو میں باہر نہیں نکلا تو اسی لئے کہ میں یہ سوچتا رہا کہ تمہاری بیعت لینے کا کون شخص اہل ہے میں نے اپنے آپ کو ابوبکرؓ کے مقام پر بھی کھڑا کیا اور چاہا کہ اگر تم میں کوئی عمرؓ ہو تو میں اس کے ہاتھ میں تمہارے ہاتھ دیدوں۔ مگر مجھے تم میں کوئی عمرؓ نظر نہیں آیا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو عمرؓ کے مقام پر کھڑا کیا اور چاہا کہ اگر مجھے ایک آدمی نہیں ملتا تو کم از کم ایسے چھ آدمی ہی مل جائیں جن کے سپرد عمرؓ نے انتخاب خلافت کا کام کیا تھا مگر مجھے آج تم میں ایسے چھ آدمی بھی نظر نہیں آتے۔ اس لئے اے لوگو! یہ اچھی طرح سُن لو کہ میں اس منصب کے قابل نہیں ہوں اور میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میرا باپ اور میرا دادا بھی اس منصب کے قابل نہیں تھے۔ میرا باپ حسینؓ سے درجہ میں بہت کم تھا۔ اور اس کا باپ حسینؓ کے باپ سے کم درجہ رکھتا تھا۔ علیؓ اپنے وقت میں خلافت کا حقدار تھا اور اس کے بعد حسنؓ خلافت کا زیادہ حقدار تھا بہ نسبت میرے دادا اور میرے باپ کے۔ اس لئے میں اس امارت سے سبکدوش ہوتا ہوں اب یہ امر تمہاری مرضی پر منحصر ہے جس کی چاہو بیعت کر لو۔ اس کی ماں اس وقت پردہ کے پیچھے بیٹھی اس کا خطبہ سُن رہی تھی۔ اس نے یہ سنتے ہی کہا۔ کمبخت! تو نے اپنے خاندان کی ناک کاٹ دی اور اس کی تمام عزت خاک میں ملا دی۔ وہ کہنے لگا۔ مجھے جو کچھ کہیں یہ آپ کی مرضی ہے۔ مگر حق بات وہی ہے جو میں نے کہی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ اپنے گھر میں بیٹھ گیا اور چند دن گذرنے کے بعد فوت ہو گیا[۲۶]

یہ اثر تھا ان مظالم کا جو اس نے اپنے خاندان کی طرف سے دیکھے اور یہ اثر تھا ان مصائب کا جو حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ وغیرہ کو پہنچے۔ اس نے ان مقابلوں کو بھی دیکھا جو اس کے دادا کے حضرت علیؓ سے ہوئے اور اس نے ان دکھوں کا بھی مشاہدہ کیا جو اس کے باپ نے حضرت حسینؓ کو پہنچائے۔ اس کا دل یہ مظالم دیکھکر اندر ہی اندر کباب ہو گیا۔ مگر چونکہ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ مقابلہ کے لئے کھڑا ہو سکتا اس لئے خاموش رہا مگر جب عنانِ حکومت اس کے ہاتھ

میں آئی تو اس نے کہدیا کہ میں اسے ہاتھ میں رکھنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔

بوجہ یزید کے نہایت قریبی ہونے کے شاید لوگ اس کی تعریف کرتے ہوئے ڈرتے ہیں خیال کرتے ہیں کہ اگر ہم نے اس کی تعریف کی تو ایسا نہ ہو کہ یہ تعریف یزید کی سمجھی جائے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خواہ اس میں کتنی ہی کمزوریاں ہوں۔ وہ ایک پاک طینت شخص تھا۔ یہ نتیجہ تھا ان ظاہری مصائب کا جو اس نے اپنی آنکھوں سے اہل بیت پر وارد ہوتے دیکھے اور انہی ظاہری مصائب نے یزید کے بیٹے کو حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کا غلام بنا دیا۔ مگر اسلام پر جو برچھی چلائی جا رہی ہے وہ مخفی ہے وہ بظاہر نظر نہیں آتی لیکن اس کا حملہ بڑا خطرناک ہے۔ آج ساری دنیا متحد ہے اور وہ اپنی متفقہ کوششوں سے چاہتی ہے کہ مظلوم اور بیکس اسلام کو مٹا دے اور اس کا کوئی نام لیوا دنیا میں نہ رہے ہم میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آتے ہیں اور کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کہ ہم اسلام کی محافظت کریں گے۔ ہم اپنی جانیں اس کی راہ میں قربان کر دیں گے مگر پھر وہ اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھ جاتے ہیں اور انہیں یاد بھی نہیں رہتا کہ انہوں نے کیا اقرار کیا تھا۔ ہماری وہ قربانیاں جنہیں ہم قربانیاں کہتے ہیں اور جن کو قربانیاں کہنا بھی قربانیوں کی ہتک کرنا ہے، اسلام کی مشکلات کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھتی ہیں پھر ابھی تو ہم صرف مالی قربانیاں کر رہے ہیں جانی قربانی کا موقع تو بالعموم ہندوستان سے باہر ان حکومتوں میں ہی میسر ہے جہاں لوگ احمدیت کے اقرار کی وجہ سے قتل کئے جاتے ہیں۔ پھر وقت کی قربانی بھی بہت کم لوگوں کو میسر ہے اسی طرح وطن کی قربانی جذبات و احساسات کی قربانی آرام و آسائش کی قربانی اور دیگر بہت سی قربانیاں بہت ہی کم لوگوں کو میسر ہیں اور پھر مالی قربانی میں بھی صحیح طریق عمل اختیار نہیں کیا جاتا۔ بہت سے لوگ ہیں جو وعدے کرتے ہیں مگر انہیں پورا نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ ہیں جو وعدے کرتے ہیں مگر انہیں میعاد کے آخر میں پورا کرتے ہیں بہت سے لوگ ہیں جو وعدے کرتے ہیں مگر وعدوں کو پورا کرنے کے لئے سامان بہم نہیں پہنچاتے۔

میں نے تحریک جدید کے شروع میں ہی کہا تھا کہ اگر تم کوئی وعدہ کرتے ہو تو تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم وہ ماحول بھی پیدا کرو جس کے ماتحت تم اپنے وعدے کو آسانی کے ساتھ پورا کر سکو۔ اگر تم صرف ایک ہی کھانا نہیں کھاتے بلکہ کئی عمدہ سے عمدہ کھانے تیار کروا کر کھاتے ہو۔ اگر تم سادہ کپڑے نہیں پہنتے بلکہ لباس پر بہت سا روپیہ بیجا طور پر صرف کر دیتے ہو۔ اور اس طرح تمہارے پاس کچھ نہیں بچتا۔ تو اگر تم نے تحریک جدید میں سو روپے دینے کا وعدہ کیا ہوا ہے سو روپے تم نے وصیت کا دینا ہے اور سو روپے تمہارا کوئی اور چندہ ہے تو وہ تین سو روپے تم کہاں

سے دوگے۔ جب تم نے اس روپے کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی۔ جبکہ اپنی آمد کے برابر پہلے سے ہی تم خرچ کر رہے ہو تو تم مزید بوجھ کس طرح اٹھا سکتے ہو۔ اس صورت میں اگر تم سو یا دو سو روپے کا وعدہ بھی لکھا دیتے ہو تو اس کے یہی معنے ہوں گے کہ تم نے محض نام و نمود کے لئے وعدہ لکھوا دیا ورنہ تمہاری نیت شروع سے ہی یہی ہے کہ تم وعدہ پورا نہ کرو۔

پس جب تک کھانے اور پینے اور پہننے اور رہائش کے طریق میں تبدیلی نہیں کی جاتی۔ اس وقت تک کسی مالی قربانی کی توفیق نہیں مل سکتی۔ اور اگر تم ان حالات میں کوئی وعدہ کرتے ہو تو تم خدا تعالیٰ سے تمسخر کرتے ہو اور پھر اگر یہ وعدہ میعاد کے اندر پورا بھی ہو جاتے تو خدا تعالیٰ کے فضل سے پورا ہوگا۔ تمہارے متعلق یہی سمجھا جائے گا کہ تم نے اس کے لئے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔

پھر جس قسم کی مالی مشکلات ہیں جن سے اس وقت ہمارا سلسلہ گذر رہا ہے ان کی موجودگی میں ہماری موجودہ مالی قربانیاں ہرگز کافی نہیں ہیں۔ اور ہم ان کاموں کو کبھی بھی ایک لمبے عرصہ تک جاری نہیں رکھ سکتے۔ اس کے لئے ہمیں اپنے بجٹوں پر دوبارہ غور کرنا پڑے گا۔ اور ہمیں اپنے طریق تبلیغ پر بھی نظر ثانی کرنی پڑے گی اور ہمیں اپنے سارے کارکنوں سے ایسے رنگ میں قربانی لینی پڑے گی جس رنگ میں ان سے پہلے کبھی قربانی کا مطالبہ نہیں کیا گیا اور میں سمجھتا ہوں کہ مالی دقتوں کے لحاظ سے اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے مبلغین سے بھی یا تو آنریری طور پر خدمت لیں یا اس صیغہ کو بالکل بند کر دیں۔ آخر تحریک جدید میں جو مبلغ کام کر رہے ہیں وہ آنریری کام کر رہے ہیں۔ اور یا پھر نہایت ہی قلیل گذارہ لے رہے ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ اگر تحریک جدید کے مجاہد اس قدر قلیل گذارہ پر کام کر سکتے ہیں تو دوسرے مبلغین کام نہ کر سکیں۔ اور اگر حالات پیدا ہوں تو ان کے سابقہ طریق میں تغیر نہ کیا جائے اسی طرح بیرونی جماعتوں میں جو سلسلہ کے کارکن ہیں ان کے لئے بھی مزید قربانیوں کے دروازے کھولے جائیں گے۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ ان کو اسی وقت ان قربانیوں کی توفیق ملے گی جب وہ تحریک جدید کے اصول کے پابند ہوں گے۔ اگر وہ ان اصولوں کی پیروی نہیں کریں گے تو انہیں قربانی کی توفیق ہرگز نہیں ملے گی کیونکہ جو شخص تیاری نہیں کرتا وہ امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

پس اے دوستو! جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے واقعہ کو سنتے اور اس کی یاد میں بکرا یا گائے یا دنبہ ذبح کرتے ہو تمہیں یاد رہے کہ بکرے یا گائے کی قربانی کرنا آسان ہے مگر اپنی جان اپنے مال اپنے آرام اور اپنی آسائش کی قربانی کرنا مشکل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے

بکرا ذبح نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے اپنی بیوی اور اپنے بچے کو قربان کر دیا تھا۔ اگر تم واقعہ میں حضرت ابراہیمؑ کی یاد تازہ کرتے ہوئے عیدالاضحیہ میں حصہ لینا چاہتے ہو اگر تم یہ آرزو رکھتے ہو کہ آئندہ جب دنیا میں عیدالاضحیہ منائی جائیں تو گو دنیا اسے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یاد میں منائے مگر خدا تعالیٰ کے رجسٹر میں تمہارا نام بھی ہو اور آسمان پر تمہاری قربانیوں کی یادگار میں بھی عیدالاضحیہ منائی جائے تو تمہیں ابراہیمی صفات اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ عید صرف حضرت ابراہیمؑ کی یاد میں منائی جاتی ہے اور ان کے بعد کوئی ایسا شخص نہیں ہوا جس نے خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی بیوی اور اپنے بچوں کو قربان کر دیا ہو کیا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے جو قربانیاں کیں وہ کوئی معمولی ہیں اور کیا ان کے بعد ہزاروں ایسے لوگ نہیں ہوئے جنہوں نے اپنے بیوی بچے خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دیئے۔ یقیناً ایسے لوگ ہوئے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں ہوئے ہیں لیکن چونکہ اتنی لمبی لسٹ (آدمی) لوگ یاد نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے دنیا کے لوگ تو یہ عید صرف حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یاد میں مناتے ہیں مگر خدا تعالیٰ کی لسٹ میں ان تمام لوگوں کے نام درج ہوتے ہیں جنہوں نے اس کی راہ میں قربانیاں کیں جب عیدالاضحیہ آتی ہے اور لوگ اسے حضرت ابراہیمؑ کی یاد میں مناتے ہیں اس وقت خدا ان سارے شہداء کی یاد میں یہ عید مناتا ہے جنہوں نے اس کے لئے قربانیاں کیں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کے فرشتے ان سارے شہداء کے نام پر یہ عید مناتے ہیں جنہوں نے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو خدا تعالیٰ کے رستہ میں قربان کر دیا۔ ہمارے سامنے آج وہ بکرے ہوتے ہیں جن کے گلوں پر ہم چھریاں پھیرتے ہیں اور میرے جیسے عدیم الفرصت انسان کے سامنے تو بکرا بھی نہیں ہوتا۔ کوئی دوسرا ہی اسے ذبح کرتا ہے مگر خدا تعالیٰ کے دربار میں یہ بکرے نہیں ہوتے۔ بلکہ آج جبکہ دنیا میں بکروں پر چھریاں پھر رہی ہوں گی خدا تعالیٰ کے سامنے حضرت ابراہیمؑ کو پیش کیا جا رہا ہوگا اور وہ اسے کہہ رہا ہوگا کہ اے ابراہیمؑ دیکھ تو نے اپنے بچے اسمٰعیلؑ کو میری راہ میں قربان کرنے کے لئے پیش کر دیا تھا دیکھ تو نے اپنی بیوی ہاجرہ کو ایک بے آب و گیاہ جنگل میں میرے حکم کے ماتحت چھوڑ دیا تھا۔ بے شک تو نے قربانی کی اور بہت بڑی قربانی کی۔ مگر اے ابراہیمؑ! ذرا دنیا کی طرف نظر اٹھا اور دیکھ کہ آج تیری نسل کس کثرت سے تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ ریت کے ذرّوں کو گنا جا سکتا ہے مگر تیری نسل کے افراد کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اب بتا کہ اسمٰعیلؑ کی قربانی ضائع گئی یا وہ دنیا میں عظیم الشان رنگ لائی اور ابراہیم شرم سے اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا ہوگا۔ اور کہتا ہوگا۔ اے خدا۔ نہیں میری قربانی تیرے انعاموں کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور پھر آج حضرت ابراہیمؑ

ہی نہیں محمد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی خدا تعالےٰ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہوگا۔ اور خدا تعالےٰ ان تمام ترقیات کے نظارے آپ کو دکھا رہا ہوگا جو تیرہ سو سال میں آپ کو اور آپ کی امت کو حاصل ہوئیں۔ اور کہتا ہوگا اے ہمارے رسول تیری مکہ کی تکالیف بے شک بہت بڑی تکالیف تھیں۔ بے شک مدینہ کے مصائب بہت بڑے مصائب تھے۔ مگر بتا تو سہی کہ ان قربانیوں کے نتیجہ میں ہم نے تیرے ہاتھوں سے جو علوم اور عرفان کے دریا بہا دیئے اور دنیا میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا یہاں تک کہ نکبت و ذلت کے گڑھے میں گرتی ہوئی قومیں تیری تعلیم پر عمل کرکے دنیا کی بادشاہ بن گئیں کیا اس انقلاب اور ان عظیم الشان انعامات کے مقابلہ میں یہ قربانیاں کوئی بھی حقیقت رکھتی ہیں۔ اور محمد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی روح محبت کے ساتھ آستانۂ الٰہی پر جھکتے ہوئے یہ کہتی ہوگی کہ اے خدا نہیں میری قربانیاں ان انعاموں کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں اسی طرح آج بدر کے شہداء اور اُحد کے شہداء جنہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پہلو بہ پہلو لڑتے ہوئے خدا تعالےٰ کی راہ میں جان دی جن کے گھروں میں اس وقت آہ و فغاں سے ایک کہرام مچ گیا تھا جن کی موت نے ان کے رشتہ داروں کے قلوب کو غم و اندوہ کے جذبات سے لبریز کر دیا تھا ان کی روحوں کو آج خدا تعالےٰ اپنے دربار میں کھڑا کرکے بتا رہا ہوگا کہ دیکھو تمہاری قربانیوں نے کیسے میٹھے پھل پیدا کئے اور انہوں نے اسلام کی کھیتی کو کس طرح ہرا بھرا کر دیا اسی طرح وہ ہزاروں نہیں لاکھوں روحیں جو دنیا میں فداکاری کے جذبات لئے آئیں جنہوں نے قربانیوں کے بعد نورِ عرفان حاصل کیا اور سماوی برکات سے بہرہ یاب ہوئیں۔ اللہ تعالےٰ انہیں اپنے سامنے بلاتا ہوگا اور کہتا ہوگا اے میرے بندو! کیا تمہاری قربانیاں رائیگاں گئیں اور کیا ان انعامات کے بدلہ میں جو میں نے تم پر کئے تمہاری قربانیاں کوئی بھی حقیقت رکھتی ہیں۔ اور وہ محبت سے اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں گرتے ہوئے یہ کہتے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہماری قربانیاں تو کچھ بھی نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ماضی انسان کو سبق دیتا ہے مگر مستقبل صرف دانا کو سبق دیتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ جب فتح ہوئی اور اسلامی لشکر غنیمت کے اموال لے کر واپس لوٹا تو منافقوں نے بکریوں اور بھیڑوں کی پیٹھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ کیونکہ جب فتح ہو جاتی ہے تو منافق بھی انعامات میں شریک ہو جاتے ہیں۔ مگر مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف مومن ہی قربانی کرتا ہے اور وہی قربانی اللہ تعالےٰ کے حضور قبول ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ایسے وقت میں قربانی کرتا ہے جب لوگ کہتے ہیں کہ یہ قربانی ضائع ہو گئی۔ جب دنیا اس کی تکلیفوں پر ہنس رہی ہوتی ہے۔ جب دنیا قربانیوں کو رائیگاں تصور کر رہی ہوتی ہے۔ جب دنیا اُسے پاگل اور مجنون کہہ رہی ہوتی ہے۔ وہ خدا تعالےٰ کے ذکر کو بلند کرنے اور اس کے نام کو دنیا کے کناروں تک پہنچانے کے لئے راتدن

جانی اور مالی قربانیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ نہ اپنے آرام کی پرواہ کرتا ہے نہ آسائش کی بلکہ خدا تعالےٰ کی راہ میں وہ اپنی بیوی اور بچوں کو بھی چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے یہی لوگ ہیں جن کی قربانی اللہ تعالےٰ قبول کرتا ہے لیکن بعد میں انعامات میں حصہ لینے کے لئے تو منافقوں کا گروہ بھی آجاتا ہے۔ اور خدا تعالےٰ انہیں بھی کہتا ہے کہ تم بھی کچھ لے لو۔ جیسے مرنے والا جب مر جاتا ہے اور اس کا ترکہ تقسیم ہونے لگتا ہے تو ایسی حالت میں اگر کوئی سائل آجائے تو اسے بھی کچھ دے دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب دنیوی برکات آتی ہیں تو خدا تعالےٰ کہتا ہے کہ ان منافقوں کو بھی کچھ دیدو مگر ابدی برکات کے وہ وارث نہیں ہو سکتے۔ وہ برکات انہی کو ملتی ہیں جو قربانیوں کے میدان میں ہمیشہ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جن کی نگاہیں آسمان کی طرف بلند ہوتی ہیں اور جو دنیوی نعماء کی بجائے اُخروی نعماء کی قدر و قیمت پہچانتے ہیں اور درحقیقت اصل نعمتیں اور حقیقی برکات وہی ہیں۔

خدا تعالےٰ مجھے بھی اور آپ لوگوں کو بھی اس امر کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم ہر قسم کی قربانیوں میں دلی شوق سے حصہ لینے والے ہوں۔

ہمارے قلوب ہر قسم کے زنگ سے پاک ہوں اور کلی اعتماد اور پورے شوق کے ساتھ ہم جانی اور مالی قربانی اس کے حضور پیش کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اور پھر ہمیشہ اپنی قربانیوں میں بڑھتے چلے جائیں تا آئندہ جب دنیا ابراہیمؑ کی یاد میں عید الاضحیہ منانے لگے تو اس وقت آسمان پر خدا تعالیٰ کے رجسٹر میں میرا اور تمہارا نام بھی ہو۔ اور اللہ تعالےٰ کی ہر قسم کی رحمتیں ہمارے شامل حال ہوں اللّٰھم آمین ۔

(الفضل ۱۵ر مارچ ۱۹۳۸ء صفحہ ۱ تا صفحہ ۱۱)

۱؎ ۔ سنن ابن ماجہ ابواب صلاۃ العیدین باب ما جاء فیما اذا اجتمع العیدان فی یوم

۲؎ ۔ سنن ابی داؤد کتاب الاطعمة باب فی اکل الضب۔

۳؎ ۔ سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ باب اذا وقع یوم الجمعة یوم عید

۴؎ ۔ ارض القرآن جلد ۱ صفحہ ۱۵

۵؎ ۔ پیدائش باب ۱۱ آیت ۲۹ ۔ باب ۱۷ آیت ۱۵ ۔ باب ۲۳ آیت ۱-۲

۶؎ ۔ پیدائش باب ۱۶ آیت ۲-۳

۷؎ ۔ دی فیملی ڈیووشنل بائبل مع تشریحی نوٹس از میتھیو ہنری جلد ۱ صفحہ ۹۱ ۔ تاریخ الخمیس صفحہ ۱۰۴۔

۸؎ ۔ پیدائش باب ۱۶ آیت ۱

٩ ۔ (١) تاریخ ابن خلدون موسومہ بہ تاریخ الانبیاء مترجمہ علامہ حکیم احمد حسین الہ آبادی حصہ اول حاشیہ ص٨٢ بر توریت کے مفسر ربی شلومو اسحاق کے حوالہ سے حضرت ہاجرہ کے متعلق لکھا ہے "وہ فرعون کی بیٹی تھی جب اس نے سارہ کے ضمن میں کرامات کو دیکھا تو اس نے کہا میری بیٹی کا دوسرے گھر میں ملکہ ہو کر رہنے سے (ابراہیم) کے گھر میں خادمہ بن کر رہنا بہتر ہے" (٢) ارض القرآن جلد ١ ص١٥ ۔ (٣) انوار الانبیاء ص٥٢ مطبوعہ لاہور ١٩٥٥ء ۔

١٠ ۔

١١ ۔ فرہنگ آصفیہ جلد چہارم ص١٩٥

١٢ ۔ النساء ٤ : ١٣٠ ۔ تفسیر درمنثور جلد ٢ ص٢٣٣

١٣ ۔ یہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے حقیقی چچا مرزا غلام محی الدین صاحب کے لڑکے تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی مرزا امام الدین صاحب کے ساتھ ساری زندگی احمدیت کی مخالفت میں گزار دی۔

١٤ ۔ التوبۃ ٩ : ٤٠ ۔ غارِ ثور میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت پناہ لی تھی۔ سورۃ توبہ کی اس آیت میں غار سے مراد غارِ ثور ہی ہے۔ غارِ حرا میں آپ بعثت سے قبل عبادت کیا کرتے تھے (زرقانی شرح مواہب لدنیہ ١/٢٠)

١٥ حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کی طرف اشارہ ہے جنہیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے چند دیگر اصحاب کے ساتھ عضل اور قارہ قبیلے میں تدریس قرآن کے لئے بھجوایا تھا۔ راستہ میں رجیع کے مقام پر کفار نے حملہ کر دیا۔ حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر کے مکہ لے جایا گیا۔ جہاں صفوان بن امیہ نے اپنے باپ کے قتل کا انتقام لینے کے لئے ان کو خرید لیا۔ یہ مکالمہ آپ کی شہادت سے معاً پہلے کا ہے۔ (اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ٢/٢٣٠)

١٦ ۔ یہ واقعہ حضرت سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ کا ہے جو جنگِ اُحد میں شہید ہو گئے تھے۔ (موطا کتاب الجہاد باب الشہداء فی سبیل اللہ۔ زرقانی شرح مواہب لدنیہ جلد ٢ ص٤٩

١٧ ۔ ١٨٦٢ء ۔ ١٩٣٠ء ۔ بیعت ١٨٨٩ء

١٨ ۔ حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی رضی اللہ عنہ (وفات ١٩٥٧ء) حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے قدیم صحابی۔ نامور مورخ اور مشہور صحافی تھے۔ ١٨٩٧ء میں انہیں سلسلہ احمدیہ کا پہلا اخبار الحکم جاری کرنے کا خصوصی شرف حاصل ہوا۔

١٩ ۔ سیرۃ حلبیہ جز اوّل ص٣٨ و ص٣٩

٢٠ ۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی۔ ابراہیم ١٤ : ٣٨

۲۱ھ ۔ روحانی خزائن (فتح اسلام) جلد ۳ صفحہ ۴۵

۲۲ھ ۔ تاریخ طبری جلد ۵ صفحہ ۴۶۵، تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۴ صفحہ ۸۵

۲۳ھ ۔ حضرت انسؓ ۔ حضرت زید بن ارقمؓ اور حضرت ابو برزۃ الاسلمیؓ ۔ مگر عام طور پر حضرت انسؓ کی بجائے حضرت زید بن ارقم کی موجودگی بتائی جاتی ہے۔ (طبری ۴۵۶/۵) حضرت امام بخاریؒ نے صحیح بخاری کتاب المناقب باب مناقب حسین میں حضرت انسؓ ہی کا نام لکھا ہے ۔ یہ واقعہ پہلے ابن زیاد کے دربار میں پیش آیا اور پھر دوبارہ یزید کے دربار میں جہاں حضرت ابو برزۃ الاسلمی رضی اللہ عنہ نے یزید کو منع کیا (تاریخ طبری ۴۶۵/۵، تاریخ کامل ابن اثیر ۸۵/۴، بحار الانوار جلد ۱۰ صفحہ ۲۳۵)

۲۴ھ ۔ بحار الانوار جلد ۱۰ صفحہ ۲۳۶-۲۳۷

۲۵ھ ۔ حضرت عمر بن عبد العزیز (۶۳ھ/۶۸۲-۸۳ء - ۱۰۱ھ/۷۲۰ء)

۲۶ھ ۔ معاویہ (ثانی) بن یزید (وفات ۶۴ھ/۶۸۴ء)

۲۷ھ ۔ تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۴ صفحہ ۱۳۱

۲۷

(فرمودہ یکم فروری ۱۹۳۹ء بمقام عیدگاہ۔ قادیان)

مسلمانوں میں دو عیدیں منائی جاتی ہیں۔ ایک عید، عید الفطر کہلاتی ہے جسے ہمارے ملک کے لوگ چھوٹی عید کہتے ہیں اور دوسری عید۔ عید الاضحیہ کہلاتی ہے جسے ہمارے ملک میں بڑی عید کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ جمعہ بھی مسلمانوں کے نزدیک عید ہے[1] اور چونکہ قرآن کریم میں جمعہ کی نماز کا خصوصیت کے ساتھ ذکر آتا ہے اس لئے بعض اولیاء نے جمعہ کی عید کو ان دونوں عیدوں سے بھی بڑا قرار دیا ہے[2] بہرحال اجتماع کے لحاظ سے یہ دونوں عیدیں اپنے اندر خصوصیت رکھتی ہیں اور چونکہ خوشی کا مظاہرہ لوگ جلد جلد نہیں کر سکتے۔ اس لئے بھی ان عیدوں کی لوگ زیادہ خوشی مناتے ہیں۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ مسلمانوں کے کھانے پینے کے دن ہیں[3] گویا اس طرح ان عیدوں کی اجتماعی خوشی کے لحاظ سے آپؐ نے ایک جداگانہ حیثیت قرار دی ہے۔ پس ان عیدوں میں جو سبق ہے وہ جمعہ کی عید سے مختلف قسم کا ہے اور ہمیں اس سبق کے سمجھنے اور اسے یاد رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس سبق کے سمجھنے سے پہلے ہمیں انسانی فطرت کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ انسان کو جو خوشی پہنچتی ہے، وہ کتنی قسم کی ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ہم انسانی فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں انسانی خوشی دو قسموں میں منقسم معلوم ہوتی ہے۔ ایک خوشی تو وہ ہوتی ہے جس کا منبع انسان کا اپنا وجود ہوتا ہے اور دوسری خوشی وہ ہوتی ہے جو دوسروں سے اسے ورثہ میں ملتی ہے جسے متعدی خوشی کہنا چاہیئے۔ یعنی پہلے اس خوشی کو چند افراد حاصل کرتے ہیں اور پھر آگے اسے اپنی اولادوں اور اولادوں کی اولادوں کی طرف منتقل کر دیتے ہیں اس سے کوئی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ چیز انسانی فطرت میں داخل ہے کہ وہ اپنے آباء کی عزت اور خوشی میں اپنی خوشی اور عزت سمجھتا ہے۔ چنانچہ قومی فخر یا خاندانی فخر اسی کی مثال ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی جب پوچھا گیا کہ کونسا شخص زیادہ اشرف ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ یوسفؑ جو نبی کا بیٹا تھا اور پھر جو آگے ایک اور نبی کا بیٹا تھا[4] گویا حضرت یوسفؑ کی عزت کی وجہ آپؐ نے یہ قرار دی کہ وہ ایک نبی کا بیٹا تھا اور اس کا باپ پھر ایک نبی کا بیٹا تھا۔ گویا متواتر اس کے باپ دادوں کو نبوت کا فخر حاصل ہونے کی وجہ سے حضرت یوسفؑ کی عزت بھی بڑھ گئی، اور اس لحاظ سے سمجھنا چاہیئے کہ اس کی خوشی بھی بڑھ گئی۔ اسی طرح جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

سے سوال کیا گیا کہ یا رسول اللہ! عربوں میں سے کونسے لوگ زیادہ معزز ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا عربوں سے جو خاندان جاہلیت میں زیادہ درجہ رکھتے تھے وہی اسلام میں بھی زیادہ درجہ رکھیں گے بشرطیکہ وہ خود بھی متقی ہوں۔ اس میں بھی آپؐ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔ کہ اپنے آباء کے کاموں پر فخر کرنا یا ان کی عزت میں اپنے آپ کو شریک سمجھنا ایک فطری تقاضا ہے جس سے اسلام روکتا نہیں سکتا وہ صرف اتنی پابندی لگاتا ہے کہ تم اپنے اندر ذاتی شرف بھی پیدا کرو تاکہ اپنے آباء کی عزت کی خوشی پر خوشی مناکر تم منافق مت بنو اور جس چیز کو ایک وقت میں عزت کا موجب قرار دو، دوسرے وقت میں اسے حقیر قرار دے کر اور متروک کرکے اس سے بیزاری کا اظہار نہ کرو۔ کیونکہ جب کوئی شخص ایک شرف کو حاصل کرنے سے اجتناب کرتا ہے۔ یا غفلت برتتا ہے تو وہ اپنے فعل سے ثابت کر دیتا ہے کہ وہ اسے شرف نہیں سمجھتا۔ پس کسی دیانتدار انسان کا حق نہیں کہ وہ بعض افعال کو تحقیر کے ساتھ ترک کر دے اور پھر انہی افعال کی وجہ سے اپنے باپ دادا کی عزت کا اعلان کرے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں فلاں دادا کی اولاد ہوں جو بڑا بہادر تھا اور خود بزدلی دکھاتا ہے تو وہ درحقیقت دو اضداد کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ نقیضین کو ایک جگہ جمع کرتا ہے کیونکہ ایک طرف تو وہ اس بات پر فخر کرتا ہے کہ میرا دادا بہادر آدمی تھا۔ اور دوسری طرف وہ قربانی سے گریز کرتا ہے اس کا یہ فعل بتاتا ہے کہ دونوں میں سے ایک بات ضرور ہے یا تو وہ جب اپنے دادا کے افعال پر فخر کرتا ہے تو وہ دوسروں کو بیوقوف بناتا ہے۔ ورنہ اپنے دل میں اپنے دادا کو معزز نہیں سمجھتا بلکہ ایک بیوقوف انسان سمجھتا ہے جو اپنی جان کو خواہ مخواہ بلاضرورت اور بلاوجہ خطرات میں ڈال دیا کرتا تھا۔ اور یا پھر وہ اس کے افعال کو تو اچھا سمجھتا ہے لیکن اپنے آپ کو ایک پاجی اور ذلیل انسان سمجھتا ہے جو شرافت کے احساسات سے عاری ہے اور اتنے گندے وجود پر شرف کا جبہ پہنانا بالکل احمقانہ بات ہے۔

غرض یہ دونوں باتیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ اگر تو ایسے شخص کے آباء جو خود بزدل ہے بوجہ بہادری اور جرأت دکھانے کے مکرّم اور معزز ہو گئے تھے تو اگر یہ قربانی کرنے کے لئے تیار نہیں تو ان کی عزت اور ان کا شرف اسے کوئی نفع نہیں دے سکتا۔ اور اگر خطرہ سے جان بچانا ہی عزت ہے اور یہی عقل ہے اور یہی مناسب ہے تو پھر یہ کہنا کہ اس کے آباء مکرم اور معزز تھے یہ جھوٹ اور دھوکہ ہے کیونکہ اگر قربانی سے بچنا عقلمندی ہے تو پھر جن لوگوں نے قربانی کی وہ جاہل اور نادان تھے اور ہرگز کسی عزت کے مستحق نہ تھے۔ پس ایسے شخص کے لئے دو طریق میں سے ایک کو اختیار کرنا لازمی ہوگا۔ یا تو اسے یہ کہنا پڑے گا کہ میرے آباء بیوقوف اور احمق تھے اور کسی شرف کے مستحق نہیں تھے۔ اور یا پھر اسے یہ کہنا پڑے گا کہ میں ایسا

گندہ اور ذلیل وجود ہوں کہ میرے آباء کا شرف اور ان کی عزت مجھے کوئی نفع نہیں دے سکتی۔ بلکہ ان کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنا ان کی ہتک کرنا ہے اور اس نسبت سے مجھے کوئی عزت حاصل نہیں ہوتی بلکہ میری ذلت بڑھ جاتی ہے کہ عزت کا سامان موجود ہوتے ہوئے میں نے ذلت کو اپنے لئے قبول کرلیا۔ یہی مثال دوسرے اخلاق کی بھی ہے۔ خواہ وہ دین کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں یا سیاست کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں۔ یا اقتصادیات کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں یا صنعت و حرفت کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں یا تجارت کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں پس جیسا کہ میں نے بتایا ہے عزتیں دو قسم کی ہیں اور ان کے مقابلے میں خوشیاں بھی دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو ذاتی ہوتی ہیں اور ایک خوشی وہ جو ورثہ میں ملتی ہے۔ ذاتی خوشی تو بہرحال خوشی ہوتی ہے مگر جو خوشی ورثہ میں ملتی ہے وہ مقید ہوتی ہے۔ جب تک اس کے ساتھ ذاتی خوشی شامل نہ ہو۔ وہ کارآمد نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات ذلت اور رسوائی کا موجب ہوجاتی ہے انسانی فطرت کے اس مطالعہ کے بعد اب ہمیں اپنی دونوں عیدوں پر غور کرنا چاہئیے کہ وہ ہمیں کیا سبق دیتی ہیں کہ جب ہم ان دو عیدوں کو دیکھتے ہیں تو ایک ہمارے ملک میں چھوٹی عید کہلاتی ہے اور دوسری بڑی عید کہلاتی ہے۔ دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جو اپنی تعلیمات میں تمام ضروری احکام پر مشتمل ہے اور تمام اچھے عناصر پر حاوی ہے۔ اس نے فطرت کے اس تقاضا کو بھی ان دونوں عیدوں کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہے۔ مثلاً چھوٹی عید کو دیکھو۔ اس عید سے پہلے ہم روزے رکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے بعد ہم ایک دن عید مناتے ہیں۔ وہ عید کسی گذشتہ عزت کی یاد نہیں ہوتی۔ ہمارے باپ دادا کے کسی شرف کو ظاہر نہیں کرتی بلکہ اس کا واحد مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہم نے خود اپنی ذات میں قربانی اور ایثار کا ثبوت مہیا کیا ہوتا ہے اور اپنی قربانی کے ساتھ اپنے رب کو خوش کیا ہوتا ہے۔ پھر دوسری عید کو ہم لیتے ہیں جو بڑی عید کہلاتی ہے۔ اس عید کے دن یا اس سے پہلے ہم نے اپنی ذات میں کوئی کام نہیں کیا ہوتا۔ کوئی خاص عبادت ہم نے نہیں کی ہوتی۔ کوئی خاص تکلیف ہم نے نہیں اٹھائی ہوتی۔ عام دنوں کی طرح ایک دن ہوتا ہے اور ہم اس دن یکدم عید کا اعلان کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہزاروں سال پہلے اس دن ہمارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ایک عظیم الشان کام صادر ہوا تھا اور اسے ایک خوشی پہنچی تھی اور چونکہ وہ ہمارا روحانی باپ تھا اور ہمارے روحانی باپ کا باپ تھا یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا۔ ہم اس دن فوراً نئے کپڑے پہن کر یا دُھلے ہوئے صاف کپڑے پہن کر گروہ در گروہ اور جماعت در جماعت اکیلے اکیلے اور اکٹھے ہو کر میدان کی طرف جانا شروع کردیتے ہیں اور ہم میں سے ہر ایک کا دل خوش ہوتا ہے۔ اس لئے

ہمارے دادا کو یہ عزت نصیب ہوتی تھی اور چونکہ وہ خوش ہوا تھا اس لئے ہم بھی خوشی مناتے ہیں یا ہم اس دن اس لئے خوش ہوتے ہیں کہ ہمارے کچھ بھائی جو دُور دراز کا سفر کر کے خدا تعالےٰ کے گھر کے پاس اپنے ایمان اور اخلاص کا تحفہ پیش کرنے کے لئے گئے تھے وہ اس پیش کش میں کامیاب ہو گئے اور حج مبرور ادا کر کے انہوں نے خدا تعالےٰ کے گھر میں عزت حاصل کی۔ پس چونکہ ہمارے بھائیوں کو خوشی پہنچی اس لئے ہم بھی خوش ہیں۔ پس ہماری یہ خوشی ورثہ کی خوشی ہوتی ہے اور ان دونوں عیدوں میں یہی سبق دیا گیا ہے کہ کسی قوم کی مکمل خوشی اسی میں ہے کہ اسے دونوں خوشیاں پہنچیں۔ ایک خوشی تو یہ کہ اس کو ذاتی قربانی کرنے کی توفیق ملے اور دوسری خوشی یہ کہ اس کے آباد کو بھی خدا تعالےٰ کی راہ میں قربانی کرنے کی توفیق عطا ہو۔ جب کسی قوم کو یہ دونوں خوشیاں نصیب ہو جائیں تو اس کی خوشی مکمل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص یہ دیکھتا ہے کہ میرے ماں باپ تو معزز و مکرم تھے لیکن میں ذلیل ہوں تو اس کا دل رنج سے بھر جاتا ہے اور وہ خوش نہیں رہ سکتا۔ تاریخوں میں ایک واقعہ آیا ہے کہ ایک امیر شاعر ایک دن حمام میں نہانے کے لئے گیا۔ اور وہاں اس نے اپنا جسم ملوانے کے لئے ایک خادم کو بلوانے کا حکم دیا۔ حمام والے نے ایک مضبوط نوجوان اپنے نوکروں میں سے اس کا جسم ملنے کے لئے بھجوا دیا۔ جب اس نے تہ بند وغیرہ باندھ لیا اور اپنے کپڑے اتار کر حمام میں بیٹھ گیا اور خوشبودار پانی اپنے جسم پر ڈالا اور خوشبودار مسالے خادم نے اس کے جسم پر ملنے شروع کئے تو اس وقت کی کیفیت اسے ایسی لطیف معلوم ہوئی کہ اس نے اپنے نفس میں موسیقی کی طرف رغبت محسوس کی اور کچھ گنگنا گنگنا کر شعر پڑھنے لگا۔ جب وہ شعر پڑھ رہا تھا تو اچانک اس ملازم کی حالت متغیر ہو گئی اور اس کی چیخ نکل گئی اور وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ اس غسل کرنیوالے نے سمجھا کہ شاید اس کو مرگی کا دورہ ہوا ہے اور اس نے حمام کے افسر کو بلایا۔ اور اس کے پاس شکایت کی کہ تم نے میرے جسم کو ملنے کے لئے ایک مجنون اور بیمار کو بھیج دیا۔ اس نے معذرت کی اور کہا کہ آجتک اس نوجوان کی بیماری کا حال مجھے معلوم نہیں ہوا، یہ تو بالکل تندرست تھا۔ بہر حال وہ اسے ہوش میں لاتے اور اس سے پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہے، آجتک تو تم پر کبھی ایسا دورہ نہیں ہوا تھا۔ اس نوجوان نے نہایت گھبرائی ہوئی حالت میں اس شاعر سے دریافت کیا کہ آپ نے جو یہ شعر پڑھے تھے یہ آپ نے کس سے سُنے ہیں اُس نے کہا میرے اپنے ہیں اور مجھے نہایت ہی محبوب ہیں۔ کیونکہ میں نہایت غریب ہوتا تھا اور نانِ شبینہ تک کا بھی محتاج تھا۔ اتفاقاً مجھے معلوم ہوا کہ فضل برمکی جو ہارون الرشید کے وزراء میں سے ایک وزیر تھا اور یحیٰی برمکی وزیر اعظم کا بیٹا تھا اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے اور شاعروں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ شعر کہکر لائیں۔ پھر جو مقابلہ میں اوّل آئے گا اسے انعام دیا جائے گا

چنانچہ مَیں بھی قسمت آزمائی کے طور پر چند شعر لکھکر اس مجلس میں حاضر ہُوا۔ اور جب میری باری آئی تو میں نے یہ شعر سُنائے۔ فضل برمکی اور اس کے بھائیوں اور اس کے باپ کو یہ شعر ایسے پسند آئے کہ انہوں نے لاکھوں روپیہ مجھے انعام میں دیا۔ اور کئی خادم اور کئی گھوڑے اور کئی اونٹ اور چاندی اور سونے کے برتن اور غالیچے اور قالین اور عطریات کا اتنا بڑا خزانہ میرے حوالہ کیا کہ مَیں دیکھکر حیران رہ گیا۔ اور مَیں نے کہا حضور میرے گھر میں تو اس کے رکھنے کی بھی گنجائش نہیں۔ انہوں نے کہا۔ کوئی فکر مت کرو۔ فلاں محلہ میں فلاں بڑی عمارت کو ابھی ہمارے خادموں نے تمہارے لئے خرید لیا ہے۔ اور ہمارے خادم ہی یہ سب مال اسباب اس نئے محل میں ابھی ابھی پہنچا دیں گے۔ اس دن سے مَیں امراء میں شمار ہوتا ہوں۔ اور مجھے یہ شعر نہایت ہی پیارے ہیں کہ انہوں نے میری حالت کو بدل دیا اور تنگی سے نکال کر فراغت سے آشنا کیا۔ اس غلام نے کہا جانتے ہو کہ وہ شعر جن کی وجہ سے تم اس مرتبہ کو پہنچے جس بیٹے کے لئے کہے گئے تھے وہ مَیں ہی ہوں جب میں نے یہ شعر تمہاری زبان سے سُنے تو مجھے وہ واقعہ یاد آگیا۔ جو مَیں نے اپنی دائیوں اور کھلائیوں سے سُنا ہُوا تھا کہ تیری پیدائش پر ایک شاعر کو اتنا انعام دیا گیا تھا اور مَیں نے کہا کہ وہ بچہ جس کی پیدائش پر یہ انعام دیا گیا تھا اور جن شعروں کی وجہ سے انعام دیا گیا تھا وہ شعر آج ایک اجنبی حمام میں اس راحت و آرام سے پڑھ رہا ہے اور وہ لڑکا جس کے لئے یہ شعر کہے گئے تھے، ایک خادم کی حیثیت سے اس کا جسم مل رہا ہے۔ اس شاعر پر اس کا اتنا اثر ہُوا کہ وہ اس کو چمٹ گیا اور رونے لگا اور اس نے کہا کہ میری ساری دولت تمہارے باپ دادا کی دی ہوئی ہے اور یہ تمہاری ہی دولت ہے۔ تم میرے گھر چلو، مَیں خادموں کی طرح تمہاری خدمت کروں گا اور تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دُوں گا۔ اس لڑکے نے جواب دیا کہ جس ذلت کو ہم پہنچ چکے ہیں وہ پہلے ہی بہت زیادہ ہے۔ اب مَیں اس کے ساتھ یہ مزید ذلت نہیں خریدنا چاہتا کہ جو انعام میرے باپ نے دیا تھا وہ جا کر خود استعمال کرنا شروع کر دوں۔ مگر چونکہ میرا راز اب کھل گیا ہے اس لئے مَیں اب اس جگہ بھی نہیں رہ سکتا۔ اب میں کسی اور علاقہ میں نکل جاؤنگا جہاں مجھے جاننے والا کوئی نہ ہو اور کوئی محرم راز میری شکل کو دیکھکر میرے آباء کی ذلت کو یاد نہ کرے یہ کہکر وہ اُٹھ کر وہاں سے چلا گیا اور نہ معلوم کہاں غائب ہو گیا۔ دیکھو یہ ایک مثال ہے کہ باپ دادا کی عزت جبکہ اولاد اس عزت میں شریک نہ رہی اولاد کو کوئی نفع نہ پہنچا سکی بلکہ شریف اولاد کے لئے زیادہ تکلیف کا موجب ہو گئی۔ بے شک کمینہ انسان اس رستہ کو چھوڑ کر جس پر چل کر اس کے آباء نے عزت حاصل کی تھی فخر کرتا ہے۔ مگر وہ اس سے صرف اپنی کمینگی کا اظہار کرتا ہے ورنہ شریف انسان تو اس واسطہ کو مٹا دیتا ہے۔ اسے چھپا دیتا ہے اور پوری کوشش کرتا ہے

کہ کوئی اس سے واقف نہ ہوتا کہ اس کی ذلت اس کے آباء کی عزت کو نہ مٹا دے اور وہ یہ کبھی نہیں کرتا کہ خود تو ان کے رستہ کو چھوڑ رہا ہو اور اس رستہ کی وجہ سے جو عزت ان کو ملی ہو اس میں اپنے آپ کو شریک کرنا چاہتا ہو۔ پس ورثہ کی عزت تبھی عزت کہلا سکتی ہے جبکہ ذاتی عزت انسان حاصل کر چکا ہو۔ قرآن کریم نے اسی نکتہ کو ایک اور رنگ میں بیان فرمایا ہے۔ فرماتا ہے کہ مومنوں کی بیویاں اور بچے بھی جنت کے اس اعلیٰ مقام میں رکھے جائیں گے جہاں ان کے باپ دادا ہوں گے۔ بشرطیکہ وہ خود بھی مومن ہوں۔ یعنی ذاتی عزت جن کو حاصل ہو گی وہی اس بات کے مستحق قرار دیئے جائیں گے کہ اگر ان کے آباء میں سے کسی نے کوئی بڑا رتبہ حاصل کیا ہو تو ان کو بھی اس بڑے رتبہ کے مطابق انعام دے دیا جائے۔ لیکن اگر ذاتی عزت حاصل نہ ہو۔ تو پھر یہ اس شرف کے مستحق نہیں ہوں گے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ ایک دوزخی کو وہاں سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے اس لئے کہ اس کے باپ دادا میں سے کوئی مومن تھا۔ ہاں یوں کہا جائیگا کہ اگر کوئی ادنیٰ درجہ کا مومن ہوگا۔ اور اپنے ذاتی شرف کی وجہ سے جنت میں داخل ہو چکا ہوگا تو اگر اس کے باپ دادا میں سے کوئی جنت کے اعلیٰ درجہ میں پہنچا ہوا ہوگا تو اس کو بھی اس مقام شرف پر رکھ دیا جائے گا کیونکہ اس نے ذاتی شرف حاصل کر کے ثابت کر دیا ہوگا کہ وہ اپنے آباء کے پسندیدہ رستہ کو خود بھی پسند کرتا تھا اور اسے حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ پس ان دونوں عیدوں نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ ہمیشہ دونوں قسم کی خوشیوں کو یاد رکھنا چاہیئے اوّل وہ خوشی جو ذاتی کامیابی کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اور دوم وہ خوشی جو آباء کی کامیابی کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ پھر اسلام کی پُر حکمت تعلیم کو دیکھو تو اس نے ان عیدوں کی ترتیب بھی عین فطرت کے مطابق رکھی ہے۔ یعنی جس طرح فطرت انسانی میں ذاتی خوشی پہلا زینہ ہے اور ورثہ کی خوشی دوسرا اور جب تک ذاتی خوشی حاصل نہ ہو۔ انسان ورثہ کی خوشی کا مستحق نہیں ہوتا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے وہ عید پہلے رکھی ہے جو ذاتی خوشی کی عید ہے اور وہ عید بعد میں رکھی ہے جو ورثہ کی خوشی پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اسلامی سال محرم سے شروع ہوتا ہے اور اس مہینہ سے اگر گنا جائے تو پہلے عید الفطر آتی ہے اور پھر عید الاضحیہ آتی ہے۔ اسی طرح ایک اور نکتہ ان عیدوں میں یہ پایا جاتا ہے کہ یہ عیدیں سال کے آخر میں رکھی گئی ہیں۔ اور اس طرح بتایا گیا ہے کہ ایک لمبی جد وجہد کے بعد ہی انسان کو کامیابی اور کامیابی کے نتیجہ میں خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ خوشی پہلے منانا چاہتے ہیں اور جد وجہد پیچھے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ احمق ہیں اور ان کے تقاضے غیر فطری ہیں اور جس طرح غیر فطری تقاضے پورے نہیں ہوا کرتے ان کا یہ تقاضا بھی کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔

میں نے دیکھا ہے کئی لوگ ادھر ہماری جماعت میں شامل ہوتے ہیں اور ادھر ان کو یہ حیرت ہونی شروع ہو جاتی ہے کہ ابھی تک الہام کا سلسلہ کیوں شروع نہیں ہوا اور مجھے حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو اوّل درجہ کے بے عمل ہوتے ہیں اوّل درجہ کے قربانی سے گریز کرنے والے ہوتے ہیں اور ایثار کے موقع پر سب سے پیچھے رہنے والے ہوتے ہیں۔ اور وہ سب سے زیادہ شور مچاتے ہیں کہ ابھی تک احمدیت کو وہ ترقی نصیب نہیں ہوئی جو پہلی جماعتوں کو حاصل ہوا کرتی تھی۔ میں ان لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ اے نادانو! تمہارے گدھے تمہارے اصطبل میں بندھے ہوئے ہیں۔ اور تمہارا یکہ تمہارے دروازے کے آگے کھڑا ہے اور تم یہ رٹ لگا رہے ہو کہ ابھی منزلِ مقصود نہیں آئی۔ تمہارا گدھا تو اصطبل میں بندھا ہے اور تمہارا یکہ اپنی بیکسی پر رو رہا ہے۔ تم منزلِ مقصود پر کس طرح پہنچ سکتے ہو۔ پہلے اچھی سواری لاؤ، اچھی گاڑی میں اس کو جوتو۔ پھر اس میں سوار ہو کر چلو۔ سفر کی صعوبتیں برداشت کرو، تب منزلِ مقصود آئے گی۔ اس سے پہلے منزل کی طلب کرنا نہ جماعت پر اعتراض وارد کرتا ہے۔ اور نہ مخلص احمدیوں پر کوئی اعتراض وارد کرتا ہے۔ یہ تو محض اس بات کی علامت ہے کہ تم ابھی قومی ترقی کے ابتدائی اصول سے بھی آگاہ نہیں۔ پہلے جدوجہد کرو، قربانیاں کرو اور وہ ایثار دکھلاؤ جو پہلی جماعتوں نے دکھایا تھا اور پھر اس بات کی امید رکھو کہ تم وہ نتائج دیکھو گے جو پہلوں نے دیکھے تھے۔
میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے ملک میں یہ نقص اس قدر عام ہے کہ عمل کی کوئی قیمت ہی باقی نہیں رہی، صرف زبان کی قیمت سمجھی جاتی ہے۔ اور سب سے بڑا لیڈر وہی سمجھا جاتا ہے جو سٹیج پر کھڑے ہو کر سب سے بڑے مقاصد کو پیش کر دے یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ عملاً اس شخص نے کوئی قربانی بھی کی ہے یا نہیں۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ چھوٹی عمر میں میں ریل پر سفر کر رہا تھا کہ ایک بوڑھا آدمی ہمارے کمرہ میں داخل ہوا۔ اس وقت لوگوں کی اخلاقی حالت کے متعلق مختلف باتیں ہو رہی تھیں، وہ بھی ان باتوں میں شامل ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں داروغہ جیل رہا ہوں۔ اس لئے اخلاق کے متعلق جو واقفیت مجھے ہو سکتی ہے اور کسی کو نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس نے بڑے بڑے قصے لوگوں کے دھوکوں اور فریبوں کے بتائے اور ساتھ ساتھ یہ کہتا چلا جائے کہ ان چالاکیوں سے ہم لوگ خوب واقف ہیں جن کا رات دن ایسے لوگوں سے تعلق رہتا ہے۔ دنیا کے اخلاق بہت بگڑ چکے ہیں، دیانت جاتی رہی ہے اور ٹھگی بڑھ گئی ہے۔ اسی وعظ کے وقت وہ اس قدر جوش میں تھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کے اخلاق کی اصلاح میں یہ شخص دیوانہ ہو رہا ہے۔ انہی باتوں کے دوران میں شاید میرٹھ یا سہارنپور کا اسٹیشن آ گیا۔ اور ٹکٹ چیک کرنیوالا

ہمارے کمرہ میں داخل ہُوا۔ ہم انٹر میں تھے جب اس نے ٹکٹ دیکھے تو اس اخلاقی واعظ کے پاس تھرڈ کلاس کا ٹکٹ نکلا۔ اور جب اس نے پوچھا کہ آپ کے پاس ٹکٹ تو تھرڈ کا ہے اور بیٹھے انٹر میں ہیں تو معًا اس کا چہرہ مجسّم سادگی بن گیا۔ اور یوں معلوم ہونے لگا کہ ساری عمر اس کو بھوڑے میں رکھا گیا ہے اور آج پہلی دفعہ اسے سورج نظر آیا ہے عجیب سادہ صورت بنا کر کہنے لگا بابو جی تھرڈ کیا ہوتا ہے اور انٹر کیا ہوتا ہے۔ بابو جی دھوکہ میں آگیا۔ اور اس نے سمجھا کہ شاید پہلی دفعہ اسے سفر کا موقعہ ملا ہے اور کہنے لگا۔ اس ڈیوڑھا کا کرایہ ذرا زیادہ ہوتا ہے آپ تھرڈ میں چلے جائیں مگر شاید اس نے خیال کیا کہ مَیں نے سادگی کا ڈرامہ ابھی پوری طرح نہیں دکھایا۔ اور چہرہ پہ کمزوری اور اضمحلال دکھا کر اس سے مخاطب ہوا۔ اور کہنے لگا کہ یہ ذرا ٹرنک اور بستر تو اٹھا کرلے چلو اور مجھے بتاؤ کہ وہ تھرڈ کیا چیز ہے۔ تب تو اس بابو بے چارے کی حالت بھی رحم مجسّم بن گئی وہ باہر نکلا اور قُلی کو لایا۔ اُس بوڑھے کا ہاتھ اسے پکڑایا اور کہا کہ بابا جی کو آرام سے تھرڈ کے کمرہ میں بٹھا دو۔ اُدھر وہ بُوڑھا باہر نکلا، اِدھر ہمارے نانا جانؒ مرحوم جو اس وقت ہم سفر تھے اور اصل میں پہلے وہی اخلاقی وعظ کر رہے تھے بڈھے نے اپنی ہوشیاری کی وجہ سے ایسا سماں باندھ دیا تھا کہ پچھلے نصف گھنٹہ میں ان کو ایک فقرہ کہنے کی بھی فرصت نہ مل سکی تھی۔ ان کے لئے خدا تعالیٰ نے ایک دروازہ کھول دیا۔ وہ سارے کمرہ پہ برس پڑے اور کہنے لگے کہ دیکھو دنیا کی جو حالت مَیں بیان کرتا تھا اسے اس نے ثابت کر دیا۔ پہلے کس طرح وعظ کر رہا تھا اور دنیا کا بڑا عقلمند اپنے آپ کو ظاہر کرتا تھا لیکن بابو کے آنے پہ مجسّم سادگی بن گیا۔ یہی حالت منافق اور بدعمل لوگوں کی ہوتی ہے۔ جب تک ان پہ گرفت نہ ہو وہ بھیڑیئے ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے رسول کی بھیڑوں کو ایک ایک کرکے اٹھا لے جانا چاہتے ہیں۔ لیکن جب پکڑے جاتے ہیں تو تین چار یوم کا لیلہ بن جاتے ہیں۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بیکسی اور ناواقفیت اور سادگی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ ابھی ضرورت ہے کہ کچھ عرصہ تک ان کا منہ کھول کر ٹوٹنیوں سے دودھ ڈالا جائے۔ اور نادان اور سادہ لوگ ان کے اس مظاہرہ سے جو وہ پبلک میں دکھاتے ہیں، دھوکے میں آجاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ایسا مسکین آدمی اوّل تو شرارت کر ہی نہیں سکتا اور اگر اس نے کی ہوگی تو محض سادگی کی وجہ سے کی ہوگی۔ وہ اس واقعہ کو بھول جاتے ہیں جو کہانیوں میں بچپن میں ہم سُنا کرتے تھے کہ کسی شخص کا کوئی نوکر تھا وہ اس تلاش میں تھا کہ کسی طرح مجھے وہ جگہ معلوم ہو جائے جہاں میرے آقا اور میری سیّدہ نے روپیہ اور زیور دفن کر رکھا ہے۔ کیونکہ پرانے زمانہ میں لوگ ان چیزوں کو دفن کیا کرتے تھے۔ اس نے بہت کوشش کی مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ ان کا ایک تین چار سال کا لڑکا

تھا۔ جس کی نسبت وہ سمجھتا تھا کہ اسے معلوم ہے کہ اس کے ماں باپ کہاں خزانہ دفن کیا کرتے ہیں۔ ایک رات اس بچہ کو اجابت کی حاجت ہوئی اور اس کے باپ نے نوکر سے کہا کہ اسے باہر لے جاؤ اور پاخانہ کرا لاؤ۔ وہ اسے اُٹھا کر لے گیا اور بٹھا کر کہنے لگا کہ اگر تم نے پاخانہ پھرا تو مار مار کر کھال ادھیڑ دوں گا اور ڈنڈا لے کر کھڑا ہو گیا۔ بچہ اس دھمکی سے ایسا ڈرا کہ بیس پچیس منٹ بغیر پاخانہ پھرے بیٹھا رہا۔ پھر نوکر نے اسے اٹھایا اور کہا کہ اگر میرے اس سلوک کا تم نے اپنے باپ سے ذکر کیا تو قتل کر دوں گا۔ یہ کہہ کر واپس لے آیا۔ اور کہا کہ اسے حضور پاخانہ کوئی نہیں آیا۔ مَیں دیر تک انتظار کرتا رہا مگر اس نے نہیں پھرا۔ اور مَیں واپس لے آیا ہوں لڑکا پہلے تو ڈر کے مارے خاموش رہا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر باپ سے کہا کہ پاخانہ آیا ہے۔ اس نے پھر نوکر کے سپرد کر دیا اور نوکر نے پھر وہی سلوک کیا اور اسی طرح اُٹھا کر لے آیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بچہ نے باپ سے کہا کہ سخت پاخانہ آیا۔ لیکن دھمکی کی وجہ سے یہ نہ کہہ سکا کہ نوکر پھرنے نہیں دیتا۔ تیسری دفعہ پھر آقا نے اس کے سپرد کیا اور کہا کہ اب کے جا کر اسے بٹھاؤ اور اگر اب بھی نہ پھرے تو خوب مارو۔ یہی اجازت نوکر چاہتا تھا وہ اسے لے کر پھر گیا اور کہا کہ بتا تیرے ماں باپ کہاں گڑھا کھودا کرتے ہیں اگر تُو نے یہ بتا دیا تو تجھے پاخانہ پھرنے دوں گا ورنہ نہیں۔ اور تیرے باپ نے تو مجھے اجازت دے ہی دی ہے اس لئے خوب ماروں گا۔ ادھر بچے کو زور سے پاخانہ آ رہا تھا ادھر مار کی دھمکی تھی۔ اس نے ڈر کے مارے بتا دیا کہ فلاں کونے میں فلاں جگہ میرے ماں باپ گڑھا کھود کر چیزیں دفن کیا کرتے ہیں۔ اس پر اس نے اسے پاخانہ پھرنے دیا۔ اور لا کر باپ کے سپرد کر دیا۔ بچہ تو تھکا ہوا تھا آرام سے سو گیا اور نوکر کمرہ میں داخل ہو کر سب مال زیور نکال کر چلتا بنا۔

یہی کیفیت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے اندر منافقت کی رگ رکھتے ہیں جب الگ ہوتے ہیں تو اس نوکر کی طرح جلاد بنتے ہیں اور جب دوسرے سامنے ہوں تو پوپلے منہ سے ایسی سادگی کی باتیں کرتے ہیں کہ رقیق القلب انسان کو ان کی مسکینی پر رونا آجاتا ہے۔ پس میں جماعت کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اس خوشی کے حصول کی کوشش کریں جو ذاتی قربانی سے حاصل ہوتی ہے۔ اور یاد رکھیں کہ تبھی وہ اس خوشی کے مستحق ہوں گے جو ان کو آباء کی طرف سے ورثہ میں ملنے والی ہے جب وہ خود بھی نیکی اور تقوی میں اعلیٰ مقام رکھنے والے ہوں گے۔ وہی بہادر جو میدانِ جنگ میں اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار رہے کہہ سکتا ہے کہ یاد رکھو مَیں وہ بہادر ہوں جس کا باپ بھی ایسا بہادر تھا اور جس کا دادا بھی ایسا بہادر تھا اور یقیناً اس کے اس اعلان سے رعب طاری ہوگا۔ مگر خیال تو کرو کہ ایک شخص ایک

طرف تو میدانِ جنگ سے بھاگتا چلا جائے سانس چڑھا ہوا ہو قدم لڑکھڑا رہے ہوں، چہرہ زرد ہو۔ آنکھیں باہر نکل رہی ہوں۔ ہونٹوں پر ڈر کے مارے پپڑیاں جم رہی ہوں۔ وہ بھاگتا بھی جائے اور مڑ مڑ کر تعاقب کرنے والوں کو یہ بھی کہتا جائے کہ تم جانتے ہو کہ میں فلاں بہادر کا بیٹا ہوں۔ کیا تم سمجھتے ہو اس کی اس بات سے ان کے دلوں پر رعب طاری ہوگا یا عزت ان کے دلوں میں پیدا ہوگی۔ یا ان کے دلوں میں اور بھی غصہ پیدا ہوگا۔ اور وہ کہیں گے کہ ٹھہر تو جا۔ تو ہمارا ہی دشمن نہیں بلکہ اپنے باپ دادا کا بھی دشمن ہے جس نے اپنی ہی عزت برباد نہیں کی بلکہ اپنے باپ دادا کی بھی کی ہے۔ پس قربانی اور ایثار کا اعلیٰ نمونہ دکھاؤ اور اپنے لئے عید الفطر حاصل کرو تاکہ اس کے بعد خدا تعالےٰ کا وہ کلام پورا ہو کہ جو مومن ہونگے وہ اپنے باپ دادا میں سے جنت میں بلند مرتبہ حاصل کرنے والوں کے ساتھ رکھے جائیں گے اور تمہارا خدا تمہیں کہے کہ پہلے تم نے خدا تعالےٰ کی راہ میں قربانی کر کے عید الفطر حاصل کی تھی اور مومن بنے تھے۔ اب آؤ عید الاضحیہ کا مزہ ہم تم کو چکھائیں۔ اور تمہیں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے قرب میں جگہ دیں۔ اور یقیناً ذاتی خوشی کے بعد یہ دوسری خوشی اتنی عظیم الشان ہوگی کہ اس کا تصور کر کے بھی دل خوشی سے گُدگدی محسوس کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ خوشی ہے جو حضرت ابراھیم علیہ السلام کو نصیب ہوئی تھی۔ حضرت محمد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو نصیب ہوئی تھی اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نصیب ہوئی تھی۔ جب پہلے ہم اپنے لئے ایک عید پیدا کر لیتے ہیں تو خدا تعالےٰ ہمارے لئے وہ دوسری عید پیدا کرتا ہے جو ابراہیمی عید ہے۔ محمّدی عید ہے اور احمدی عید ہے۔

پس پہلے عید الفطر پیدا کرو۔ اور اس سے پہلے قومی کامیابی کے دن کا انتظار کرنا تمہیں ایسا ہی احمق بناتا ہے جیسے وہ احمق ہے جو عید الاضحیہ پہلے کرنا چاہتا ہے اور عید الفطر کا بعد میں انتظار کرے۔ تم جانتے ہو کہ ایسے شخص کے لئے نہ عید الاضحیہ آئے گی اور نہ عید الفطر وہ عید الاضحیہ کو پہلے حاصل نہیں کرے گا بلکہ دونوں عیدوں سے محروم رہے گا۔ مگر جو پہلے عید الفطر کرے گا۔ اسے عید الاضحیہ بھی نصیب ہوگی اور وہ ایک کی جگہ دو عیدیں دیکھے گا۔ پس آؤ اور اپنے دلوں میں پختہ ارادہ کر لو۔ کہ پہلے اپنی ذاتی قربانیوں کے ساتھ تم اپنے لئے عید پیدا کرو گے تاکہ اس کے بعد تمہارا خدا آسمان سے تمہارے لئے ابراھیمی عید اتارے محمّدی عید اُتارے اور احمدی عید اتارے۔ اللّٰھم آمین۔

(الفضل ۱۷ر جولائی ۱۹۵۶ء صفحہ ۳ تا ۴)

۱ے ۔ سنن کبریٰ (کتاب الجمعۃ) جلد ۳ صفحہ ۲۴۳

۲ے ۔ نزہۃ المجالس ومنتخب النفائس مصنفہ علامہ عبدالرحمٰن الصفوری جزو اول صفحہ ۱۱

۳ے ۔ صحیح مسلم کتاب الصیام باب تحریم صوم ایام التشریق

۴ے ۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب قول اللہ عزوجل لَقَدْ کَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَاِخْوَتِہٖ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ ۔

۵ے ۔ صحیح بخاری کتاب المناقب باب قول اللہ تعالےٰ وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا الی الآخر۔ صحیح مسلم کتاب الفضائل باب خیار الناس ۔

۶ے ۔ محمد بن یزید الدمشقی

۷ے ۔ کتاب تحفۃ المجالس ونزہۃ المجالس مؤلفہ علامہ جلال الدین السیوطی صفحہ ۱۹۳ تا صفحہ ۱۹۵

۸ے ۔ الطور ۵۲ : ۲۲ ۔ تفسیر دُرِّ منثور ۱۱۹/۶

۹ے ۔ حضرت نانا جان میر ناصر نواب صاحب رضی اللہ عنہ (۱۸۴۵ء ۔ ۱۹۲۴ء) اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی عزت اور عظمت بخشی ہے کیونکہ آپ کو حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کے ساتھ صہری ابوّت کا فخر حاصل ہے آپ محکمہ انہار میں اوورسیر تھے ملازمت سے ریٹائر ہونے پر دہلی سے ہجرت کرکے مستقل طور پر قادیان میں رہائش اختیار کرلی اور آخر دم تک سلسلہ عالیہ احمدیہ کی مثالی رنگ میں خدمات بجا لاتے رہے۔ آپ نہایت ہی نیک دل، صاف گو، پاکیزہ طبیعت، صوفی منش اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔

۲۸

(فرمودہ ۲۰ ؍جنوری ۱۹۴۲ء بمقام عیدگاہ۔ قادیان)

آج کی عید جو عیدالاضحیہ کہلاتی ہے یعنی وہ عید جو قربانیوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ حج کے دوسرے دن اور اس کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہو کر آتی ہے[1] اس تقریب کی وجہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ قربانی بیان کی جاتی ہے۔ جو انہوں نے اپنے بیٹے کی خدا کے حضور پیش کی پس یہ عید حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کی یادگار ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے بیٹے کو قربان کر دیا۔

بیٹوں کی ظاہری رنگ میں قربانی تو اسلام نے ناجائز بتائی ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے کی قربانی کرنے کا حکم دینے کی وجہ بھی یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اس اصل کو قائم کرنا چاہتا تھا کہ آئندہ کے لئے بیٹوں کی ظاہری قربانی ممنوع قرار دی جاتی ہے ورنہ ہو سکتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خواب کی جو تعبیر تھی اس مضمون کو اللہ تعالیٰ اس صورت میں نہ دکھاتا بلکہ کسی اور صورت میں دکھا دیتا کیونکہ آخر اللہ تعالیٰ کے حضور ان کے بیٹے کی ظاہری قربانی مقصود نہیں تھی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نبی ہونے والے تھے اور جس شخص کے لئے نبوّت مقدر تھی۔ اس کے متعلق یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے کہتا کہ اسے ذبح کر دو۔ پس خدا تعالیٰ کا شروع سے ہی یہ مقصد نہ تھا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کیا جائے بلکہ یہ رؤیا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دکھایا گیا تعبیر طلب تھا اور جبکہ اللہ تعالیٰ کا مفہوم کچھ اور تھا اور جبکہ رؤیا بھی تعبیر طلب تھا تو سوال ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امر کو کسی اور صورت میں کیوں نہ بیان کر دیا۔ خواب آئندہ رونما ہونے والے واقعات کی ایک تصویر ہوتی ہے۔ جیسے مصوّر تصویریں کھینچتے ہیں ویسے ہی اللہ تعالیٰ خوابوں میں واقعات کی تصویر کھینچ کر اپنا مفہوم بیان کر دیتا ہے۔ پھر جبکہ اللہ تعالیٰ اس مفہوم کو کسی اور رنگ میں بھی بیان کر سکتا تھا تو سوال ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس رنگ میں یہ مفہوم کیوں بیان کیا؟ اس کا جواب یہی ہے کہ اس سے پہلے لوگ اپنے بیٹوں کی قربانی کیا کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ نہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہ یہ خبر دے کہ وہ آپ سے اپنے بیٹے کی قربانی کرانا چاہتا ہے بلکہ اس امر سے بھی انہیں مطلع کرے کہ ابراہیمی دین میں انسانوں کی ظاہری قربانی جس کا ان کی قوم میں رواج تھا۔ آئندہ جائز نہیں ہو گی۔

پس خدا تعالیٰ نے یہ خواب دکھا کر دو اہم امر بیان فرما دیئے۔ یہ بھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا بیٹا خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنا ہوگا۔ اور یہ بھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب ظاہری رنگ میں بیٹے کی قربانی کرنا چاہیں گے تو میں انہیں منع کر دوں گا اور کہوں گا کہ انسان کی اس رنگ میں قربانی میں نہیں چاہتا۔ اسی حکمت کے ماتحت خدا تعالیٰ نے تصویری زبان میں انہیں یہ تمام نظارہ دکھایا جس کا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان بھی ہو گیا اور وہ شرح صدر سے اپنے بیٹے کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا بھی امتحان ہو گیا اور وہ بھی خوشی سے ذبح ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور دوسری طرف جب وہ اپنے بیٹے کو قربان کرنے گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بتا دیا کہ میرا اس قربانی کے حکم سے یہ مفہوم نہیں تھا بلکہ کچھ اور تھا۔ انسانوں کی ظاہری قربانی میں پسند نہیں کرتا اور یہ آئندہ کے لئے ممنوع قرار دی جاتی ہے۔

پس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنی نوع انسان پر یہ عظیم الشان احسان کیا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو قربان کرنے کے ارادہ کے ساتھ ہی آئندہ انسانوں کی قربانیوں کو روک کر انہیں ہلاکت سے بچا لیا۔ اصلی قربانی کیا تھی؟ وہ جیسا کہ میں نے کئی دفعہ بیان کیا ہے یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ میں چھوڑ آئیں تاکہ وہ بیت اللہ کی حفاظت اور دینِ ابراہیمی کی خدمت کریں [۵۳] اور ان کے ذریعہ وہ اولاد پیدا ہو جس کے ہاتھوں خدا تعالیٰ اپنے دین کا آخری دور قائم کرنا چاہتا تھا [۵۴]۔ پس درحقیقت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو جس دن بیت اللہ کے پاس چھوڑا گیا اس دن رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی آمد کا اعلان کیا گیا۔ کیونکہ بیت اللہ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے زمانہ میں ہی اللہ تعالیٰ کے ذکر کا آخری گھر ہونا تھا۔ اور اس کی تیاری صرف حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے زمانہ سے کی گئی تھی جیسے یہاں اب عید کا خطبہ ہونے لگا ہے مگر بعض دوست رات سے ہی یہاں آ گئے تھے۔ جنہوں نے صفائیاں کیں۔ چٹائیاں بچھائیں اور دیگر انتظامات کئے۔ اور پھر صبح سے وائرلیس والے آ گئے جنہوں نے بیٹریاں تیار کیں۔ بجلی کی تاریں درست کیں اور اسی طرح کے اور انتظامات کئے تاکہ جب آپ لوگ آئیں تو آسانی سے بیٹھ کر خطبہ سُن سکیں۔ تو جب کوئی بڑا کام ہونے لگتا ہے تو پہلے سے اس کی تیاری شروع کر دی جاتی ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا چونکہ مکہ میں ظہور مقدر تھا۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے دو ہزار سال پہلے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذریعہ سے تیاری شروع کر دی۔ یہ کتنا اہم مقام ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو حاصل ہے کہ دو ہزار سال پہلے اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم اور حضرت

اسمٰعیل علیہما السلام کو حکم دیتا ہے کہ میرے اس گھر کو صاف کرو کیونکہ یہاں میرا وہ نبی آنیوالا ہے جس کے نور سے ساری دنیا منوّر ہوگی۔ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ۔ میرے اس گھر کو ان لوگوں کے لئے تیار کرو جو طواف کرنے کے لئے یہاں آئیں گے جو اعتکاف بیٹھنے کے لئے یہاں آئیں گے اور جو یہاں آکر رکوع اور سجدہ کریں گے۔ مگر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے زمانہ میں اور اس کے بعد کتنے لوگ تھے جو اس نیت کے ساتھ وہاں آیا کرتے تھے۔ طواف تو لوگ کرتے ہی تھے مگر کتنے لوگ تھے جو وہاں اعتکاف بیٹھتے تھے اور اپنی عمریں خدا تعالیٰ کے دین کی خدمت کے لئے وقف کر دیتے تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے پہلے سینکڑوں سال کی تاریخ محفوظ ہے مگر وہ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ اس وقت وہاں بُت پرستی ہی بُت پرستی تھی۔ نہ خدا کے لئے کوئی اعتکاف بیٹھنے والا تھا۔ نہ خدا کے لئے وہاں رکوع ہوتا تھا اور نہ خدا کے لئے وہاں سجدہ ہوتا تھا۔ بلکہ جو لوگ خدا تعالیٰ کے نام کو بلند کرتے انہیں مارا اور پیٹا جاتا تھا۔ پس یہ جو باتیں بیان کی گئی ہیں کہ میرے اس گھر کو تیار کرو تاکہ طواف کرنے والے اعتکاف بیٹھنے والے اور رکوع وسجود کرنے والے یہاں آئیں۔ یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ہی ہونے والی تھیں اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو اسی تیاری کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ باقی رہا یہ سوال کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے کیا کام کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے ظاہری رنگ میں کعبہ کی تعمیر کی۔ اس طرح انہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے زمزم نکلوایا۔ بعد میں جو خرابیاں نظر آتی ہیں ان کی وجہ سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پر اعتراض نہیں ہو سکتا اصل غور کرنے والی بات یہ ہے کہ گو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے جن لوگوں کو اپنے بعد چھوڑا ان میں سے بہت سے مشرک اور بُت پرست ہو گئے مگر کیا دنیا کا کوئی شخص اس امر سے انکار کر سکتا ہے کہ دین کو پھیلانے کی قابلیت انہی کے اندر تھی۔ اہل مکہ نے بے شک اسلام کی مخالفت کی۔ قریش نے بے شک رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کی اور شدید مخالفت کی بلکہ ابوجہل کو پیش کرکے کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ جس قوم میں ابوجہل جیسے لوگ پیدا ہونے والے تھے کیا اس کے متعلق یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ۔ کیونکہ جب خدا نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام سے کہا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں۔ اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لئے تیار کرو تو اس کے معنے یہی تھے کہ ان کی آئندہ نسلیں یہ کام کریں گی ورنہ وہ تو ہمیشہ کے لئے زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔

پس ایک کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ کیا جس قوم میں ابوجہل جیسے لوگ پیدا ہونے تھے، اس

قوم کے متعلق یہ پیشگوئی ہو سکتی ہے؟ مگر مَیں اسے کہوں گا کہ اے نادان تجھے ابوجہل تو نظر آ گیا جس کا کام ختم ہو گیا۔ مگر تجھے ابوبکرؓ نظر نہ آیا جس کا کام آجتک جاری ہے۔ تجھے عتبہ و شیبہ تو نظر آ گئے جو پیدا ہو کر فنا ہو گئے مگر تجھے عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ نظر نہ آئے جن کو دائمی حیات بخشی گئی ہے اور جن کے کارنامے قیامت تک دنیا سے محو نہیں ہو سکتے۔ پھر اس میں کیا شبہ ہے کہ جس جوش اور جس اخلاص کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس اولاد نے دین کی خدمت کی اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتی۔

پس بے شک وہ لوگ بظاہر خراب ہو گئے مگر وہ خرابی ایسی ہی تھی جیسے اچھے کپڑے پر کوئی ایسی چیز گر جاتی ہے جس کا نشان نہیں پڑتا۔ مثلاً کوٹ پہ خشک مٹی جا پڑے تو برش سے اس کو جھاڑ دیتے ہیں۔ پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مکہ والے بظاہر خراب نظر آتے تھے مگر ان کی یہ خرابی ایسی ہی تھی جیسے کوٹ پر مٹی جا پڑے یا وہ ہیرا تو تھے مگر تراشا ہوا ہیرا نہیں تھے۔ جب محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توجہ اور آپؐ کی قوتِ قدسیہ کی برکت سے وہ تراشے گئے تو وہی ہیرے دنیا کی بہترین متاع شمار ہونے لگے۔ جب تک سونے کے ذرات مٹی میں ملے ہوئے ہوتے ہیں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ مگر جب کسی ماہر کی نگاہ ان پر پڑتی ہے تو وہ ان ذرات کو مٹی سے علیحدہ کر لیتا ہے۔ اور پھر وہی ذرات بہت بڑی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہیرا جب تک پتھر میں رہتا ہے اس کی قدر و قیمت کا کسی کو احساس نہیں ہوتا۔ مگر جب کوئی ماہر اسے کاٹ کر ہیرے کو اپنی اصلی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے تو اس کی قیمت لاکھوں، کروڑوں روپیہ تک پہنچ جاتی ہے۔

پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان میں خرابیاں پیدا ہوئیں۔ مگر جب محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں صفائی پیدا کی تو انہی میں ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ جیسے لوگ پیدا ہو گئے اور نہ صرف ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ پیدا ہوئے بلکہ اور ہزاروں لوگ پیدا ہوئے۔ ان میں طلحہؓ جیسے لوگ پیدا ہوئے، ان میں زبیرؓ جیسے لوگ پیدا ہوئے، ان میں عبدالرحمٰنؓ بن عوف جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ ان میں ابوعبیدہؓ جیسے لوگ پیدا ہوئے، ان میں سعدؓ جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ ان میں عثمانؓ بن مظعون جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے نام کو روشن کرنے کے لئے اپنے جذبات کی انتہائی قربانی کی یہاں تک کہ ان میں سے ہر شخص زندہ ابراہیم بن گیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ آپؐ ابوابراہیم بھی تھے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی قوت قدسیہ سے آپ کی رُوحانی اولادیں ہزاروں ابراہیمؑ پیدا ہوئے۔ مَیں نے ایک دفعہ رؤیا دیکھا کہ مَیں بیت الدعا میں بیٹھا ہوں کہ ایک فرشتہ میرے سامنے آیا۔ اور اس نے کہا مَیں تم کو ابراہیم بتاؤں۔ مَیں نے کہا مَیں ابراہیمؑ کو جانتا ہوں۔ وہ کہنے لگا ایک ابراہیمؑ نہیں کئی ابراہیمؑ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد اس نے کئی ابراہیمؑ مجھے بتانے شروع کئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت اس نے کہا۔ کہ وہ بھی ابراہیمؑ تھے۔ پھر اس نے حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا کہ وہ بھی ابراہیم تھے اور آپ کا نام اس نے ابراہیم ادھم بتایا۔ اسی طرح اور بیسیوں ابراہیم اس نے مجھ پر ظاہر کئے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہی نہ تھے بلکہ روحانی طور پر آپؐ ابراہیموں کے باپ بھی تھے۔ اور آپؐ کی روحانی اولادیں سے ہزاروں ابراہیم ہوئے۔ مجھے ہی فرشتہ نے بیسیوں کے قریب ابراہیم بتا دیئے تھے اور امتِ محمدیہ میں تو آجتک ہزاروں ابراہیم گذرے ہوں گے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو اسلام ابراہیموں کا باپ بھی قرار دیتا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالےٰ کے لئے اپنی اولادوں، اپنی جائدادوں، اپنے مالوں اور اپنی جانوں کو اس رنگ میں قربان کیا کہ ان میں اور ابراہیمؑ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم ایک دفعہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے ان کے لڑکے عبدالرحمٰن بھی موجود تھے یہ بعد میں مسلمان ہوئے ہیں پہلے کچھ مدت تک مسلمانوں کا مقابلہ کرتے رہے تھے اور بدر یا اُحد کی جنگ میں کفار کی طرف سے لڑے تھے۔ دَورانِ گفتگو وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے کہنے لگے۔ ابّا جان! اس جنگ میں جب فلاں جگہ سے آپ گذرے تھے تو مَیں ایک پتھر کے پیچھے چھپ کر کھڑا تھا۔ اور مَیں اگر چاہتا تو آپ کو مار دیتا کیونکہ اس وقت میری تلوار آپ تک پہنچ سکتی تھی مگر مَیں نے اپنے ہاتھ کو روک لیا۔ اور کہا اپنے باپ کو کیوں ماروں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے جواب دیا۔ خدا کی قسم اگر میری نظر تجھ پر پڑ جاتی تو مَیں تجھے ضرور مار ڈالتا۔ یہی ابراہیمی مقام ہے ابراہیمؑ کو بھی خدا نے کہا۔ قربانی کر اور وہ قربانی کے لئے تیار ہو گیا۔ اور یہاں بھی خدا تعالیٰ نے مسلمانوں سے کہا۔ اگر تمہیں اپنے ماں باپ۔ اپنے بیٹے۔ اپنے رشتہ دار، اپنے مکان اور اپنے اموال خدا اور اس کے رسولؐ سے زیادہ پیارے ہیں تو تمہیں میری طرف سے کوئی انعام نہیں مل سکتا بلکہ تم پر میرا عذاب نازل ہوگا۔ ان لوگوں نے خدا تعالےٰ کی اس آواز کو سُنا۔ اور پھر جیسا کہ خدا نے ان سے مطالبہ کیا تھا۔ انہوں نے اپنے ماں باپ کو قربان کر دیا۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کو قربان کر دیا۔ انہوں نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو قربان کر دیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو ہی دیکھ لو۔ انہوں نے جب اپنے بیٹے کی بات سُنی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح فوراً یہ جواب دیا کہ اگر میری نظر تجھ پر پڑ جاتی تو مَیں تجھے ضرور مار ڈالتا۔ یہ تیری خوش قسمتی تھی کہ تو بچ گیا۔ ان کا بیٹا اس وقت کافر تھا اور اس کی نگاہ میں اپنے باپ کی بڑی قدر تھی۔ چنانچہ باوجود دینی مخالفت کے اس نے نہ چاہا کہ اپنے باپ کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ مگر حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جو ماننے والے تھے ان کے اندر خدا تعالےٰ نے وہ ایمان پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹوں کو اپنے ہاتھ سے قربان کر دینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اسلام ہی ہماری ماں ہے۔ اسلام ہی ہمارا باپ ہے اور اسلام ہی ہمارا سب کچھ ہے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف بیٹے کی قربانی اصل قربانی نہیں کیونکہ بسا اوقات لوگ ماں باپ کے لئے اپنے بیٹوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ بے شک اولاد کی محبت کا طبعی جذبہ ہر انسان کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ مگر بعض لوگ ان طبعی جذبات سے بالا ہو کر اخلاقی زندگی بسر کرنے لگ جاتے ہیں اور اخلاقی دنیا میں ماں باپ کا درجہ بڑا ہوتا ہے۔ طبعی اور حیوانی دنیا میں بے شک بیٹے کا درجہ بڑا ہوتا ہے۔ لیکن اخلاقی دنیا میں ماں باپ کا درجہ بڑا ہوتا ہے۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اَتباع نے اللہ تعالےٰ کے دین کی خاطر ماں باپ کی ایسے ایسے رنگ میں قربانی کی ہے کہ انسان ان واقعات کو پڑھ کر بغیر اس کے کہ اس کے جذبات قابو سے نکل جائیں نہیں رہ سکتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا ہی واقعہ ہے ایک نوجوان جو بارہ تیرہ سال کا تھا اسلام میں داخل ہوا۔ اس کی ماں نے اسے تکلیفیں دیں، برتن الگ کر دیئے، کھانا الگ کر دیا اور گھر کے افراد سے کہہ دیا کہ کوئی اسے چھوئے نہیں اور اس کی چیزوں کو ہاتھ تک نہ لگائے۔ اس کے علاوہ اس پر سختی بھی کی جاتی اور اسے مارا پیٹا جاتا۔ اور سالہا سال یہی حالت رہی یہاں تک کہ ہجرت حبشہ کا زمانہ آگیا اور وہ مکّہ سے ہجرت کر کے حبشہ چلا گیا۔ وہاں ایک لمبا عرصہ رہنے کے بعد وہ پھر مکّہ میں واپس آیا اور کئی سال کے بعد وہ اپنے ماں باپ کے گھر گیا۔ اس نے سمجھا کہ اب ان کا غصّہ دور ہو چکا ہوگا اور ماں کی مامتا اور باپ کی محبت جوش میں آئی ہوئی ہوگی۔ آجکل سفر کی سہولتیں ہیں اور ریل گاڑیوں کی آمد و رفت اور ڈاک کی وجہ سے بُعدِ مسافت کا زیادہ احساس نہیں ہوتا۔ مگر آج بھی جن کے بچے لاہور یا دہلی میں عید منا رہے ہیں ان کی ماؤں کے دلوں میں بار بار یہ خیال آتا ہوگا کہ نہ معلوم ہمارا بچہ کس حال میں ہے۔ لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ جب کوئی دُور چلا جاتا تو سالہا سال تک اس کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ ایسی صورت میں ماں باپ کی جو قلبی کیفیات ہوتی ہوں گی ان کا بآسانی اندازہ

لگایا جاسکتا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ مَیں جب گھر میں داخل ہوا تو میری ماں بیتاب ہو کر مجھ سے چمٹ گئی اور رونے لگی۔ اس نوجوان کو بھی رونا آگیا اور اس نے سمجھا کہ شاید مَیں اب اس گھر میں رہ سکوں گا۔ لیکن اس کی ماں بھی کفر میں بڑی پختہ تھی اور وہ اگر اسلام پر مضبوطی سے قائم تھا تو اس کی ماں کفر کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی ماں اسے کہنے لگی کہ بچے اب تو تجھے سمجھ آگئی ہوگی کہ تو نے کیسا دین اختیار کیا ہے۔ دیکھ تجھے ماں باپ چھوڑنے پڑے اپنے عزیز اور رشتہ دار چھوڑنے پڑے اور پھر کیسی کیسی تکلیفیں ہیں جو تو نے اُٹھائیں۔ اب بھی تو ہم میں آکر مِل جا۔ اور یاد رکھ کہ ہم اس صورت میں تجھ کو اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے سکتے ہیں کہ تو پھر ہم میں شامل ہو جائے اور اسلام کو ترک کر دے۔ اس نے سمجھا کہ اثر ڈالنے کا یہی موقعہ ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے مگر وہ نوجوان بھی کم ایمان دار انہیں تھا۔ یہ سُنکر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے کہا ماں اگر تمہاری یہی شرط ہے کہ مَیں حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ دوں تو یہ شرط مَیں کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ یہ میری تم سے آخری ملاقات ہے اس کے بعد مَیں اب اس گھر میں نہیں آؤں گا چنانچہ پھر عمر بھر اس صحابی نے اپنی ماں کی شکل نہیں دیکھی۔[۱۰۹]

یہ قربانی اگر ہم غور کریں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی سے کسی طرح کم نہیں بلکہ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے جب اس قربانی کو دیکھا جائے تو یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی سے بڑھی ہوئی نظر آتی ہے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا درجہ اس صحابی سے کم ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ایسی ہی قربانی کا مطالبہ کرتا تو وہ بھی ضرور کرتے۔ میرا مطلب اس سے یہ ہے کہ ابراہیمی صفت لوگ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت میں پیدا ہوئے جو ابراہیمؑ کی طرح اس مقام پر کھڑے ہوئے کہ جب خدا نے انہیں کہا۔ کہ اَسْلِمْ۔ ہماری بات مان لو تو انہوں نے کہا اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ حضور کیا کہتے ہیں ہم تو پہلے سے قربانی کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ تو اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ[۱۱۰] کہنے والے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانی اولادمیں ہزاروں ہوئے۔ جنہوں نے دنیا کے سامنے پھر وہی نظارہ پیش کر دیا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ اور جبکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہم سیّد الانبیاء بلکہ ابوالانبیاء کہتے ہیں تو اس کے معنی یہی ہیں کہ آپ کی روحانیت کے اثر کے نیچے ہر نبی کا جلوہ آپؐ کی اُمت نے دکھا دیا۔ کوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان لے کر دنیا میں ظاہر ہوا۔ کوئی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی شان لے کر دنیا میں ظاہر ہوا۔ کوئی حضرت اسحاق علیہ السلام کی شان لے کر دنیا میں ظاہر ہوا۔ اور کوئی یعقوب علیہ السلام

کی شان لے کر دنیا میں ظاہر ہؤا۔ اسی طرح کسی نے نوحؑ کا جلوہ دکھایا، کسی نے موسیٰؑ کا جلوہ دکھایا کسی نے صالحؑ کا جلوہ دکھایا۔ کسی نے شعیبؑ کا جلوہ دکھایا، کسی نے زکریاؑ کا جلوہ دکھایا اور کسی نے عیسٰیؑ کا جلوہ دکھایا۔ غرض ہر رنگ کے لوگ آپ کی جماعت میں ہوئے۔ اور ہر نبی کی شان کا جلوہ دکھانے والے لوگ خدا تعالیٰ نے آپ کی اُمت میں پیدا کر دیئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس دن جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ میں بھیجا تو درحقیقت یہ تیاری تھی رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی آمد کی۔ خدا تعالیٰ نے انہیں کہا کہ تم ہمارا گھر تیار کرو۔ کیونکہ ہمارا محبوب اور ہمارا آخری شرعی رسول دنیا میں نازل ہونے والا ہے۔ تم آج سے ہی ہمارے محبوب کی آمد کی تیاری میں مشغول ہو جاؤ۔ اور آج سے ہی ایسی اولاد پیدا کرو جو میرے محبوب کو ابوبکرؓ دے، جو میرے محبوب کو عمرؓ دے، جو میرے محبوب کو عثمانؓ دے، جو میرے محبوب کو علیؓ دے۔ جو میرے محبوب کو طلحہؓ، زبیرؓ، حمزہؓ اور عباسؓ دے اور اسی طرح کے اور سینکڑوں صحابہ اس کے حضور بطور نذر پیش کرے۔ یہی مفہوم تھا اس حکم کا ورنہ ظاہری معنوں میں تو مکہ والوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد دین کا کوئی اچھا نمونہ نہیں دکھایا۔ ہاں چونکہ اس پیشگوئی کا ظہور رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے زمانہ سے شروع ہونا تھا، اس لئے خدا تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ میں لا کر رکھا تا کہ وہ ایسی اولاد تیار کریں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے دین کی خدمت کرے اور اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے جلال کے اظہار کے لئے وقف کر دے۔

مَیں نے خطبہ کے شروع میں یہ ذکر کیا تھا کہ یہ عید حج کے قریب رکھی گئی ہے۔ اس میں درحقیقت اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب جب کسی قوم کو نصیب ہو جائے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کی قربانی کرے۔ حج کیا ہے؟ خدا تعالیٰ کی رؤیت اور اس کا دیدار[11]۔ چنانچہ خواب میں اگر کوئی شخص اپنے متعلق دیکھے کہ اس نے حج کیا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ اس کا مقصد پورا ہو جائے گا[12]۔ اور انسان کی زندگی کا بڑا مقصد خدا تعالیٰ کی عبادت اور اس کا قرب حاصل کرنا ہوتا ہے۔ جیسے وہ فرماتا ہے۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[13]۔ کہ مَیں نے بنی نوع انسان کو اپنا مقرب بنانے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور حج اس بات کی علامت ہے کہ جس غرض کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے وہ اس نے پوری کر لی اور وہ غرض جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں لقاءِ الٰہی ہے۔

پس حج کے ساتھ عید الاضحیہ کی تقریب رکھ کر خدا تعالیٰ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب کسی قوم کو لقاءِ الٰہی نصیب ہو جائے تو اس کا دوسرا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی قربانی

کرے تاکہ خدا تعالےٰ کی لقاء دنیا سے مٹ نہ جائے۔ لقاءِ الٰہی ایک نہایت ہی قیمتی چیز ہے اور دنیا میں قیمتی چیزوں کے متعلق یہ دستور ہے کہ ان کی حفاظت کا زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے چنانچہ دیکھ لو جب تمہارے پاس کوئی اچھی چیز ہوتی ہے تو تم اس کے متعلق کیا کرتے ہو تم یہی کرتے ہو کہ اس کو حفاظت سے رکھنے کے لئے برتن تیار کرتے ہو۔ جن لوگوں کے گھر گائے یا بھینس ہوتی ہے ان کے متعلق بالعموم یہ دیکھا جاتا ہے کہ جب بھینس بچہ جننے والی ہو تو وہ بچہ جننے سے پہلے ہی برتن تیار کرنے شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی برتن دودھ دوہنے کے لئے تیار کرتے ہیں کوئی دودھ گرم کرنے کے لئے تیار کرتے ہیں کوئی دودھ جمانے کے لئے تیار کرتے ہیں، کوئی لسی بنانے کے لئے تیار کرتے ہیں اور کوئی مکھن اور گھی رکھنے کے لئے تیار کرتے ہیں تاکہ گائے یا بھینس جب دودھ دے تو اس وقت دقت پیش نہ آئے۔ اسی طرح اگر کسی کو لقاءِ الٰہی میسر آتی ہے۔ تو اس کا بھی فرض ہوتا ہے۔ کہ وہ لقاءِ الٰہی کو محفوظ رکھنے کے لئے برتن تیار کرے اور لقاءِ الٰہی کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ اولاد کی قربانی ہے۔ جب کوئی شخص اللہ تعالےٰ کے دین کے لئے اپنی اولاد کی قربانی کرتا ہے تو وہ عرفان کا دودھ اپنی ایک نسل کے لئے محفوظ کر دیتا ہے اور جب اس کی نسل کو عرفان ملتا ہے اور وہ بھی اپنی اولاد کی قربانی کرتی ہے تو عرفان کا دودھ اگلی نسل میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب تک لوگ اپنی اولاد کی قربانی کرتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کا عرفان ان کے دلوں میں محفوظ رہتا ہے۔

پس اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ ہمیں یہ نسخہ بتایا ہے کہ جب تمہیں خدا ملے اور اس کا قرب حاصل ہو جائے تو اس رحمت اور برکت کو آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ تم اللہ تعالےٰ کے لئے اپنی اولادوں کو قربان کر دو تب اس کی رحمت کا دودھ بعد کی نسل کے لئے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اس اولاد کو بھی عقل دیتا ہے اور وہ بھی اپنی اولاد کی قربانی پیش کر دیتا ہے تو اس سے اگلی نسل میں بھی یہ رحمت اور فضل کا دودھ محفوظ ہو جاتا ہے۔ غرض جب تک نسلیں اپنی اولاد کی قربانی کرتی رہیں گی، دین اور عرفان ان میں محفوظ رہے گا۔

یہ اولاد کی قربانی دو طرح ہوتی ہے ظاہری رنگ میں تو اس طرح کہ اپنی اولاد کی اعلیٰ تربیت کی جائے۔ ان میں دین کی محبت اور اس سے رغبت پیدا کی جائے اور انہیں علم دین سے واقف کیا جائے۔ مگر اس کے علاوہ اولاد کی ایک خاص قربانی بھی ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان اپنی اولاد کو اللہ تعالےٰ کے دین کی خدمت کیلئے وقف کر دے۔ تاکہ جب تک وہ زندہ رہے اسلام کی خدمت کرتی رہے۔ قربانی کے یہ دونوں رنگ اللہ تعالےٰ کے فضل سے ہماری جماعت میں پائے جاتے ہیں۔ اور اس وقت ایک ہماری جماعت ہی ایسی ہے جس میں خدا تعالےٰ نے وقفِ زندگی

کے سامان کئے ہوئے ہیں۔ اور ایک ہماری جماعت ہی ایسی ہے جسے اولاد کی اعلیٰ تربیت کے سامان میسّر ہیں مگر کتنے ہیں جو ان سامانوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

عید کے موقعہ پر خوشی منانے کے لئے تو بعض لوگ سب سے آگے آجاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح خدا تعالیٰ کے دین کے لئے اپنی اولاد کی قربانی نہیں کرتے اور اسے اسلام کی خدمت کے لئے وقف نہیں کر دیتے تو ان کا کیا حق ہے کہ وہ اس خوشی میں شامل ہوں جبکہ وہ وہ کام نہیں کرتے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خوشی میں شامل ہونے کا اسی کو حق ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسی قربانی بھی کرتا ہے۔ بے شک یہ خوشی منانے کا ابو بکرؓ کو حق حاصل تھا جس نے خدا کے لئے ہر قسم کی قربانی میں حصّہ لیا۔ بے شک یہ خوشی منانے کا عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کو حق حاصل تھا جنہوں نے ہر قسم کی قربانی میں حصہ لیا۔ اور بیشک یہ خوشی منانے کا طلحہؓ، زبیرؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حمزہؓ، عباسؓ اور عثمانؓ بن مظعون کو حق حاصل تھا جنہوں نے اپنی جانوں، اپنے مالوں، اپنی اولادوں، اپنے رشتہ داروں اور اپنی عزیز سے عزیز چیزوں کو خدا کے لئے قربان کر دیا۔ مگر دوسروں کا کیا حق ہے کہ وہ اس خوشی میں شریک ہوں۔

ایک لطیفہ مشہور ہے کہتے ہیں نظام الدین صاحب اولیاءؒ جن کی طرف خواجہ حسن نظامیؒ صاحب بھی اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں ایک دفعہ اپنے مریدوں کے ساتھ بازار میں سے گذر رہے تھے کہ انہیں ایک خوبصورت لڑکا نظر آیا جسے آگے بڑھ کر انہوں نے چوم لیا۔ یہ دیکھ کر ان کے تمام مرید ایک ایک کر کے آگے بڑھے اور انہوں نے اس بچے کو چومنا شروع کر دیا۔ مگر ان کے ایک مرید جو بعد میں ان کے خلیفہ بھی ہوئے۔ خاموش کھڑے رہے اور انہوں نے اس بچے کو نہ چوما۔ یہ دیکھ کر باقی سب نے آپس میں چہ میگوئیاں شروع کر دیں اور کہا کہ پیر صاحب نے اس بچہ کو چوما مگر اس نے نہیں چوما۔ معلوم ہوتا ہے اس کے اخلاص میں کوئی نقص ہے حالانکہ اسے چاہئیے تھا یہ پیر صاحب کی نقل کرتا۔ اور جس طرح پیر صاحب نے اسے چوما تھا اسی طرح یہ بھی چومتا اس نے ان باتوں کو سنا مگر کوئی جواب نہ دیا اور حضرت نظام الدین صاحب اولیاء پھر آگے چل پڑے۔ چلتے چلتے انہوں نے ایک بھٹیاری کو دیکھا کہ وہ دانے بھون رہی ہے اور بھٹی میں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ حضرت نظام الدین صاحب اولیاء آگے بڑھے اور انہوں نے آگ کے ان شعلوں کو چوم لیا۔ یہ دیکھ کر اور تو کسی مرید نے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کی مگر وہی مرید جس نے بچہ کو نہیں چوما تھا آگے بڑھا اور اس نے بھی شعلے کو چوم لیا۔ پھر اس نے باقیوں سے کہا کہ اب شعلے کو کیوں نہیں چومتے؟ ہمت ہے تو آگے بڑھو اور اسے چومو مگر سب پیچھے ہٹ گئے اور کسی نے ان شعلوں

کو چومنے کی جرأت نہ کی۔ ان کو تو خدا نے محفوظ رکھا۔ اور باوجود شعلوں کو بوسہ دینے کے نہ ان کے سر کے بال جلے اور نہ داڑھی کا کوئی بال جلا۔ لیکن اگر دوسرے بھی چومتے تو انہیں خطرہ تھا کہ ان کے سر اور داڑھی کے بال جل جائیں گے اور وہ ٹنڈ منڈ ہو کر گھر پہنچیں گے۔ غرض جب کوئی بھی آگے نہ بڑھا تو وہ مرید جس نے شعلوں کو چوما تھا کہنے لگا۔ میں نے تمہارے اعتراض کو سن لیا تھا مگر بات یہ ہے کہ تم حقیقت تک نہیں پہنچے تھے تم نے سمجھا کہ پیر صاحب نے اس لڑکے کو چوما ہے حالانکہ پیر صاحب نے اس لڑکے کو نہیں چوما۔ اس کے اندر انہیں کوئی روحانی قابلیت نظر آئی ہو گی۔ جس نے کسی آئندہ زمانہ میں ظاہر ہونا ہوگا اور اسی وجہ سے انہوں نے اسے چوما۔ مگر مجھے اس میں وہی جلوہ نظر نہ آیا اس لئے میں نے پیر صاحب کی نقل نہ کی اور اس لڑکے کو نہ چوما۔ پھر انہیں وہی جلوہ آگ میں نظر آیا اور مجھے بھی اس آگ میں خدا تعالیٰ کا جلوہ نظر آگیا۔ پس انہوں نے آگ کو چوما اور میں نے بھی آگ کو چوما لیکن میرا چومنا ایک حقیقت پر مبنی ہے اور تم نے جو اس بچہ کو چوما تو یہ محض ایک نقل تھی[۲۵]

تو حقیقت خوشی میں شامل ہونا اسی کو نصیب ہوتا ہے۔ جو آگ کے شعلوں کو چومنے کے لئے تیار ہوتا ہے اور اسی کا حق ہے کہ وہ عید منائے کیونکہ جب تک کوئی شخص آگ کے شعلوں میں سے نہیں گذرتا اس وقت تک وہ حقیقی خوشی بھی نہیں دیکھ سکتا۔

پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح جس نے اپنے بیٹے کی قربانی کر دی۔ خواہ تعلیم و تربیت کے رنگ میں اور خواہ وقف زندگی کی صورت میں اُسے حق ہے کہ وہ اس عید کی خوشی میں شریک ہو۔ اور اگر وہ اپنی اولاد کو خدمت دین کے لئے وقف نہیں کرتا اور نہ ان کی اس رنگ میں تربیت کرتا ہے جس رنگ میں اسلام اس سے مطالبہ کرتا ہے تو یقیناً اس کا اس عید میں شامل ہونے کا کوئی حق نہیں۔

قرآن کریم میں آتا ہے کہ منافق لوگوں کو جب جہاد پر جانے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ بہانے بنا بنا کر پیچھے بیٹھے رہتے ہیں[۲۶] مگر مسلمان جب فتح پا کر اور مال غنیمت لے کر بکریوں اور اونٹوں کے گلے ہانکتے ہوئے واپس آتے ہیں تو وہ منافق بھی دوڑ کر ان کے پاس پہنچتے ہیں اور کہتے ہیں ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ ہمیں بھی مال غنیمت میں سے حصہ دو اور ہمیں بھی ان گلوں اور ریوڑوں کی تقسیم میں شریک کرو[۲۷]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب اس قسم کے منافق تمہارے پاس پہنچیں تو تم انہیں دھتکار دو اور کہو کہ دُور ہو جاؤ ہماری نظروں سے۔ تم جب جہاد میں شامل نہیں ہوئے تو تمہارا کیا حق ہے کہ تم مالِ غنیمت میں شامل ہو۔ اسی طرح جس نے حضرت ابراہیم کے جہاد میں شمولیت کی، اس کا حق ہے

کہ وہ عید منائے۔ مگر جس نے حضرت ابراہیمؑ کے جہاد میں شمولیت نہیں کی، جس نے حضرت ابراہیمؑ کی طرح اپنی اولاد کو خدا تعالیٰ کے دین کی خدمت کے لئے وقف نہیں کیا اور اس خوشی میں شریک ہونے کے لئے آگیا ہے وہ منافق ہے۔ اور جس وقت وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خوشی میں شریک ہوتا ہے آسمان کے فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے منافقو! دور ہو جاؤ ہماری نظر سے۔ تمہارا کوئی حق نہیں کہ تم اس خوشی میں شریک ہو۔ تم نے وہ جہاد تو نہ کیا جو حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا۔ مگر تم بوٹیاں کھانے کے لئے آگئے۔ پس تمہاری عید کوئی عید نہیں۔ عید اسی کی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے نمونہ کو اپنے سامنے رکھتا اور اپنی اولاد کو خدا تعالیٰ کے دین کے لئے قربان کرتا ہے۔ اے دوستو! اس سبق کو یاد رکھو جو اس عید سے حاصل ہوتا ہے اور اپنے اندر سے نفاق کو دور کرو۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی طرح اپنے بیٹوں کی قربانی کرو تا کہ تمہیں بھی حقیقی عید کا دن دیکھنا نصیب ہو۔ ورنہ وہ شخص جو خوشی میں تو شامل ہو جاتا مگر تکلیف میں شامل نہیں ہوتا وہ منافق ہوتا ہے۔ خدا اس نفاق سے ہر شخص کو اپنی پناہ میں رکھے۔"

(الفضل ۹ر مئی ۱۹۴۰ء)

۱؎ ۔ صحیح بخاری کتاب المناسک باب الزیارۃ یوم النحر والخطبۃ ایام منیٰ

۲؎ ۔ البقرہ ۲ : ۱۲۹ تفسیر کبیر امام رازی جزء ۴ صفحہ ۷۹ مطبوعہ مصر

۳؎ ۔ البقرہ ۲ : ۱۳۰ ۔ الاعراف ۷ : ۱۶۰ ۔ سنن ابن ماجہ کتاب الزہد باب صفۃ امۃ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

۴؎ ۔ البقرہ ۲ : ۱۲۶

۵؎ ۔ (۱) الملل والنحل للامام ابی الفتح محمد بن عبدالکریم الشہرستانی برحاشیہ کتاب الفصل فی الملل والاھواء والنحل امام ابن حزم جزء ثالث صفحہ ۲۱۷ تا صفحہ ۲۲۲ کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔ امام شہرستانی نے عرب میں بت پرستی کی ابتداء ۔ بتوں کے نام اور ان کی وجہ تسمیہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ (۲) معجم البلدان یاقوت حموی جلد ۸ صفحہ ۱۲۹ ۔ زیر لفظ مکۃ لکھا ہے:۔ عرب میں بت پرستی کی عام اشاعت کی وجہ یہ ہوئی کہ قبائل عرب جو تمام اطراف سے حج کو آتے تھے واپس جاتے ہوئے حرم کے پتھروں کو اٹھا کر ساتھ لے جاتے تھے اور ان کو اصنام کعبہ کی صورت پر تراش کر ان کی عبادت کرتے تھے۔

۶؎ ۔ تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۳۳۳ مطبوعہ دارالمعارف مصر ۱۹۶۱ء ۔ تاریخ الخمیس جلد ۱ صفحہ ۳۳۰

۷؎ ۔ عمرو بن ہشام کنیت ابوالحکم، جنگ بدر میں دو لڑکوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ مسلمانوں نے اسے ابوجہل کہنا شروع کر دیا تھا۔ ([illegible])

۸؎ ۔ طلحہ بن عبیداللہ۔ کنیت ابو محمد۔ القرشی التیمی ۔ عشرہ مبشرہ میں سے ایک تھے ۳۶ھ میں جنگ جمل میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

۹ ۔ زبیر بن العوام۔ کنیت ابوعبداللہ القرشی الاسدی۔ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ کے بیٹے اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ ۳۶ھ میں وفات پائی۔

۱۰ ۔ عبدالرحمٰن بن عوف۔ کنیت ابومحمد القرشی الزہری۔ واقعہ فیل کے دس سال بعد پیدا ہوئے۔ زمانہ جاہلیت میں ان کا نام عبدالکعبہ تھا۔ ۳۱ھ میں وفات پائی۔

۱۱ ۔ ابوعبیدہ عبداللہ بن الجراح القرشی الفہری (۴۰ ق ھ ۔ ۱۸ھ) آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں امین الامت کا خطاب اور دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی تھی۔

۱۲ ۔ سعد بن ابی وقاص۔ کنیت ابواسحٰق القرشی الزہری۔ عشرہ مبشرہ میں ساتویں نمبر پر تھے مدینہ سے دس میل دور عقیق کے مقام پر ۵۴ھ یا ۵۵ھ یا ۵۸ھ میں فوت ہوئے۔

۱۳ ۔ عثمان بن مظعون۔ القرشی الجمحی۔ وفات ۲ھ

۱۴ ۔ کنز العمال جلد ۶ ص۱۱۸

۱۵ ۔

۱۶ ۔ یہ واقعہ حضرت عامر بن ابی وقاص کا ہے (طبقات ابن سعد ۴/۱ مطبوعہ لیڈن۔ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ۳/۹۷)

۱۷ ۔ البقرہ ۲ : ۱۳۲

۱۸ ۔ حمزہ بن عبدالمطلب۔ بنو ہاشم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا اور رضاعی بھائی تھے جنگِ اُحد میں شہید ہوئے۔

۱۹ ۔ عباس بن عبدالمطلب۔ بنو ہاشم۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا تھے ۳۲ھ میں ۸۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔

۲۰ ۔ لسان العرب جلد ۲ ص۲۲۶ زیر لفظ حجج

۲۱ تعطیر الانام مؤلفہ الشیخ عبدالغنی النابلسی جزو اول ص ۱۲۴-۱۲۵

۲۲ ۔ الذاریت ۵۱ : ۵۶

۲۳ ۔ محمد بن احمد بن دانیال بدایونی (۶۳۶ھ ۔ ۷۲۵ھ) برصغیر پاک وہند میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے نام اور محبوب الٰہی کے لقب سے مشہور ہیں۔

۲۴ ۔ خواجہ علی حسن نظامی (۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء ۔ ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۵ء) ناشر۔ مورخ اور اردو کے صاحبِ طرز ادیب تھے۔

۲۵ ۔ اس سے ملتا جلتا واقعہ خیر المجالس مرتبہ حمید شاعر القلندر رحمۃ اللہ علیہ پر بیان ہوا ہے یہ کتاب حضرت خواجہ صاحبؒ کے خلیفہ اعظم محمود چراغ کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔

۲۶ ۔ التوبہ ۹ : ۹۰ ۔ الاحزاب ۳۳ : ۱۴

۲۷ ۔ الفتح ۴۸ : ۱۶

۲۹

(فرمودہ ۹ جنوری ۱۹۴۱ء بمقام عیدگاہ قادیان)

یہ عید اس قربانی کی یاد میں منائی جاتی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کی خوشنودی کے حصول اور دنیا کی ہدایت کے لئے پیش کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ہدایت پر جمع کرنے کے لئے یہ انتظام فرمایا کہ دنیا میں سے ایک مقام کو برگزیدہ کرے اور لوگوں کے لئے مثابۃ یعنی جمع ہونے کی جگہ بنا دے اور اسے پاک وصاف اور عبادت کے لئے تیار رکھنے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ اپنے بچہ کو مقرر کر دیں کہ وہ اور اس کی آئندہ نسلیں اس مقام کو باہر سے آنیوالوں نیز مکہ کے رہنے والوں کے لئے بھی عبادت کے قابل رکھیں۔[1] مگر یہ حکم اس رنگ میں دیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رؤیا میں دیکھا کہ وہ اپنے بچہ کو ذبح کر رہے ہیں۔ اور آپ نے اس زمانہ کے رواج کے مطابق کہ تمام دنیا میں اس قسم کی قربانی رائج تھی یہی سمجھا کہ گویا انہیں اپنے بچہ کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور وہ اسے ظاہری شکل میں پورا کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔[2] اللہ تعالیٰ نے یہ حکم اس رنگ میں اس لئے دیا کہ تا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ اس رواج کا قلع قمع کیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ اپنے اکلوتے بیٹے کو لیکر جنگل میں گئے اور اسے ذبح کرنے کے لئے زمین پر گرا دیا۔ مگر عین اس وقت یہ الہام ہوا۔ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا[3]۔ کہ تُو نے ظاہری طور پر بھی یہ بات پوری کر دی اور باطنی طور پر بھی تو نے اس حقیقت کو پورا کر دیا۔ جو شخص چھری سے اپنے بچے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو جائے وہ اسے جنگل میں چھوڑ آنے سے کبھی انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ آپ نے اس رؤیا کے مطابق اپنے بچے اور بیوی کو خانہ کعبہ کے مقام پر چھوڑ دیا تا وہ دین کی خدمت کے لئے ایک مرکز تیار کریں[4] اور وہی مرکز اس وقت حج کا مقام ہے جہاں تمام دنیا سے حاجی اکٹھے ہو کر پہنچتے ہیں۔[5] یہ دراصل اسی قربانی کی یاد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے خدا کے حکم کے مطابق اپنے بیٹے کی قربانی کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ حج کے موقع پر سب مسلمان قربانی کر کے اس کی یاد کو تازہ کرتے ہیں اور اسی کی نقل میں ہر جگہ مسلمان قربانی کرتے ہیں[6] اور اس طرح گویا یہ بتاتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی اور اپنی اولادوں کو قربان کرنے کو بالکل تیار ہیں۔

یہ عید ہمیں یاد دلاتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لئے اپنی اور اپنی اولادوں کی قربانی ضروری ہے۔ جب بھی انبیاء دنیا میں آئے ہیں ان کو معنوی طور پر یہ قربانی

پیش کرنی پڑی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی سے انسان کی جسمانی قربانی تو بند ہوگئی مگر نفوس کی قربانی کی بنیاد ڈال دی گئی۔ اور حق یہ ہے کہ اس کے بغیر خدا تعالےٰ کی رضاء کا حصول ناممکن ہے۔ ظاہری قربانی جو جانوروں کی باقی ہے۔ اس کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے یہاں تک فرمادیا ہے کہ جو لوگ ظاہری رنگ میں جانور وغیرہ کی قربانی کرتے ہیں۔ ان کو اس امر پر خوش نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ خدا تعالےٰ کو پہنچتی ہے۔ فرمایا۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ۔ تمہارے ان قربانی کے جانوروں کا گوشت یا خون اللہ تعالےٰ کو نہیں پہنچتا بلکہ اللہ تعالےٰ کو صرف وہ نیکی اور پاکیزگی پہنچتی ہے جو تمہارے دلوں میں ہے۔ بہت سے لوگ بکرے اونٹ یا گائے کی قربانی کرکے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اللہ تعالےٰ کو پالیا۔ مگر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ یہ کوئی چیز نہیں۔ خود ہی جانور ذبح کیا۔ اور خود ہی کھالیا۔ اس سے خدا تعالےٰ کو کیا۔ یہ تو تصویری زبان ہے جس کے معنی کچھ اور ہیں۔ مصور ہمیشہ تصویریں بناتے ہیں۔ کبھی وہ زنجیر بناتے ہیں جس سے مراد قومی اتحاد ہوتا ہے کبھی وہ طلوع آفتاب کا نظارہ دکھاتے ہیں مگر اس کا مطلب قومی ترقی ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ ظاہری قربانی بھی ایک تصویری زبان ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جانور ذبح کرنے والا اپنے نفس کی قربانی کے لئے تیار ہے جو شخص قربانی کرتا ہے وہ گویا اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ میں خدا تعالےٰ کی راہ میں سب کچھ قربان کردونگا اور جو شخص قربانی کا گوشت کھاتا ہے۔ وہ گویا یہ اقرار کرتا ہے۔ کہ ہماری قوم کی قربانیاں میرے لئے اور ساری امت کے لئے سہولت پیدا کردیں گی۔ جب عید کے روز کسی کے ہاں قربانی کا گوشت بطور تحفہ آتا ہے تو یہ بکرے یا دُنبے یا گائے کا گوشت نہیں ہوتا بلکہ دراصل اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ میرے بھائیوں کی قربانیاں جو وہ خدا تعالےٰ کی راہ میں کررہے ہیں قبول ہوں گی اور اسلام کی ترقی کا موجب ہوں گی۔ یہ گوشت گویا تصویری زبان میں اسلام کی ترقی کا اقرار ہوتا ہے۔ پس جو بات ہم تصویری زبان میں بیان کرتے ہیں، چاہیئے کہ عملاً بھی اسے پورا کریں۔ کیونکہ محض نقل جس کے ساتھ حقیقت نہ ہو عزت کا موجب نہیں ہوسکتی۔ تھیٹر والوں کو شرفاء کیوں ناپسند کرتے ہیں۔ تھیٹر میں جو نقال بادشاہ بنتے ہیں، شرفاء کے نزدیک ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی لیکن حقیقی بادشاہ کی عزت سب کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ جب بادشاہ بننا موجب عزت ہے تو کیوں اس ایکٹر کی عزت نہیں کی جاتی جو تھیٹر میں بادشاہ بنتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ تھیٹر والا محض نقل کرتا ہے اور حقیقی بادشاہ جو کچھ کرتا ہے دنیا کو فائدہ پہنچانے کے لئے کرتا ہے۔ تھیٹر میں بادشاہ بننے والا اگر عملی زندگی میں بھی اس کے لئے جد و جہد کرے تو اسے بُرا نہیں سمجھا جائے گا لیکن محض نقل کسی عزت کا مستحق نہیں بناسکتی۔ اسی طرح جو شخص

بکرے کی قربانی کے ساتھ اپنے نفس کی قربانی بھی کرتا ہے، وہ شرفاء کے نزدیک قابل عزت و احترام ہے لیکن جو صرف بکرے کی قربانی پر اکتفا کرتا ہے۔ وہ نقال اور بھانڈ ہے اس لئے کسی عزت کا مستحق نہیں جس طرح بھانڈ کی کوئی عزت نہیں ہوتی اس کی بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح جو شخص قربانی کا گوشت کھانے کو تو تیار ہو جاتا ہے مگر اسلام کی ترقی کی خوشی میں شامل ہونے کو تیار نہیں وہ بھی بھانڈ وں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ در اصل عمل ہی ہے جو انسان کو معزز بناتا ہے محض نقالی کوئی چیز نہیں۔

پس دوست آج کے دن سے سبق حاصل کریں اور ہمیشہ اس قربانی کو مدنظر رکھیں جو ابراہیم علیہ السلام کے مدنظر تھی، جو حضرت ہاجرہ کے مدنظر تھی۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ تو نبی تھے عام انسان انبیاء جیسی قربانی کس طرح کر سکتے ہیں۔ مگر ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت ہاجرہ تو نبی نہیں مگر ان کی قربانی کتنی شاندار ہے کیا ہی دردناک نظارہ ہے، حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی اور بچے کو ایک جنگل میں چھوڑ آتے ہیں جہاں پچاس پچاس میل یا سو سو میل تک کوئی آبادی نہیں۔ پھر کوئی ساتھی بھی نہیں، کوئی سامان نہیں، صرف ایک مشکیزہ پانی کا اور ایک تھیلی کھجوروں کی جو زیادہ سے زیادہ دو تین روز کے لئے کفایت کر سکتی ہے۔ ایسی بیکسی کی حالت میں چھوڑ کر حضرت ابراہیمؑ واپس ہوتے ہیں تو حضرت ہاجرہ ان کا تعاقب کرتی ہیں انہوں نے سمجھ لیا کہ حضرت ابراہیمؑ ان کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اس لئے وہ پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔ اور پوچھتی ہیں۔ کہ ابراہیمؑ ہم کو کہاں چھوڑے جاتے ہو، یہاں نہ تو کوئی آبادی ہے۔ اور نہ ہمسایہ، نہ کھانے پینے کی کوئی چیز ہے۔ وہ بار بار یہ سوال کرتی ہیں مگر حضرت ابراہیمؑ کوئی جواب نہیں دیتے چونکہ ان کو سخت صدمہ اور غم تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر میں نے بات کی تو میرے آنسو جاری ہو جائیں گے اور اس سے ان کو اور صدمہ ہوگا، اس لئے وہ جواب سے پہلو تہی کرتے رہے۔ آخر حضرت ہاجرہ نے دریافت کیا کہ کیا آپ کو اللہ تعالٰے نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں۔ حضرت ہاجرہ کی لئے بانی دیکھو! ان کو اس امر میں صریح تباہی نظر آتی تھی۔ پھر ساتھ چھوٹا بچہ تھا، حفاظت کا کوئی سامان نہ تھا، دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجور کے سوا کھانے پینے کا بھی کوئی سامان پاس نہ تھا جو دو آدمیوں کے لئے زیادہ سے زیادہ دو تین روز تک کفایت کر سکتا ہے۔ یہ ایسے حالات ہیں کہ جن میں ایک قوی سے قوی انسان بھی ڈر جاتا ہے۔ لیکن جب حضرت ابراہیمؑ نے جواب میں کہا کہ میں خدا تعالیٰ کے حکم سے تمہیں یہاں چھوڑے جاتا ہوں تو جانتے ہو کہ حضرت ہاجرہ نے کیا جواب دیا۔ آپ فوراً پیچھے لوٹیں اور کہا کہ اگر خدا کا حکم ہے تو بے شک جائیے ہمیں کوئی پرواہ نہیں، ہمارا

خدا ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ دیکھو کتنا زبردست ایمان اور عظیم الشان یقین ہے۔ حضرت ہاجرہ کا یہ ایمان اور یقین ہی تھا جس نے حضرت ابراہیمؑ کے ایمان اور یقین سے مل کر مکہ کو ایک آباد شہر بنا دیا۔ دنیا کی عورتوں میں اس کی مثالیں بہت کم مل سکتی ہیں۔ اوّل تو عورت ہوتی ہی کمزور دل کی ہے۔ لیکن اگر کسی سے کہا جائے کہ آگ میں جل جاؤ یا چھری سے اپنے آپ کو ذبح کر لو، تو یہ نسبتاً آسان ہے بجائے جنگل میں بھوکا مرنے کے۔ جہاں اور بھی خطرات ہوں۔ ممکن ہے شیر یا کوئی چیتا آکر ہلاک کر دے یا پیاس سے تڑپنا پڑے اور بھوک سے مرنا ہو۔

پھر اس کے علاوہ ایک اور بات ہے۔ اور وہ یہ کہ ماں اپنی موت قبول کر سکتی ہے مگر اپنے بچے کی ایسی دردناک موت کو برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کا اکلوتا لڑکا پانی کے گھونٹ اور روٹی کے لقمہ کے لئے ایڑیاں رگڑ کر مر جائے۔ پھر حضرت ہاجرہ کے دل میں یہ وسوسہ بھی پیدا ہوتا ہوگا کہ ممکن ہے پہلے میں مر جاؤں اور بچہ بعد میں تڑپ تڑپ کر جان دے۔ اس قسم کے خطرات کے باوجود ان کا اس قربانی کے لئے تیار ہو جانا ایسی ہمت کا کام ہے جو ہمیشہ کے لئے یاد رکھے جانے کے قابل ہے۔ وہ ان سب صدمات کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ اور اپنی اور اپنے بچہ کی موت کے خوف کے باوجود اس دن کے انتظار کے لئے آمادہ ہو گئیں۔ جب اللہ تعالیٰ مکہ کو ایک شہر بنا دے گا۔

یہ قربانی ہمیں بتاتی ہے، کہ انسان مومن کامل اس صورت میں بن سکتا ہے جب وہ خدا تعالیٰ کے سامنے اپنے آپ کو اس رنگ میں ڈال دے کہ اسے کسی خطرہ کی پرواہ نہ ہو۔ بھوک اور پیاس کی تکلیف کا احساس مٹ جائے۔ اور وہ دوستوں اور مددگاروں سے بالکل بے نیاز ہو جائے۔ یہ قربانی اپنے اندر ہر قسم کی قربانی رکھتی ہے۔ اس میں وطن کی قربانی بھی ہے رشتہ داروں اور دوستوں کی قربانی بھی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ ڈر سے بچ جائے مگر اس قربانی میں اطمینان کی قربانی بھی شامل ہے۔ گویا آرام کی ساری صورتیں یہاں مفقود تھیں۔ ساتھی نہ تھے بیوطنی تھی۔ بھوک پیاس سے بچنے کے سامان نہ تھے، اطمینان کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حضرت ہاجرہ کو توفیق دی۔ اور انہوں نے ان سب خطرات کو قبول کیا۔ اور سمجھ لیا کہ جب میں خدا تعالیٰ کے لئے قربانی کرتی ہوں تو وہ مجھے کبھی ضائع نہیں کرے گا۔

سب انبیاء کی جماعتوں کو درجہ بدرجہ قربانی کرنی پڑتی ہے۔ اس وقت جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں ان میں سے اکثر ہیں جن کو اپنے وطن قربان کرنے پڑے۔ پھر اب تو قادیان میں حالات کچھ درست ہو گئے ہیں اور کچھ تجارتیں چل نکلی ہیں مگر جو لوگ ابتدائی زمانوں میں یہاں آئے، ان کے گزارہ کی یہاں کوئی صورت نہ تھی۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے ایک اعلیٰ درجہ

کی ملازمت عطا فرمائی تھی۔ وہ چھوٹی تو آپ نے اپنے وطن میں پریکٹس شروع کی۔ وہاں آپ کی بہت شہرت تھی۔ آپ کا وطن بھیرہ سرگودھا کے ضلع میں ہے جہاں بڑے بڑے زمیندار ہیں اور ان میں سے اکثر آپ کے بڑے معتقد تھے۔ پس وہاں کام چلنے کا خوب امکان تھا۔ لیکن آپ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملنے قادیان آئے چند روز بعد جب واپسی کا ارادہ کیا تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ دنیا کا آپ بہت کچھ دیکھ چکے ہیں۔ اب یہیں آ بیٹھئے۔ آپ نے اس ارشاد پر ایسا عمل کیا کہ خود سامان لینے بھی واپس نہیں گئے بلکہ دوسرے آدمی کو بھیج کر سامان منگوایا۔ اس زمانہ میں یہاں پریکٹس چلنے کی کوئی امید ہی نہ تھی۔ بلکہ یہاں تو ایک پیسہ دینے کی حیثیت والا بھی کوئی نہ تھا مگر آپ نے کسی بات کی پرواہ نہیں کی۔ پھر بھی آپ کی شہرت ایسی تھی کہ باہر سے مریض آپ کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ اور اس طرح کوئی نہ کوئی صورت آمد کی پیدا ہو جاتی تھی۔ مگر حضرت مولوی عبدالکریم صاحب کی قربانی ایسے رنگ کی تھی کہ کوئی آمد کا احتمال بھی نہ تھا۔ نہ کہیں سے کسی فیس کی امید تھی نہ کوئی تنخواہ تھی اور نہ وظیفہ۔ کسی طرف سے کسی آمد کا کوئی ذریعہ نہ تھا، مگر وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سیکرٹری کے طور پر کام کرتے تھے۔ اس وقت جتنے کام تمام محکمے کر رہے ہیں یہ سب وہ اکیلے کرتے تھے۔ حالانکہ گذارہ کی کوئی صورت نہ تھی۔ اور یہ بھی وادیٔ غیر ذی زرع میں جان قربان کرنے والی بات ہے۔

اور بھی کئی ایسے لوگ ہیں۔ اب تو یہاں بعض ملازمتیں نکل آئی ہیں اور صنعت و حرفت کے بعض کام بھی چل پڑے ہیں۔ تجارت بھی کچھ نہ کچھ ہونے لگی ہے گو لاہور، امرتسر وغیرہ بڑے شہروں کی طرح تو نہیں مگر پھر بھی گذارہ کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن ابتداء میں ان چیزوں میں سے کچھ بھی یہاں نہ تھا۔ اور اب بھی دوست اگر اپنی قربانیاں جاری رکھیں تو موجودہ حالت بھی ترقی کے لئے بیج بن جائے گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ کہ وہ ہر قربانی کو جو انسان کرتا ہے آئندہ ترقیات کے لئے بیج کی حیثیت دے دیتا ہے۔ کئی لوگوں کی قربانیوں کی مثال بوڑھے درخت کی ہوتی ہے جو صرف اپنے آپ کو ہی فائدہ پہنچاتے ہیں۔ کئی ایک کی مثال جوان پھلدار درخت کی ہوتی ہے جو کچھ نہ کچھ فائدہ دنیا کو بھی پہنچاتے ہیں۔ مگر کئی ایک کی مثال اس بیج کی سی ہوتی ہے۔ جس میں سے سو سو، دو دو سو دانے پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایسی ہی قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی طرح ہوتی ہے۔ اور کوئی انسان جتنی اس قسم کی قربانی کرتا ہے اتنا ہی اللہ تعالیٰ اس میں نشوونما کی طاقت کو بڑھا دیتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب قربانی کی تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ آسمان کی طرف دیکھ جس طرح آسمان پر ستارے بے شمار ہیں اسی طرح دنیا میں تیری نسل بھی بے شمار ہو گی۔ آج دنیا میں جدھر جاؤ، حضرت ابراہیمؑ کی نسل نظر آتی ہے۔ کروڑوں یہودی ہیں، پھر سید بھی چالیس پچاس لاکھ ہوں گے، کروڑ دو کروڑ

قریب قریش ہیں۔ اور اس طرح تمام دنیا کی قریبًا پانچ فیصدی آبادی ابراہیمی نسل سے ہے۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کی نسل کو اس قدر صرف اس لئے بڑھایا کہ وہ اپنے آپ کو نیز اپنی اولاد کو اللہ تعالےٰ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے[۱۵] اور حضرت ابراہیمؑ کی یہ قربانی ہمیں یہ سبق سکھاتی ہے کہ اولاد قربان کرنے سے نسل بڑھتی ہے۔ اور اگر کوئی چاہتا ہے کہ اس کی نسل بڑھے اور پھیلے اور اسے اور اس کی نسلوں کو عزت ملے تو اس کا طریق یہ ہے کہ اپنی اولاد کو دین کی راہ میں قربان کر دے۔ یہ ایک ایسا گر ہے کہ ہمارے دوستوں کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کی نسلیں دنیا پر چھا جائیں اور ہزاروں سال تک ان کا نام عزت کے ساتھ زندہ رہے تو وہ اسوہ ابراہیمیؑ پر عمل پیرا ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ کیا تھے ایک معمولی رئیس تھے۔ جن کے پاس شاید چار پانچ سو بکریاں ہوں گی، سو دو سو اونٹ ہوں گے جو آج ہزاروں لوگوں کے پاس ہیں۔ مگر ان کا کسی کو علم بھی نہیں ہوتا لیکن حضرت ابراہیمؑ کی یاد ساری دنیا میں قائم ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے ان کی نسل کو وسعت دی اور اب تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ دے کر ان کی روحانی اولاد بھی بہت سی بنا دی ہے اور اس طرح اور بھی عزت قائم کر دی۔ آج یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی یہودی حضرت ابراہیمؑ کے لئے گالی برداشت کرے مگر کوئی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا۔ یہودی آپ کی ذریت سے ہیں مگر کوئی یہودی آپ کے لئے روزانہ دعا نہیں کرتا ہو گا۔ لیکن مسلمان دن میں پانچ وقت اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ کہتا ہے اور اس طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے لئے بھی دعا کرتا ہے۔ یہ برکت حضرت ابراہیمؑ کو اس قربانی کی وجہ سے ملی۔ اور یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اللہ تعالےٰ کا کوئی رشتہ نہ تھا جو اُن کو اتنی برکت دیدی۔ ہر شخص جو آپ کے نقشِ قدم پر چلے اور اپنے نفس اور اپنی اولاد کو خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دے ان برکات سے حصہ پا سکتا ہے جو اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو عطا کیں۔

پس اس عید سے یہ سبق سیکھا جائے تو یہ ہمارے لئے خوشی کا موجب ہو سکتی ہے۔ ورنہ یہ ہمارے لئے خوشی کا نہیں بلکہ ملامت کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ایسا انتظام کیا ہے کہ ہر سال یہ عید آکر ہمیں اپنے فرض منصبی کی طرف متوجہ کرتی ہے مگر ہم پھر بھول جاتے ہیں۔ پس دوستوں کو یہ سبق اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے اور کوشش کرنی چاہیئے کہ حضرت ابراہیمؑ کے نقشِ قدم پر چلیں۔ اللہ تعالےٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے، مَیں اسی پر خطبہ کو ختم کرتا ہوں۔

آج بعض دوستوں کی طرف سے تحریک کی گئی تھی کہ اعلان کر دیا جائے کہ سب لوگ خطبہ کے لئے بیٹھے رہیں کوئی خطبہ ختم ہونے سے پہلے نہ جائے۔ مگر مَیں نے اس سے روک دیا کیونکہ قربانی کے لئے یا اور اشد ضرورتوں کے لئے چلے جانا جائز ہے[۵۳]۔ مگر مَیں نے دیکھا ہے کہ قریباً سب لوگ آپ ہی آپ بیٹھے رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ لاؤڈ سپیکر کی وجہ سے آواز ہر جگہ آسانی سے پہنچ رہی ہے۔ یا شاید اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ سب کے سب بیٹھ کر خطبہ سُنیں۔

اسی طرح مولوی محمد ابراہیم صاحب بقا پوری نے مجھے لکھا ہے کہ جو روزہ اس عید کے موقع پر رکھا جاتا ہے وہ سنّت نہیں، اس کا اعلان کر دیا جائے۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق ثابت ہے کہ آپ صحت کی حالت میں قربانی کر کے کھاتے تھے[۵۴] تاہم یہ کوئی ایسا روزہ نہیں کہ کوئی نہ رکھے تو گنہگار ہو جائے۔ یہ کوئی فرض نہیں بلکہ نفلی روزہ ہے اور مستحب ہے، جو رکھ سکتا ہو رکھے مگر جو بیمار، بوڑھا، یا دوسرا بھی نہ رکھ سکے وہ مکلف نہیں اور نہ رکھنے سے گنہگار نہیں ہوگا۔ مگر یہ بالکل بے حقیقت بھی نہیں جیسا کہ مولوی بقا پوری صاحب نے لکھا ہے مَیں نے صحت کی حالت میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس پر عمل کرتے دیکھا ہے۔ پھر مسلمانوں میں یہ کثرت سے رائج ہے اور یہ یونہی نہیں بنا لیا گیا بلکہ مستحب نقل ہے جس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا تعامل رہا اور جس پر عمل کرنے والا ثواب پاتا ہے مگر جو نہ کر سکے اسے گناہ نہیں۔

اس کے بعد میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس عید کو ہمارے لئے حقیقی عید بنائے اور اسے اسلامی ترقیات کا موجب کرے۔ ہم میں باہمی محبت اور الفت پیدا کرے اور مخالفتوں، بُغض و عناد اور عداوتوں کو دُور کر دے۔ اور سب کے دلوں میں حقیقی ہمدردی اور محبت پیار پیدا کرے۔ ہماری سُستیوں اور کوتاہیوں کو دُور کر کے محنت کی عادت ڈال دے تا ہم دنیا میں کار آمد اور مفید وجود بن سکیں، نکمّے ذلیل اور ناکارہ نہ ہوں۔ آمین۔

(الفضل ۷ر جنوری ۱۹۴۱ء)

---

۵۲ ۔ البقرۃ ۲ : ۱۹۶ - الحج ۲۲ : ۲۷

۵۳ ۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۳-۱۰۴

۵۴ ۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۶

۴؎ - ابراہیم ۱۴ : ۳۸

۵؎ - آلِ عمران ۳ : ۹۷-۹۸ - الحج ۲۲ : ۲۸

۶؎ - الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۵

۷؎ - الحج ۲۲ : ۳۸

۸؎ - صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی۔

۹؎ - تاریخ احمدیت جلد ۴ ص ۱۴۴

۱۰؎ - تاریخ احمدیت جلد ۴ ص ۱۴۵

۱۱؎ - مکتوب امام الزمان بنام حضرت نواب محمد علی خانؓ۔ اصحاب احمد جلد ۲ ص ۹۱

۱۲؎ - حیاتِ نور الدینؓ مطبوعہ دسمبر ۱۹۲۲ء ص ۱۵۴ و حیاتِ نُور مصنفہ شیخ عبدالقادر صاحب ص ۳۰۲

۱۳؎ - ملفوظات جلد ۸ ص ۳۶۵

۱۴؎ - پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۷

۱۵؎ - پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۸

۱۶؎ - الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۵، ۱۰۷ - سنن ابی داؤد صلوٰۃ العیدین۔ باب الجلوس للخطبۃ

۱۷؎ - حضرت مولوی محمد ابراہیم صاحب بقاپوریؓ (۱۸۷۳ - ۱۹۶۴ء) باقاعدہ بیعت ۱۹۰۵ء میں کی۔ آپ سلسلہ کے ممتاز خادم تھے۔ سالہا سال تک مبلغ اور پھر رئیس التبلیغ کے فرائض انجام دیتے رہے۔

۱۸؎ - سنن کبریٰ جلد ۳ ص ۲۸۳

۳۰

(فرمودہ ۲۹؍دسمبر ۱۹۴۱ء بمقام مسجد نور قادیان)*

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ۔ اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ۔

آج سے کوئی سوا تیرہ سو سال پہلے یا اس سے کچھ زیادہ یہ سُورۃ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ اس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی یہ حالت تھی کہ باہر نماز بھی ادا نہیں کرسکتے تھے اور آپ کے پیغام کو ماننے والے صرف چند ہی آدمی تھے[۱]۔ جب آپؐ نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی تو معتبر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مکہ مکرمہ کے کل ۸۰ آدمی آپؐ پر ایمان لائے تھے[۲] مگر یہ تو آخری دنوں کی بات ہے۔ اس سے پہلے یہ حالت تھی کہ صرف چند آدمی ہی آپ پر ایمان لائے تھے جن کی تعداد پندرہ سولہ سے زیادہ نہیں تھی۔ مکہ کی آبادی گو وہ بہت بڑا شہر نہیں ہے اور نہیں تھا مگر پھر بھی اس وقت آٹھ دس ہزار کی معلوم ہوتی ہے۔ اور آٹھ دس ہزار کی آبادی میں سے ایک دو درجن کے قریب آدمیوں کا ساتھ ہونا اور سارے شہر کے لوگوں کا مخالف ہونا کہ ہر وقت ان کا مسلمانوں کی جان لینے کی فکر میں رہنا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سالہا سال تک مکہ میں مسلمانوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ چنانچہ اس بات کو دیکھ کر کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صرف چند آدمی ایمان لائے تھے جو مکی زندگی کے پہلے سالوں میں دو تین درجن تک تھے اور آخر میں چھ سات درجن تک ہوگئے اور ادھر یہ دیکھ کر کہ آپ کی نرینہ اولاد کوئی نہیں آپؐ کے دشمن اپنی نابینائی اور اندھےپن

---

* عیدالاضحیہ جلسہ سالانہ کے دنوں میں منائی گئی اس تقریب سعید کے متعلق الفضل نے جو نوٹ لکھا اس کے چیدہ چیدہ پہلو حسب ذیل تھے:۔

۲۹؍دسمبر کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالےٰ بذریعہ کار مسجد نور میں تشریف لے گئے اور پھر نماز عید پڑھانے کے بعد جلسہ گاہ میں تشریف لائے۔ حضور نے خطبہ کے لئے کھڑے ہوتے ہی بلند آواز سے عید کی تکبیر اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد دو دفعہ پڑھی۔ خطبہ کے بعد حضور نے ہدایت فرمائی کہ احباب ایک دوسرے سے ملاقات کرتے وقت عید کی تکبیرات پڑھیں۔ خواتین نے عید کی نماز زنانہ جلسہ گاہ میں پڑھی۔ اور اسی جگہ لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ خطبہ سُنا۔ عیدگاہ میں بھی نماز عید ہوئی جہاں مکرم مولوی عبدالرحمان صاحب مولوی فاضل جنرل پریذیڈنٹ لوکل انجمن احمدیہ نے تقریباً ۲½ سو مقامی احباب کو عید کی نماز پڑھائی۔ (الفضل یکم جنوری ۱۹۴۲ء صفحہ ۲)

کی وجہ سے یہ خیال کرتے تھے کہ یہ شخص دین سے بھی گیا اور دنیا سے بھی۔ وہ کہتے تھے کہ روحانی لحاظ سے بھی اس کے ماننے والے کوئی نہیں اور جسمانی لحاظ سے بھی نرینہ اولاد سے محروم ہے۔ ہماری پنجابی زبان میں جیسے کسی کی تحقیر کرنی ہو تو کہتے ہیں "او نترا نکھترا"۔ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان بدبختوں نے یہی نام رکھا ہوا تھا کہ "او نترا نکھترا" ہے۔ مکہ میں آپ کے ماننے والوں کی جو درگت بنا کرتی تھی۔ اس کے متعلق غلاموں کے واقعات تو بہت دفعہ بیان ہو چکے ہیں مگر جو لوگ گھر بار والے تھے اور بڑے بڑے رئیس خاندانوں میں سے تھے۔ ان کی بھی یہ حالت تھی کہ اپنے کیا اور غیر کیا بہت بری طرح ان کی خبر لیتے تھے۔ ایک صحابی جو مکہ کے بہت بڑے خاندان میں سے تھے اور ایک بڑے رئیس کی اولاد تھے عثمان بن مظعون ان کا نام تھا وہ اپنی جوانی کے ایام میں ہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے اور اس صدق اور جوش سے ایمان لائے کہ گویا اپنے محلہ والوں کو انہوں نے ہلا دیا۔ لوگوں نے ان کو تکلیفیں دینی شروع کیں۔ دُکھ دینے شروع کئے اور اس قدر دُکھ دیئے کہ جب ہجرت اُولیٰ ہوئی تو وہ ایبے سینیا* (ETHOPIA) کی طرف چلے گئے۔ مگر بعد میں کفار نے جب یہ خبر اڑا دی کہ مکہ کے تمام لوگ مسلمان ہو گئے ہیں اور وہاں امن قائم ہو گیا ہے تو وہ پھر مکہ کو واپس آئے مگر جب مکہ میں پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ خبر بالکل جھوٹی ہے اور اس لئے اڑائی گئی ہے تاکہ مسلمان واپس آئیں اور کفار ان کو پھر دکھ دیں۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ پھر واپس ایبے سینیا چلے جائیں مگر اتنے میں مکہ کا ایک سردار جو بہت بڑی عظمت اور شان رکھتا تھا اور جس کا تمام لوگ ادب کیا کرتے تھے اور جو عثمان بن مظعون کے باپ کا گہرا دوست تھا اور وہ دونوں آپس میں بھائی بھائی بنے ہوئے تھے۔ ان کو ملا اور انہیں دیکھ کر کہنے لگا کہ تم کہاں غائب تھے؟ انہوں نے کہا میری زندگی یہاں کے لوگوں نے حرام کی ہوئی تھی۔ اور میں مظالم سے تنگ آ کر ایبے سینیا چلا گیا تھا۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ مکہ کے تمام لوگ مسلمان ہو گئے ہیں مگر جب واپس آیا تو معلوم ہوا کہ وہی حالات ہیں۔ اس لئے اب میں پھر واپس جانے لگا ہوں اس نے کہا۔ نہیں تمہارا باپ میرا بھائی بنا ہوا تھا، کون ایسا ہو سکتا ہے جو میری موجودگی میں تم کو دکھ دے سکے۔ چنانچہ اس نے ان کا ہاتھ پکڑا اور خانہ کعبہ کی طرف لے کر چل پڑا۔ جیسے ہمارے ہاں جلسہ سالانہ کے موقعہ پر اگر کوئی عام اعلان کرنا ہو تو جلسہ کی سٹیج پر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں میں دستور تھا کہ جب کوئی عام اعلان کرنا ہوتا تو خانہ کعبہ میں جا کر کرتے اس نے بھی

---

* اس سے مراد حبشہ ہے۔

ان کا ہاتھ پکڑا۔ خانہ کعبہ میں لے گیا۔ اور وہاں جاکر اعلان کر دیا کہ اے لوگو سُن لو۔ عثمان بن مظعون میری حفاظت میں ہے اگر اس کو کسی نے کچھ کہا تو اس نے اسے نہیں بلکہ مجھے کہا۔ عربوں میں اس بات کا بڑا لحاظ کیا جاتا تھا کہ جس شخص کا ادب اور احترام ان کے دلوں میں ہوتا تھا وہ جس کو بھی اپنی پناہ میں لے لیتا اسے کوئی شخص تکلیف نہیں پہنچا سکتا تھا۔

عثمانؓ بن مظعون بھی کھلے بندوں مکہ میں پھرنے لگے اور کوئی شخص انہیں چھیڑ نہیں سکتا تھا۔ مگر ایک دن جب وہ باہر نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ بعض مسلمانوں کو لوگ مار رہے ہیں اور بعض غلاموں کو دیکھا کہ لوگ ان کو گلیوں میں گھسیٹ رہے ہیں۔ ان کے مونہوں پر تھوک رہے ہیں اور انہیں کوڑے لگا رہے ہیں۔ یہ نظارہ دیکھکر ان سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ واپس آئے اور جس رئیس نے انہیں پناہ دی تھی اس سے آکر کہنے لگے کہ آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا تھا جو مجھے پناہ دی۔ اور مکہ والوں کے ظلموں سے مجھے بچایا۔ مگر آج میں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو اس طرح ظلم کا نشانہ بنتے دیکھا ہے کہ مجھ سے یہ بے غیرتی اور بے حیائی برداشت نہیں ہو سکتی کہ اُن کو تو ماریں پڑیں اور مجھے نہ پڑیں۔ بس آپ کا اعلان واپس کرنے کیلئے آیا ہوں۔ اس نے کہا بچے! سوچ لو۔ انہوں نے کہا میں نے خوب سوچ لیا ہے۔ چنانچہ اس نے اعلان کر دیا کہ میں نے عثمانؓ بن مظعون کو جو پناہ دی ہوئی تھی وہ واپس لیتا ہوں۔ تھوڑے دنوں کے بعد حج کا موقعہ آیا اور عرب کے مشہور شاعر لبید جو بعد میں اسلام لے آئے تھے اور جو ایک سو بیس سال کی عمر میں فوت ہوئے وہ حج کے دنوں میں مکہ میں آئے اور انہوں نے اپنے شعر سُنائے۔ تمام رؤسا جمع تھے مجلس لگی ہوئی تھی اور سب تعریفیں کر رہے تھے کہ اشعار سناتے سناتے انہوں نے یہ مصرعہ پڑھا

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلُ

سُنو خدا کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ عربوں کو زبان کا چسکا تو بڑا ہی ہوا تھا صحابہ بھی اس سے متاثر تھے اور وہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ داد دیا کرتے تھے عثمانؓ بن مظعون اس وقت مجلس میں موجود تھے جب اس نے کہا۔

اَلَا کل شی ءٍ ما خلا اللہ باطلُ

سنو ہر چیز خدا کے سوا فنا ہونے والی ہے تو عثمانؓ بن مظعون نے کہا۔ سچ کہا سچ کہا وہ اپنے آپ کو اتنا بڑا آدمی سمجھتا تھا کہ سوائے بڑے بڑے ادیبوں اور رؤساء کے اپنے اشعار کی کسی سے تعریف سننا بھی اپنی ہتک سمجھتا تھا اس نے جب سنا کہ ایک لڑکے نے اس کا مصرعہ سُن کر کہا ہے کہ سچ کہا سچ کہا تو اس نے وہیں شعر پڑھنے بند کر دیئے اور مکہ والوں سے کہا کیا تم میں اب کوئی شریف آدمی نہیں رہا۔ یہ کل کا چھوکرا مجھے داد دیتا ہے۔ کیا میں اس کی داد کا محتاج ہوں اگر یہ کہے گا کہ میں نے

سچ کہا تو میری بات سچ ہوگی اور اگر یہ کہے گا کہ میری بات غلط ہے تو وہ غلط ہوگی۔اس پر رؤساء نے عثمانؓ بن مظعون کو ڈانٹا اور کہا خبردار تم مت بولو۔تمہارا کوئی حق نہیں کہ اس مجلس میں کسی شعر پر داد دو۔ اور ان کی منتیں کرکے کہا کہ آپ آگے چلیئے چنانچہ انہوں نے اگلا مصرعہ پڑھا کہ ع

وَكُلُّ نَعِيمٍ لَامَحَالَةَ زَائِلُ

اور ہر نعمت آخر تباہ ہوجانے والی ہے۔عثمانؓ بن مظعون ابھی ڈانٹ کھا کر بیٹھے ہی تھے کہ جونہی انہوں نے یہ مصرعہ پڑھا وہ فوراً بول اُٹھے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔جنّت کی نعمتیں کبھی زائل نہیں ہوں گی۔ پھر کیا تھا لبید کو غصّہ آگیا۔ اور انہوں نے کہا۔ میں تو اب آگے نہیں پڑھتا۔ چنانچہ بعض نوجوان رئیس کھڑے ہوئے اور انہوں نے عثمانؓ کو مارنا شروع کردیا۔ اسی دوران میں ایک نے زور سے آپ کی آنکھ پر مُکّہ مارا جس سے آنکھ نکل گئی۔ وہ رئیس جوان کے باپ کا بھائی بنا ہُوا تھا۔ وہ اس حالت میں ان کی مدد بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اور ادھر ان کے باپ کی محبت بھی اس کے دل پر غالب تھی۔ ایسی حالت میں اس نے وہی کچھ کیا جو غریب ماں اپنے اس بچہ سے کیا کرتی ہے جسے کسی امیر آدمی کے بچہ نے مارا ہو۔جب کسی غریب عورت کے بچہ کی کسی امیر عورت کے بچہ سے لڑائی ہوجاتی ہے۔ اور اس امیر کے نوکر اور رشتہ دار اور عزیز اپنے آقا کے بیٹے کی طرفداری کرتے ہوئے اس غریب عورت کے بچہ کو مارتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم زبردست ہیں تو جانتے ہو وہ غریب عورت کیا کیا کرتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے آقاؤں کا مقابلہ کرے بلکہ وہ غصہ اپنے اس بچہ پر نکالا کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں اور وہ اپنے بچہ کو مار رہی ہوتی ہے۔ اور یہ کہتی جاتی ہے کہ تجھے جو کہا ہے کہ ایسی جگہ نہ جایا کر اور اس طرح وہ اپنی کمزوری اور بےبسی کا گویا اظہار کرتی ہے۔ اس رئیس کی حالت بھی یہی تھی ایک طرف وہ اپنی قوم کے جتھہ اور اس کی مخالفت اور غصّہ کو دیکھ رہا تھا۔ اور دوسری طرف عثمانؓ بن مظعون کی مظلومیت اور اس کے باپ کی محبت اس کے دل میں جوش مار رہی تھی۔ آخر اس غریب ماں کی طرح اس نے بھی عثمان بن مظعون پر اپنا غصّہ نکالا اور انہیں مخاطب ہوکر کہا۔ دیکھا میں نہیں کہتا تھا کہ میری پناہ میں آجاؤ۔ آخر تجھے یہ دیکھنا پڑا کہ تیری آنکھ نکال دی گئی۔ مگر جانتے ہو عثمانؓ بن مظعون نے اس کا کیا جواب دیا۔ انہوں نے کہا تم اپنی حفاظت اپنے گھر میں رکھو۔ تم کو تو یہ بُرا لگ رہا ہے کہ میری ایک آنکھ نکل گئی اور میری تو دوسری آنکھ بھی اسی طرح خدا تعالیٰ کی راہ میں نکلنے کے لئے تیار ہے[۵۶]

یہ ان لوگوں کی حالت تھی۔ ظلم و ستم کا وہ ایسا نشانہ بنے ہوئے تھے کہ دنیا کے پردہ پر کوئی ایسا بے بس قوم نہیں گذری جیسی بے بس قوم محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع کی بن گئی تھی

خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ گو آپ کو خانہ کعبہ میں جا کر نماز پڑھنے کی اجازت نہیں تھی مگر کبھی کبھی آپ محبت الٰہی کے جوش میں وہاں چلے جاتے اور نماز ادا فرماتے ایک دفعہ آپ نماز ادا کر رہے تھے کہ شہر کے غنڈے اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے آپ کو مارنا شروع کر دیا۔ اور پھر آپ کے گلے میں رسی ڈال کر گلا گھونٹنے لگ گئے یہاں تک کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے یوں لگتا تھا کہ آپؐ کی آنکھیں باہر آ گئی ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو وہاں آئے اور مارنے والوں اور آپ کے درمیان کھڑے ہو گئے اور انہیں ہٹانا شروع کیا۔ آپ اس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خون پونچھتے جاتے تھے۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اور یہ کہتے جاتے تھے کہ اے میری قوم تم کو کیا ہو گیا کہ تم ایک شخص کو محض اس لئے مار رہے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ میرا رب ہے ان حالات میں اور اس قسم کے اعتراضوں کو دیکھ کر خدا تعالےٰ کی غیرت آسمان پر جوش میں آئی اور اس نے کہا۔ اے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ لوگ کہتے ہیں کہ تیرے ماننے والے تھوڑے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ تیری نرینہ اولاد کوئی نہیں۔ اور یہ لوگ تجھے خانہ کعبہ میں بھی نماز پڑھنے نہیں دیتے۔ مگر اے ہمارے رسول! ایک دن ہم تجھ کو اس شہر پر غالب کریں گے اور تو ایک بہت بڑی مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ یہاں آ کر حج کرے گا۔ اور کھلے بندوں نماز پڑھے گا عید ادا کرے گا اور قربانیاں کریگا اور تیرے دشمن جو آج تجھ پر طعنہ زنیاں کر رہے ہیں ان کا نام و نشان بھی نہیں ملے گا چنانچہ فرماتا ہے۔ اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ۔ یہ تجھے کہہ رہے ہیں کہ تیرے ساتھی تھوڑے ہیں۔ یہ تجھے کہہ رہے ہیں کہ تیری نسل تیرے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ ہم تمہیں ایک بہت بڑی جماعت دیں گے اور خالی جماعت ہی نہیں دیں گے بلکہ غالب جماعت دیں گے جو اس شہر پر غالب آئے گی اور یہاں آ کر حج کرے گی۔

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ

جب ہم تجھے کثرت عطا کریں گے جب ہم تجھے غلبہ عطا کریں گے اور تم حج کرو گے اس وقت یہاں آ کر خدا کی عبادت کرنا اور اس کی راہ میں قربانیاں کرنا۔

اِنَّ شَانِئَکَ ہُوَ الۡاَبۡتَرُ

اس وقت تمہارے دشمنوں کا نشان بھی نہیں ملے گا اور صرف تمہاری ہی نسل باقی ہو گی۔

یہ وہ حج تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد کیا اور جس میں اس طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ تجھ پر سب سے زیادہ اعتراض کرنے والے ابو جہل، عتبہ شیبہ اور ولید وغیرہ اس وقت تک مٹا دیئے جائیں گے۔ چنانچہ خدا نے یہ کیسا زبردست نشان دکھایا کہ جس وقت رسول کریم

صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس حج کے لئے آئے اور خدا کے حکم کو پورا کرنے کے لئے کہ تم نمازیں پڑھو اور قربانیاں کرو۔ انہوں نے نمازیں پڑھیں اور خدا تعالیٰ کے رستہ میں قربانیاں کیں تو وہ کوثر جس کا وعدہ دیا گیا تھا وہ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حاصل ہؤا۔ چنانچہ ابوجہل کا بیٹا اس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جماعت میں شامل ہو گیا اور ولید کا بیٹا اس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جماعت میں شامل ہو گیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی نرینہ اولاد نہیں۔ مگر خدا نے کہا کہ میں ان اعتراض کرنے والوں کے بچے محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دے دوں گا۔ چنانچہ جب اس حج کے موقعہ پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کھڑے ہو کر نماز پڑھائی ہوگی اور پھر قربانیاں کی ہوں گی۔ تو گو آپ نے اپنے اعلیٰ درجہ کے اخلاق کے ماتحت دشمنوں کو شرمندہ کرنے کے لئے یہ نہیں پوچھا کہ بتاؤ میرا دشمن ابتر ہے یا میں ابتر ہوں۔ لیکن جس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آگے پیچھے عکرمہ اور خالد وغیرہ نوجوان پھر رہے ہوں گے اس وقت گو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زبان کچھ کہہ نہیں رہی تھی۔ مگر مکہ کی گلیوں کی وہ زمین جس پر ان کے قدم پڑ رہے تھے وہ ان دشمنوں کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی کہ او ابوجہل! او عتبہ! او شیبہ! کہاں ہے تمہاری وہ اولاد جس پر فخر کرتے ہوئے تم محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دشمن بنے پھرتے تھے اور کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ابتر ہے۔ وہ ابتر ہے یا آج تم ابتر ثابت ہو رہے ہو۔

پھر کوثر کے ایک اور معنے بھی ہیں جس کے لحاظ سے اس میں آئندہ کی ایک پیشگوئی کا ذکر کیا گیا تھا اور وہ معنے یہ ہیں کہ ایک بڑا آدمی جو بڑا صدقہ و خیرات کرنے والا ہو۔ اور آنے والے مسیح کے متعلق بھی لکھا ہے کہ وہ اتنا صدقہ کرے گا، اتنا صدقہ کرے گا کہ کوئی اسے قبول نہیں کرے گا۔ یعنی وہ اس قدر روحانی معارف لٹائے گا کہ حد ہو جائے گی۔ مگر لوگ اپنی ناسمجھی کی وجہ سے ان کو رد کر دیں گے۔ وہ سونے اور چاندی کے خزانوں پر تو مر رہے ہوں گے مگر خدا کے کلام کی قدر نہیں کریں گے۔

تو اس سورۃ میں یہ خبر بھی دی گئی تھی کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تجھے یہ لوگ ابتر کہتے ہیں۔ اور ابتر اسے کہتے ہیں جس کی کوئی نرینہ اولاد نہ ہو۔ اور روحانی اولاد میں سے نرینہ بیٹا اللہ تعالیٰ کا نبی ہوتا ہے کیونکہ نبوّت ہی ایک ایسا عہدہ ہے جو عورتوں کو نہیں مل سکتا۔ باقی سارے عہدے عورتوں کو مل سکتے ہیں۔ عورت صدیقہ ہو سکتی ہے چنانچہ سب لوگ کہتے ہیں مریم صدیقہ، عائشہ صدیقہ۔ عورت شہداء میں شامل ہو سکتی ہے چنانچہ کئی مسلمان عورتیں شہید ہوئی ہیں۔ اور صالح تو ہوتی ہی ہیں اگر کوئی عہدہ عورت کو نہیں مل سکتا تو وہ صرف نبوّت ہی ہے

پس اللہ تعالیٰ نے اس سُورۃ میں یہ بیان فرمایا تھا کہ ہم اب بھی تجھے کثرت دیں گے اور آئندہ زمانہ میں بھی تجھے ایک بہت بڑا روحانی فرزند دیں گے وہ کثیر الخیر ہوگا۔ کثرت سے وہ قرآن کریم کی دولت لٹائے گا۔ چنانچہ فرماتا ہے:۔

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ

اے محمد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم ہم نے آج ہی ساری نعمتیں تیرے لئے ختم نہیں کر دیں بلکہ خدا تعالیٰ کی اس سنّت کے مطابق کہ ہر نبی کی جماعت پر کچھ عرصہ کے بعد ضعف کا زمانہ آتا ہے جب تیری امت پر ضعف کا زمانہ آئے گا اور شیطان لوگوں کو گمراہ کرنے لگے گا تو اس وقت ہم تجھے ایک روحانی بیٹا عطا کریں گے جو بڑا کثیر الخیر ہوگا۔

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ

پس تو اس کی پیدائش کی خوشی میں آج ہی اس کے لئے خدا تعالیٰ کے حضور دُعائیں کر اور اس شکریہ میں قربانیاں کر۔

اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ

اس وقت تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تیرا دشمن ہی ابتر ہے تو ابتر نہیں۔

پہلے معنوں کے لحاظ سے دشمن سے مراد ابو جہل، عتبہ اور شیبہ وغیرہ ہیں۔ اور دوسرے معنوں کے لحاظ سے ابتر سے مراد وہ تمام قومیں ہیں جو آج اسلام پر حملہ کر رہی ہیں۔ چنانچہ اس وقت جب اسلام ضعیف ہو گیا۔ جب مسلمانوں کی طاقتیں کمزور ہو گئیں جب عیسائی مصنّفین نے یہ لکھنا شروع کر دیا کہ ہم نے اسلام کو کھا لیا ہے اب وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا حتیٰ کہ مسلمان مصنّفین نے بھی اسلام کی طرف سے دشمن کے مقابلہ میں معذرتیں لکھنا شروع کر دیں۔ اور عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا کہ اب اسلام میں یہ طاقت نہیں رہی کہ وہ دوسرے مذاہب کا مقابلہ کر سکے۔ ہندوؤں میں بھی جوش اُٹھا اور پنڈت دیانند[1] اور دوسرے لوگ اسلام کے مقابلہ میں کھڑے ہو گئے۔ اور انہوں نے سمجھا کہ ہم اسلام کو مٹا دیں گے۔ دوسرے ممالک مثلاً چین وغیرہ میں بھی جو مسلمانوں کو غلبہ حاصل تھا، وہ جاتا رہا اور بُدھ اور کنفیوشس مذہب کے پیروؤں نے بھی خیال کیا کہ ان کا مذہب غالب آگیا ہے اور اسلام کو انہوں نے مٹا دیا ہے۔ غرض لوگوں نے خیال کر لیا کہ اسلام کی روحانی نسل دنیا سے مٹ گئی ہے۔ اور یہی خبر اس سُورۃ میں دی گئی تھی۔ کہ آج ہی نہیں بلکہ ایک اور زمانہ میں بھی دشمن کہیں گے کہ ہم نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد کو ختم کر دیا ہے۔ مگر فرمایا ہم تجھے ایک ایسا بیٹا دیں گے جو بڑا کثیر الخیر ہوگا اور وہ دنیا کو چیلنج کرے گا کہ میں محمد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا روحانی بیٹا ہوں اور میرے

---

(۱) خطوط شکاگو "پادری عماد الدین ۱۸۹۳ء (۲) "دی مشنز" مصنفہ آرکلا ک ۳۳ (۳) برو ز یکم ۲۳

ذریعہ سے اسلام دوبارہ دنیا پر غالب آئے گا۔ وہ تمام مذاہب کے مقابلہ میں کھڑا ہو گا اور اعلان کرے گا کہ میں زندہ نمونہ ہوں اس بات کا کہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ نبی ہیں مگر تمہارے مذاہب زندہ نہیں ہیں اگر تم سمجھتے ہو کہ تم زندہ مذہب کے پیرو ہو تو تم میرے سامنے وہ زندہ شخص پیش کرو جس پر خدا تعالیٰ کا تازہ کلام اترتا ہو۔ مگر ساری قومیں ابتر ہو کر رہ جائیں گی اور وہ اسلام کے پہلوان کے مقابلہ میں اپنا کوئی پہلوان پیش نہیں کر سکیں گی چنانچہ عملی لحاظ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے ایسا ہی بیٹا دیا اور اس نے اعلان کیا کہ آج محمدی چشمہ ہی جاری ہے باقی تمام چشمے سوکھ گئے ہیں اور اس بات کا ثبوت میری ذات ہے میں اسی چشمہ کا پانی پی کر زندہ ہوا ہوں اور اسی چشمہ کے پانی سے تمام دنیا کو زندہ کرنے آیا ہوں غرض دوبارہ دنیا نے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتراض کیا۔ کہ وہ ابتر ہیں اور دوبارہ اس نے کہا کہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانی نسل دنیا سے مٹ گئی ہے۔ تب پھر خدا تعالیٰ نے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک روحانی بیٹا دیا جس نے دنیا کو چیلنج دیا۔ کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا روحانی بیٹا ہوں تم بھی اپنے نبیوں کے روحانی بیٹے میرے مقابلہ میں پیش کرو مگر آج پچاس سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ نہ ہندو کوئی روحانی بیٹا پیش کر سکے ہیں نہ عیسائی کوئی روحانی بیٹا پیش کر سکے ہیں نہ یہودی کوئی روحانی بیٹا پیش کر سکے ہیں نہ بدھ کوئی روحانی بیٹا پیش کر سکے ہیں، نہ کنفیوشس مذہب کے پیرو کوئی روحانی بیٹا پیش کر سکے ہیں اور نہ ہی یورپ کا فلسفہ کوئی بیٹا پیش کر سکا ہے۔ پچاس سال سے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے بیٹے کا چیلنج موجود ہے کہ اگر تم میں کوئی نور ہے۔ اگر تمہارے پاس سچائی ہے، اگر تمہارے اندر صداقت ہے تو تم میرے مقابلہ میں ایسا کوئی روحانی بیٹا پیش کرو جس نے تمہارے مذہب پر چل کر خدا تعالیٰ کے انعامات کو حاصل کیا ہو مگر پچاس سال ہو گئے، کوئی مذہب اپنا روحانی بیٹا پیش نہیں کر سکا۔

یہ عید بھی اسی کوثر کے وعدہ کو پورا کر رہی ہے۔ جس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شروع میں بہت کم لوگوں نے مانا اور قبول کیا، ایسا ہی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ابتداء میں لوگوں نے نہیں مانا۔ آپ ایک فرد واحد کی حیثیت میں تھے جب آپ نے دنیا کو مقابلہ کے لئے بلایا۔ مگر جس طرح آج سے تیرہ سو سال پہلے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک عید منائی تھی جو حج کے بعد آئی اور اس میں آپ نے یہ اعلان کر دیا کہ خدا نے میرے ساتھ جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔ اسلام قائم ہو گیا ہے اور دین اپنے کمال کو پہنچ گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ

نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ

آج یہ عید بھی اسی رنگ کی عید ہے یہ وہ جلسہ ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جماعت کو اکٹھا کرنے کے لئے قائم کیا اور یہ جلسہ ان ایام میں آیا ہے جبکہ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ کا نظارہ نظر آ رہا ہے۔ چنانچہ کل حج تھا اور آج ہم سب عید منا رہے ہیں پس آج خدا کا یہ کلام پھر پورا ہو رہا ہے کہ

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جو اکیلے تھے انہیں خدا تعالیٰ نے اتنی کثیر جماعت دی ہے کہ آج آلۃ نشر الصوت کے بغیر ان تک آواز بھی نہیں پہنچ سکتی۔ پس صَلِّ کے حکم کی تعمیل تو ہم کر بھی چکے ہیں اب ہم قربانیاں کریں گے اس خوشی میں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کوثر عطا کیا یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں ظاہری کثرت بھی دی جس طرح اس نے ہمیں روحانی انعامات کی کثرت دی ہے اور ہم خدا تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے۔ کہ اس نے ایک بار پھر دنیا پر ثابت کر دیا۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی صاحب اولاد ہیں اور آپ کے دشمن ہی ابتر ہیں۔ دیکھو آج ہم یہاں کتنی کثرت سے موجود ہیں۔ اترسوں میں نے ۲۳ ہزار آدمیوں کا اندازہ بتایا تھا مگر بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ اندازہ بالکل غلط ہے کیونکہ اس وقت عورتوں کی مردم شماری اندازہ سے بہت زیادہ نکلی گویا قریباً تیس چالیس ہزار آدمی اس وقت جلسہ میں شامل تھے۔ اور آج بھی قریباً اتنے ہی ہیں اگر کچھ فرق ہے تو بہت معمولی ہے پس اس وقت تیس چالیس ہزار کے قریب مرد وعورت بیٹھے ہیں۔ اتنے کثیر مجمع کے مقابلہ میں محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن کتنے تھے۔ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن صرف بیسیوں تھے۔ اور آپ اکیلے تھے مگر آج خدا تعالیٰ کے فضل سے ہم میں سے ہر ایک فخر کے طور پر نہیں، تکبر کے طور پر نہیں، ریا کے طور پر نہیں بلکہ امر واقعہ کے اظہار کے طور پر یہ کہنے کے لئے تیار ہے کہ میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا بیٹا ہوں۔ کیا ہے کوئی اس تیس چالیس ہزار میں سے جو یہ کہہ سکے کہ میں ابوجہل کا بیٹا ہوں یا عتبہ یا شیبہ کا بیٹا ہوں یقیناً ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے۔ پھر عید کا یہ اجتماع صرف اسی مقام پر نہیں بلکہ دنیا کے ہر کونہ میں اس وقت لوگ جمع ہیں۔ ہر ملک میں لوگ جمع ہیں اور ہر علاقہ میں لوگ جمع ہیں۔ ان لاکھوں لاکھ لوگوں میں سے ہر شخص اس تمنا کے ساتھ اس اجتماع میں شریک ہوتا ہے کہ کاش میرا ظن سچا ہو کہ میں محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیٹا ہوں۔ مگر ابوجہل کی اولاد میں سے آج اگر کوئی ہے بھی تو وہ یہ نہیں کہے گا کہ میں ابوجہل کی اولاد میں سے ہوں۔ بلکہ وہ بھی یہی کہے گا کہ میں محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد میں سے ہوں۔

پس ہم اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہیں جس نے آج سے تیرہ سو سال پہلے مسلمانوں کو تکلیف کی زندگی سے بچا کر انہیں کوثر عطا کیا۔ اور ہم اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہیں کہ تیرہ سو سال کے بعد اس نے آج پھر ہم کو چُنا اور پھر وہی نظارہ انہی حالات میں سے گذار کر ہم کو دکھایا اور ہمیں ؏

صحابہ سے ملا جب مجھ کو پایا[۸]

کا مصداق بنا کر وہی ایمان افروز نظارہ دکھا دیا۔ پس آؤ ہم دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں واقعہ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرزند بننے کی توفیق بخشے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں کو اور بھی ابتر کرے۔ اللّٰھم آمین۔

(الفضل ۸ جنوری ۱۹۴۲ء)

۱۔ تاریخ ابن خلدون ۷/۲، تاریخ الخمیس ۳۲۴/۱، تاریخ طبری ۳۱۸/۱ دار المعارف مصر۔

۲۔ سیرت الامام ابن ہشام کے مندرجہ ذیل صفحات کے مطالعہ سے ہجرت تک مکہ کے مسلمانوں کی تعداد معلوم کی جا سکتی ہے۔
۸۴ تا ۸۸/۱، ۱۱۰ تا ۱۴/۱، ۱۲۶-۱۲۸/۱، ۱۶۳ تا ۱۶۸/۲، ۱۹۷ تا ۲۰۱/۲۔

۳۔ حضرت رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحبزادہ قاسم کی وفات پر عاص بن وائل سہمی (والد حضرت عمروؓ بن عاص) نے کہا تھا کہ نعوذ باللہ "ان محمدًا ابتر لا یعیش لہٗ ولد ذکر" یعنی آپ کی کوئی نرینہ اولاد زندہ نہ رہے گی (تاریخ کامل ابن اثیر ۲۷-۳۳/۲ - سیرۃ ابن ہشام مترجمہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی ۱۵۳/۲)

۴۔ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ۳۸۵/۳

۵۔ سیرت حلبیہ جز اوّل ص ۳۴۸

۶۔ صحیح بخاری باب بنیان الکعبۃ باب ما لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من المشرکین بمکۃ ۔ زرقانی شرح مواہب لدنیہ ۲۵۱/۱

۷۔ حضرت عکرمہؓ کی طرف اشارہ ہے۔ جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے۔ اور ۱۳ھ میں جنگ یرموک میں لڑتے ہوئے شہادت پائی۔

۸۔ اس سے مراد حضرت خالدؓ بن ولید ہیں۔ جن کی کنیت ابو سلیمان اور لقب سیف اللہ تھا۔ ۶ھ اور ۸ھ کے درمیان مشرف بہ اسلام ہوئے اور زندگی کا بیشتر حصہ میدان جہاد میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے گذار دیا۔ ان کے اسی ذوقِ جہاد اور شجاعانہ کارناموں کی وجہ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو "سیف اللہ" کا لقب مرحمت فرمایا۔ تقریبًا سوا سو لڑائیوں میں تلوار کے جوہر دکھائے ۲۲ھ

میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

۹؎ ۔ تاج العروس جلد ۳ صفحہ ۵۲۶ ۔ مفردات امام راغب زیر لفظ کسر

۱۰؎ ۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب نزول عیسیٰ بن مریم صلے اللہ علیہ وسلم

۱۱؎ ۔ تاج العروس جلد ۳ صفحہ ۲۵

۱۲؎ ۔ الانبیاء ۲۱ : ۸ ۔ حُسْنُ الْاُسْوَۃِ بِمَا ثَبَتَ مِنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فِی النِّسْوَۃِ مؤلفہ نواب محمد صدیق حسن خاں صاحب صفحہ ۶۱ طبع اوّل مطبوعہ قسطنطنیہ ۱۳۰۱ھ

۱۳؎ ۔ سوامی دیانند سرسوتی (وفات ۱۸۸۳ء) ہندوؤں کا مشہور مذہبی رہنما اور آریہ سماج کا بانی تھا۔

۱۴؎ ۔ اعجاز احمدی صفحہ ۵۶، صفحہ ۷

۱۵؎ ۔ ملفوظات جلد اوّل صفحہ ۱۴۳

۱۶؎ ۔ المائدہ ۵ : ۴

۱۷؎ ۔ بشیر احمد، شریف احمد اور مبارکہ کی آمین مطبوعہ ۱۹۰۱ء۔

(۳۱)

عیدالاضحیٰ مورخہ ۱۹ر دسمبر ۱۹۴۲ء کے متعلق
الفضل ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۲ء صا پر یہ نوٹ
درج ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی
ایدہ اللہ تعالےٰ نے نماز عیدالاضحیٰ پرانی
عیدگاہ میں پڑھائی اور لطیف خطبہ ارشاد
فرمایا۔
یہ خطبہ غالباً سلسلہ کے کسی اخبار میں شائع
نہیں ہوا۔ (مرتب)

۳۲

عیدالاضحیٰ ۹ر دسمبر ۱۹۴۳ء کو منائی گئی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ چونکہ بیمار تھے اس لئے حضور عید کی نماز نہ پڑھا سکے۔ اس تقریب سعید کے بارہ میں روزنامہ الفضل نے لکھا:-

"چونکہ حضرت امیرالمؤمنین ایدہ اللہ تعالیٰ بوجہ علالت عیدگاہ میں تشریف نہ لے جا سکے اس لئے عید کی نماز حضرت مولوی شیر علی صاحب نے گیارہ بجے پڑھائی۔ حضرت امیرالمؤمنین ایدہ اللہ کے عہد مبارک کی یہ پہلی عیدالاضحیٰ ہے جس کے اجتماع میں حضور قادیان میں رونق افروز ہوتے ہوئے بوجہ علالت تشریف نہ لے جا سکے۔"

(الفضل ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۳ء صہ ۲)

(۳۴)

(فرمودہ ۲۷ نومبر ۱۹۴۴ء بمقام قادیان)

مجھے چونکہ شدید نزلہ اور کھانسی ہے اور میں صرف عید کی وجہ سے یہاں آگیا ہوں۔ اس لئے مَیں بہت ہی اختصار کے ساتھ چند باتیں کہوں گا۔

جیسا کہ ہر مسلمان کو اس بات سے واقف ہونا چاہیئے یہ عید جو عید الاضحیہ کہلاتی ہے یعنی قربانی کی عید حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی یاد ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا تعالےٰ کے حضور میں پیش کی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رؤیا میں دیکھا کہ گویا انہوں نے اپنے بیٹے کو اللہ تعالےٰ کی راہ میں ذبح کر دیا ہے۔ اور چونکہ اس وقت تک انسانی قربانی کی ممانعت کا حکم نہ ہُوا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی سمجھا کہ شاید ان سے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اس وقت چھوٹے سے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو بتایا کہ میں نے اس قسم کی رؤیا دیکھی ہے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے جو ایک اچھی تربیت پائے ہوئے بچہ تھے، باپ کے اس رؤیا کو سُنکر اس بات کی اہمیت کو سمجھ لیا کہ خدا تعالیٰ کا حکم بہرحال پورا ہونا چاہیئے۔ اور انہوں نے اپنے والد سے کہدیا کہ آپ اپنی رؤیا کو پورا کریں مَیں اس قربانی کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے گلے پر چھری پھیرنی چاہی تو اللہ تعالےٰ نے الہامًا انہیں بتا دیا کہ درحقیقت رؤیا کی تعبیر اَور تھی۔ اور کہ تم نے ظاہری طور پر بھی اپنی اس رؤیا کو پورا کر دیا ہے[۱] کیونکہ تم نے اپنے بیٹے کو فی الواقع ذبح کرنے کا ارادہ کیا اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی نسل کو خدا تعالےٰ کی راہ میں قطع کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اس وقت تک ان کے ہاں صرف ایک ہی بچہ تھا تو اس کے بالمقابل خدا تعالےٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ مَیں تیری نسل کو کبھی قطع نہ ہونے دُوں گا۔ اور خدا تعالیٰ کی قدرت ہے کہ دیکھ لو آج سے ۱۹ سو سال قبل حضرت مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے اور ان سے قریبًا چودہ سو سال قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ یہ گویا ۳۳ سو سال ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اندازًا چھ سو سال قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوئے یہ گویا چار ہزار سال کے قریب کا زمانہ ہے جب ایک دن ایک غیر آباد علاقے میں خدا تعالےٰ کا ایک مامور اور ایک نبی اپنے اکلوتے بیٹے کو جو اسّی سال کی عمر میں ان کے ہاں پیدا ہُوا تھا ایک سنسان جنگل میں اس لئے لے گیا کہ

خدا تعالیٰ کے لئے اُسے ذبح کر دے۔ اس وقت آسمان اور زمین کے خدا نے۔ تمام کائنات کے پیدا کرنے والے خدا نے عرش سے آواز دی کہ اے ابراہیمؑ تو نے اپنے رؤیا کو سچا کر دکھایا اور اپنی نسل کو قطع کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ مگر میں تیری اولاد کو کبھی ختم نہ ہونے دُونگا، تیری نسل کو کبھی قطع نہ ہونے دُوں گا۔ بلکہ اسے بڑھاؤں گا یہاں تک کہ جس طرح آسمان کے ستارے نہیں گنے جا سکتے تیری نسل بھی نہ گنی جا سکے گی۔

اب دیکھو آج سے چار ہزار سال قبل فلسطین کے ایک سنسان جنگل میں دنیوی لحاظ سے ایک نہایت ہی کمزور شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آواز آئی تھی اور آج دنیا کی بہترین مہذب قوم کے سردار، دنیا کی بہترین طاقت رکھنے والی قوم کے سردار، دنیا کی بہترین سائنٹیفک قوم کے سردار نے چند سال قبل یہ فیصلہ کیا کہ وہ ابراہیم (علیہ السلام) کی نسل کو تباہ کر دے گا اور سات سال قبل دنیا نے یہ اندازہ بھی کر لیا۔ کہ یہودی قوم اب مٹ جائے گی۔ مگر باوجود اس کے کہ یہودی قوم اپنے مذہب کو چھوڑ چکی ہے۔ چونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جسمانی اولاد سے ہے، اس لئے چار ہزار سال قبل اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو وعدہ کیا تھا کہ میں تیری نسل کو کبھی قطع نہ ہونے دُوں گا، اس نے اس کے حق میں اسے پورا کر دکھایا۔ جرمن قوم کے سردار ہٹلر نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ یہودی قوم کو ہلاک کر دیگا، اسے تباہ کر دے گا۔ اور بظاہر یہ نظر بھی آتا تھا کہ وہ ایسا کر دے گا، مگر عرش پر سے خدا تعالیٰ کہہ رہا تھا کہ میں اسے ناکام کر دوں گا۔ بے شک آج یہودی قوم بے حقیقت ہے اور اسے کوئی طاقت حاصل نہیں اور بے شک دنیا کا سب سے زیادہ اقتدار والا سیاسی لیڈر اس سے ٹکرایا۔ ایسا زبردست لیڈر کہ جس کے سامنے برطانیہ جیسی عظیم الشان سلطنت کے وزیر اعظم مسٹر چیمبرلین بھی سر جھکا آئے تھے لیکن آخر وہ وعدہ پورا ہوا جو آج سے قریباً چار ہزار سال قبل فلسطین کے ایک جنگل میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے سے کیا تھا اور خدا تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ آج چھ سال کے بعد دنیا یہ بحث کر رہی ہے کہ ہٹلر زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ وہ جرمنی میں ہے یا کہیں بھاگ گیا ہے۔ وہ پاگل ہو گیا ہے یا تندرست ہے۔

اب دیکھ لو خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا اسے کس طرح پورا کیا۔ یہود نے خدا تعالیٰ کو بھلا دیا مگر خدا تعالیٰ نے یہود کو نہیں بھلایا۔ انسان بے وفا ہو سکتا ہے مگر خدا تعالیٰ بے وفا نہیں ہو سکتا۔ جب ہٹلر یہ کہہ رہا تھا کہ میں یہود کو مٹا دُوں گا خدا تعالیٰ اپنے عرش سے یہ کہہ رہا تھا کہ چار ہزار سال ہوئے ہم نے دنیوی شان و شوکت کے لحاظ سے ایک معمولی حیثیت کے انسان سے فلسطین کے جنگل میں یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم اس کی

نسل کو قطع نہ ہونے دیں گے۔ اور ہم زندہ خدا ہیں۔ ہمارا وعدہ ضرور پورا ہو کر رہے گا اور ہم ابراہیمؑ کے سامنے شرمندہ نہ ہوں گے۔ چنانچہ دیکھ لو خدا تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا۔ یہ ایک ایسا زندہ نشان دنیا کے سامنے ہے۔ ایسا زندہ معجزہ دنیا کے سامنے ہے کہ جس کا انکار کوئی بڑے سے بڑا دہریہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس معجزہ سے فائدہ اٹھانے والا آج دنیا میں سوائے ہماری جماعت کے اور کوئی نہیں۔ ہماری جماعت کے بانی علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ فرمایا ہے۔ اور یہ معجزہ دکھا کر اللہ تعالیٰ نے ہماری جماعت کو بتایا ہے کہ میرے وعدوں کے بارہ میں تمہیں کوئی شک نہ ہونا چاہیئے۔ اور جو اس بارہ میں کسی شک میں ہو، وہ دیکھے کہ ابراہیم اوّل کے ساتھ چار ہزار سال قبل میں نے جو وعدہ کیا تھا وہ کس طرح پورا ہوا ہے۔ اور جب میں اتنے پرانے وعدوں کو نہیں بھلاتا تو اپنے تازہ وعدوں کو کس طرح بھلا سکتا ہوں۔ اور یہ معجزہ دکھا کر اللہ تعالیٰ ہمیں بتاتا ہے کہ جس طرح ابراہیمؑ کی نسل کو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت اور قوت اور کوئی بڑے سے بڑا بادشاہ نہیں مٹا سکتا۔ اسی طرح اے جماعت احمدیہ! تمہیں بھی کوئی طاقت اور کوئی قوت تباہ نہیں کر سکتی ہاں یہود ابراہیم اوّل کی جسمانی اولاد ہیں اور جسمانی تعلق میں دین کی شرط نہیں ہوتی مگر تم ابراہیم ثانی کی روحانی نسل ہو اور روحانی نسل کے لئے دین کی شرط نہایت ضروری ہے۔ پس تمہیں کوئی قوت اور طاقت مٹا نہیں سکتی بشرطیکہ تم اس روحانی تعلق کو مضبوط رکھو جو تم نے ابراہیم ثانی کے ساتھ قائم کیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہود کو مٹنے نہیں دیا کیونکہ ابراہیم اوّل سے ان کا جسمانی تعلق قائم ہے اور ہم ابراہیمؑ ثانی کی روحانی نسل سے ہیں اور جب تک یہ روحانی تعلق قائم ہے۔ ہمیں کوئی نہیں مٹا سکتا۔ یہ روحانی تعلق قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے آپ کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا مثیل ثابت کرے۔ اور اپنی جان کو دین کی خدمت کے لئے ایک حقیر تحفہ کے طور پر پیش کر دے اور اسے ایک بے حقیقت قربانی قرار دے۔

پس جب تک ہماری جماعت کے دوست دین کے لئے اپنی قربانیاں پیش کرتے رہیں گے جب تک وہ اسلام کی شمع پر پروانہ وار فدا ہونے کے لئے آگے بڑھتے رہیں گے دنیا کی کوئی قوت اور کوئی طاقت بلکہ جیسا کہ میں کئی بار کہہ چکا ہوں دنیا کی تمام طاقتیں اور تمام قوتیں اور تمام بادشاہتیں مل کر بھی ہم کو مٹا نہ سکیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ابراہیم قرار دیا ہے اور تم اس ابراہیم کے روحانی فرزند ہو اس لئے تم وہ کونے کا پتھر ہو کہ جس پر تم گرو گے وہ بھی چکنا چور ہو جائے گا اور جو تم پر گرے گا وہ بھی چکنا چور ہو جائیگا۔ دنیا

ہم کو ڈراتی ہے، ہم کو دھمکاتی ہے اور اپنی قوت و طاقت کے مظاہرے کرتی ہے۔ بے شک ہم کمزور ہیں اور ظاہری طاقت و قوت کے لحاظ سے ہمارا تباہ کرنا مشکل نہیں مگر انجام ہمارے ہاتھ میں ہے۔ دشمن جتنا بھی ہم کو ڈبوئیں گے اتنا ہی ہم اُبھریں گے۔ جتنا بھی وہ ہم کو نیچے پھینکنا چاہیں گے اتنا ہی ہم اونچا اٹھیں گے جتنا وہ ہم کو قتل کرنا چاہیں گے، خدا تعالےٰ اتنی ہی ہمیں نمایاں زندگی دیگا۔ بشرطیکہ ہم میں سے ہر ایک اسمٰعیل کا نمونہ بن جائے تا ابراہیم ثانی کے ساتھ اللہ تعالےٰ کے وعدے پورے ہوں۔ بے شک ہم کمزور ہیں۔ مگر ہم یقین رکھتے ہیں کہ ذرہ ذرہ کا خدا کائناتِ عالم کا خدا اور زمین و آسمان کا خدا ہمارے ساتھ ہے۔ ہم پر حملہ کرنے والا ہم پر نہیں بلکہ خدا تعالےٰ پر حملہ کرنے والا ہوگا اور خدا تعالےٰ پر حملہ کرنے والے کا انجام ظاہر ہی ہے۔

اب میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ جماعت کے دوستوں کو توفیق دے کہ وہ ہر وقت اسمٰعیل کی طرح خدا تعالےٰ کی راہ میں اپنی جانیں فدا کرنے والے ہوں تا اللہ تعالےٰ اس دنیا میں بھی اور اگلی زندگی میں بھی اپنی برکات کو ان کے لئے مخصوص کر دے۔ اور خدا تعالےٰ نہ صرف یہ کہ ان کو موت سے بچائے بلکہ دنیا ان کے ذریعہ زندگی حاصل کرے اور دوبارہ خدا تعالےٰ کا قرب ان کے ذریعہ پائے۔

خطبہ ثانیہ میں فرمایا۔

اب مَیں دعا کرتا ہوں اسلام کیلئے، جماعت کیلئے، افرادِ جماعت کے لئے، ان مبلّغین کے لئے جو باہر گئے ہوئے ہیں۔ اور ان کے لئے جو تیاری کر رہے ہیں۔ ان دوستوں کے لئے جو مال و جان سے خدمتِ دین کے لئے کمربستہ ہیں اور ان کمزوروں کیلئے بھی جو قربانی کرنے سے ڈرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے دِل کو مضبوط کر دے۔ خدا تعالیٰ ان کو توفیق دے کہ وہ موت کو حقیر ترین چیز سمجھیں اور خدا تعالےٰ کی راہ میں مرنے کو لذیذ ترین شے جانیں۔ آمین۔ (الفضل یکم دسمبر ۱۹۴۲ء)

۱؎ ۔ الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۰۳ تا ۱۰۷۔ ۲؎ ۔ پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۷

۳؎ ۔ جرمنی کے آمرِ مطلق اور دوسری جنگِ عظیم کے اصل محرک اوڈلف ہٹلر (۱۸۸۹ء تا ۱۹۴۵ء) کی طرف اشارہ ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹینکا زیرلفظ HITLER ADOLF)۔ جرمن نسل کے بیسویں صدی کے مردِ آہن اوڈلف ہٹلر کی خود نوشتہ سوانحعمری "تزکِ ہٹلری" مترجمہ مولوی محمد ابراہیم علی صاحب چشتی صفحہ ۱۹ تا ۲۱

۴؎ ۔ CHAMBERLAIN (ARTHUR) NEVILLE (۱۸۶۹ء-۱۹۴۰ء) مشہور برطانوی سیاستدان۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۰ء تک برطانوی وزیر اعظم رہا۔

۵؎ ۔ تذکرہ ایڈیشن سوم صفحہ ۷۹، ۳۳۱، ۳۷۷، ۳۹۲، ۷۲۷۔

(۲۴)

"قادیان ۱۸ ر نومبر ۱۹۴۵ء ۔عید الاضحیٰ کی تقریب ۱۶ ر نومبر کو منائی گئی۔ حضرت امیرالمؤمنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کی طبیعت کئی روز قبل سے علیل چلی آرہی تھی۔ حرارت کے علاوہ درد نقرس کی شدید تکلیف تھی۔ مگر اس حالت میں ایک طرف تو ہر خورد وکلاں کی یہ خواہش تھی کہ حضور کی اس مبارک تقریب پر زیارت کرے اور حضور کے ارشادات سے مستفیض ہو اور دوسری طرف ڈاکٹر صاحبان کی یہ رائے تھی کہ حضور کے عیدگاہ تک سواری پر تشریف لے جانے سے بھی تکلیف میں کم از کم ۲۵ فیصدی اضافہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مگر باوجود اس کے حضور نے اپنی تکلیف کے مقابلہ میں خدام کی دلجوئی کو مقدم کرتے ہوئے عیدگاہ میں تشریف لے جانے کا ارادہ فرمایا اور کہلا بھیجا کہ نماز مفتی محمد صادق صاحب پڑھا دیں اور عید کا خطبہ بھی وہی پڑھیں گے۔ اس کے بعد میں کچھ کلمات کہوں گا۔

لیکن حضور کے تشریف لے جانے کی تیاری ہی کی جارہی تھی کہ مطلع پر جو پہلے معمولی سا ابر آلود تھا اور بارش کے کوئی آثار نہ تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں بادل گھر آئے۔ اور بارش ہونے لگی۔ اس پر اعلان کرنا پڑا کہ نماز عیدگاہ کی بجائے مسجد اقصےٰ میں ہوگی۔ چنانچہ بہت سے لوگ مسجد میں پہنچ گئے جہاں حضرت امیرالمؤمنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالےٰ کرسی پر بیٹھکر تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضور کے ارشاد کے مطابق نماز حضرت مفتی محمد صادق صاحب نے پڑھائی اور خطبہ بھی مختصر طور پر پڑھا.....

اس کے بعد حضور نے آرام کرسی پر بیٹھکر درود شریف کے کلمات کی تشریح میں نہایت ہی لطیف تقریر فرمائی۔ اور جماعت کو نہایت ہی مؤثر الفاظ میں تبلیغ احمدیت کی طرف توجہ دلائی اور پھر دُعا کرنے کے بعد گھر تشریف لے گئے۔"

(الفضل ۱۹ ر نومبر ۱۹۴۵ء صہ ۲)

۳۵

(فرمودہ ۵ ؍ نومبر ۱۹۴۶ء بمقام باغ حضرت ام المؤمنین قادیان)*

انسان کی زندگی پر مختلف مواقع آتے ہیں کبھی اسے بڑی باتیں ضرورتاً کہنی پڑتی ہیں اور کبھی اسے چھوٹی باتیں ضرورتاً کہنی پڑتی ہیں۔ کبھی وہ چھوٹی بات کہتا ہے جو بظاہر بڑی نہیں ہوتی مگر حقیقتاً بڑی ہوتی ہے اور کبھی وہ چھوٹی بات اس لئے کہتا ہے کہ کئی چھوٹی باتیں کہنی بھی ضروری ہوتی ہیں۔ آج کی عید جو عید الاضحیہ کہلاتی ہے یہ وہ عید ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے لڑکے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی یادگار کے طور پر اسلام میں منائی جاتی ہے۔ یہ وہ عید ہے جو ہر سچے مسلمان سے یہ اقرار لیتی اور اس سے یہ عہد کراتی ہے کہ اس کی زندگی اس کی جان اور اس کا مال صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے اور وہ ہر وقت اپنی جان اور اپنے مال کو قربان کرنے کے لئے خدا تعالیٰ کے حضور حاضر ہے۔ پس یہ عید اپنے اندر نہایت اہمیت رکھتی ہے اور یہ خدا تعالیٰ کے سامنے مومنوں کے اخلاص کے اظہار کے لئے عظیم الشان مواقع میں سے ایک موقع ہے مگر آج میں اس عید کے سلسلے میں ان باتوں کے متعلق زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا سوائے ایک چھوٹی سی بات کے اور جو اس سے پہلے کسی عید کے موقعہ پر مَیں نے بیان نہیں کی۔ مگر آج بیان کرتا ہوں۔ اور وہ بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رؤیا میں نظر آیا کہ وہ اپنے بیٹے کی قربانی دے رہے ہیں۔ تو آپ نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے اس کا ذکر کیا کہ رؤیا میں مَیں نے دیکھا ہے کہ مَیں تمہیں قربان کر رہا ہوں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنے باپ سے یہ سُنکر اس پر آمادگی کا اظہار کیا اور کہا آپ اسے پورا کیجئے۔ مجھے اس میں ہرگز عذر نہیں ہوسکتا اور مَیں بخوشی اس کے لئے تیار ہوں اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام چھری لے کر اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہوگئے آپ نے اپنے بیٹے کو زمین پر گرایا اور جب چھری چلانے لگے تو ذبح کرنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا بس بس! یٰاِبْرٰاھِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا۔ اے ابراہیم (علیہ السلام) تو نے اپنی خواب پوری کردی۔ اب اس قربانی کی ضرورت نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَفَدَیْنٰہُ

---

* اعلان کے مطابق عید الاضحیہ کی نماز عید گاہ میں پڑھی جانی تھی (الفضل ۴ر نومبر ۱۹۴۶ء صفحہ ۱) مگر الفضل ۷ر نومبر ۱۹۴۶ء صفحہ ۱ پر لکھا ہے کہ حضور نے نماز عید باغ حضرت ام المؤمنین میں پڑھائی (مرتب)

بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ۔ ہم نے اس کی جگہ ایک اور ذبیحہ پیش کر دیا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ ذبیحہ کونسا تھا۔ بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے اس کی جگہ مینڈھے کو قربان کرنے کا حکم دیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب رؤیا والی انسانی قربانی سے مراد حقیقی قربانی نہ تھی اور خدا تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی نیّت کو ہی دیکھ کر کہہ دیا کہ بس تمہاری قربانی ہوگئی۔ تو جانور کی قربانی کا حکم دینے کی ضرورت ہی کیا تھی اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ انسانی قربانی کے رواج کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا اس سے پہلے لوگ انسانوں کی قربانی دیا کرتے تھے۔ اور بڑے بڑے زاہد جو نیکی اور تقویٰ کی راہوں کو اختیار کرتے تھے اپنا آخری امتحان یہ سمجھتے تھے کہ اپنی اولاد کو خدا تعالےٰ کی راہ میں قربان کر دیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسی رواج کو مدنظر رکھتے ہوئے انسانی قربانی کے لئے کھڑے ہوگئے اور آپ نے رؤیا سے یہ سمجھا کہ خدا تعالےٰ کہتا ہے اپنے بیٹے کو قربان کر دو اور اس خیال سے کہ غالباً اس رؤیا سے مراد ظاہری صورت میں بیٹے کی قربانی ہے وہ اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہوگئے مگر خدا تعالےٰ نے اس سے منع کر کے بتا دیا کہ ہم آئندہ کے لئے انسانی قربانی کا رواج بند کرتے ہیں اور یہ بھی بتا دیا کہ اگر کوئی رؤیا میں اپنے بچے کو ذبح کرتے دیکھے تو اس کی جگہ دُنبے کی قربانی کرے۔ اور آج کے بعد انسانوں کی بجائے جانوروں کی قربانی کی جائے۔ پس اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو انسانی قربانی کے لئے اس لئے کہا تھا کہ اس طرح سے انسانی قربانی کو بند کر دے۔ پس ایک وجہ تو اس کی یہ ہے جو میں نے بارہا بیان کی ہے۔ مگر اس کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ بعض جگہ لوگ جانی قربانی تو بڑے شوق سے کر دیتے ہیں مگر انہیں مالی قربانی سے دریغ ہوتا ہے۔ جانی قربانی ایسی ہے جس کا ازالہ نہیں ہوسکتا اور مالی قربانی کا ازالہ ہوسکتا ہے پس جہاں اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا امتحان لیا کہ وہ خدا تعالےٰ کی راہ میں اپنے بیٹے کو قربان کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں یا نہیں اور جہاں خدا تعالےٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا امتحان لیا کہ وہ اپنی جان کو میرے حضور پیش کر سکتے ہیں یا نہیں اور جہاں خدا تعالےٰ نے انسانی قربانی کو آئندہ کے لئے بالکل منسوخ کر دیا اور فرمایا کہ آئندہ سچے مذہب میں انسانی قربانی نہیں ہوگی۔ انسانی قربانی صرف جہاد کے موقعہ پر کی جائے گی بلاوجہ نہیں کی جائے گی وہاں دوسری طرف خدا تعالےٰ نے یہ بھی کہہ دیا کہ صرف جانی قربانی پر ہی خوش نہیں ہوجانا چاہیئے۔ تم سے مالی قربانی کے مطالبے بھی کئے جائیں گے اور تمہارے لئے ضروری ہوگا کہ تم مالی قربانی بھی پیش کرو۔ دنیا میں کئی ایسے زمانے آتے ہیں کہ لوگ جانی قربانی تو کرتے ہیں

مگر مالی قربانی نہیں کرسکتے اس لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ مینڈھے کی قربانی کیا کرو تاکہ تمہاری مالی قربانی کا بھی امتحان ہو جائے۔ کسی شاعر نے اس کی مثال دیتے ہوئے فارسی میں یہ شعر کہا ہے ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست

یعنی اگر جان مانگو تو کوئی حرج نہیں لیکن دوسرے مصرعہ میں کہتا ہے۔

گر زر طلبی سخن درین است*

اگر روپیہ مانگو تو اس میں مجھے اعتراض ہے بظاہر تو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص اپنی جان دینے کو بخوشی تیار ہو جائے مگر وہ روپیہ نہ دے لیکن دنیا میں بہت سے ایسے دَور بھی آتے ہیں جب لوگوں کی ذہنیتیں یہ شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ چنانچہ آجکل کے غیر احمدیوں پر بھی یہ دَور آیا ہوا ہے۔ دیکھو کس طرح ہندوستان میں ہزاروں ہزار مسلمان مارے جا رہے ہیں۔ یوں تو ہمارے احمدیوں کے بھی زخمی ہونے کی خبر آئی ہے گو کسی کے مارے جانے کی خبر نہیں آئی۔ اس کے علاوہ احمدیوں کی کئی عمارتیں جلا دی گئی ہیں۔ حالانکہ جھگڑا ہندوؤں اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان تھا۔ لیکن جہاں تک عام مسلمانوں کا سوال ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو ان صوبوں میں کہ جہاں ہندو اکثریت ہے بے رحمی سے مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں میں بھی جانی قربانی کا جذبہ تو پایا جاتا ہے خواہ وہ لغو ہی کیوں نہ ہو اور خواہ وہ فضول ہی کیوں نہ ہو مگر جذبہ ضرور موجود ہے۔ چنانچہ اس جذبہ نے نواکھالی اور ملتان راولپنڈی میں نہایت افسوسناک صورت اختیار کرلی۔ لیکن ایسے واقعات پڑھ کر کہ فلاں صوبہ کے مسلمانوں کو ہندوؤں نے گاجر مولی کی طرح کاٹ کاٹ کر پھینک دیا۔ حیرت آتی ہے کہ مسلمان کیوں ان جانوں کو بچانے کی کوشش نہیں کرتے حالانکہ تھوڑی سی کوشش کر کے ان کو بچایا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ مسلمان روپیہ خرچ کرنے سے دریغ نہ کریں اور پورے طور پر منظم ہو جائیں تب یہ جانی قربانی مٹائی جا سکتی ہے ورنہ اس کے علاوہ اور کوئی صورت مسلمانوں کے بچنے کی دکھائی نہیں دیتی۔ مگر مسلمان ان تمام تفکرات سے بالکل آزاد نظر آ رہے ہیں اور باوجود اس نازک زمانہ کے پھر بھی وہ خوابِ خرگوش سے بیدار نہیں ہوتے۔ حالانکہ موجودہ حالات جھنجوڑ جھنجوڑ کر مسلمانوں کو بیدار کر رہے ہیں مگر وہ ہیں کہ کروٹ ہی نہیں لیتے۔ جب تک مسلمان اس طرح غافل پڑے رہیں گے جب تک مسلمان اپنے آپ کو منظم نہیں کریں گے جب تک مسلمان اپنے مالوں کو غیر اقوام سے بھی بڑھ چڑھ کر قربان نہ کریں گے وہ کبھی چین اور سکھ کی زندگی بسر نہیں کر سکتے اس وقت جانی قربانی اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی مالی قربانی۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں کا ہاتھ اپنی جیبوں

---

* یہ شعر غالباً شاہ عالم کا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی اپنی مشہور کتاب آبِ حیات کے صفحہ ۱۲۲ اس شعر کو درج کیا ہے۔ (مرتب)

کی طرف اُٹھتا نظر ہی نہیں آتا۔ میں جب دلّی گیا تو لوگوں نے مجھ سے ایسے واقعات کا ذکر کیا ان کو بھی میں نے یہی کہا تھا کہ اگر چندہ کے ذریعہ مسلمانوں سے روپیہ اکٹھا کیا جائے تو ان کی حالت سُدھر سکتی ہے۔ مگر انہوں نے کہا ہم کیا کریں۔ لوگ روپیہ نہیں دیتے۔ پس آج یہ حالت ہے کہ مسلمان یہ تو برداشت کر لیتا ہے کہ اس کی بیوی بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ مسلمان یہ تو برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے گھر کو جلا دیا جائے اور مسلمان یہ تو برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے مال کو لوٹ لیا جائے اور وہ اس کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے کہ دشمن کو قتل کر دے یا اس کے گھر کو جلا دے مگر وہ یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ اپنے مال کا دسواں حصّہ ہی اپنے ہاتھ سے دے کر اپنی قوم اور اپنی جان کو بچائے۔ پس یہ وہی زمانہ ہے کہ اگر جان مانگو تو حاضر اور اگر مال مانگتے ہو تو ہمیں اس میں اعتراض ہے۔ یہ موجودہ دَور نہایت ہی نازک حالات میں سے گذر رہا ہے۔ اور عید قربان ہمیں یہی سبق سکھاتی ہے کہ صرف جانوں کو ہی نہیں بلکہ اپنے اموال کو بھی قربان کرو۔ چنانچہ جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے ذریعہ یہ سنّت قائم کی کہ جانوں کو قربان کیا جائے۔ جہاں یہ فرمایا کہ انسانی قربانی ناجائز قرار دی جاتی ہے وہاں ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ بسا اوقات صرف جانی قربانی سے کام نہیں چلتا بلکہ اس کے ساتھ مالی قربانی بھی ہونی چاہیئے، ورنہ تمہاری قربانیاں حقیقت کا رنگ اختیار نہیں کر سکتیں۔ آج غیر احمدی مسلمانوں پر وہی دَور آیا ہوا ہے کہ مالی قربانی کا نام ہی نہیں لیتے۔ آخر احمدی بھی تو مسلمانوں میں سے ہی آئے ہوئے ہیں احمدی خواہ اتنی قربانی نہ کریں جتنی قربانی کا خدا تعالیٰ ان سے مطالبہ کر رہا ہے اور خواہ وہ اتنی قربانی نہ کریں جتنی قربانی کا مطالبہ ان کا امام ان سے کر رہا ہے بہرحال جماعت احمدیہ نے قربانی کی ایک مثال دنیا میں قائم کر دی ہے۔ ایک چھوٹی سی جماعت ہونے کے باوجود دنیا بھر کے کونے کونے میں اسلام کے مشن قائم کر دیئے ہیں۔ ہمارے نوجوان اپنی نوکریاں چھوڑ کر اپنے عزیز و اقارب کی محبّت کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے امام کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے اعلائے کلمۃ اللہ کیلئے نکل گئے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ کے فضل سے احمدی جانی قربانی بھی پیش کر رہے ہیں اور مالی قربانی بھی پیش کر رہے ہیں۔ وہ جانی قربانی بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی تھی جو ہمارے احمدیوں نے افغانستان اور دوسرے غیر ممالک میں شہید ہو کر پیش کی[۱] لیکن یہ جانی قربانی بھی قابلِ قدر ہے جو ہندوستان کے کئی علاقوں میں احمدیوں نے پیش کی ہے۔ ہندوستان میں بھی انہیں طرح طرح کی مصائب اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا بائیکاٹ کر دیا گیا اور وہ خود بھی اور ان کے بیوی بچے بھی فاقوں سے رہے۔ پھر یہ بھی عظیم الشان جانی قربانی ہے کہ ہماری جماعت کے سینکڑوں

نوجوانوں نے اپنی زندگیاں اسلام کے لئے وقف کی ہوئی ہیں۔ اور ان کو ایک لمبے عرصہ کے لئے غیر ممالک میں بھیج دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے وطن اور عزیزوں کی محبت کو فراموش کرتے ہوئے اور اپنے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد کو رکھتے ہوئے کہ انہوں نے کفر کے قلعوں پر اسلامی جھنڈے کو گاڑنا ہے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو دوبارہ دنیا میں اسی شان وشوکت سے قائم کرنا ہے جس طرح آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قائم ہوا تھا نہایت قلیل گذارے پاتے ہوئے ان علاقوں میں پہنچ جاتے ہیں جہاں انہیں نہایت غربت کے ساتھ اپنی زندگی کے دن بسر کرنے پڑتے ہیں۔ نہ وہاں ان کا کوئی دوست ہوتا ہے نہ آشنا وہ ایسے ایسے غیر مانوس علاقوں میں پہنچتے ہیں جہاں سوائے خدا کے کوئی بھی ان کا پُرسان حال نہیں ہوتا۔ وہ اگر بیمار ہو جائیں تو ان کا تیمار دار کوئی نہیں ہوتا اور اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچ جائے تو کوئی تسلّی دینے والا نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی وہ اپنے عزم پر چٹان کی سی مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔ بعض اوقات ان کو درختوں کے پتے کھا کر یا پیٹ پر پتھر باندھ کر گذارا کرنا پڑتا ہے مگر وہ اپنے پائے استقلال میں تزلزل نہیں آنے دیتے۔ یہ سب باتیں جانی قربانی میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے گھروں میں جو حالت ہوتی ہے وہ بھی جانی قربانی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان مبلغین کی بیویاں آٹھ آٹھ دس دس سال تک ان کی واپسی کے انتظار میں گذار دیتی ہیں، ان کے بچے نہایت غربت اور جدائی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت کا دہرا بوجھ ان پر ہوتا ہے۔ یہ بھی جانی قربانی ہے۔ پس آج دنیا میں صرف ہماری جماعت ہی ہے جو مالی قربانی بھی کر رہی ہے اور جانی قربانی بھی کر رہی ہے۔ احمدی کوئی آسمان سے تو نہیں آئے یہ بھی انہی مسلمانوں میں سے ہیں۔ اور یہ صرف تین چار لاکھ کی قلیل تعداد میں ہوتے ہوئے بھی جو کچھ کر رہے ہیں وہ ساری دنیا کے مسلمان بھی نہیں کر سکتے۔ اس وقت ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ہیں۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ وہ احمدیوں سے دو سو گنے زیادہ ہیں گویا ایک احمدی کے مقابلہ میں دو سو غیر احمدی ہیں۔ دیکھو یہ کتنا بھاری فرق ہے۔ ہماری جماعت خدا تعالےٰ کے فضل سے پچیس لاکھ روپیہ سالانہ چندوں میں دیتی ہے۔ جس میں سے کچھ تحریک جدید اور کچھ چندہ عام اور کچھ دوسری مدات میں آتا ہے اس میں سے اگر چار یا پانچ لاکھ روپیہ باہر کی جماعتوں کا نکال دیں تو بیس لاکھ روپیہ سالانہ صرف ہندوستان کی جماعتوں کا بنتا ہے اگر ہماری جماعت کی طرح ہندوستان کے دوسرے مسلمان بھی چندہ اکٹھا کریں تو چالیس کروڑ روپیہ سالانہ چندہ اکٹھا ہو سکتا ہے اور چالیس کروڑ روپیہ سالانہ وہ آمدن ہے جو چالیس پچاس سال پہلے حکومت ہند کی ہوا کرتی تھی۔ چالیس کروڑ روپیہ ہندوستان کے سب سے امیر صوبہ

کی پوری آمدن سے بھی دُگنی رقم ہے۔ پس اگر باقی مسلمان بھی ہماری جماعت کے برابر قربانی کریں تو چالیس کروڑ روپیہ سالانہ کی رقم اکٹھی کر سکتے ہیں اور اس رقم سے وہ اپنی ہر قسم کی مشکلات کو آسانی سے دُور کر سکتے ہیں مثلاً آجکل ایک ہوائی جہاز پچیس تیس ہزار روپیہ میں مل سکتا ہے اور ایک لاکھ روپیہ میں چار ہوائی جہاز خریدے جاسکتے ہیں۔ اور ایک کروڑ روپے میں چار سو ہوائی جہاز خریدے جاسکتے ہیں۔ چار سو ہوائی جہاز وہ طاقت ہے جس سے دنیا کے ہر گوشے کے مسلمانوں کی نگرانی اور خبر گیری کی جاسکتی ہے۔ اگر وہ لوگ ہمارے برابر قربانی کریں تو چالیس کروڑ روپیہ سالانہ اکٹھا کر سکتے ہیں اور اگر اس میں سے صرف ایک کروڑ روپیہ کے ہوائی جہاز خریدلیں تو تمام دنیا کے مسلمانوں کی خبر گیری ہو سکتی ہے۔ بہار کے متعلق اخبارات کی رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں چار سو مسلمان مارے گئے ہیں مگر ہماری جماعت کے آدمیوں نے جو رپورٹ بھجوائی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ صرف ایک علاقہ میں ہی دو ہزار مسلمان مارے گئے ہیں اور یہ بھی خبر ہے کہ ایک جگہ تین سو میل کے لمبے علاقہ کے اندر کوئی ایک مسلمان بھی نہیں رہا، سب مارے گئے ہیں۔ یہ حالت مسلمانوں کی کیوں ہوئی اس لئے کہ ان کی خبر لینے والا کوئی نہ تھا اور وہ خود اپنی خبر کسی کو پہنچا نہ سکتے تھے اور مسلمانوں کو پتہ بھی نہیں کہ کون مرا اور کون جیا۔ اب مسلمان لیڈر اعلان کر رہے ہیں کہ ہمیں سب حالات کا علم دیا جائے مگر سوال تو یہ ہے کہ ان کو پتہ کون دے چونکہ مسلمانوں میں مالی قربانی کی عادت نہیں اس لئے یہ انتظام ہونا مشکل ہے ایسے انتظامات جانی قربانی سے نہیں بلکہ مالی قربانی سے ہُوا کرتے ہیں۔ اگر مسلمان مالی قربانی کرتے تو انہیں یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اسی طرح اور ہزاروں طریق اور ذرائع ہو سکتے تھے جن کو استعمال کر کے ایسے فسادات کا اندفاع ہو سکتا تھا۔ اگر دوسرے مسلمان ہماری جماعت کا دسواں حصّہ بھی قربانی کرتے تو چار کروڑ روپیہ سالانہ کی رقم فراہم کر سکتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آج کا مسلمان جانی قربانی تو دیتا ہے مگر مالی قربانی سے دریغ کرتا ہے۔ آج کا چھوٹا ابراہیم جانی قربانی تو کر سکتا ہے مگر سچے ابراہیمؑ کی طرح اس کے ساتھ دُنبہ قربان نہیں کر سکتا حالانکہ قومی ترقی کے لئے بسا اوقات دُنبے کی قربانی نہایت ضروری ہوتی ہے۔ آج دنیا میں صرف اور صرف ہماری جماعت ہے جو دونوں قسم کی قربانیاں کر رہی ہے۔ وہ جانی قربانی بھی پیش کر رہی ہے اور دُنبے کی قربانی بھی پیش کر رہی ہے۔

مَیں عید کے خطبہ کے بعد اب اس طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ بعض چھوٹی چیزوں سے بھی ایمان کی آزمائش کیا کرتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہر عید کے ساتھ کچھ چھوٹی چھوٹی باتیں رکھ دی ہیں۔ ان میں سے پہلی بات جو ہر عید کے ساتھ رکھی ہے یہ ہے کہ عید

کے دن غسل کیا کرو۔ دوسری بات یہ ہے کہ عید کے دن یا تو نئے کپڑے پہنے جائیں ورنہ احتیاط سے دھو کر پرانے ہی پہن لئے جائیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہر عید کے موقعہ پر عطر ضرور لگایا جائے۔ چوتھی بات جو صرف اس عید الاضحیہ کے لئے ہے یہ ہے کہ جب دو مسلمان گھر پر یا رستہ میں ملیں اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد پڑھا کریں۔ مگر کتنے مسلمان ہیں جو باقاعدہ ان باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کے لوگ کپڑے بدلنے میں غلو کر لیتے ہیں اور خاص کر شہروں میں تو بہت زیادہ ہوتا ہے اور وہ لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منشاء سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ گاؤں والے تو بیچارے سیدھے سادے ہوتے ہیں اور پرانے کپڑے ہی دھو کر پہن لیتے ہیں مگر شہری لوگ بہت زیادہ غلو اور اسراف سے کام لیتے ہیں جو ناجائز ہے اس کے علاوہ مسلمانوں کو عام طور پر مجالس میں آتے وقت صفائی کا خیال نہیں ہوتا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی احکام مجالس میں صفائی کر کے آنے کے بارہ میں ارشاد فرمائے ہیں۔ جن میں سے پہلا حکم بلا ناغہ مسواک کرنا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے منہ کو ہمیشہ صاف رکھا کرو اس کے متعلق میں نہیں جانتا کہ اسلامی ممالک میں اس پر کس حد تک عمل ہو رہا ہے۔ مگر ہندوستان میں سو میں سے ۹۹ فیصدی مسلمان رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ ہزار میں سے ایک آدمی بھی اس حکم پر پوری طرح عمل کرنے والا نہ ہوگا۔ اگر کسی کو اس کے متعلق شبہ ہو (یہاں تو معانقہ کا رواج نہیں) تو کسی سے معانقہ کر کے دیکھ لو اور اپنے ساتھی کے منہ کو سونگھو تو نہیں پتہ لگ جائے گا کہ یہ آدمی کا منہ نہیں سنڈاس ہے جو شخص منہ کی صفائی نہیں رکھتا اگر وہ قریب آجائے تو ہمارا ناک ہمیں بتا دیگا کہ اس نے کبھی منہ کی صفائی نہیں کی۔ مجھے اللہ تعالےٰ نے خاص طور پر قوت شامّہ عطا کی ہے اور مجھے بعض اوقات ایسی باتوں سے سخت تکلیف ہوتی ہے مثال کے طور پر بیعت کے وقت بیعت کرنیوالا مجھ سے فٹ ڈیڑھ فٹ پر بیٹھا ہوتا ہے مگر الّا ماشاء اللہ سب کے منہ سے بُو آتی ہے اور بعض اوقات بیعت سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ بسا اوقات وہ بُو اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منہ کی صفائی کا اتنا خیال تھا کہ کئی کئی دفعہ دن میں مسواک کرتے تھے۔ پس منہ کی صفائی کے لئے مسواک نہایت ضروری چیز ہے یہ بحث فضول ہے کہ منجن اچھے ہیں یا مسواک اچھی ہے۔ آجکل کے ڈاکٹروں کا دعوٰی ہے کہ منجن مسواک سے اچھے ہیں مگر اصل مدعا تو یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں میں سے کسی ایک کا تو باقاعدہ استعمال کیا جائے۔ اور منہ کی بُو کو دُور کیا جائے۔ خواہ وہ مسواک سے دُور ہو یا منجن سے بہرحال منہ کو صاف رکھنا ضروری ہے تا کہ وہ دوسروں کی طبائع پر بُرا اثر ڈالنے کا موجب

نہ ہو مگر عام طور پر لوگ منہ کی صفائی نہیں کرتے جس کی وجہ سے وہ عید کو خراب کر دیتے ہیں۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے جو حکمتیں اس کے اندر رکھی ہیں وہ ضائع ہو جاتی ہیں۔

پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کوئی ایسی چیز کھا کر مسجد میں نہ جاؤ جس سے تمہارے مونہوں سے بُو آئے اور نمازیوں کی نماز میں خلل واقع ہو ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ کچا پیاز کھا کر انسان ہرگز مسجد میں نہ جائے[۵۱] اس سے فرشتوں کو اذیت پہنچتی ہے۔ مگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ فرشتے نظر نہیں آتے اس لئے ان کو بُو بھی نہیں آتی اور اذیت بھی نہیں پہنچ سکتی۔ پھر بعض لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ صرف پیاز ہی کی شرط ہے کہ نہ کھایا جائے حالانکہ پیاز سے بھی زیادہ مولی کا ڈکار متعفن ہوتا ہے۔ اور وہ اتنا سخت متعفن ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص آٹھ یا دس گز کے فاصلہ پر بھی ڈکار لے تو اس کی بُو سے سر چکرا جاتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ ہر چیز جو اپنے اندر بُو رکھتی ہے اس کو کھا کر مجالس یا مساجد میں نہیں جانا چاہیئے۔ آپ نے پیاز کا نام صرف مثال کے طور پر لیا ہے ورنہ اس حکم میں ہر وہ چیز شامل ہے جس سے بُو پیدا ہوتی ہے۔ اور فرشتے کے متعلق یہ خیال کہ وہ صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے زمانہ میں آیا کرتا تھا اور اب نہیں آتا، یہ صرف قلّتِ تدبّر کا نتیجہ ہے اور ایسا خیال بالکل باطل ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے جس فرشتہ کے متعلق ارشاد فرمایا ہے، اس سے مراد مومن فرشتہ ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو عورتوں نے یہی کہا تھا کہ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ[۵۲] یہ شخص تو بشر نہیں ہے، فرشتہ ہے۔ مگر تعجب ہے کہ مصر کے کفار تو اس بات کو سمجھتے تھے کہ مومن کو ہی فرشتہ کہتے ہیں مگر جو مومن ہیں وہ نہیں سمجھ سکتے کہ فرشتہ کس کو کہتے ہیں جب رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا کہ پیاز کھا کر مسجد میں نہ آؤ کیونکہ اس سے فرشتے کو اذیت ہوتی ہے۔ تو وہ فرشتے تم ہو اور رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مومن جو میرے احکام پر پوری طرح عمل کر کے مجالس میں آتا ہے، اس کو اس شخص کے منہ کی بُو سے اذیت اور تکلیف پہنچتی ہے جو ان احکام پر عمل نہیں کرتا پس فرشتہ سے مراد وہ مومن ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے احکام پر پوری طرح عمل کرتا ہے۔

پھر بعض اوقات ان ساری باتوں پر عمل کرنے کے باوجود بھی کچھ کوتاہی ہو جاتی ہے مثلاً بعض لوگوں کو بغل گند[۵۳] ہوتی ہے یا بعض کے پیروں کی انگلیوں میں بُو ہوتی ہے۔ اس کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عطر لگا کر آیا کرو[۵۴] پس پہلی بات جو مجالس میں آنے کے لئے نہایت

ضروری ہے وہ مُنہ کی صفائی ہے۔ دوسری یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز نہ کھائی جاوے جس سے مُنہ میں بُو پیدا ہو۔ تیسری یہ ہے کہ نہا دھو کر بدن اور کپڑوں کی اچھی طرح صفائی کر کے آؤ۔ اور چوتھی یہ ہے کہ چونکہ بعض کو بغل گند یا اور کسی قسم کی تکلیف ہوگئی ہے جو صفائی کرنے سے بھی نہیں جا سکتی اس لئے سب کے لئے حکم ہے کہ عطر لگا کر آؤ۔ خصوصًا عیدین اور جمعہ کے موقعہ پر سب لوگوں کو عطر لگانے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ کسی شخص کی وجہ سے دوسرے مومن کو تکلیف نہ ہو یعنی ایسے مومن کو جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے احکام پر پوری طرح عمل کر کے فرشتہ بن کر مجلس میں آتا ہے۔ **بظاہر یہ چھوٹے چھوٹے احکام ہیں مگر اپنے اندر بڑی بڑی حکمتیں رکھتے ہیں چونکہ نماز میں** توجہ کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اگر ایسے لوگ بھی نمازوں میں شامل ہوں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ان حکمت بھری باتوں پر عمل نہیں کرتے تو نماز سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔

اب تو میں تمام نمازوں میں امام ہوتا ہوں مگر جب میں اپنی خلافت سے پہلے مقتدی ہوتا تھا تو بعض دفعہ میری نماز خراب ہو جایا کرتی تھی اور لوگوں کے مونہوں کی بُو کی وجہ سے نماز کی طرف توجہ رکھنی مشکل ہو جاتی تھی۔ پس نماز کو صحیح طریق سے ادا کرنے کے لئے توجہ نہایت ضروری ہے، اور توجہ کے لئے ضروری ہے کہ کوئی ایسی حرکت نہ ہو جس سے نماز کی طرف سے توجہ کے ہٹ جانے کا احتمال ہو۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مساجد میں شور نہ کیا کرو[۱۱۵]۔ اس لئے نمازوں میں عورتوں کو سب سے پیچھے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ ان کے ساتھ بچے بھی آجاتے ہیں اور وہ شور مچاتے ہیں۔ عورتوں کو پیچھے رکھنے سے علاوہ پردہ کا انتظام کرنے کے یہ بھی غرض ہے کہ اگر بچے شور مچائیں تو نمازیوں کی نماز خراب نہ ہو۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک دفعہ نماز پڑھا رہے تھے کوئی بچہ رو دیا تو آپؐ نے نماز جلد پڑھا کر ختم کردی[۱۱۶]۔ پس نمازوں میں توجہ کے لئے ضروری ہے کہ ان احکام پر پوری طرح عمل کیا جائے خصوصًا عیدین اور جمعہ کی نمازوں کے مواقع پر ان باتوں پر پوری طرح عمل کیا جائے تاکہ عبادت بابرکت ہو اور توجہ کا موجب ہو اور نمازیوں کی نمازوں میں حرج واقعہ نہ ہو۔

اسی طرح مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذکر الٰہی کی عادت ڈالے مگر آجکل لوگ اس پر بہت کم عمل کرتے ہیں اور عید کے مواقع پر دنیوی اور غیر ضروری رسم و رواج کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ ایسے مواقع پر طرح طرح کی عیاشیوں ناچ گانے اور تماشے کی طرف بہت زیادہ رغبت رکھتے ہیں اور یہ سب نقائص اجتماعی عیدوں کے مواقع پر پیدا ہوتے ہیں اسی لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اجتماعی عیدوں کے مواقع پر خاص طور پر حکم دیا کہ ذکر الٰہی کثرت سے کیا کرو[۱۱۷]۔ مگر کثرت سے اور زائد ذکر الٰہی تو الگ رہا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم

نے جو احکام دیئے تھے ان کی بھی پوری پابندی نہیں کی جاتی۔ مثلاً اس عید کے موقع پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد کا کثرت سے ذکر کیا جائے[۱]۔ آپ اس موقع پر صحابہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ٹیلے پر چڑھو تو یہ ذکر کرو اور ٹیلے سے اترو تو بھی لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر پڑھا کرو اور جب ایک دوسرے کے سامنے آؤ تو بھی ذکر بلند آواز سے پڑھا کرو[۲]۔

مَیں نے پچھلے چند سالوں سے متواتر اپنی جماعت کو اس طرف توجہ دلائی ہے مگر ابھی تک اس نے پوری توجہ نہیں کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ایسے اذکار کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن اگر [illegible] نہیں [illegible]ے اندر کوئی شان ہے تو وہ ذکر الٰہی کرنے سے جائے گی نہیں بلکہ اور بھی زیادہ ہو گی۔ جو چیز محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے خلاف ہے وہ ہرگز شان نہیں کہلا سکتی۔ وہ شان نہیں بلکہ شیطان ہے۔

آج عید گاہ کی طرف آتے ہوئے رستے میں مَیں نے دیکھا کہ لوگ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے اور ان کی زبان پر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر کا ذکر نہ تھا۔ حالانکہ مَیں اور میرے ساتھی سب یہ ذکر الٰہی کرتے آرہے تھے۔ اور ہم جس کے پاس سے بھی گذرے ہم نے لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر پڑھا۔ مگر ہمارے منہ سے سُنکر بھی کسی نے اس کا جواب نہ دیا۔ حالانکہ مَیں پہلے بھی کئی دفعہ اس طرف توجہ دلا چکا ہوں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی طریق تھا خصوصاً اس عید کے موقعہ پر یہ ذکر کثرت سے کرتے تھے۔ صحابہؓ ایک دوسرے کو رستہ میں جاتے ہوئے پکڑ لیتے تھے اور کہتے تھے کہ ذکر الٰہی کرو[۳]۔ پس جو جھوٹا وقار قائم رکھنے کے لئے ذکر الٰہی کو ترک کرتا ہے اس میں اس کی شان نہیں بلکہ وہ ایک شیطانی فعل کا ارتکاب کرتا ہے بعض لوگ تو اپنے وقار کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ کسی سے بات ہی نہیں کرتے۔ حالانکہ وقار کی بھی حد ہونی چاہیئے۔ وقار پر اتنا بھی زور نہ دیا جائے کہ بنی نوع انسان کی محبت کے اندر خلیج حائل ہو جائے۔ پس تمہیں چاہیئے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک بات پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔ ممکن ہے وہ بات جس کو تم نے چھوٹا سمجھ رکھا ہو۔ وہ حقیقت میں بڑی ہو اور وہی تمہاری اصلاح کا موجب ہو جائے۔ اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی عمل کئے بغیر نہ چھوڑو تا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور تمہارے اندر پیدا ہو اور تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقی معنوں میں تصویر بن جاؤ تا کہ لوگ تمہیں دیکھ کر پکار اٹھیں کہ یہ شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے متبعین میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ہمیں ان سب باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم ان پر عمل کر کے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے منشاء کو پُورا کرنے والے ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اور دوسرے تمام مسلمان کہلانے والوں کو بھی موجودہ مشکلات اور تکالیف سے اور جو تغیرات زمانہ میں رونما ہو رہے ہیں ان سے بھی اپنی حفاظت میں رکھے۔ دوسرے مسلمان گو وہ احمدی نہیں ہیں لیکن چونکہ وہ بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام لیواؤں میں ہیں اس لئے وہ بھی ہماری دعاؤں میں شامل ہیں۔

مَیں نے آج اس مضمون پر جو اپنے اس خطبہ میں مسلمانوں کے متعلق شروع کیا تھا زیادہ زور اس لئے نہیں دیا کہ کسی کے دل کو ٹھیس نہ پہنچ جائے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سُوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں [۳]

میرے نزدیک صحیح طریق یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے حضور رات دن دُعائیں کی جائیں کہ وہ اپنے فضل اور کرم سے اسلام اور مسلمانوں کی عزت کو بچا لے اور مسلمانوں کو ہدایت دے کہ وہ مسیح محمدی کو قبول کر کے اُنکی بے چینی اور بے آرامی کی حالتوں کو راحت اور آرام سے بدل لیں۔

اب مَیں دُعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ہم پر اپنے انعامات نازل فرمائے مَیں نے جو خواب چند دن ہوئے عید کے دن کے متعلق دیکھی تھی، وہ اپنے ظاہری رنگ میں تو پوری نہیں ہوئی اور خدا تعالیٰ کے فضل سے دنگہ اور فساد بھی نہیں ہُوا اور بادل بھی نہیں آئے۔ اگر بادل آجاتے تو ہم سمجھ جاتے کہ وہ خواب اپنے ظاہری رنگ میں پوری ہوگئی ہے۔ شاید خدا تعالیٰ کے نزدیک اس خواب والی تاریکی سے وہ تاریکی مراد ہو جو آجکل کے مسلمانوں پر چھائی ہوئی ہے اور ہر طرف مسلمانوں کو ذلت نصیب ہو رہی ہے اور ان سیاہ بادلوں سے مراد وہ بادل ہوں جو دشمنوں کی تباہ کن پالیسیوں کی شکل میں مسلمانوں کے سروں پر چھائے ہوئے ہیں اور عید کی قربانی سے مراد اسمٰعیل علیہ السلام کے سچے یا جھوٹے نام لیواؤں کی قربانی ہو (واللہ اعلم بالصواب)

(الفضل ۲۴ رمئی ۱۹۴۷ء)

لہ ۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۳ تا ۱۰۸

ٹہ ۔ پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۳

۳؎ :- تاریخ احمدیت جلد ۱۰ صفحہ ۵۹۱ - ۵۹۲

۴؎ - شہدائے افغانستان کے متعلق دیکھیں نوٹ صفحہ ۱۸۷ ان کے علاوہ البانیہ کے ممتاز احمدی شریف دوتسا اپنے خاندان سمیت کمیونسٹ حکومت کے ہاتھوں نہایت بیدردی سے شہید کر دیے گئے۔ شریف دوتسا صاحب یورپ کے پہلے احمدی تھے جنہوں نے جام شہادت نوش کیا (تاریخ احمدیت جلد ۱۰ صفحہ ۵۸۳)

حضرت مولانا عبیداللہ صاحب اور حضرت شہزادہ عبدالمجید صاحب بھی علی الترتیب ماریشس اور ایران میں اعلائے کلمۃ اللہ کرتے ہوئے فوت ہوئے اور شہادت کا درجہ پایا۔ (تاریخ احمدیت جلد ۵ صفحہ ۱۹۰-۱۹۱ و صفحہ ۴۴۱-۴۴۲)

۵؎ - سنن ابن ماجہ صلاۃ العیدین باب ماجاء فی الاغتسال فی العیدین

۶؎ - صحیح بخاری کتاب العیدین باب ماجاء فی العیدین والتجمل فیہما۔ سنن کبریٰ جلد ۳ صفحہ ۲۸۱

۷؎ - جامع ترمذی ابواب الجمعۃ باب السواک والطیب۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ مؤلفہ عبدالرحمٰن الجزیری جزاوّل صفحہ ۳۵

۸؎ - سنن کبریٰ جلد ۳ صفحہ ۳۱۲۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ مؤلفہ عبدالرحمٰن الجزیری جزاوّل صفحہ ۳۵۷

۹؎ - صحیح بخاری کتاب الوضوء باب السواک، جامع ترمذی ابواب الطہارۃ باب ماجاء فی السواک۔ سنن ابن ماجہ کتاب الطہارۃ وسننہا باب السواک۔

۱۰؎ - صحیح بخاری کتاب الاذان باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اکل الثوم والبصل فلا یقربن مسجدنا۔ سنن ابی داؤد کتاب الاطعمۃ باب فی اکل الثوم

۱۱؎ - یوسف ۱۲ : ۳۲

۱۲؎ - مخزن الجواہر مؤلفہ شمس الاطباء حکیم و ڈاکٹر غلام جیلانی خان صفحہ ۳۳۰

۱۳؎ - جامع ترمذی ابواب الجمعۃ باب السواک والطیب - مؤطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب الہیئۃ وتخطی الرقاب والاستقبال الامام یوم الجمعۃ۔

۱۴؎ - صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب یرفع الصوت فی المسجد

۱۵؎ - صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب من اخف الصلوٰۃ عند بکاء الصبیّ

۱۶؎ - سنن کبریٰ جلد ۳ صفحہ ۳۱۵، سنن دارقطنی جلد ۲ صفحہ ۲۴

۱۷؎ - سنن کبریٰ جلد ۳ صفحہ ۳۱۲

۱۸؎ - سنن دارقطنی جلد ۲ صفحہ ۵ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۶ء سنن کبریٰ جلد ۳ صفحہ ۳۱۲

۱۹؎ - کشف الغمہ جلد ۱ صفحہ ۱۳۱ مطبوعہ مصر

۲۰؎ - یہ شعر سید انشاء اللہ خاں انشاء (وفات ۱۲۳۳ھ) کا ہے (آب حیات مصنفہ مولانا محمد حسین آزاد صفحہ ۲۹۱ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۰ء بار پانز

(۳۶)

(فرمودہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء بمقام منٹو پارک لاہور)

دُنیا کی ہر چیز میں ایک نسبت پائی جاتی ہے اور نسبتوں کو نظر انداز کر دینا کبھی بھی انسان کے لئے سکھ کا موجب نہیں ہوتا۔ اپنے اپنے مقام پر ہر چیز کی ایک اہمیت بھی ہوتی ہے اور اپنے اپنے مقام پر ہر چیز دوسرے کے لئے قربان بھی کی جاتی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ [1] تم میں سے ہر شخص ایک نگران کی حیثیت رکھتا ہے اور جو چیزیں اس کے سپرد کی گئی ہیں ان کے متعلق وہ خدا تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ اب کُلُّکُمْ رَاعٍ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ نسبت کا اصل بالکل درست ہے۔ کیونکہ کُلُّکُمْ رَاعٍ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بادشاہ بھی ایک راعی ہے اور اس سے رعایا کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث میں یہ نہیں فرمایا کہ صرف بادشاہ راعی ہے بلکہ فرمایا ہے کُلُّکُمْ رَاعٍ تم میں سے ہر شخص ایک راعی کی حیثیت رکھتا ہے پس بادشاہ ہی نہیں ایک وزیر بھی راعی ہے اور اسے اللہ تعالےٰ کے حضور جوابدہ ہونا پڑے گا مگر اس کے ساتھ ہی وہ اپنے بادشاہ کے سامنے بھی جوابدہ ہے۔ پھر گورنر بھی راعی ہے اور اپنی رعایا کے متعلق اسے اللہ تعالےٰ کے حضور جواب دینا پڑے گا مگر اس کے ساتھ ہی وہ وزیر کے سامنے بھی جوابدہ ہے۔ پس کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ نے بتا دیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نسبت کے اصل کو تسلیم فرماتے ہیں اگر نسبت کے اصل کو تسلیم نہ کیا جائے تو ایک ہی راعی ہوگا مگر آپ فرماتے ہیں تم میں سے ہر شخص ایک راعی کی حیثیت رکھتا ہے یہاں تک کہ خاکروب بھی اپنی جگہ ایک راعی ہے اور چرواہا جو بکریاں چراتا ہے وہ بھی اپنی جگہ راعی ہے اسی طرح مرد بھی راعی ہے اور عورت بھی بلکہ بچے بھی اپنے اپنے مقام پر راعی کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ کوئی انسان ایسا نہیں ہوتا جس کے سپرد کوئی چیز نہیں ہوتی۔

راعی کے معنے ضروری نہیں کہ ایسے شخص کے ہوں جس کے سپرد آدمی ہوں۔ اگر ایک چرواہا اپنے پاس صرف بھیڑ بکریاں رکھتا ہے تو اس سے بھی ان کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ بچوں کو کھلونے لے کر دیئے جاتے ہیں تو مائیں اپنے بچوں سے پوچھتی ہیں کہ تم نے فلاں کھلونا کیوں ضائع کر دیا۔ یا فلاں دن تمہیں گڑیا خرید کر دی گئی تھی وہ تم نے کیوں

توڑ دی جس طرح بچوں سے کھلونے کے متعلق سوال کیا جاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر شخص سے دریافت کرے گا کہ اس نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اپنی ذمہ داریوں کو کہاں تک ادا کیا ہے۔

رعیت کے معنے لفظی طور پر خواہ کچھ ہوں كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ میں ہر وہ چیز مراد ہے جو کسی کے سپرد کی جاتی ہے۔ خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان جاندار چیزوں میں اس کا مفہوم اور معنوں کے لحاظ سے آجائے گا اور بیجان چیزوں میں اس کا مفہوم اور معنوں کے لحاظ سے آجائے گا۔ بہرحال ہر شخص پر کچھ نہ کچھ ذمہ داری ہوتی ہے مگر وہ ذمہ داری نسبتی ہوتی ہے۔ بسا اوقات جس کے سپرد کوئی کام کیا جاتا ہے اس کے اوپر اور افسر ہوتے ہیں، اور ان کے اوپر اور افسر ہوتے ہیں۔ اگر نسبت کے اصول کو ہم نظر انداز کر دیں تو کارخانۂ عالم سب درہم برہم ہو جائے۔

اس دنیا میں نسبت کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہمیت اللہ تعالیٰ کے وجود کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حیثیت ایک خالق اور مالک کی ہے اور باقی جس قدر ہستیاں ہیں وہ سب اس کی مخلوق اور مملوک ہیں۔ اس وجہ سے اس دنیا میں یا ہر دنیا میں سب سے مقدم مقام اللہ تعالیٰ کی آواز کو حاصل ہے اور سب سے زیادہ اہمیت اللہ تعالیٰ کے حکم کو حاصل ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کی آواز آئے گی، وہاں دوسروں کی آواز ہمیں دبانی پڑے گی۔ اور جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم آئے گا وہاں دوسروں کے احکام کو ہمیں نظر انداز کرنا پڑے گا۔ ورنہ ہماری حیثیت ایک باغی کی سی ہوگی۔

ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ لاکھوں لاکھ غریب جو دوسروں کی ملازمت پر گذارا کرتے ہیں ان کے اپنے جذبات ان کے مالکوں کے جذبات کے مقابلہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ ایک مشاطہ کا بچہ فوت ہو جاتا ہے، ایک دھوبی کے گھر موت واقع ہو جاتی ہے، ایک نائی کا عزیز اسے چھوڑ چکا ہوتا ہے مگر اس کے باوجود وہ مجبور ہوتے ہیں کہ مسکراتے ہوئے چہروں کے ساتھ اپنے آقاؤں کی خدمت کریں اس لئے کہ وہ خادم ہیں اور ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے آقا کے مقصد اور مدعا کو پورا کریں خواہ انہیں خوشی ہو یا غمی۔ رنج ہو یا راحت۔ حالانکہ دھوبی سے کپڑے دھلانے والے کا یا نائی سے حجامت بنوانے والے کا یا مشاطہ سے چوٹی کروانے والی کا دھوبی یا نائی یا مشاطہ سے کتنا چھوٹا اور محدود تعلق ہوتا ہے۔ بسا اوقات دھوبی کی خدمت زیادہ ہوتی ہے، نائی کی خدمت زیادہ ہوتی ہے۔ مشاطہ کی خدمت زیادہ ہوتی ہے اور جو کچھ ان کے آقاؤں کی طرف سے انہیں معاوضہ میں ملتا ہے وہ بہت کم ہوتا ہے کیونکہ عام طور پر امراء اپنی طبیعت میں خست رکھتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں امراء کی یہ حالت ہوتی

ہے کہ بسا اوقات وہ بازار میں سودا سلف خریدنے کے لئے جائیں گے تو دوکاندار سے بحث شروع کر دیں گے کہ اتنی قیمت ہمیں چھوڑ دی جائے گی۔ گویا وہ غرباء سے بھی روپیہ چھڑانے کے عادی ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے پاس سے کچھ دینے کی عادت مفقود ہوتی ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو اپنے اندر تقوٰی رکھتے ہوں اور اللہ تعالیٰ کی خشیت ان کے دلوں میں پائی جاتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں عام طور پر مزدور پیشہ لوگ اپنے آقاؤں سے عناد رکھتے ہیں کیونکہ مالک ان کا حق مارنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں اور انصاف اور حُسنِ سلوک سے کام نہیں لیتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے یہ معاملہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کا حق نہیں مارتا۔ کیونکہ وہ غنی ہے اور نہ صرف غنی ہے بلکہ صمد بھی ہے۔ غنی کے معنے ہیں جس کو خود کسی کی احتیاج نہیں اور صمد کے معنے ہیں جس کو خود کسی کی احتیاج نہیں اور جو دوسروں کی احتیاج کو پُورا کرتا ہے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ؑ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے کہ خود کسی کا محتاج نہیں اور دوسروں کی ضروریات کو بھی پُورا کرتی ہے۔ ایسے آقا کی شان کا مقابلہ دوسرے لوگ کہاں کر سکتے ہیں۔ اور جب ہمارا آقا اس شان اور عظمت کا ہے تو ایک مومن کو ہمیشہ اپنے آقا کے منشاء اور اس کے مقصد کو اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔ اور اپنے مقاصد کو اسی طرح بھول جانا چاہیئے جس طرح عام ملازمت پیشہ لوگ اپنے آقا کی خوشی میں اپنے غموں کو بھول جاتے ہیں۔

آج کی عید اس بات کا سبق اپنے اندر رکھتی ہے کہ اپنے آقا کی خوشی اور اس کی مرضی کے موقع پر انسان کو اپنا غم بالکل بھول جانا چاہیئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کی یادگار کے طور پر یہ عید مقرر کی گئی ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تُو اپنا اکلوتا بیٹا ذبح کر دے ؑ۔ ابراہیمؑ نے اس خواب کے معنے یہی سمجھے کہ مجھے ظاہری طور پر اپنے بیٹے کو قربان کر دینا چاہیئے اور انہوں نے عملی طور پر اپنے بیٹے کے حلق پر اس کو ذبح کرنے کے لئے چھری رکھ دی ؑ۔ اپنے بیٹے کا اپنے ہاتھوں حلق کاٹنا تو دُور کی بات ہے۔ اپنے بچے کی موت کی خبر سننا بھی باپ کے لئے بہت تلخ ہوتا ہے۔ پھر باپ کے سامنے اپنے بیٹے کا مرنا اَور بھی تلخ ہوتا ہے۔ اور بیٹے کا باپ کی غلطی کی وجہ سے مر جانا اس سے بھی زیادہ تلخ ہوتا ہے۔ مگر بیٹے کا اس کی اجازت سے مارا جانا اس سے بھی تلخ تر ہوتا ہے۔ اور بیٹے کو لٹا کر اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا اور بھی تلخ ہوتا ہے لیکن باوجود اس انتہائی تلخی اور مرارت کے ابراہیمؑ نے تعبیر کی کوشش نہیں کی بلکہ جب خدا تعالیٰ نے کہا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دو تو ابراہیمؑ نے یہی سمجھا کہ مجھے اس حکم کی ظاہری طور پر تعمیل کرنی چاہیئے اور اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر دینا چاہیئے۔ انہوں نے سمجھا یہ ایک انعام ہے کہ مَیں خدا تعالیٰ کے ایک حکم کو پُورا کرنے لگا ہُوں اور انہوں نے اپنے بیٹے کو بلا کر اس کا

ذکر کیا - وہ بیٹا بھی اپنے باپ کا سپوت بیٹا تھا - جب ابراہیمؑ نے کہا کہ مَیں نے خواب میں دیکھا ہے کہ مَیں تمھیں ذبح کر رہا ہوں اور اب مَیں چاہتا ہوں کہ تمھیں واقعہ میں ذبح کر دوں تو حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام نے جواب میں کہا مجھے اور کیا چاہیئے - جب خدا نے یہ حکم دیا ہے تو آپ شوق سے اس حکم کی تعمیل کریں[۵] - چنانچہ بیٹا اپنے باپ کے ساتھ قربان ہونے کے لئے چل پڑا - جب حضرت ابراھیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو لٹا کر اس کے حلق پر چھری رکھدی تو اللہ تعالےٰ نے کہا - ابراہیمؑ! تو نے اپنا رؤیا ظاہر میں بھی پورا کر دیا ہے[۶] مگر ہمارا منشاء اور تھا - اب تم اس کی جگہ ایک دُنبہ ذبح کر دو - رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں یہ عید ابراہیمؑ کے اس واقعہ کی یادگار کے طور پر امّتِ محمدیہ میں قائم کی گئی ہے[۵] اب ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ اس عید میں وہ کونسی چیز ہے جو یادگار سمجھی جا سکتی ہے - یہ امر ظاہر ہے کہ یہ عید تبھی یادگار ہو سکتی ہے جب ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنا اپنے لئے عید سمجھا ہو - اگر اسمٰعیلؑ کی قربانی کو انہوں نے عید نہیں سمجھا تو یہ عید اس واقعہ کی یادگار بھی نہیں ہو سکتی - یادگار اسی صورت میں کہلا سکتی ہے جب ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کی قربانی کو اپنے لئے عید سمجھا ہو - اور درحقیقت یہی سبق ہے جو اس عید کے ذریعہ دیا گیا ہے - عیدالاضحیہ ہمیں سبق دیتی ہے کہ ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی کو مصیبت نہیں سمجھا - ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی کو آفت نہیں سمجھا - ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی کو ابتلاء نہیں سمجھا بلکہ چونکہ وہ اپنے بیٹے کی قربانی کے لئے خدا تعالےٰ کے حکم کے ماتحت گیا تھا اس لئے اس دن ابراہیمؑ ویسی ہی خوشی محسوس کر رہا تھا جیسے عید کے دن ہم بکرا ذبح کر کے خوشی محسوس کرتے ہیں یا اگر ہم خود قربانی نہ کریں تو اپنے ہمسایہ کو قربانی کرتے دیکھکر ہی جو خوشی محسوس کرتے ہیں، ویسی ہی خوشی اس روز ابراہیمؑ کا قلب محسوس کر رہا تھا - مگر افسوس کہ ابراہیمؑ کی تو یہ حالت تھی کہ اس نے خدا تعالےٰ کے لئے اپنے بچہ کو قربان کرنا بھی اپنے لئے عید سمجھا - اور مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ان میں سے بعض لوگ عید کے موقعہ پر بکرا قربان کرنے کی توفیق رکھنے کے باوجود اس قربانی کو بھی بوجھ سمجھتے اور اس کے لئے تیار نہیں ہوتے - مَیں نے خود کئی مسلمانوں کے مضامین اخبارات میں پڑھے ہیں جن میں وہ لکھتے ہیں کہ قربانی پر بلا وجہ روپیہ ضائع کیا جاتا ہے - کیوں نہ یہ روپیہ غرباء میں تقسیم کر دیا جائے یا کیوں نہ یتیم خانوں کو دے دیا جایا کرے یا کیوں نہ قومی ترقی کے کاموں پر اس روپیہ کو صرف کیا جائے[۸] ان سے کوئی نہیں کہتا کہ تمہاری جیب میں اَور بھی تو پیسے ہیں - تم خدا تعالےٰ کے اس حکم کو پورا کرو اور پھر اس حکم کو پورا کرنے کے بعد جو کچھ تمہاری جیب میں بچے وہ یتیم خانوں کو دے دو یا قومی ترقی کے کاموں پر صرف کر لو - تمھیں اس سے کون منع کرتا ہے - مگر وہ نام تو یہ رکھیں گے کہ یتیم خانہ کی

مدد کی جائے، وہ نام تو یہ رکھیں گے کہ حجاز ریلوے کی مدد کی جائے، وہ نام تو یہ رکھیں گے کہ ریفیوجیز (REFUGEES) کی مدد کی جائے مگر جب خرچ کریں گے تو اس خانہ میں سے خرچ کریں گے جو خدا نے اپنے لئے رکھا تھا حالانکہ اگر انہیں ریفیوجیز کی مدد کا شوق تھا، اگر وہ یتیم خانوں کو روپیہ دینا چاہتے تھے اگر وہ حجاز ریلوے کی مدد کرنا چاہتے تھے تو وہ اپنے جیب سے کر سکتے تھے۔ کیا قربانی کرنے کے بعد انسان کنگال ہو جاتا ہے اور کیا دُوسرے کاموں کے لئے اس کے پاس کوئی روپیہ نہیں بچتا؟ جب بچتا ہے تو خدا تعالٰے کے ایک حکم کو پسِ پُشت ڈال کر اَور کاموں پر روپیہ صرف کر دینا کونسی دانائی اور عقلمندی ہے۔ ایمان تو یہ تھا کہ جو کچھ خدا نے کہا تھا پہلے اس کو پورا کیا جاتا اور پھر اَور کاموں پر روپیہ صرف کیا جاتا۔ مگر خدا تعالٰے کے حکم کو نظر انداز کر دینا اور دوسرے کاموں پر وُہ روپیہ صرف کرنا جسے خدا تعالٰے نے اَور جگہ خرچ کرنے کا حکم دیا ہوا تھا بتاتا ہے کہ مسلمان اسلام سے کس قدر دُور جا چکے ہیں اور وہ اللہ تعالٰے کے احکام کو کیسی ناقدری کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگر یتیم خانوں اور حجاز ریلوے اور ریفیوجیز کی مدد کا انہیں شوق ہی ہے تو وہ اپنی جیب سے کریں۔ خدا تعالٰے کے حکم کو پسِ پُشت ڈال کر کیوں کرتے ہیں کیا یہی ایک قربانی ہے جس پر امیر آدمی سارے سال میں روپیہ صرف کیا کرتا ہے اور اس کے بعد اس کے پاس کوئی پیسہ نہیں رہتا۔ جب بیسیوں نہیں سینکڑوں کاموں کے لئے اس کے پاس روپیہ ہوتا ہے۔ تو قربانی کے روپیہ کو دوسری جگہ کیوں صرف کیا جاتا ہے؟ کیوں قربانی کا روپیہ قربانی پر صرف نہیں کیا جاتا اور باقی کاموں کے لئے اپنے پاس سے روپیہ نہیں دیا جاتا؟ قربانی پر اعتراض کرنا اور اسی روپیہ کو اپنے ذاتی کاموں پر صرف کر دینا بتاتا ہے۔ کہ مسلمانوں کو قربانی کی اہمیت کا کوئی احساس ہی باقی نہیں رہا۔ وہ قربانی کی توفیق رکھنے کے باوجود چند روپے خرچ کرنا بھی اپنے اوپر بوجھ محسوس کرتے اور بکرے کی قربانی بھی موت کی طرح سمجھتے ہیں مگر ابراہیم علیہ السلام نے یہ نمونہ دکھایا کہ اس نے اپنے بیٹے کی قربانی کو عید سمجھا اس نے کہا مجھ سے زیادہ خوش قسمت انسان اَور کون ہو سکتا ہے جسے اللہ تعالٰے نے اس فضل سے نوازا اور وہ اپنے ہاتھ سے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گیا اور سچے وفاداری کی یہی علامت ہوتی ہے، وہ اپنے دوست اور محبوب کے لئے اپنی ہر چیز قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے کجا یہ کہ ایسا محبوب اور دلدار ہو جو نہ صرف محبوب اور دلدار ہو بلکہ انسان کا خالق اور مالک اور آقا بھی ہو۔

قصّہ مشہور ہے کہ ایک نوجوان اپنے باپ کا مال دوستوں کے ساتھ مل کر اُڑانے کا عادی تھا۔ ہر وقت اس کے ارد گرد خوشامدیوں کا ہجوم رہتا اور وہ دن رات روپیہ کو برباد کرتے رہتے

اس کا باپ اسے ہمیشہ نصیحت کرتا کہ یہ خوشامدی اور خود غرض نوجوان ہیں انہیں تم سے حقیقی محبت نہیں۔ تم ان پر اپنا روپیہ برباد مت کرو۔ مگر وہ اپنے باپ کی نصیحت کو کبھی تسلیم نہ کرتا اور یہی جواب دیتا کہ یہ میرے سچے دوست ہیں۔ باپ نے کہا تمہیں اتنے دوست کہاں سے مل گئے مجھے تو ساری عمر میں صرف ایک دوست ملا ہے۔ اور تمہاری یہ حالت ہے کہ تمہارے اردگرد ہر وقت دوستوں کا ہجوم رہتا ہے۔ جب بہت عرصہ گذر گیا اور باپ کی نصیحت اس نے تسلیم نہ کی۔ تو ایک دن باپ نے اسے کہا اگر تمھیں میری بات پر اعتبار نہیں تو تجربہ کرلو۔ اور اپنے دوستوں کا امتحان لے لو۔ پھر تمہیں خود بخود پتہ لگ جائے گا۔ کہ تمہارے کتنے حقیقی دوست ہیں اس نے کہا۔ مَیں اپنے دوستوں کا کس طرح امتحان لوں۔ باپ نے کہا، کہ تم ہر دوست کے مکان پر جاؤ اور اسے کہو کہ میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے اور جائداد سے مجھے بے دخل کر دیا ہے۔ مجھے اس وقت کچھ روپیہ دیا جائے تاکہ مَیں روزگار کا انتظام کرسکوں۔ جب وہ اپنے دوستوں کے مکانوں پر گیا اور انہیں معلوم ہوا کہ اسے باپ نے گھر سے نکال دیا ہے تو کسی نے اندر سے کہلا بھیجا۔ کہ مَیں بیمار ہوں افسوس ہے کہ اس وقت مل نہیں سکتا۔ کسی نے خادم کے ذریعہ کہلوا دیا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ کسی نے معذرت کا اظہار کر دیا اور کہدیا کہ روپیہ تو تھا۔ مگر آج ہی فلاں کو دیدیا گیا ہے۔ اسی طرح وہ خالی ہاتھ اپنے باپ کے پاس واپس پہنچا۔ اور اسے کہا کہ آپ کی بات درست ثابت ہوئی، میری تو کسی شخص نے مدد نہیں کی۔ باپ نے کہا۔ اب آؤ مَیں تمہیں اپنا دوست بتاتا ہوں۔ یہ کہکر وہ اسے اپنے ساتھ شہر سے باہر جنگل کی طرف لے گیا اور ایک مکان کے پاس پہنچ کر اس نے آواز دی۔ جس طرح اس زمانہ میں ریل پر پہرہ ہوتا ہے اس طرح پُرانے زمانے میں سڑکوں پر پہرہ ہوا کرتا تھا۔ اور وہ شخص بھی انہی پہرہ داروں میں ملازم تھا۔ اس نے زنجیر کھٹکھٹائی تو اندر سے آواز آئی کہ کون ہے اس نے اپنا نام لیا کہ فلاں شخص ہوں۔ اس نے کہا بہت اچھا مگر اتنا کہنے کے بعد خاموشی طاری ہوگئی اور آدھ گھنٹے تک اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ بیٹا کہنے لگا۔ آپ کا دوست بھی میرے دوستوں جیسا ہی ثابت ہوا ہے۔ باپ نے کہا گھبراؤ نہیں ابھی پتہ لگ جاتا ہے، کہ اس نے نکلنے میں کیوں دیر لگائی ہے۔ پانچ دس منٹ اور گذرنے کے بعد وہ شخص باہر نکلا۔ اس نے ایک ہاتھ میں اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اس کی کمر میں ہمیانی بندھی ہوئی تھی اور اس کے دوسرے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس نے باہر نکل کر کہا۔ میرے دوست معاف کرنا۔ مجھے دیر اس لئے ہوگئی کہ آج آپ آدھی رات کے وقت تشریف لائے ہیں۔ جب آپ نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میرے دل میں خیال آیا کہ آدھی رات کے وقت آپ کا میرے پاس آنا ضرور اپنے اندر کوئی غرض رکھتا ہے۔ چنانچہ

مَیں نے سوچا کہ ممکن ہے آپ پر اس وقت کوئی مصیبت آئی ہوئی ہو اور آپ مدد کے لئے میرے پاس آئے ہوں اس خیال کے آنے پر مَیں نے تلوار اٹھا لی کیونکہ یہی اک چیز ہے جس سے مَیں آپ کی مدد کر سکتا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ گو آپ کروڑپتی ہیں مگر کبھی کروڑپتیوں پر بھی ایسی مصیبت آجاتی ہے کہ وہ پیسہ پیسہ کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ (جیسے مشرقی پنجاب میں کئی مسلمان کروڑپتی تھے مگر آج وہ بالکل کنگال ہیں) میں نے ساری عمر پیسہ پیسہ جمع کر کے چار پانچ سو روپیہ اکٹھا کیا تھا اور اسے زمین میں دبا رکھا تھا۔ اس خیال کے آنے پر مَیں نے زمین کھودنی شروع کردی اور وہ تھیلی نکال لی اس لئے مجھے باہر آنے میں دیر ہوگئی ہے اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے آپ کے گھر والے بیمار ہوں اور ان کی تیمارداری کے لئے کسی کی مدد کی ضرورت ہو۔ چنانچہ مَیں نے اپنی بیوی کو جگایا اور اسے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ اب یہ تینوں چیزیں حاضر ہیں، بتایئے آپ کو کیا کام ہے۔ باپ نے اپنے بیٹے سے کہا۔ دیکھا! اس قسم کے دوست ہُوا کرتے ہیں[۵]

یہ مثال اپنے اندر یہ سبق رکھتی ہے کہ اگر انسانوں کے دوست اس قسم کے ہو سکتے ہیں تو خدا تعالےٰ کے دوست کو کیسا ہونا چاہیئے اور اسے خدا تعالےٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کو کس طرح مدنظر رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ انسان اگر سچا مومن ہو تو اسے ہر وقت خدا تعالےٰ پر نظر رکھنی چاہیئے۔ اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ میرا خدا کدھر دیکھ رہا ہے۔ پھر جس چیز میں خدا کی رضا ہو اسی چیز کو قبول کرنا چاہیئے اور خوشی اور بشاشت کے ساتھ قبول کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں کو بھی چاہیئے کہ بہت بڑی مصیبت پر جو ان دنوں ان پر وارد ہوئی ہے بجائے اس کے کہ وہ روئیں اور ہمت ہار کر بیٹھ جائیں، اللہ تعالےٰ کی تقدیر کو خوشی سے قبول کریں اور مصائب کو ہمت اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے کی عادت ڈالیں۔ مجھے افسوس ہے کہ باہر سے جو ریفیوجی (REFUGEE) آرہے ہیں وہ کوئی اچھا نمونہ نہیں دکھا رہے۔ بلکہ ہماری جماعت کے بعض دوستوں میں بھی یہ نقص پایا جاتا ہے کہ وہ پہلے ایک گاؤں میں جاتے ہیں اور جب انہیں وہاں دانہ وغیرہ مل جاتا ہے تو اس گاؤں سے دوسرے گاؤں چلے جاتے ہیں اور یہ عذر کر دیتے ہیں کہ وہاں زمین اچھی نہیں ہمیں کسی اور جگہ بھیجا جائے۔ دراصل انہیں بیکار بیٹھکر روٹی کھانے کی عادت پڑگئی ہے۔ اور دوسری طرف چونکہ ان کی اپنی جائدادیں ضائع ہوگئی ہیں ان کے نفس میں بے اطمینانی پائی جاتی ہے اور وہ کسی جگہ استقلال کے ساتھ بیٹھکر کام نہیں کر سکتے۔ حالانکہ اگر وہ اپنے خدا پر سچا ایمان رکھتے تو ان مصائب میں بھی ایک لذت محسوس کرتے اور خدا تعالےٰ کے مقابلہ میں دُنیا کی کسی

چیز کی پرواہ نہ کرتے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق اُحد کی جنگ میں جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ آپ شہید ہو گئے ہیں تو اس خبر کے سنتے ہی مدینہ کی عورتیں گھبرا کر اپنے گھروں سے باہر نکل آئیں۔ اور بعض تو اس اضطراب اور پریشانی میں اُحد تک جا پہنچیں جو مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے جب مسلمان عورتیں گھبراہٹ اور اضطراب کے عالم میں اُحد کی طرف جا رہی تھیں تو انہیں راستہ میں بعض مسلمان سپاہی ملے جو واپس مدینہ جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک عورت آگے بڑھی اور اس نے ایک مسلمان سپاہی سے پوچھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے۔ چونکہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلامت دیکھ چکا تھا اور اس کا دل مطمئن تھا۔ اس نے بجائے یہ جواب دینے کے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم خیریت کے ساتھ ہیں۔ اس عورت کو یہ جواب دیا کہ بی بی مجھے بڑا افسوس ہے تمہارا والد اس جنگ میں شہید ہو گیا ہے۔ اس نے کہا میں تم سے اپنے والد کا حال دریافت نہیں کر رہی۔ میں تم سے یہ پوچھتی ہوں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا حال ہے۔ اس نے پھر اصل بات کا کوئی جواب نہ دیا اور کہا۔ بی بی تمہارا خاوند بھی شہید ہو گیا ہے اس عورت نے پھر کہا میں تم سے اپنے خاوند کے متعلق بھی نہیں پوچھ رہی تم مجھے یہ بتاؤ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا حال ہے۔ اس نے کہا بی بی تمہارا بیٹا بھی شہید ہو گیا ہے اس پر پھر اس نے کہا میں نے تم سے اپنے بیٹے کے متعلق بھی سوال نہیں کیا میں تم سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال دریافت کر رہی ہوں اور غصہ سے کہا کہ میں تم سے اپنے رشتہ داروں کے متعلق سوال نہیں کر رہی۔ تم مجھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال بتاؤ۔ اس نے کہا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تو خیریت سے ہیں جب عورت نے یہ سنا تو اس نے کہا جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم خیریت سے ہیں تو پھر مجھے کسی کی موت کی پرواہ نہیں۔ اس کے بعد اس عورت نے کہا۔ گو تم نے مجھے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر سنا دی ہے مگر مجھے تسلی نہیں ہو گی جب تک میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔ اس نے بتایا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فلاں جگہ کھڑے ہیں۔ وہ عورت دوڑی ہوئی وہاں گئی وہ منہ سے کہتی جاتی تھی کہ یا رسول اللہ! آپ نے یہ کیا کیا یعنی زخمی ہو کر گرے اور آپ کی شہادت کی خبر مشہور ہوئی اور ہم لوگوں کو اتنا دکھ پہنچا ہے اس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تو دیوانہ وار دوڑی ہوئی آپ کے پاس پہنچی اور محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اس نے جھک کر آپ کے کرتے کا دامن چوما۔ اُسے اپنی آنکھوں سے لگایا۔ اور پھر کہا یا رسول اللہ! لوگ مجھے کہتے ہیں کہ تیرا خاوند مارا گیا ہے۔

تیرا باپ مارا گیا ہے۔ تیرا بیٹا مارا گیا ہے۔ یا رسُول اللہ! آپؐ کے زندہ ہوتے ہوئے کسی اَور کی مجھے پرواہ ہی کیا ہے۔ تو دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ان لوگوں کے دلوں میں کتنی تھی اور کتنا عشق تھا جو ان لوگوں کے قلوب میں پایا جاتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک مومن کو نسبت کا اصل ہمیشہ مدِّنظر رکھنا چاہیئے۔ بے شک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے بہت بڑے محبوب ہیں مگر خدا ہمیں آپ سے بھی زیادہ پیارا ہے۔ اگر اس عورت کو اپنے خاوند کی موت، اپنے باپ کی موت، اپنے بیٹے کی موت اور اپنے بھائی کی موت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں پریشان نہیں کر سکتی تھی تو ہمیں اپنے زندہ خدا کی موجودگی میں کوئی مصیبت کس طرح پریشان کر سکتی ہے۔ اگر ہمارا نقصان ہو جائے تو ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے خدا کا ایسا ہی ارادہ تھا۔ اور ہمیں راضی برضا رہ کر اس کے ساتھ اپنے تعلقات کو بڑھانا چاہیئے۔ لیکن اگر بفرضِ محال ہمارا خدا ہی ہمیں مارنے پر تُلا ہوُا ہے تو پھر ہمیں کوئی طاقت موت سے بچا نہیں سکتی۔ اس صورت میں ہمارا اپنے متعلق فکر کرنا نادانی اور حماقت ہے۔ بہرحال دو صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہے اگر ہمارے خدا نے ہماری موت کا فیصلہ کر دیا ہے تو پھر کوئی طاقت ہمیں اس موت سے بچا نہیں سکتی۔ اس صورت میں غم میں مبتلا رہنا بالکل فضول ہے۔ اور اگر ہمارے خدا نے ہمیں زندہ رکھنے کا فیصلہ کیا ہوُا ہے تو اس صورت میں بھی ہمارا گھبرانا اور پریشان ہونا بیوقوفی اور پاگل پن کی بات ہے۔ بے شک غموں اور مصیبتوں کے وقت خوشی کا اظہار مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایک مشاطہ۔ ایک نائی اور ایک دھوبی تھوڑے سے پیسوں کی خاطر اپنے آقا کے سامنے اپنے چہرہ کو اس لئے ہشاش بشاش بنا لیتے ہیں کہ کہیں ان کے تعلقات اپنے آقا سے خراب نہ ہو جائیں تو کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ جب خدا نے ہماری جماعت کے لئے ایک عید تجویز کی ہے تو ہم مصائب کے دَوران میں بھی خوشی کے ساتھ اس عید کو منائیں اور ہشاش بشاش چہروں کے ساتھ اپنے رب کی عطا کردہ خوشی میں شریک ہوں۔

عید الاضحیہ کے معنے ہیں قربانیوں کی عید جس کا دوسرے الفاظ میں یہ مفہوم ہے کہ قربانیوں پر لوگ رویا کرتے ہیں مگر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے مَیں تمہارا اس طرح امتحان لُوں گا کہ تم قربانی کرو اور ہنسو۔ اور اگر ہمارا خدا چاہتا ہے کہ ہم ہنستے ہوئے اس کے حضور قربانی پیش کریں تو ایک مومن کی حیثیت سے، ایک عاشق کی حیثیت سے ایک محبّ کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم قربانی کریں اور ہنستے ہوئے کریں۔

پس میں دوستوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ انہیں آج کی عید کی حکمت کو کبھی نہیں بھولنا چاہیئے۔ یہ عید بتاتی ہے کہ مسلمانوں کو قربانیاں کرنی پڑیں گی اور ان کا فرض ہوگا کہ وہ ہنستے ہوئے چہروں

کے ساتھ قربانیاں کریں۔

گذشتہ جنگ عظیم میں ایک جرمن بڑھیا کے متعلق اخبارات میں شائع ہُوا تھا کہ اس کے سات بچے تھے اور اس نے ساتوں کے ساتوں بچے ملک کی خدمت کے لئے میدانِ جنگ میں بھیج دیئے۔ اور وہ سارے کے سارے مارے گئے جب اس کا آخری بچہ بھی مارا گیا تو گورنمنٹ کی طرف سے وزیر کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس بڑھیا سے خود اظہار ہمدردی کرے جب اسے بُلا کر بتایا گیا کہ اس کا آخری بیٹا بھی جنگ میں مارا گیا ہے تو ایک طرف غم کے مارے اس کی کمر جھکی چلی جارہی تھی اور دوسری طرف اس خیال سے کہ اس کا بیٹا ملک کی خدمت کرتے ہوئے مارا گیا ہے اس نے کوشش کرکے اپنی کمر سیدھی کی اور پھر اپنے چہرہ کو خوش بناتے ہوئے قہقہہ لگایا اور کہا۔ کیا ہوُا اگر میرا بچہ مارا گیا ہے وہ ملک اور قوم کی خاطر مارا گیا ہے ۔[1]

اگر ایک عورت، کافر عورت، ایسی قوم کی عورت جو توحید کے علم سے نا واقف تھی جو خدا تعالےٰ کی محبت اور اس کے پیار سے ناواقف تھی۔ ملک کی خاطر اپنے ساتوں بیٹے قربان کر سکتی ہے اور پھر اپنے آخری بچہ کی وفات پر اپنی کمر کو سیدھا کرتے اور اپنے چہرہ پر خوشی کے آثار ظاہر کرتے ہوئے قہقہہ لگا کر کہتی ہے کہ کیا ہوُا اگر میرا بیٹا مارا گیا ہے۔ وہ قوم اور ملک کی خدمت کرتا ہوُا مارا گیا ہے تو ایک زندہ قوم، ایک موحد قوم، ایک خدا سے تعلق رکھنے والی قوم اور رات اور دن خدا تعالےٰ کے معجزات اور نشانات دیکھنے والی قوم کو کس طرح خوشی سے اللہ تعالےٰ کی طرف سے آنیوالے مصائب برداشت کرنے چاہئیں۔ اگر وہ خدا تعالےٰ پر سچا ایمان رکھتی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ ہر مصیبت پر رضا بالقضا کا اعلیٰ نمونہ دکھائے۔ اپنے آپ کو کلی طور پر خدا تعالیٰ کے آستانہ پر ڈال دے اور اس کے لئے مرنا خندہ پیشانی سے قبول کرے۔ اگر وہ ایسا کریگی تو دنیا کی کوئی طاقت اسے ہلاک نہیں کرسکے گی کیونکہ جو لوگ خدا کے لئے مرتے ہیں انہیں کوئی شخص مار نہیں سکتا۔ وہ ایک تنومند درخت کی طرح دنیا میں بڑھتے اور پھیلتے اور پھولتے ہیں جس کی جڑیں ایک طرف زمین کی پاتال تک چلی جاتی ہیں اور دوسری طرف اس کی شاخیں آسمان تک پھیل جاتی ہیں۔

اب مَیں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے ہمیں سچی فرمانبرداری کی توفیق عطا فرمائے اور بغیر کسی ملاوٹ کے اپنا خالص عشق عطا کرے۔ ہمارے دلوں پر وُہ آپ جلوہ گر ہو۔ اپنا چہرہ ہم پر روشن کرے۔ ہماری تاریکیاں ہم سے دُور کرے اور اپنا نور ہمارے لئے ظاہر فرمائے آمین اللّٰھم آمین۔

(الفضل یکم نومبر ۱۹۴۷ء)

لے۔ صحیح بخاری کتاب النکاح باب المرأۃ راعیۃ فی بیت زوجھا۔

لے۔ الاخلاص ۱۱۲ : ۲-۳

لے۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۳

لے۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۴

لے۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۳

لے۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۶

لے۔ سنن ابن ماجہ کتاب الاضاحی باب ثواب الأضحیۃ

لے۔ عید کی قربانیاں۔ مصنفہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب ایم۔ اے رضی اللہ عنہ صفحہ ۵۹-۶۰

لے۔

لے۔ تاریخ الخمیس جزاول صفحہ ۵

لے۔

۳۷

(فرمودہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء بمقام منٹو پارک لاہور)

رسُول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا طریق تھا کہ عید الاضحیہ کے موقع پر آپ نماز کے بعد اس قربانی کے گوشت سے جو آپ پیش کرتے تھے ناشتہ فرماتے تھے۔ اس لئے عید الاضحیہ کا خطبہ عید الفطر کی نسبت مختصر کیا جاتا ہے تاکہ جو لوگ اس سنت اور تعامل کی اتباع کرنا چاہیں وہ اس پر عمل کر سکیں۔ گو شہروں میں یہ بات آجکل ناممکن ہو گئی ہے بوجہ اس کے کہ قربانیاں قریب میں نہیں کی جا سکتیں۔ دوسرے اتنے بڑے بڑے شہر بن گئے ہیں کہ باہر جا کر نماز پڑھنے اور پھر واپس آنے میں ہی بارہ ایک بج جاتے ہیں۔

یہ عید جو عید الاضحیہ کہلاتی ہے یعنی قربانیوں کی عید کس طرح شروع ہوئی اور کس واقعہ کی یاد میں مقرر ہوئی۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہمیشہ مسلمانوں میں بیان ہوتا چلا آیا ہے اور قریباً تمام تعلیم یافتہ لوگ اس سے واقف ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی قربانی پیش کی ایک رؤیا کی بناء پر، ایک ارشادِ الٰہی کی بناء پر۔ اور خدا نے ان کے اس فعل کو پسند فرما کر حکم دیا کہ تم بکرے کی قربانی کرو۔ بیٹے کی قربانی نہ کرو۔ میں کئی دفعہ بیان کر چکا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو یہ دکھائی دیا تھا کہ اپنے بیٹے کو قربان کر رہے ہیں اس کی کیا تعبیر تھی۔ میں بارہا بتا چکا ہوں کہ بیٹے کی قربانی کا یہ مطلب نہیں تھا کہ چھری لے کر اپنے بیٹے کو ذبح کر دو بلکہ مطلب یہ تھا کہ دین کی خدمت کے لئے اپنے بیٹے کو وقف کر دو۔ دنیوی ترقیات کے رستہ کو چھوڑ دینا۔ دنیوی عزتوں پر لات مار دینا اور دنیوی کامیابیوں کے حصول کے تمام ذرائع کو نظر انداز کر دینا ایک بہت بڑی موت ہوتی ہے جو بسا اوقات دوسری موت سے زیادہ سخت معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ دوسری موت کو تو قبول کر لیتے ہیں لیکن اس موت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ کیونکہ اس میں احساسِ اذیت بہت لمبا ہوتا ہے اور ایک لمبے عرصہ تک انسان کو تکالیف میں مبتلا رہنا پڑتا ہے۔ بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس زمانہ کے لحاظ سے خدا تعالیٰ کے حکم اور ارشاد کو جس رنگ میں سمجھا اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اُس زمانہ میں چونکہ عام طور پر انسانوں کی قربانیاں کی جاتی تھیں اس لئے وہ بھی اپنے بچے کو ظاہری رنگ میں قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے لیکن اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ تھا کہ وہ انسانی قربانی کسی نبی کے ذریعہ سے روک دے۔ اور

اسی لئے اس نے حضرت ابراھیم علیہ السلام کو یہ نظارہ دکھایا کہ وہ اپنے بیٹے کو قربان کر رہے ہیں اس طرح دونوں فائدے ہوگئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایمان کا بھی ایک روشن ثبوت دنیا کو مل گیا اور دوسری طرف ہمیشہ کے لئے یہ بات مذہب کا جزو بن گئی کہ انسان کی قربانی کسی صورت میں بھی جائز نہیں، خواہ وہ اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

یہ عید اس خوشی میں منائی جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی قربانی خدا تعالےٰ کی راہ میں پیش کی لیکن ہماری یہ حالت ہے کہ ہم ان کے ذبحہ کی قربانی کو تو یاد رکھتے ہیں لیکن ہمارا ذہن اس طرف بالکل نہیں جاتا کہ ہم کس چیز کی یاد مناتے ہیں اور کس چیز کی یاد دہلاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو قربانیاں تھیں۔ ایک وہ قربانی جو انہوں نے اپنے بیٹے کی کی اور ایک وہ قربانی جو انہوں نے بکرے کی کی۔ بکرے کی قربانی محض یادگار کے طور پر تھی تا کہ جو حقیقی قربانی انہوں نے پیش کی تھی اس کی ایک ظاہری شکل بھی پیدا کر دی جائے۔ اصل قربانی ان کی یہی تھی۔ کہ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ میں اپنی نسل کو خدا واحد کی یاد اور اس کے ذکر کے لئے ایک ایسی جگہ بسا دیا ہے جہاں دنیوی آمد کا کوئی ذریعہ نہیں اور جہاں کی زندگی دنیوی مال و متاع کے کمانے میں ممد نہیں ہوسکتی۔ یہ قربانی تھی جو حضرت ابراھیم علیہ السلام نے کی لیکن اس کی یاد کے طور پر خدا تعالےٰ نے یہ بھی فرمایا کہ تم بکرے کی قربانی کرو۔ (اس موقع پر ایک احمدی نوجوان نے کھڑے ہو کر حضور کا فوٹو لینا چاہا۔ اس پر حضرت امیرالمؤمنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالےٰ بنصرہ العزیز نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ اور اس نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ میاں اپنے کیریکٹر مسلمانوں والے بناؤ۔ یورپ تمہارا آقا نہیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم تمہارے آقا ہیں۔ کہیں تم نے پڑھا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم بھی اس طرح کیا کرتے تھے۔ کیا چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن کے پیچھے تم پڑے ہوئے ہو۔ تمہیں بتایا یہ جا رہا ہے کہ تم اسمٰعیلؑ کی طرح اپنی جانیں قربان کرو اور تم کام وہ کرتے ہو جو محض تعیّش کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ نہ تم میری باتیں سنتے ہو اور نہ ضرورت سمجھتے ہو کہ سنو۔ اگر میرے ایک لفظ پر بھی تم عمل کر لو تو تمہاری اور تمہاری اولادوں کی زندگی سنور جائے۔ لیکن اگر میرا دس ہزار فوٹو بھی تمہارے پاس موجود ہو تو وہ تمہیں ایک پیسے کا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا فوٹو ہمارے پاس نہیں، پھر ہمیں کیا نقصان ہوگیا۔ اسی طرح اگر میرے فوٹو مٹ جائیں گے تو کیا نقصان پہنچ جائے گا)

اس کے بعد پھر سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے حضور نے فرمایا:-

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دو فعل کئے تھے ایک انہوں نے اپنے بیٹے کی قربانی پیش کی اور دوسرے اس کی یاد میں انہوں نے بکرے کی قربانی پیش کی۔ مگر آج کے دن مسلمان کیا کرتے ہیں۔ وہ بکرے کی قربانی تو پیش کرتے ہیں لیکن بیٹے کی قربانی بھول جاتے ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ ایک خادمہ رمضان کے دنوں میں باقاعدہ سحری کے وقت اپنی مالکہ کے ساتھ اٹھتی اور پھر سحری تو کھا لیتی مگر روزہ نہیں رکھتی تھی۔ گھر کی مالکہ ایک شریف اور رحمدل عورت تھی اس نے خادمہ کی اس حالت کو دیکھ کر سمجھا کہ یہ شاید ہماری خدمت کے لئے اٹھتی ہے اور چونکہ اس وقت ہمارے پاس بیٹھی ہوئی ہوتی ہے اس لئے سحری بھی کھا لیتی ہے۔ چنانچہ دو چار دن کے بعد مالکہ نے اس خادمہ سے کہا کہ بیٹی تو رات کو نہ اٹھا کر۔ ہم خود کام کر لیا کریں گے۔ تجھے بلاوجہ تکلیف ہوتی ہے۔ اس پر وہ لڑکی بڑی سادگی سے کہنے لگی کہ بی بی اتنا تو سوچو کہ روزہ میں نہیں رکھتی۔ نماز میں نہیں پڑھتی۔ اگر سحری بھی نہ کھاؤں تو کافر ہی ہو جاؤں۔ اس مثال پر تم سب ہنس پڑے ہو۔ لیکن کیا تم سوچتے نہیں کہ تمہاری بھی یہی حالت ہے۔ کہ تم اپنے بیٹے کو وادیٔ غیر ذی زرع میں رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ تم اپنے بیٹے کو اللہ تعالےٰ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ گویا روزہ تم نہیں رکھتے، نماز تم نہیں پڑھتے، لیکن بکرے کی قربانی کرنے اور اس کا گوشت کھانے کے لئے فوراً تیار ہو جاتے ہو۔ اور تم پر بھی وہی مثال صادق آتی ہے کہ اگر میں سحری بھی نہ کھاؤں تو کافر ہی ہو جاؤں۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی نسل اور کوئی قوم اور کوئی خاندان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنی اولاد کی قربانی پیش نہ کرے۔ جس طرح کوئی زمیندار اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے حاصل شدہ غلّہ کی قربانی نہ کرے۔ زمیندار ہل چلاتا، زمین کو نرم اور ہموار کرتا اور پھر بطور بیج اپنا وہ غلہ زمین میں ڈالتا ہے۔ جو کما کر وہ اپنے گھر میں لا چکا ہوتا ہے اس امید پر کہ اس کے ہاں موہوم غلہ پیدا ہوگا۔ جو چیز وہ زمین میں ڈالتا ہے وہ یقینی اور قطعی ہوتی ہے اور جو چیز پیدا ہونے والی ہوتی ہے وہ وہمی ہوتی ہے مگر کامیاب وہی زمیندار ہوتا ہے جو ایک وہمی چیز کے لئے اپنی حاضر چیز کو قربان کر دیتا ہے۔ جو زمیندار اس بات کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ اپنے حاضر غلہ کو موہوم غلہ کے لئے قربان کر دے، وہ خود بھی آئندہ ترقی سے محروم رہتا ہے اور اپنے ملک کو بھی آئندہ ترقی سے محروم رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی قوم یہ سمجھتی ہے کہ اس کی اولاد کی حاضر زندگی زیادہ قیمتی ہے اور وہ اپنی اولاد کو آئندہ کی زندگی کے حصول کے لئے قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی، وہ بھی اسی طرح تباہ ہو جاتی ہے جس طرح وہ زمیندار تباہ ہو جاتا ہے جو اپنے حاضر غلّہ کو محفوظ رکھتا ہے

اور غائب غلّہ کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ بے شک بعض جگہیں ایسی بھی ہوتی ہیں جہاں حاضر چیزیں غائب چیزوں سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ لیکن ایسے بھی مواقع ہوتے ہیں جہاں غائب چیز حاضر چیز سے زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ ایک شخص جھوٹ بول کر اپنی جان بچا لیتا ہے۔ جھوٹ بول کر اپنی جان بچا لینا ایک حاضر فائدہ ہے۔ اور سچ بولکر اللہ تعالیٰ کی رضا کا حاصل ہونا ایک غائب فائدہ ہے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ حاضر چیز غائب سے زیادہ بہتر ہے یا ایک چور چوری کرکے اپنے لئے روٹی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اب اس کا دیانت پر عمل کرکے اس دنیا کی آئندہ زندگی یا اگلے جہاں کی زندگی میں فائدہ حاصل کرنا ایک غائب چیز ہے اور روٹی کا مل جانا ایک حاضر چیز ہے مگر کوئی نہیں کہتا کہ یہ حاضر چیز غائب چیز سے اچھی ہے تو بعض چیزیں غائب ہوتی ہیں مگر وہ حاضر کی نسبت اچھی ہوتی ہیں۔ اور انہی چیزوں میں سے ایک اولاد کی قربانی ہے جس کا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہمیں نمونہ دکھایا۔ آپ کا اپنی اولاد کو وادیٔ غیر ذی زرع میں رکھنا اور عملی طور پر چھری لے کر اپنے بچے کو قربان کرنے کے لئے کھڑے ہو جانا یہ دو باتیں تھیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیں۔ خدا تعالیٰ کا منشاء یہی تھا کہ وہ وادیٔ غیر ذی زرع میں جا کر اپنے بچے کو چھوڑ آئیں اور خدا تعالیٰ کے ذکر اور اس کے کلمہ کے اعلاء کے لئے اسے وقف کر دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں نظارہ یہ دکھایا کہ وہ اپنے بیٹے کو قربان کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا تھا۔ کہ اگر خواب میں مَیں نے ابراہیمؑ کو یہ نظارہ دکھایا کہ وہ اپنے بیٹے کو قربان کر رہا ہے تو وہ واقعہ میں اپنے بیٹے کو ظاہری رنگ میں قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ ابراہیمؑ کے ذریعہ آئندہ انسانی جان کی قربانی کو ہمیشہ کے لئے ممنوع قرار دینا چاہتا تھا اس لئے اس نے بجائے یہ کہنے کے کہ اے ابراہیمؑ جا اور اپنے بچے کو وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑ آ، یہ نظارہ دکھایا کہ وہ اپنے بچے کو قربان کر رہے ہیں۔ تا کہ جب وہ اپنے بچے کو قربان کرنے لگیں انہیں روک کر ہمیشہ کے لئے انسانی قربانی کو ممنوعہ قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ویسے ہی کیا۔ انہوں نے چھری پکڑی اور اپنے بچے کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب وہ اس فعل پر کلّی طور پر تیار ہو گئے تو خدا تعالیٰ نے انہیں روک دیا اور فرمایا آئندہ خدائی سلسلوں میں انسان کی قربانی قبول نہیں کی جائے گی، تم اس کی بجائے بکرا ذبح کر دو۔ اس طرح انسانی قربانی بھی بند ہو گئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان بھی ہو گیا اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑنے کے نتیجہ میں ان کا رؤیا بھی پورا ہو گیا بہرحال اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کی یادگاریں کہ وہ اپنے بیٹے کو خدا تعالیٰ

کی راہ میں ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے بکرے کو رکھا تھا مگر ہم تمثیل کو قبول کرتے ہیں اور حقیقت کو رد کرتے ہیں۔ ہماری زندگیاں گذرتی چلی جاتی ہیں۔ ہماری اولادوں کی زندگیاں گذرتی چلی جاتی ہیں، ہمارے بھائیوں کی زندگیاں گذرتی چلی جاتی ہیں۔ ہمارے ہمسایوں کی زندگیاں گذرتی چلی جاتی ہیں مگر ہم میں سے کوئی بھی حضرت ابراھیم علیہ السلام کی قربانی پیش نہیں کرتا لیکن ہم میں سے ہر شخص ابراہیمؑ کے بکرے میں سے گوشت کھانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

یہ تو وہی بات ہے جیسے کہتے ہیں کہ کوئی پوربیا مر گیا۔ وہ آسودہ حال تھا اور روپیہ کا استعمال صیح طور پر کرتا تھا کہیں تجارتوں میں اس نے اپنا روپیہ لگایا ہوا تھا۔ کہیں سود پر روپیہ دیا ہوا تھا۔ کہیں قرض دیا ہوا تھا۔ اس کی وفات کے بعد پوربیوں کے دستور کے مطابق ماتم شروع ہوا۔ پوربیوں میں دستور ہے کہ تمام پوربی جمع ہو جاتے ہیں اور عورت بَین ڈالنا شروع کرتی ہے جس میں وہ اپنی مشکلات کا ذکر کرتی ہے اور قوم ان مشکلات کا جواب دیتی ہے گویا وہ ایک قسم کا مشورہ ہو رہا ہوتا ہے۔ وہ اپنے حالات کا ذکر کرتی جاتی ہے اور قوم اسے جواب دیتی جاتی ہے۔ اس طرح سب لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ آئندہ یہ بیوہ اور بچے کس طرح زندگی بسر کریں گے۔ اسی رواج کے مطابق اس پوربی عورت نے بین ڈالنے شروع کئے۔ کہ ہائے میرے خاوند کے اتنے روپے فلاں کے ذمے تھے اب وہ روپیہ کون وصول کرے گا اس پر ایک پوربیا آگے بڑھا اور اس نے کہا ہم رے ہم۔ پھر اس نے بین ڈالا اور کہا اتنا روپیہ اس نے تجارت پر لگایا ہوا تھا۔ اب کون اس روپیہ کو لے گا۔ اس پر وہ پھر کھڑا ہوا اور کہنے لگا ہم رے ہم۔ پھر اس نے روتے ہوئے کہا کہ فلاں شخص کو اس نے اتنا روپیہ سود پر دیا ہوا تھا اب کون اس سے روپیہ وصول کرے گا۔ اس پر وہ پھر بول اٹھا کہ ہم رے ہم۔ غرض جتنی وصولیاں تھیں وہ اس نے بیان کرنی شروع کر دیں اور ہر وصولی کے ذکر پر وہ پوربیا فوراً جواب دیتا کہ ہم رے ہم۔ اس کے بعد اس نے ذمہ داریاں بیان کرنی شروع کیں اور کہا کہ اس نے فلاں کا اتنا روپیہ قرض دینا تھا۔ اب وہ کون دیگا، اس پر وہ پوربیا اپنی قوم کے دوسرے افراد کی طرف منہ کر کے کہنے لگا۔ ارے میں ہی جواب دیتا جاؤں یا کوئی اور بھی بولے گا۔ گویا جب تک وصولیوں کا ذکر تھا وہ ہر وصولی کے ذکر پر آگے بڑھتا اور کہتا ہم رے ہم۔ اور جب قربانی کا وقت آیا تو کہنے لگا ارے مَیں ہی بولتا جاؤں یا کوئی اور بھی بولے گا۔ یہی حال ہمارا ہے، جب بکرے کے گوشت کھانے کا وقت آتا ہے تو ہم کہتے ہیں ارے ہم رے ہم اور جب بیٹے کی قربانی کا وقت آتا ہے تو ہم بھی اس پوربئے کی طرح یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ ارے کوئی اور بھی بولیگا یا ہم ہی بولتے چلے جائیں۔ ہمیں غور کرنا چاہیئے، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کونسی قربانی تھی جس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ہر سال عید منائی جاتی ہے۔ کیا ہر سال اس لئے

عید منائی جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کی راہ میں بکرا قربان کیا تھا بکرے کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے اور پھر وہ لوگ جو جنگل میں رہنے والے ہوں اور جن کا گذارہ ہی جانوروں پر ہو، وہ تو بکرے کی کوئی حیثیت ہی نہیں سمجھتے بلکہ بکرے کی قربانی ان کی نگاہ میں انڈے سے بھی زیادہ حقیر ہوتی ہے۔ انہیں انڈے کا میسر آنا زیادہ مشکل ہوتا ہے لیکن بکرا بڑی آسانی سے مل جاتا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق تو بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ ان کے کئی گلّے تھے اسی طرح ان کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کے بھی کئی گلّے تھے کئی نوکر انہوں نے رکھے ہوئے تھے اور جانور اس کثرت کے ساتھ ان کے پاس تھے کہ ان سے وادیاں بھر جاتی تھیں۔ پس بکرے کی قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے کچھ بھی مشکل چیز نہیں تھی۔ جو چیز مشکل تھی وہ یہ تھی کہ بڑھاپے کے زمانہ میں پیدا ہونے والا اکیلا بچہ ان کے ہاں موجود ہے اور خدا کہتا ہے کہ اس بچے کو میری راہ میں قربان کر دو۔ اور ابراہیمؑ کہتا ہے کہ اے میرے ربّ میں اس کے لئے تیار ہوں۔ اور پھر وہ عملی طور پر چھری ہاتھ میں لے کر اسے ذبح کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

پھر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو وادیٔ غیر ذی زرع میں رکھے جانے کا حکم دینے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طرف بھی اشارہ تھا کہ دنیا میں جب بھی کوئی نیا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قائم کیا جاتا ہے وہ ایک وادیٔ غیر ذی زرع کا سا رنگ رکھتا ہے جس طرح ایسی وادی میں بسنا انتہائی مشکلات کا موجب ہوتا ہے اسی طرح الٰہی سلسلوں میں جو لوگ شامل ہوتے ہیں وہ بھی مقہور و معتوب اور لوگوں کی نگاہ میں مغضوب بن جاتے ہیں۔ لوگ ہر طرح انہیں تکالیف دینے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر رنگ میں انہیں دکھ اور اذیت پہنچاتے ہیں اسلئے انبیاء اور ماموریں کا سلسلہ بھی ایک وادیٔ غیر ذی زرع سے مشابہت رکھتا ہے پھر اس وقت تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے وادیٔ غیر ذی زرع کا ایک اور نظارہ بھی پیدا کر دیا ہے۔ قادیان ہمارا مرکز ہے مگر ان دنوں جو لوگ وہاں بس رہے ہیں، ان کے گذارہ کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ وہ لوگ وہاں محبوس ہیں اور ہر شخص بغیر کمائی کے اپنی زندگی کے دن بسر کر رہا ہے۔ میں جماعت کے تمام افراد سے پوچھتا ہوں کہ جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یاد میں وہ بکرے کا گوشت کھاتے ہیں وہاں وہ ان کی اس قربانی کی یاد میں کہ انہوں نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں جا کر چھوڑ دیا تھا۔ کونسی قربانی پیش کر رہے ہیں۔ قادیان اس وقت ایک وادیٔ غیر ذی زرع کا رنگ رکھتا ہے اور وہاں رہنا اپنے آپ کو بے آب وگیاہ بستی میں جا کر بسا دینا ہے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح تم میں سے کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اس قربانی کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔

سو میں سے کتنے ہیں جنہوں نے وہاں جانے کے لئے اپنے نام پیش کئے ہیں۔ کیا ایک فیصدی لوگوں نے اب تک اپنے نام پیش کئے ہیں کیا ½ فیصدی لوگوں نے اب تک اپنے نام پیش کئے ہیں؟ کیا ¼ فیصدی لوگوں نے ہی اب تک اپنے نام پیش کئے ہیں؟ اگر اتنے لوگوں نے بھی اپنے آپ کو پیش نہیں کیا تو کونسی قربانی ہے جس کا تم نمونہ دکھا رہے ہو۔ آخر خدا تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رہنے کے لئے نیکی اور تقویٰ اور قربانی کی کوئی نسبت تو ہونی چاہیئے۔

جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب آیا تو خدا تعالیٰ کے بعض مرسل پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کی خبر دینے کے لئے گئے۔ قرآن کریم میں بھی اس کا ذکر آتا ہے[۲] اور بائبل میں بھی اس کا ذکر آتا ہے[۳] مگر بائبل چونکہ تاریخی کتاب ہے، اس لئے اس میں زیادہ تفصیل سے یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت نرم دل انسان تھے۔ انہوں نے مرسلوں سے خبر سُنکر چاہا۔ کہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں کہ وہ لوطؑ کی قوم کو اس عذاب میں مبتلا نہ کرے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ خبر سنتے ہی ایک گوشے میں چلے گئے۔ اور انہوں نے دعا کی کہ الٰہی ان بستیوں میں تیرے بڑے بڑے نیک بندے بھی بستے ہیں۔ کیا تو ان نیک لوگوں کو بھی بدوں کے ساتھ تباہ کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ابراہیمؑ! ان بستیوں کے رہنے والوں نے بڑا ظلم کیا ہے۔ ہمارے بندے لوطؑ نے انھیں بڑا سمجھایا مگر وہ باز نہیں آئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ اے میرے خدا! بے شک یہ بُرے ہیں۔ مگر تیرا رحم بھی تو بہت بڑا ہے۔ یہ کتنے ہی گندے اور ناپاک کیوں نہ ہوں تیرا رحم تو بہرحال سب پر غالب ہے۔ اور اے میرے رب! کیا تیرے قانون میں بھی یہ بات داخل ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس جائے۔ اگر یہ لوگ بُرے ہیں تو ان میں کچھ نیک لوگ بھی ضرور ہوں گے کیا ان نیکوں کا لحاظ بھی نہیں کیا جائے گا اور کیا اگر ایک سو بھی ان میں نیک لوگ موجود ہوں تو ان کی خاطر اس عذاب کو دُور نہیں کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابراہیمؑ! اگر ان لوگوں میں سو بھی نیک آدمی ہوں تو مَیں اس بستی کے لوگوں کو کبھی تباہ نہیں کروں گا۔ تب ابراہیمؑ سمجھ گیا کہ اس بستی میں سو بھی نیک آدمی نہیں ہیں اور اس نے کہا۔ اے میرے ربّ سو کیا اور نوّے کیا۔ اگر پورے سو نہ ہوں اور نوّے نیک ہوں۔ تو کیا دس کی کمی کی وجہ سے تیرا رحم آڑے نہیں آئے گا اور وہ ان لوگوں کو تباہی سے نہیں بچائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ نے کہا۔ ابراہیمؑ! اگر نوّے بھی نیک آدمی ہوں تو مَیں ان کی خاطر اس بستی کو تباہ نہیں کرونگا تب ابراہیمؑ نے کہا خدایا نوّے کیا اور اسّی کیا۔ نوّے اور اسّی کا فرق تو بہت معمولی بات ہے۔ اتنے معمولی سے فرق کی وجہ سے تو ان پر عذاب نہیں آنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا۔ ان میں اسّی بھی

نیک آدمی ہوں تو مَیں ان پر اپنا عذاب نازل نہیں کروں گا۔ تب ابراہیمؑ نے سمجھا کہ اگر اسّی نہیں تو ستّر تو ان میں ضرور نیک ہوں گے اور اس نے کہا۔ خدایا اسّی کیا اور ستّر کیا۔ اگر ستّر بھی نیک نکل آئیں تو آخر یہ بھی تو ایک بڑی تعداد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا۔ ابراہیمؑ! اگر ان میں ستّر بھی نیک آدمی ہوں تو میں ان کو تباہ نہیں کروں گا۔ اس طرح گفتگو ہوتے ہوتے حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ خدایا اگر ان میں بیس نیک آدمی ہوں تو کیا ان بیس کا لحاظ نہیں کرے گا۔ اور اس بستی کو تباہ کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا اگر اس بستی میں بیس بھی نیک آدمی ہوں تب بھی مَیں اسے تباہ نہیں کروں گا۔ تب ابراہیمؑ نے یہ سمجھ کر کہ اس بستی میں بیس آدمی نہیں ہیں کہا۔ خدایا! اگر ان میں دس نیک آدمی موجود ہوں تو کیا ان دس کا لحاظ نہیں رکھا جائیگا اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابراہیمؑ اگر ان میں دس بھی نیک آدمی ہوں تو مَیں ان کو تباہ نہیں کروں گا۔ تب ابراہیمؑ خاموش ہو گیا اور اس نے سمجھ لیا کہ ان بستیوں میں دس بھی نیک آدمی نہیں ہیں اور یہ اس قابل ہیں کہ ان کو عذاب سے تباہ کر دیا جائے۔[۵۹] تو دیکھو کچھ افراد کی نسبت بھی ایک قابلِ لحاظ نسبت ہوتی ہے۔ اگر وہ نسبت پوری ہو جائے تو قوم پر سے الزام دور ہو جاتا ہے۔ اور اگر پوری نہ ہو تو ساری قوم الٰہی مؤاخذہ کے نیچے آجاتی ہے۔ ہماری جماعت کو بھی غور کرنا چاہیئے کہ کیا قربانی کے لحاظ سے اس کے افراد کے اندر وہ نسبت پائی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے محفوظ رکھنے والی ہوتی ہے۔ اگر نہیں تو یہ کتنے بڑے خوف کا مقام ہے کہ وہ دعویٰ تو ایمان کا کرتے ہیں اور عمل وہ کرتے ہیں جو ایمان کے خلاف ہوتا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں اب بھی اس واقعہ کے بعد جب کہ جماعت اس قربانی میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہے اور وہ اپنی اولادوں کو اس رنگ میں خدمتِ دین کے لئے پیش کرنے کو تیار نہیں ہوتی اور اگر پوچھا جائے کہ کیا تم خدا کے لئے قربانی کرنے کے لئے تیار ہو تو تم سب کھڑے ہو کر کہنے لگ جاؤ گے کہ ہاں جی! ہم تیار ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہو گا کہ تم اوّل درجہ کے مجرم ہو گے۔ یہ تو ویسی ہی بات ہو گی جیسے جیلخانہ میں کوئی شخص تقریر کرے اور کہے کہ چوری نہیں کرنی چاہیئے تو تمام چور کھڑے ہو جائیں اور کہیں کہ ہاں ہاں چوری ہرگز نہیں کرنی چاہیئے، ہم چوری کو بہت بُرا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ چور تو چوری کر چکا، اب اس کا یہ کہنا کہ چوری نہیں کرنی چاہیئے کیا حقیقت رکھتا ہے۔ اسی طرح جس فعل کے تم مرتکب ہو چکے ہو اس کے بعد تمہارا یہ کہنا کہ ہم اپنی جانیں خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار ہیں اس سے زیادہ جھوٹ اور کیا ہو سکتا ہے۔ حالانکہ مومن کی حالت تو یہ ہوتی ہے۔ کہ اگر کوئی ایسی جگہ پیدا ہو جو وادیٔ غیر ذی زرع کا سا رنگ رکھتی ہو تو اس کا دل خوشی سے اُچھلنے لگتا ہے۔ اور وہ سمجھتا ہے کہ آج مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے مجھے بھی ابراہیمی نمونہ دکھانے کا موقع دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے یہ واقعہ ہوا ہے مَیں نے یہ عہد کیا ہوا ہے

کہ مَیں اپنا ایک بیٹا ہمیشہ قادیان میں رکھوں گا۔ اس وجہ سے میرا حق ہے کہ آج مَیں ابراہیمؑ کے ساتھ بکرے کا گوشت کھاؤں کیونکہ جو کچھ ابراہیمؑ نے کیا وہی مَیں نے بھی کیا گو میرا فعل اس شان کا نہیں جس شان کا فعل حضرت ابراہیمؑ کا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنا اکلوتا بیٹا جو نوّے سال کی عمر میں ان کے ہاں پیدا ہوا تھا خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دیا تھا اور میرے کئی بیٹے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے لئے وہ وادیٔ غیر ذی زرع زیادہ خطرناک تھی۔ آجکل پریس کی وجہ سے کئی قسم کی سہولتیں میسّر ہیں۔ اخبارات کثرت سے شائع ہوتے ہیں اور مظلومیت کی آواز ساری دنیا میں پھیلائی جا سکتی ہے۔ اگر آجکل ان لوگوں پر جو قادیان میں رہتے ہیں مظالم ہوں، یا وہ مارے جائیں تو ہم ساری دنیا میں اس کی تشہیر کر سکتے ہیں اور اس اشاعت سے بھی ظالم لوگ ڈرتے ہیں۔ پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میری پیش کردہ قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کا مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن اپنے حالات میں ہی ہر شخص قربانی کیا کرتا ہے۔ اگر ابراہیمؑ کا صرف ایک بیٹا تھا اور میرے زیادہ بیٹے ہیں یا اس زمانہ میں پریس کی وجہ سے خبروں کی اشاعت کے سامان موجود ہیں اور پریس ظلم کے کم کرنے میں مدد دیتا ہے تو یہ میرے بس کی بات نہیں۔ مَیں نے خدا سے یہ نہیں کہا تھا کہ میرے اتنے بیٹے کر دے تب مَیں ابراہیمؑ کی طرح قربانی کروں گا۔ یا پریس جاری کر دے تب میں قربانی کروں گا۔ یہ خدا کا فعل ہے۔ میرا فعل نہیں۔ پس جو فرق ہے وہ خدائی فعل کے نتیجہ میں ہے۔ میری خواہش کے نتیجہ میں نہیں۔ یہ سوال کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو مَیں کیا کرتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میرا دل تو یہی کہتا ہے کہ مَیں اس وقت بھی ابراہیمؑ کی نقل ہی کرتا۔ لیکن بہرحال موجودہ حالات نے میری قربانی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی میں ایک بہت بڑا فرق پیدا کر دیا ہے۔

پھر اب ایک اور وادیٔ غیر ذی زرع اس رنگ میں بھی ہمارے سامنے ہے کہ ہم مرکز سلسلہ کے لئے ایک نئی بستی اسی قسم کے مقام پر بسا رہے ہیں یہ بستی بھی اسی لئے بسائی جا رہی ہے کہ بد ماحول اور بُرے خیالات سے الگ ہو کر ہماری جماعت کے افراد دین کی تعلیم حاصل کریں اور پھر اسلام اور احمدیت کی اشاعت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ یہ ایک چھوٹی قربانی ہے جس کے ذریعہ جماعت کے افراد اپنے اخلاص کا ثبوت دے سکتے ہیں اور دیں گے مگر عملاً وہی ثبوت دیں گے جو اس بات کو مدِّنظر رکھیں گے کہ ہمارا اس وادیٔ غیر ذی زرع میں رہنا صرف اس غرض کے لئے ہے کہ ہم دین کی اشاعت کریں۔ اس کے بغیر اگر وہاں رہیں گے تو انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

بہرحال مَیں جماعت کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ کوئی قومی ترقی بغیر اولاد کی

قربانی کے نہیں ہوسکتی۔ جو قوم یہ چاہتی ہے کہ وہ ترقی یافتہ قوموں کی صفوں میں جا کھڑی ہو اور پھر وہ اپنی اولاد کی قربانی سے دریغ کرتی ہے وہ ایک ناممکن بات کا قصد کرتی ہے اور اپنے وقت کو ضائع کرتی ہے۔ گری ہوئی قومیں تبھی بڑھتی ہیں اور تبھی وہ ترقی یافتہ قوموں کی صفوں میں اپنا رستہ بنانے میں کامیاب ہوتی ہیں جب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنی اولادوں کو وادیٔ غیر ذی زرع میں رکھنے اور خدا کے لئے انہیں قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ جب وہ مرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں، جب وہ اپنی اولادوں کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے ماتحت اس وقت کی زندہ قوموں کی زندہ نسلیں مر جاتی ہیں۔ یہ قانونِ قدرت ہے جس کا ہر جگہ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ بوڑھا درخت مرتا ہے اور نیا درخت ترقی کرتا ہے۔ پس دنیوی لحاظ سے بھی ترقی کی یہی راہ ہے کہ اپنی اولادوں کو قربان کیا جائے۔ اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ وہ یورپ کے لوگوں پر غلبہ حاصل کریں تو انہیں اپنی اولادوں کو قربان کرنا پڑے گا۔ انہیں تعیش کے سامانوں کو اپنے لئے حرام کرنا پڑے گا یہ موت ہے جو انہیں قبول کرنی پڑے گی، اسی موت کے دروازہ سے زندگی ملتی ہے اور اسی دروازہ میں سے گذر کر گری ہوئی قومیں دنیا پر غالب آیا کرتی ہیں۔ اگر آج مسلمان اپنی زندگیوں کو سادہ بنالیں اور اپنی جانوں اور اپنی اولادوں کی جانوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو اب بھی کچھ نہیں گیا۔ جس وقت عیسائیت بڑھنی شروع ہوئی ہے، اس وقت اسلام کے مقابلہ میں عیسائیت کی جو حالت تھی، آج عیسائیت کی ترقی کے زمانہ میں مسلمانوں کی حالت اس سے بدرجہا اچھی ہے۔ اگر عیسائیت ہم سے کمزور ہو کر ساری دُنیا پر غالب آسکتی ہے تو مسلمان ساری دنیا پر کیوں غالب نہیں آسکتے۔ اگر وہ اپنے نفس میں تغیر پیدا کریں اگر وہ اپنی اولادوں کو شیطان کے قبضہ میں دینے کی بجائے خدا تعالیٰ کے قبضہ میں دے دیں، تو یقیناً اسلام کفر پر غالب آسکتا ہے، یقیناً محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت آج بھی ساری دنیا پر قائم ہوسکتی ہے۔

خدا تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ مسلمانوں کے دلوں کے زنگ دور کر دے۔ اور ان کی آنکھوں کو کھولے۔ ان کی غفلتوں اور کوتاہیوں کو دور کرے اور انہیں صحیح طور پر کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ تا جس طرح وادیٔ غیر ذی زرع میں بسنے والے اسمٰعیلؑ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایک نورانی چراغ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں روشن کیا جس سے تمام دنیا جگمگا اُٹھی۔ اسی طرح خدا محمدیت کے باغ میں سے ایک نیا پودہ پھوڑے جو ساری دنیا کو اسلام اور صداقت کی طرف کھینچ لانے کا موجب ہو۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ پودا خدا نے

پیدا کر دیا ہے۔ کاش مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں۔ اور وہ سمجھیں کہ آج سوائے ایک ہاتھ پر جمع ہونے کے ان کی نجات کی اور کوئی صورت نہیں اور اسی شخص کے ہاتھ پر تمام دنیا کے لوگ اکٹھے ہو سکتے ہیں جسے خدا نے کھڑا کیا ہو کوئی انسانی ہاتھ ساری دنیا کو متحد نہیں کر سکتا، عرب عراق کے ہاتھ پر جمع نہیں ہو سکتا، عراق سعودی عربیہ کے ہاتھ پر جمع نہیں ہو سکتا، مصر شام کے ہاتھ پر اکٹھا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ عربی علاقے پاکستان کے ہاتھ پر اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اور پاکستان ان کی اتباع نہیں کر سکتا۔ ہر شخص کو اپنی آزادی پیاری ہوتی ہے۔ کون ہے جو دوسرے کیلئے اپنی آزادی قربان کر دے۔ اس کے لئے اپنی آزادی قربان کی جا سکتی ہے جس کے متعلق انسان کو یہ یقین ہو۔ کہ اس کا ہاتھ انسان کا ہاتھ نہیں بلکہ خدا کا ہاتھ ہے۔

ابھی تھوڑے دن ہوئے ایک جرمن نومسلم کا خط میرے نام آیا جو بڑے اخلاص اور محبت کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے جواب میں لکھا کہ کیا یہ ممکن تھا کہ جرمنی کے لوگ ہندوستانیوں کی فرمانبرداری اور اطاعت کرتے۔ یہ خدا کا ہاتھ ہی ہے جو تمہیں ہندوستان میں رہنے والے ایک شخص کی طرف کھینچ لایا۔ ورنہ وہ لوگ جو ایشیا اور ہندوستان میں رہنے والوں کو ذلیل سمجھا کرتے تھے ان سے یہ کب امید ہو سکتی تھی کہ وہ ان کی اطاعت کریں گے۔ یہ خدا کے ہاتھ کی ہی برکت ہے کہ اسی ہاتھ پر سب دنیا جمع ہو گی اور اسی سے ساری دنیا ایک دن عدل اور انصاف سے بھر جائے گی۔

اب میں دُعا کرتا ہوں۔ سب دوست میرے ساتھ اس دعا میں شامل ہوں کہ اللہ تعالےٰ ہماری جماعت کو حقیقی طور پر ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور باقی مسلمانوں کی بھی آنکھیں کھولے تا وہ اپنے اس فرض کو پہچانیں جو ان پر عائد ہوتا ہے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وہ نور جو آج دنیا کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے اور جس کے متعلق اللہ تعالےٰ یہ چاہتا ہے کہ وہ ہمارے ذریعہ سے پھر ظاہر ہو اس میں وہ اپنی غفلتوں اور سستیوں سے روک نہ بنیں بلکہ اس جماعت میں شریک ہو کر اللہ تعالےٰ کے نور کے پھیلانے میں ممد ہوں تا جلد سے جلد اللہ تعالےٰ کا فضل نازل ہو اور وہ اس دُنیا کی حالت کو بدل دے۔

(الفضل ۸ مارچ ۱۹۴۹ء)

لے۔ سُنن کبریٰ جلد ۳ صفحہ ۲۸۳

سے۔ سُنن نسائی کتاب صلوٰۃ العیدین باب القصد فی الخطبۃ

۳ھ۔ الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۰۳ تا ۱۰۸

۴ھ۔ ابراھیم ۱۴: ۳۸

۵ھ۔ پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۴

۶ھ۔ پیدائش باب ۱۳ آیت ۲ تا ۶

۷ھ۔ ھود: ۷۰-۷۱۔ الذّاریٰت ۵۱: ۲۵-۲۷-۳۲ تا ۳۷

۸ھ۔ پیدائش باب ۱۸ آیات ۲ تا ۷-۲ تا ۳۲

۹ھ۔ پیدائش باب ۱۸ آیات ۲۳ تا ۳۲

۱۰ھ۔ حضور رضی اللہ عنہ کے اس عہد کے مطابق پہلے حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب (خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ) قادیان میں رہے۔ آپ ۱۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان تشریف لائے۔ آپ کے بعد حضرت صاحبزادہ مرزا خلیل احمد صاحب اور پھر ۵ مارچ ۱۹۴۸ء سے اب تک صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب قادیان میں درویشانہ زندگی گذار رہے ہیں (تاریخ احمدیت جلد ۱۱ صفحہ ۳۵ جلد ۱۳ صفحہ ۷)

(۳۸)

(فرمودہ ۱۴؍ اکتوبر ۱۹۴۹ء بمقام ربوہ)

یہ عید جیسا کہ دوستوں کو معلوم ہے عید الاضحیہ کہلاتی ہے یعنی قربانی کی عید اور قربانی کی عید کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو اس کے دو ہی معنے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ وہ عید جو قربانی کے نتیجہ میں منائی جاتی ہے اور دوسرے وہ عید جس کے نتیجہ میں قربانی کی جاتی ہے۔ اضافت دونوں قسم کے معنوں پر دلالت کرتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس جملہ میں یہ لفظ دونوں قسم کی حیثیتیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ کسی بڑی قربانی کی توفیق پانے پر ہی عید حاصل ہوتی ہے۔ اور خوشی حاصل ہونے کے شکریہ میں بھی قربانی کی جاتی ہے۔ یہ عید اس یاد میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اگر اپنے بیٹے کی قربانی کی تو ہمیں کس بات کی خوشی ہے۔ قربانی کرنے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور قربان ہونے والے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام۔ ہم اس بات پر کسی خوشی کا اظہار نہیں کر سکتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے توفیق بخشی اور آپ نے اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو اس کی خاطر قربان کر دیا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ہمارے زمانہ میں ایک لمبا فاصلہ ہے۔ اور اتنے لمبے عرصہ تک اس واقعہ کی یاد کو تازہ رکھنا کوئی معقول بات نہیں کہلا سکتی۔ دوسرے ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی پر اس لئے بھی خوشی کا اظہار نہیں کر سکتے کہ آپ ایمان اور تقویٰ میں بہرحال ہم سے زیادہ تھے اور ہم یہ شبہ نہیں کر سکتے کہ شاید وہ یہ قربانی نہ کرتے یا ان کے قدم ڈگمگا جاتے، شکر ہے ایسا نہیں ہوا۔ اس طرح تو یہ عید عید نہیں بلکہ شک، تذبذب اور بے ایمانی سے بچنے پر اظہارِ خوشی ہے کیا ہم اس وجہ سے عید مناتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم صلح حدیبیہؓ کے موقعہ پر کفار کے مقابلہ میں خوب ڈٹے رہے یا کیا ہم اس بات کی عید منایا کرتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قوم نے جب آپ کو دنیاوی لالچ دیا تو آپ ان کے لالچ میں نہ آئے اور اپنے مقصد کے پورا کرنے میں آپ نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی یا کیا ہم اس لئے عید مناتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے پے درپے اپنی اولادوں کو خدا تعالیٰ کی خاطر قربان کیا بلکہ خود اپنی جانوں کے دینے میں بھی دریغ نہ کیا۔ پس نہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانیاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قربانیوں سے زیادہ ہیں کہ ہم ان کی خاطر عید مناتے ہیں۔ اور نہ ہمیں حضرت

ابراہیم علیہ السلام کے ایمان اور تقویٰ پر کوئی شک وشبہ ہوسکتا ہے کہ شاید خدا تعالیٰ کی خاطر آپ اپنے بیٹے کو قربان نہ کرتے، مگر چونکہ آپ نے ایسا کر دیا اس لئے ہم خوش ہیں کیا ہم آپ کے مقام کو اپنے مقام سے ادنیٰ سمجھتے ہیں کہ ہم کہتے ہیں خدا تعالیٰ کا فضل ہوگیا کہ آپ کا قدم نہ ڈگمگایا پس یہ بات غلط ہے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کی وجہ سے یہ عید مناتے ہیں اور اگر ایسا نہیں تو ضرور اس کی کوئی اور وجہ ہے۔ اس عید کا منانا اور پھر ساری دنیا میں اس عید کا منایا جانا کسی خدائی فعل کی وجہ سے ہے اور خدائی فعل کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیئے۔ اسلام سے پہلے بھی تو عرب میں عید منائی جاتی تھی۔ درحقیقت یہ حج کا ہی ایک حصہ ہے لوگ حج کرنے کے بعد خوشی مناتے تھے۔ پھر اسلام کے زمانے سے یہ عید ساری دُنیا میں منائی جانے لگی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر وہ کیا وجہ ہے جس کی وجہ سے یہ عید ساری دنیا کے لئے کر دی گئی۔ اور صرف ہم ہی یہ عید نہیں مناتے بلکہ ساری دُنیا میں یہ عید منائی جاتی ہے۔ اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ بات یقیناً نہیں کہ یہ عید ہم اس لئے مناتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کسی بے ایمانی کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ ہی ہم اس لئے عید مناتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کی محض حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے کو قربان کر دینا کیا ہمارے لئے خوشی کا موجب ہوسکتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو چار ہزار سال پہلے گذرا ہے ایک ایسا شخص جس کے ساتھ نہ ہمیں کوئی جسمانی رشتہ ہے اور نہ سیاسی، پھر اس کے ساتھ ہمیں کوئی تمدنی رشتہ بھی نہیں پھر اس کے اور ہمارے درمیان ایک ایسا راہبر آجاتا ہے جس کی عزت ہمارے دلوں میں اس سے زیادہ ہے جو خاتم النبیینؐ ہے، جو سیّد ولد آدمؐ ہے۔ بلکہ جو سیّد الانبیاء ہے۔ پس گو وہ ایک قربانی کرتا ہے بے شک وہ بہت بڑی قربانی ہے لیکن ہم اس قربانی کی وجہ سے عید کیوں منائیں۔ پھر کیا ہم اس لئے خوشی مناتے ہیں۔ کہ شاید حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی نہ کرتے ہم شکر کرتے ہیں کہ ان کو ٹھوکر نہ لگی۔ یہ بات بالبداہت غلط ہے، ابراہیم علیہ السلام کے پایہ کے آدمی کو ٹھوکر لگ ہی نہ سکتی تھی، ابوالانبیاء کا مقام یقیناً ٹھوکروں سے بہت اونچا تھا۔

غرض ہماری اس عید کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا یہ کہ ہم اس لئے عید مناتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے اکلوتے بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم دیا اور انہوں نے اسے ذبح کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا یا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام قربان ہونے کے لئے تیار ہوگئے۔ اور یا ہم اس لئے عید مناتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بچا لیا۔ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بھی ایسی بات نہیں جس کا براہ راست ہم سے تعلق ہو۔ یا اس کے واقع ہونے پر ہمیں خوشی کا حق پہنچتا ہو یا جو اتنی اہم ہو کہ اس کی مثال دوسرے انبیاء میں نہ پائی جاتی ہو۔ اس واقعہ پر ہمارا خوشی

منانا ایسا ہی مضحکہ خیز ہے جیسے مثلاً چنیوٹ یا احمد نگر میں کسی عام شخص کے ہاں لڑکا پیدا ہو اور صوبہ بمبئی کا گورنر اس کی خوشی میں صوبہ بھر میں چھٹی کا اعلان کر دے۔ کیا کوئی شخص اس گورنر کو عقلمند قرار دے گا۔ اسی طرح حضرت اسمٰعیلؑ کے بچائے جانے کا واقعہ ہے۔ ہم اس امر پر بھی خوشی نہیں منا سکتے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو قربانی کے اثرات سے بچا لیا۔ کیونکہ اس نے صرف حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ہی نہیں بچایا بلکہ ان کے علاوہ لاکھوں دوسرے اولیاء کو بھی بچایا ہے ہر صحابی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم پر ایمان لایا اور آپؐ کے ساتھ لڑائیوں میں شامل ہوا کیا اس کی جان معجزانہ طور پر نہیں بچی۔ چنانچہ خالدؓ بن ولید جب وفات پانے لگے تو آپ رو پڑے۔ ان سے ان کے ایک دوست نے کہا۔ آپ روتے کیوں ہیں، خدا تعالیٰ کے رستہ میں قربانی کرنے کی آپ کو غیر معمولی توفیق ملی ہے اس لئے جب آپ خدا تعالیٰ کے پاس جائیں گے تو انعام پائیں گے۔ خالدؓ نے کہا۔ یہ بات نہیں۔ تم ذرا میرے پاؤں سے پاجامہ اٹھا کر تو دیکھو کیا وہاں کوئی ایسا حصہ ہے جس پر تلوار کا نشان نہ ہو۔ پھر دوسرے پاؤں سے پاجامہ اٹھا کر دیکھو۔ ہاتھوں پر سے کپڑا اٹھا کر دیکھو، پیٹھ کو ننگا کر کے دیکھو، میرا سینہ دیکھو، غرض سارا جسم دکھانے کے بعد کہا۔ میرے دوست کیا میرے جسم پر کوئی انچ بھر بھی ایسی جگہ باقی ہے جس پر تلوار کا نشان نہ ہو۔ خالدؓ یہ بیان کرنے کے بعد پھر رو پڑے اور کہا۔ میں نے خدا تعالیٰ کے رستہ میں شہادت پانے کے لئے اپنے آپ کو ہر قسم کے خطرات میں ڈالا۔ چنانچہ تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ میرے جسم پر کوئی ایسی جگہ باقی نہیں جس پر تلوار کا نشان نہ ہو لیکن باوجود کوشش کے میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا اور شہادت نصیب نہ ہوئی اور آج پلنگ پر مر رہا ہوں۔ خالدؓ نے ادب کی وجہ سے اس طرح بچ جانے کے اور معنے لئے۔ انہوں نے سمجھا کہ شاید میں بدقسمت ہوں کہ مجھے باوجود کوشش کے شہادت کا رتبہ نہ مل سکا۔ لیکن ان کے دوست کی جگہ اگر میں ہوتا تو یہ کہتا کہ خالدؓ یہ کتنا بڑا معجزہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کی جان تو خدا تعالیٰ نے ایک دفعہ بچائی لیکن تمہیں خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی برکت سے ہزاروں دفعہ موت سے بچایا۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ بہت سے ایسے واقعات پیش آئے ہیں جبکہ خدا تعالیٰ کی خاطر آپؐ نے قربانی کی اور آپ کی قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کوئی کم نہ تھی بلکہ زیادہ تھی۔ پس سوال یہ ہے کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی سے زیادہ تھی تو پھر آپؐ کی قربانی کی وجہ سے ہم کیوں عید نہیں مناتے بیشک عید الفطر محمدی عید ہے۔ اسلام سے قبل یہ عید عربوں میں نہیں منائی جاتی تھی عربوں میں صرف عید الاضحیہ رائج تھی۔ لیکن یہ عید محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کسی قربانی کی خوشی میں نہیں منائی جاتی

حالانکہ آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کم نہیں تھے اس لئے ہمیں یہ سوچنا پڑے گا کہ ایسا کیوں ہُوا ۔ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک قربانی کی وجہ سے تو عید مناتے ہیں لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی قربانی کی وجہ سے عید نہیں مناتے۔ لازمًا ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اگر مسلمان عید مناتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی شامل ہوں ورنہ آپ کی قربانی ایثار اور جو کام آپ نے کیا۔ اور جو عملی نمونہ آپ نے دکھایا، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کم نہیں تھا بلکہ بہت زیادہ تھا۔ آج اس سوال کا جواب میں دیتا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی وجہ سے ہم یہ عید کیوں مناتے ہیں۔ اور ہمارے اس عید کے منانے پر وہ شبہات کس طرح وارد نہیں ہوتے جو میں نے وارد کئے ہیں۔ اس شبہ کا ازالہ کرنے کے لئے ہم بائیبل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ بائیبل میں لکھا ہے کہ اللہ تعالٰے نے کہا۔ اے ابراہیم تو اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کر (ہمارے نزدیک اکلوتے بیٹے سے مراد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں عیسائیوں کے نزدیک حضرت اسحٰق علیہ السلام ہیں) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بات کا اپنے بیٹے سے ذکر کیا اور اسے راضی پاکر ساتھ لے گئے۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور اُلٹا لٹا دیا۔ اور چھری نکالی تا اُسے خدائی حکم کے مطابق ذبح کریں لیکن بجائے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ایک دنبہ ان کے سامنے پیش کیا گیا اور انہوں نے اسے ذبح کر دیا۔ اس طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بچ گئے۔ جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے قربانی کا اعلیٰ نمونہ دکھایا۔ یا بقول بائیبل حضرت اسحاق علیہ السلام نے قربانی کا اعلیٰ نمونہ دکھایا تو اللہ تعالٰے نے کہا: اے ابراہیم! تو نے میری خاطر اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کیا ۔ دیکھ میں تیری ذرّیت کو بڑھاؤں گا۔ اور اسے پھیلاؤں گا جیسے ستارے نہیں گنے جاسکتے اسی طرح تیری ذرّیت بھی نہیں گنی جاسکے گی۔ پھیلنے کے معنے غالب طور پر پھیلنے کے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ کسی کا ایک بیٹا امریکہ چلا جائے، ایک افریقہ چلا جائے تو کہیں اس کی نسل پھیل گئی۔ پھیلنے کے تو یہ معنے ہُوا کرتے ہیں کہ وہ قوم غلبہ یا بمنزلہ غلبہ حیثیت رکھتی ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ابراہیمی نسل حضرت اسحٰق علیہ السلام کے ذریعہ تمام دنیا میں نہیں پھیل سکتی تھی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جن کی طرف " اکلوتا بیٹا" کے الفاظ اشارہ کرتے ہیں۔ ان کی نسل بھی تمام دنیا میں نہیں پھیل سکتی تھی، عملاً بھی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل عرب میں ہی محدود رہی۔ اس کے پھیلنے کا وقت تب آیا جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ظاہر ہوئے۔ اور آپ نے فرمایا۔ مجھے سیاہ و سفید، سُرخ اور زرد سب ہی کی طرف مبعوث کیا گیا ہے مجھے عربوں کی طرف بھی مبعوث کیا گیا ہے اور مجھے عجمیوں کی طرف بھی مبعوث کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالٰے نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

مخاطب کر کے فرمایا ہے :۔ اے محمد (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو کہدے ۔ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا ۔ کہ میں تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں ۔ خواہ وہ کسی ملک کے ہوں ، خواہ وہ کوئی زبان بولتے ہوں ، تمام روئے زمین پر بسنے والوں کی طرف مجھے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے ۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جو تمام دنیا سے منقطع تھا ۔ وہ تمدن کے لحاظ سے بھی کمزور تھا ۔ وہ علمی لحاظ سے بھی کمزور تھا ، وہ سیاسی لحاظ سے بھی کمزور تھا اس کمزور ترین ملک میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک کمزور ترین انسان تھے لیکن خدا تعالےٰ نے آپ کو پہلے اس ملک میں غلبہ عطا فرمایا پھر پیشگوئی کے مطابق آپؐ کو ابیض واسود ، احمر واصفر سب میں ہی قبولیت بخشی گئی ہے ۔ آپ کا دین مختلف قوموں میں پھیلنا شروع ہوا ۔ یہاں تک کہ وہ دنیا کے کناروں تک پھیل گیا ۔ چین میں کروڑوں مسلمان ہیں ، انڈونیشیا میں نوّے فیصدی مسلمان ہیں ، انڈین یونین میں پچیس تیس فیصدی مسلمان ہیں ۔ پھر افغانستان ، ایران ، برما ، شام فلسطین ، ایبے سینیا ، وسطی افریقہ ، شمالی وجنوبی افریقہ مغربی ومشرقی افریقہ ، امریکہ ، ایشیا اور یورپ کے بہت سے علاقوں میں لاکھوں کروڑوں مسلمان پائے جاتے ہیں ۔ پس آج ایک مسلمان اگر عید الاضحیہ مناتا ہے تو اس لئے نہیں کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو خدا تعالےٰ نے بچا لیا یا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بے ایمانی کا نمونہ نہیں دکھایا اور الٰہی حکم کے مطابق وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے پر تیار ہو گئے بلکہ مسلمان جب عید کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں تو وہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق خدا تعالےٰ کی یہ پیشگوئی کہ ستارے گنے جا سکیں گے لیکن تیری اولاد نہیں گنی جا سکے گی ۔ پوری ہو گئی ہے ۔ وہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ پیشگوئی دراصل محمدی پیشگوئی تھی اور ابراہیمی نسل کے پھیلنے کا وقت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا زمانہ تھا ۔ پس یہ عید بے شک حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی یادگار ہے ۔ لیکن یہ اس بات کی شہادت ہے کہ چار ہزار سال قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام پر خدا تعالےٰ کا جو کلام نازل ہوا تھا وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق تھا اور آپؐ ہی کے ذریعہ پورا ہوا ۔ اس عید کے ذریعہ ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ اب ابراہیمی نسل وہ نہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے نطفہ سے پیدا ہوئی ۔ بلکہ ابراہیمی نسل وہ لوگ ہیں جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے ۔ آج ہم اس لئے جمع ہوئے ہیں تا اس بات کا اعلان کریں کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روحانی اولاد ہیں اور ان پر نازل شدہ خدا تعالیٰ کے کلام کو پورا کرنے والے ہیں ۔ ہم آج جمع ہو کر اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ کلام جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر مکّہ میں بھی نہیں بلکہ فلسطین کے جنوبی اور عرب کے شمالی حصہ میں ایک ریگستان

اور کم آبادی والی جگہ میں نازل ہوا ۔ اور ایک ایسے شخص پر نازل ہوا جو اپنی قوم اور ملک سے نکال دیا گیا تھا جس کی ساری مالی حیثیت چند گائے اور بکریاں تھیں۔ اور افراد کے لحاظ سے اس کا خاندان اسکے ایک بھتیجے کو ملا کر پندرہ بیس افراد پر مشتمل تھا۔ وہ جب اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنے پر تیار ہوا تو خدا تعالیٰ نے کہا میں تیری اولاد کو دنیا کے کناروں تک پھیلاؤں گا۔ اور تیری نسل کو اس قدر ترقی دوں گا کہ ستارے گنے جا سکیں گے مگر تیری اولاد نہیں گنی جا سکے گی۔ یہ بات حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق ہی کہی گئی تھی۔ جس کی نسل کے پھیلنے کے ذرائع موجود نہیں تھے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی نسل بھی دنیا میں پھیلی لیکن ان کے پاس طاقت تھی جس کے زور پر وہ پھیلی۔ یہودیوں کو ابتداء میں ہی حکومت مل گئی تھی لیکن حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل عرب میں ہی محدود رہی اور تہذیب اور ان قوتوں سے جن سے قومیں ترقی کیا کرتی ہیں منقطع رہی۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بنی اسمٰعیل میں پھر دینی روح پیدا ہوئی۔ وہ دنیوی طاقت کی وجہ سے نہیں، دینی طاقت کے زور پر دنیا میں پھیلے۔ جہاں جہاں بنی اسرائیل پھیلے ہیں، دنیوی طاقت کے زور سے پھیلے ہیں اور ان کا پھیلنا نسلی لحاظ سے پھیلنا کہلا سکتا ہے۔ لیکن یہ پھیلنا کوئی پھیلنا نہیں کیونکہ آخر ہر قوم کے بیٹے ہوتے ہیں۔ اور وہ کچھ نہ کچھ پھیلتی ہے۔ ہاں غیر قوم کے بیٹوں کو چھین کر لے آنا اور اپنی نسل بنا لینا ایک نشان ہوتا ہے۔ اس لئے یہ پیشگوئی بنی اسحٰق کے حق میں پوری نہیں ہوتی کیونکہ وہ نسلی لحاظ سے پھیلے ہیں لیکن اس کے مقابل پر بنی اسمٰعیل بھی دنیا میں پھیلے ہیں مگر انہوں نے جو ترقی کی ہے وہ اس طرح کی ہے کہ ان میں سے زیادہ تعداد دوسروں کے گھروں سے چھین کر لائی گئی ہے۔ ہم مغل ہیں کیا ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صلبی اولاد ہیں؟ ہم جب اپنے بزرگوں بانو خانؒ اور قبلائی خاںؒ کے نام لیتے ہیں تو ان کے لئے کچھ نہ کچھ اعزاز کا جذبہ ہمارے اندر ضرور پیدا ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے اچھی حکومتیں کی ہیں لیکن چنگیز خاںؒ اور ہلاکو خاںؒ وغیرہ کا نام آنے پر جذبۂ نفرت پیدا ہوتا ہے حالانکہ وہ بھی ہماری قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر پر جو جذبۂ اکرام پیدا ہوتا ہے اور آپ کے ذکر سے جو گدگدی ہمارے دلوں میں ہوتی ہے وہ اپنے آباء و اجداد کے ذکر پر نہیں ہوتی۔ ہمیں روحانی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم اتفاقی طور پر مغلوں کے ہاں پیدا ہو گئے ہیں ورنہ ہم ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد مغل ہمیں چرا کر لے گئے تھے۔ اسی طرح ہر قوم کا مسلمان خواہ وہ جاٹ ہو یا راجپوت مغل ہو یا پٹھان یورپین ہو یا ایرانی بلکہ خواہ وہ یہودیوں میں سے ہی کیوں نہ آیا ہو۔ اسے اپنے آباء و اجداد کے ذکر پر وہ جوش نہیں آتا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذکر پر آتا ہے۔ پس درحقیقت یہ کہنا چاہیئے کہ حضرت اسماعیلؑ کی نسل

دنیا کے کناروں تک پھیل گئی۔ دوسرے لوگوں نے اپنی اولادیں حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے گھر میں پھینک دیں اور وہ ان کی اولادیں نہ رہیں بلکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی روحانی اولادیں بن گئیں لیکن یہ ہوا کس کے ذریعہ۔ یہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ ہوا۔ پس جب ہم عید مناتے ہیں تو اس پرانے واقعہ کی وجہ سے نہیں مناتے بلکہ اس بات کے اظہار کے لئے مناتے ہیں کہ ہمارا خدا زندہ ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ ہیں۔ اور ہم جو آپ کی روحانی اولاد ہیں زندہ ہیں۔ ہم اس موقعہ پر جمع ہو کر اور اپنے آپ کو ابراہیمی اولاد کے طور پر پیش کر کے دنیا سے کہتے ہیں کہ دیکھو ستارے گِنے جا سکتے ہیں مگر ابراہیمی نسل نہیں گنی جا سکتی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے فلسطین کے جنوب میں واقع ایک ریگستان میں ایک ایسے شخص پر جس کی کل جائداد چند بکریاں اور چند گائیں تھیں، اس کا خاندان پندرہ بیس افراد پر مشتمل تھا، خدا تعالےٰ کا کلام نازل ہوا کہ جو چار ہزار سال کے بعد محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ شاندار رنگ میں پورا ہوا، ہم آج ربوہ میں جو سینکڑوں سال (جہاں تک اس جگہ کی تاریخ بتاتی ہے) آباد نہیں ہوا۔ جہاں پانی بھی مشکل سے ملتا تھا، جمع ہوئے ہیں اور اس بات کا اظہار کر رہے ہیں کہ جو بات آج سے چار ہزار سال قبل خدا تعالےٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہی تھی، وہ ہمارے ذریعہ سے پوری ہو رہی ہے ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے اسمٰعیلؑ اور ابراہیمؑ کی اولاد ہیں اور عرب سے ہزاروں میل دُور غیر زبانیں بولتے ہوئے ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ مَیں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا اور ستاروں کا گننا ممکن ہو گا مگر تیری اولاد کا گننا ممکن نہ ہو گا۔ ہماری طرح اور لاکھوں جگہ پر مسلمان جمع ہو کر اس بات کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں کہ خدا تعالےٰ کا یہ کلام کہ مَیں تیری نسل کو بڑھاؤں گا اور اتنا بڑھاؤں گا کہ تارے گنے جا سکیں گے مگر تیری نسل گنی نہیں جا سکے گی۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ شاندار طور پر پورا ہوا ہے۔ سو ہم یہاں اس لئے جمع نہیں ہوئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے الٰہی حکم کے مطابق اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی پیش کی۔ ہم اس لئے یہاں جمع نہیں ہوئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کمزوریٔ ایمان کا نمونہ نہیں دکھایا۔ ہم اس لئے یہاں جمع نہیں ہوئے کہ خدا تعالےٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بچا لیا۔ بلکہ اس لئے جمع ہوئے ہیں تا اس بات کا اظہار کریں کہ یہ معجزانہ کلام جو خاص شان رکھتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق تھا اور انہیں کے ذریعہ سے پورا ہوا اور ہم اس کے زندہ گواہ ہیں۔

پس جہاں بھی یہ عید منائی جاتی ہے، گویا وہاں یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ابراہیمی نسل حضرت

اسحٰق علیہ السلام کے ذریعہ نہیں پھیلی بلکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بیٹے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے پھیلی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ ہمارا یہ دعویٰ غلط ہے، یہ پیشگوئی بنو اسحٰق کے حق میں حضرت مسیحؑ کے ذریعہ سے پوری ہوئی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ درست ہوتا تو بنو اسحٰق اس واقعہ کی یاد میں کوئی عید مناتے مگر ایسا نہیں ہے۔ صرف مسلمان ہی اس گذشتہ واقعہ کی یاد کو تازہ رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے ذریعہ ابراہیمی نسل پھیلی ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ کہ مسیح علیہ السلام نے اس عہد کو قائم کیا ہے اور اب ساری دنیا کے مسلمان یہ عید مناتے ہیں نہ کہ مسیحی یا یہودی، اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے بھی عید الاضحیہ عربوں میں منائی جاتی تھی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مبعوث ہونے پر اس پیشگوئی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اسے عالمگیر بنا دیا۔ اس لئے کہ پہلے صرف عرب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد تھے لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعویٰ کے بعد آپ پر ایمان لانے والے سب لوگ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں شامل ہو گئے اور پیشگوئی پورا ہونے کا وقت آگیا ہے۔ پھر جہاں ہم یہ عید منا کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کا ایک ثبوت ہم پہنچاتے ہیں۔ وہاں یہ عید اس طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ ہم تبلیغ کے ذریعہ ابراہیمی نسل کو اور بھی بڑھائیں۔ جتنی جتنی ہم تبلیغ کریں گے اور جتنے جتنے مقامات پر اسلام پھیلے گا اتنے ہی شاندار طور پر یہ پیشگوئی پوری ہو گی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی ابراہیم کہا گیا ہے[۵۱] اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں جہاں اس طرف اشارہ ہے کہ آپ کی نسل میں بھی اسمٰعیلی ہجرت کا نمونہ ملے گا، وہاں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ پیشگوئی آپ کے ذریعہ اور بھی شاندار طور پر پوری ہو گی۔ خدا تعالیٰ آپ سے اور آپ کی قوم سے تبلیغ کا کام لے گا اور تبلیغ کے ذریعہ ابراہیمی نسل کو دنیا میں پھیلائے گا۔ پس جب ہم اس عید کے لئے جمع ہوتے ہیں تو اس لئے جمع ہوتے ہیں تا اس نشان کا اظہار ہو اور ہم نئی روح کے ساتھ اٹھیں اور کوشش کریں کہ ابراہیمی نسل اور بھی پھیلے تا وہ نشان پہلے سے دُگنا تِگنا بلکہ ہزار گنا زیادہ شان سے ظاہر ہو اور ہم یہ کوشش کریں کہ اس جہان میں سوائے ابراہیمی نسل کے اور کوئی باقی نہ رہے۔"

(الفضل ۲۳ مئی ۱۹۵۰ء)

---

۵۱ سنن ابن ماجہ کتاب الاضاحی باب ثواب الاضحیۃ

۵۲ صلح حدیبیہ ۶ھ میں ہوئی۔ حدیبیہ ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ سے ۹ میل کے فاصلے پر ہے (تاریخ الخمیس جلد ۲ صفحہ ۱۷)

۵۳ - مرقاۃ شرح مشکوٰۃ (باب صلوٰۃ العیدین) جلد ۲ ص۲۵۲

۵۴ - اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ جلد ۲ ص۱۰۳ - تاریخ الخمیس جلد ۲ ص۲۷۵

۵۵ - پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۳

۵۶ - پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۷

۵۷ - الاعراف ۷ : ۱۵۹ - تفسیر درمنثور جلد ۳ ص۱۳۵ - جلد ۵ ص۲۳۶ زیر آیت کریمہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سبا)

۵۸ - باتو خاں (وفات ۱۲۵۵ء) جوجی کا بڑا لڑکا اور چنگیز خاں کا پوتا، روس کا فاتح اور اردوئے مطلا (خانوادہ زریں) کا بانی تھا۔ اپنے ہمعصروں میں نیک دل خان کے نام سے مشہور تھا۔ بعض غیر جانبدار مورخین نے اسے بڑا انصاف پسند، نیک خصلت اور دانش مند بادشاہ قرار دیا ہے۔ طبقات ناصری میں لکھا ہے کہ وہ جنگ میں اپنے دشمنوں سے بڑا ظالمانہ سلوک کرتا تھا۔ مگر اپنی رعایا کے حق میں بڑا رحم دل تھا۔ اس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ در پردہ مسلمان تھا (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۱ ص۶۸۳) باتو خاں کے بعض اوصاف کی تفصیل کے لئے دیکھیں "تاتاریوں کی یلغار" - مؤلفہ ہیرلڈ لیم مترجمہ عزیز احمد ص۲۲۷ تا ص۲۳۱

۵۹ - قبلائی خاں (وفات ۱۲۹۴ء) تولوئی کا بیٹا۔ چنگیز خاں کا پوتا اور چین کا فاتح تھا۔ چین کی تاریخ میں قبلائی کے خاندان کو یوآن (بیرونی) خاندان کہتے ہیں۔ اس کے عہد میں رفاہ عامہ کی طرف توجہ دی گئی چنانچہ سڑکوں اور ڈاک کا انتظام کیا گیا۔ یتیموں اور بوڑھے عالموں کے لئے وظیفے مقرر ہوئے بیماروں کے لئے ہسپتال بن گئے۔ ملکی نظم و نسق میں مسلمان ناظموں اور مدبروں کا بہت عمل دخل تھا (انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم جلد ۲ ص۲۳۵)

۶۰ - چنگیز خاں (۱۱۶۲ - ۱۲۲۷ء) کا آبائی نام تموجین تھا۔ اس نے تاتاریوں کے متفرق گروہوں کو متحد کر کے ایک خوفناک طاقت بنا دیا۔ اور خود چنگیز خاں (نہایت عظیم الشان) کا لقب اختیار کیا۔ اس کے ماتحت منگول کی فتوحات کا سلسلہ دور دور تک پہنچ گیا۔ چنگیز خاں نے دنیائے اسلام کے اکثر بڑے بڑے شہر برباد کر ڈالے (انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم جلد اوّل ص۵۲)

۶۱ - ہلاکو خاں (وفات ۱۲۶۴ء) چنگیز خاں کے بیٹے تولوئی کا تیسرا لڑکا تھا۔ اس نے ایران کو فتح کر کے ایل خانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ۱۲۵۸ء میں ہلاکو نے بغداد پر حملہ کیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ عباسی خاندان کے آخری خلیفہ معتصم باللہ کو قتل کرا دیا۔ بے شمار لوگ مارے گئے۔ صدیوں کی جمع کی ہوئی دولت تاتاریوں نے لوٹ لی۔ بڑے بڑے کتب خانے نذر آتش کر دیئے گئے۔ درسگاہیں ویران ہوگئیں۔ علم و فضل اور جاہ و حشمت کا یہ سب سے بڑا اسلامی مرکز کھنڈرات بن کر رہ گیا۔ (انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم جلد اوّل ص۵۳)

۶۲ - تذکرہ ایڈیشن سوم ص۷۹، ص۳۳۱، ص۳۷۷۔

۳۹

(فرمودہ ۲۳ ستمبر ۱۹۵۰ء بمقام تعلیم الاسلام کالج لاہور)

وہ دوست جو اخبار پڑھنے کے عادی ہیں ان کو معلوم ہوگا کہ مجھے ڈیڑھ مہینہ سے شدید کھانسی ہے، راستہ کی گرد کی وجہ سے یہ شکایت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اور پھر چونکہ یہاں کئی دن بارش رہی اور اس کی وجہ سے کمرے نم آلود تھے اس نمی نے اور بھی زیادہ کھانسی کے بڑھانے میں مدد دی ہے، اس لئے نہ تو میں اونچا بول سکتا ہوں اور نہ لمبا بول سکتا ہوں۔ بہرحال عید کے بعد خطبہ پڑھنا سنت[1] ہے۔ اس لئے خطبہ تو میں پڑھوں گا لیکن بجائے کسی ایک مضمون کے میں ایک دو چھوٹی چھوٹی باتیں بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میں پہلے ربوہ میں سُنا کرتا تھا لیکن کل میں نے دیکھا تو نہیں، ہاں میں نے اپنے کانوں سے سُنا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہاں لاہور میں دو جمعے ہوتے ہیں، ایک مسجد میں اور ایک رتن باغ میں۔ مجھے اس بات کو دیکھکر نہایت تعجب ہوا کیونکہ شریعت کا مسئلہ یہ ہے کہ ایک شہر میں ایک ہی جمعہ ہو[2]۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ چوہدری قسم کے لوگ رتن باغ میں اکٹھے ہو جاتے ہیں اور غریب مسجد میں چلے جاتے ہیں۔ شاید میرے کچھ دن یہاں رہنے کی وجہ سے رتن باغ کو ان کی نگاہ میں وہ فضیلت حاصل ہو گئی ہے جو خانہ کعبہ کو اللہ تعالیٰ کا گھر ہونے کی وجہ سے حاصل ہے۔ یہ دین کے ساتھ تمسخر ہے اور مومن کے لئے ایسا کرنا ہرگز جائز نہیں۔ اگر تم نے جمعہ کی مشق ہی کرنی ہے تو ہفتہ یا اتوار کے کسی دن اکٹھے ہو کر جمعہ کی مشق کر لیا کرو، دین کو تمسخر بنانا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں قادیان میں دو جمعے ہوتے تھے[3] یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ ممکن ہے یہ دلیل دی جائے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں قادیان میں تو دو جمعے ہوتے رہے ہیں۔ پھر ہمیں روکا کیوں جاتا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اس کی ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ ان دنوں ملک میں شدید طاعون پھیلا ہوا تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الہامات اور آپ کی پیشگوئیوں کے مطابق مسجد مبارک اور اس کے اردگرد کا حلقہ زیادہ تر طاعون سے محفوظ رہا۔ لیکن مسجد اقصیٰ کے اردگرد چونکہ کثرت سے ہندو رہتے تھے۔ ان میں طاعون پھوٹی اور ان میں سے اکثر ہلاک ہو گئے۔ اور چونکہ مسئلہ یہ ہے کہ جہاں طاعون پھیلی ہوئی ہو وہاں کے لوگ دوسرے علاقوں میں نہ جائیں اور دوسرے علاقوں کے لوگ طاعون زدہ علاقہ میں نہ آئیں[4]۔ اس لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں مسجد مبارک

میں الگ جمعہ ہوتا رہا اور مسجد اقصےٰ میں الگ۔ مسجد اقصےٰ میں وہ لوگ جو اس مسجد کے ارد گرد رہتے تھے اور وہ لوگ جن کے علاقہ میں طاعون پھیلی ہوئی تھی اکٹھے ہو جاتے تھے۔ اور مسجد مبارک میں وہ لوگ جمع ہو جاتے تھے جو طاعون سے محفوظ تھے۔ پس یہ شریعت کا حکم تھا جس کے ماتحت دو جمعے ہوتے تھے کسی بندے نے یہ حکم نہیں بنایا تھا۔ لیکن رتن باغ میں جمعہ کی نماز الگ پڑھنا بندوں کی خالص اپنی ایجاد ہے۔ مَیں ربوہ میں سُن سُنکر سمجھتا تھا کہ شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہو مگر یہاں آکر معلوم ہؤا کہ یہ بات درست ہے۔ یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے قرآن کریم میں چند لوگوں کے متعلق ذکر آتا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک علیحدہ مسجد بنائی تھی۔ جس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حکم دیا کہ اس مسجد کو گرا کر مزبلہ یعنے مَیلے کے ڈھیر بنا دیا جائے۔ جسے ہمارے ہاں رُوڑی کہتے ہیں۔ چنانچہ صحابہؓ نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے مسجد گرادی اور وہاں رُوڑی کا ڈھیر بنا دیا جہاں لوگ گند پھینکا کرتے تھے۔

پس یہ نہایت ہی مکروہ اور ناپسندیدہ بات ہے اور دین میں تفرقہ اور انشقاق پیدا کرنے والی چیز ہے۔ مَیں حیران ہوں کہ باقی جماعت کے لوگوں نے اس کے خلاف کیوں احتجاج نہ کیا یہاں ہمارے مولوی صاحب جو مقامی مبلغ ہیں رہتے ہیں، مولوی کے معنے ہوتے ہیں ایسا شخص جو شریعت کے مسائل جانتا ہو۔ انہیں سختی سے اس بات کا اظہار کرنا چاہیئے تھا کہ یہ جائز نہیں، تم مسجد میں آؤ اور سب کے ساتھ مل کر جمعہ کی نماز ادا کرو۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جیل روڈ اور بھاٹی دروازہ کے آدمی تو مسجد میں جمعہ پڑھنے کے لئے جائیں اور رتن باغ جو بالکل قریب ہے وہاں کے لوگ الگ نماز پڑھ کریں۔ آئندہ جو یہاں کے مبلغ ہیں انہیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کا کام صرف اتنا ہی نہیں کہ خطبہ پڑھا دیا یا کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا تو وہ بتلا دیا۔ بلکہ تعلیم و تربیت بھی ان کا کام ہے۔ جب وہ دیکھیں کہ کوئی کام دین کے خلاف ہو رہا ہے تو ان کا فرض ہے کہ اس سے لوگوں کو روکیں۔ اور اگر لوگ پھر بھی نہ رکیں، خلیفۂ وقت کے پاس رپورٹ کی جائے۔

ایک زمانہ ایسا گذرا ہے کہ یہاں لاہور میں کئی جمعے ہوتے تھے اور وہ سب جمعے جائز ہوتے تھے کیونکہ دفاتر کو جمعہ کے دن چھٹی نہیں ملتی تھی۔ اور چونکہ جمعہ مقدم ہے۔ اس لئے ملازم پیشہ لوگ عموماً آدھ گھنٹہ کی چھٹی لے کر دفاتر کے قریب ہی کہیں جمع ہو کر نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ ایسے دو تین جمعے لاہور میں ہوتے تھے اور ہمیں کبھی اعتراض نہیں ہؤا۔ لیکن رتن باغ میں جمع ہونے والوں کو کونسی حکومت مجبور کرتی ہے کہ آدھ گھنٹہ کے اندر ہی نماز سے فارغ ہو کر واپس آجاؤ، صرف اپنی چوہدریت جتانے کے لئے وہ ایسا کرتے ہیں۔

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ تعالےٰ عنہ بعض دفعہ جب بیماری میں بیٹھے بیٹھے تھک جاتے تو فرماتے

اب دوست چلے جائیں۔ اس پر کچھ چلے جاتے اور کچھ بیٹھے رہتے۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد آپ پھر تنگ آ کر فرماتے کہ دوست چلے جائیں مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ اس پر پھر کچھ لوگ چلے جاتے اور کچھ بیٹھے رہتے۔ آخر تیسری دفعہ آپ فرماتے کہ اب چوہدری بھی چلے جائیں[۸] یعنی جو ہر دفعہ میرے کہنے کے یہ معنے لیتے ہیں کہ یہ حکم دوسروں کے لئے ہے، ہمارے لئے نہیں ہے، وہ بھی تشریف لیجائیں۔ اسی طرح یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ مسجد میں جمعہ پڑھنے کا حکم ہمارے لئے نہیں دوسروں کے لئے ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے حکم ساروں کے لئے ہوتے ہیں۔ ان احکام پر عمل کرنے کے لحاظ سے ایک بادشاہ بھی برابر ہے اور ایک چوڑھا بھی، ایک نبی بھی برابر ہے اور ایک عام مسلمان بھی۔ جو خدا تعالیٰ کے احکام ہوتے ہیں وہ سب کے لئے یکساں ہوتے ہیں۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم رات کے وقت کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تو بعض دفعہ آپؐ اتنی دیر تک کھڑے رہتے کہ آپؐ کے پاؤں متورم ہو جاتے[۹] جب آپؐ کی عمر بڑی ہو گئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ دیکھ کر تکلیف پہنچی۔ چنانچہ انہوں نے ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ اپنی جان کو اتنا دکھ میں کیوں ڈالتے ہیں۔ کیا خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ کے اگلے اور پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عائشہ! جب خدا تعالیٰ نے یہ بات میرے متعلق فرمائی ہے اور اس نے مجھ پر اتنا بڑا احسان فرمایا ہے کہ میرے اگلے پچھلے سب گناہ اس نے معاف کر دیئے ہیں تو کیا اس احسان کے بدلہ میں میرے لئے ضروری نہیں کہ میں پہلے سے بھی زیادہ عبادت کروں[۱۰]۔ اب دیکھو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تو اس کے یہ معنے لئے کہ آپ کو عبادت کم کرنی چاہیئے۔ لیکن آپ نے اس کے یہ معنے لئے کہ مجھے پہلے سے زیادہ عبادت کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ یہ ابتدائی زمانہ کی بات ہے۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چھوٹی عمر کی تھیں اور دین کی معرفت ان میں کم تھی۔ پھر حضرت عائشہؓ نے بھی وہی بات کی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی تھی۔ ایک وقت آیا جب ان کی معرفت بھی تیز ہو گئی۔ اور انہوں نے بالکل وہی طریقہ اختیار کیا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اختیار کیا تھا۔ صحابہؓ کا دستور تھا کہ وہ حضرت عائشہؓ کو دین کی خاص واقف اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاص بیویوں میں سے سمجھ کر اکثر تحائف وغیرہ بھیجا کرتے تھے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عادت تھی کہ جو کچھ روپیہ وغیرہ آتا اس کا اکثر حصہ صدقہ کر دیتیں۔ حضرت زبیرؓ کے چھوٹے بچے عبید اللہؓ نے جب یہ بات دیکھی تو چونکہ وہ آپ کے بھانجے تھے۔ انہیں خیال آیا کہ اگر خالہ نے اسی طرح اپنا تمام مال تقسیم کر دیا تو باقی رشتہ داروں اور قریبیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دفعہ کہہ دیا کہ لوگو تم عائشہؓ کو اس اسراف سے

روکتے کیوں نہیں۔ ان کے پاس جتنا روپیہ آتا ہے اس کا اکثر حصہ وہ تقسیم کر دیتی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ بات سُنی تو آپ نے فرمایا اس بھانجے کو آئندہ میرے گھر میں آنے کی اجازت نہیں ہوگی اور میں اسے معاف نہیں کروں گی، اگر کروں تو مجھ پر صدقہ لازم ہوگا۔ چنانچہ آپ نے اپنے بھانجے کو اپنے گھر آنے جانے میں منع کر دیا۔ صحابہؓ نے جب یہ بات دیکھی تو انہوں نے سمجھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان میں ایسا اختلاف پسندیدہ نہیں خصوصاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایسی مقبول اور محبوب بیوی کا اپنے بھانجے پر ناراض ہونا اچھا نہیں اور انہوں نے تجویز کی کہ کسی طرح حضرت عائشہؓ سے ان کے بھانجے کو معافی دلوائی جائے۔ چنانچہ ایک دن انہوں نے عبید اللہ کو اپنے ساتھ لیا۔ اور حضرت عائشہؓ کے دروازہ پر جا کر کہا کہ حضور ہم نے ایک بات کہنی ہے، اگر اجازت ہو تو ہم سب اندر آجائیں۔ حضرت عائشہؓ نے پردہ کھچوا دیا۔ اس زمانہ میں علیحدہ علیحدہ کمرے تو ہوتے نہیں تھے صحن میں پردہ لٹکا دیا جاتا تھا۔ جس کے ایک طرف مرد بیٹھ جاتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی پردہ لٹکا دیا، خود ایک طرف ہوگئیں۔ اور انہیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔ جب وہ اندر گئے تو عبید اللہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اجازت دیتے وقت کسی خاص شخص کا نام نہیں لیا تھا، یہی کہا تھا کہ سب آجائیں۔ انہوں نے عبید اللہ کو پہلے سمجھا رکھا تھا کہ جب ہم تجھے اندر پہنچا دیں تو پردہ اُٹھا کر خالہ سے چمٹ جانا اور کہنا کہ مجھے معاف کر دو۔ جب صحابہؓ پردہ کے ایک طرف بیٹھ گئے تو عبید اللہ نے دوڑ کر پردہ اُٹھایا اور خالہ سے چمٹ گئے اور کہنے لگے خالہ مجھے معاف کر دیں۔ مجھ سے سخت غلطی ہوئی ہے۔ ادھر سے صحابہؓ نے بھی سفارش کر دی کہ بچہ تھا اس سے غلطی ہوگئی ہے۔ آپ اسے معاف فرما دیں چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسے معاف فرما دیا۔ مگر اس کے بعد آپ کے پاس جو چیز بھی آتی آپ اسے صدقہ کے طور پر دیدیا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ کسی نے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتی ہیں تو آپ نے فرمایا۔ میں نے یہ عہد کیا تھا کہ اگر میں اپنے بھانجے کو معاف کروں گی تو کچھ صدقہ کروں گی۔ میں ڈرتی ہوں کہ اگر میں تھوڑا صدقہ کروں تو شاید وہ کچھ کی مقدار تک نہ پہنچے اور اللہ تعالیٰ مجھ پر ناراض ہو۔ اس لئے میرے پاس جو چیز بھی آتی ہے، میں صدقہ دے دیتی ہوں۔ اس طرح آپ نے اپنے بھانجے کو معاف بھی کر دیا اور صدقہ اس سے بھی زیادہ دینا شروع کر دیا جتنا وہ پہلے دیا کرتی تھیں۔ کیونکہ انہوں نے سمجھا کہ جب خدا نے مجھے اور میرے بھانجے کو ملا دیا ہے تو اب میرا فرض ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے شکر میں پہلے سے بھی زیادہ صدقہ دوں۔ گویا جو کچھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا وہی حضرت عائشہؓ نے کیا۔ مگر اس وقت جب ان کی معرفت زیادہ ترقی کر گئی۔

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب ہماری جماعت کو قائم ہوتے ساٹھ سال گذر

چکے ہیں۔ ساٹھ سال کا عرصہ کوئی معمولی عرصہ نہیں ہوتا۔پس ہمیں سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیئے کہ اتنے لمبے عرصہ میں ہم نے دنیا پر روحانی لحاظ سے غالب آنے کے لئے کیا کیا ہے۔ بے شک خدا تعالےٰ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ ہماری جماعت کو غالب کرے گا مگر یہ کبھی نہیں ہؤا کہ خدا تعالےٰ کسی دینی اور روحانی جماعت کو اشاعت دین کے لئے متواتر جدوجہد اور قربانیوں کے بغیر غلبہ عطا کر دے۔پس مَیں جماعت کو ایک دفعہ پھر ان کے فرائض کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔خصوصاً یہ عید کا دن ایسا ہے جس میں ہمیں وہ وعدہ یاد دلایا گیا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کیا تھا کہ مَیں تیری اولاد کو دنیا کے کناروں تک پھیلاؤں گا۔ ہم اس پیشگوئی کی یاد میں یہ دن مناتے ہیں۔مگر تعجب ہے ہم دنیا کے ایک کونے میں بیٹھے ہیں اور عید اس بات کی منا رہے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو ساری دنیا میں پھیلا دیا۔اگر یہ سچی بات ہے تو تم ہی حق پر ہو، اگر یہ سچی بات ہے کہ خدا تعالےٰ کے دین کو ماننے کی تمہیں ہی توفیق ملی ہے تو تمہیں سوچنا چاہیئے کہ تم کس طرح خوش ہو کر یہ کہہ سکتے ہو کہ خدا تعالےٰ نے ابراہیم علیہ السّلام کی پیشگوئی پوری کر دی۔

اگر تم دنیا کے ایک کونے میں بیٹھے ہو تو خدا تعالےٰ نے ابراہیمؑ کی پیشگوئی پوری نہیں کی بلکہ اس کے پورے ہوتے ہوتے اس میں روک پیدا کر دی اور یا پھر تمہیں ماننا پڑے گا کہ تمہارے علاوہ بھی کچھ جماعتیں ایسی ہیں جو خدا تعالےٰ سے تعلق رکھتی ہیں اور چونکہ وہ دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اس لئے ابراہیمؑ کی پیشگوئی پوری ہو رہی ہے۔ ایک طرف تمہارا یہ دعویٰ کرنا کہ خدا تعالیٰ کی رضا تم سے وابستہ ہے اور دوسری طرف تمہارا ابراہیمؑ کی پیشگوئی کے پورا ہونے پر خوش ہونا حالانکہ تم دنیا کے ایک کونے میں سمٹے بیٹھے ہو آپس میں کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔جب قانونی طور پر بنی نوع انسان کو خدا تعالےٰ کی رضا اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب وہ احمدی جماعت میں داخل ہو جائیں تو ابراہیمؑ کی پیشگوئی بھی اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے جب تم دنیا کے کونے کونے میں پھیل جاؤ۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالےٰ یہ اختیار رکھتا ہے کہ وہ جس کو چاہے بخش دے مگر یہ استثناء ہے اور استثناء اور قانون میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ایک شخص اگر اپنے دوستوں کی دعوت کرتا ہے تو بعض دفعہ وہ کسی فقیر کو بھی کھانا کھلا دیتا ہے۔مگر اس کا فقیر کو کھانا کھلانا ایک استثنائی رنگ رکھتا ہے۔اسی طرح ہم یہ نہیں کہتے کہ خدا تعالےٰ کسی اور کو بخش نہیں سکتا۔وہ استثنائی طور پر جس کو چاہے بخش دے مگر قانونی طور پر صرف خدائی جماعتوں کا ہی یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ شامل ہونے سے اللہ تعالےٰ کی رضا حاصل ہو سکتی ہے۔اگر کسی اور کو رضا حاصل ہوتی ہے تو وہ غیر قانونی اور استثنائی رنگ

رکھتی ہے جیسے آج ہی اخبارات میں یہ اعلان ہوا ہے کہ آسٹریلیا کی پارلیمنٹ میں پاکستان کے ایک ممبر کو بھی بیٹھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اور یہ تیسری مثال ہے جبکہ آسٹریلیا کی پارلیمنٹ میں ایک غیر ممبر کو بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔ اب دیکھو پارلیمنٹ میں ایک غیر ممبر کا بیٹھنا ممکن تو ہوگیا۔ کیونکہ دو پہلے بیٹھ چکے تھے ایک یہ بیٹھ گیا مگر اس کو قانون نہیں کہا جا سکتا۔ قانونی طور پر صرف پارلیمنٹ کا ممبر ہی پارلیمنٹ میں بیٹھ سکتا ہے اور اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ بلکہ اگر کوئی روکے تو اس پر مقدمہ چل جاتا ہے۔ عدالتیں بھی سیاسی مقدمات میں ایسے آدمی کی گرفتاری کو ناجائز سمجھتی ہیں ہاں اگر دیوانی یا فوجداری مقدمہ ہو جائے۔ تو پھر اور بات ہے۔ غرض قانونی طور پر ہماری جماعت کا ہی یہ دعویٰ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہے۔ باقی رہا استثنیٰ، سو استثنیٰ قانون کو توڑتا نہیں۔ ہم کہتے ہیں۔ وہ اختیار رکھتا ہے جس کو چاہے بخش دے۔ ہمارا دعویٰ صرف اتنا ہے۔ کہ ہم کو خدا تعالیٰ نے بخشش کے لئے قانون بخشا ہے۔ اور دوسرے لوگوں کو استثنا بخشا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے احکام کی اتباع کریں۔ تو لازمی طور پر ہم اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن دوسرے لوگ یہ نہیں کہہ سکتے وہ صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں بخش دے تو اس کا احسان ہے۔ بہرحال اگر یہ سچی بات ہے کہ صرف ہم لوگ ہی اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں پر چلنے والے ہیں۔ تو پھر ہمارے ذریعہ سے ابراہیمؑ کی نسل دُنیا میں پھیلی نہیں بلکہ وُہ سمٹ گئی ہے۔ کیونکہ کروڑوں کروڑ لوگوں کے متعلق ہم نے کہہ دیا کہ قانوناً وہ رضاءِ الٰہی کے مستحق نہیں پس ہمیں فکر کرنا چاہیئے کہ ہمیں خدا نے کس ابتلاء میں ڈال دیا کہ ایک عظیم الشان پیشگوئی جو دنیا کے کناروں تک ابراہیمی ذریّت کے پھیلنے کے ساتھ تعلق رکھتی تھی وہ ہماری وجہ سے سمٹ کر رہ گئی اور ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ اس پیشگوئی کے حلقہ کو ہم زیادہ سے زیادہ وسیع کریں۔ تاکہ کوئی شخص ہمیں یہ طعنہ نہ دے کہ تم نے آلِ ابراھیمؑ کو محدود کر دیا۔

یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اگر کوئی احمدی سوچے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کی راتوں کی نیند بھی اُڑ جائے۔ جب تک دنیا میں ان لوگوں کی اکثریت نہ ہو جائے جو اس قانون کے مطابق جس کو تم سچا سمجھتے ہو، اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے وارث ہوں اس وقت تک تم صحیح معنوں میں اپنے فرائض کو ادا کرنے والے نہیں سمجھے جا سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ تبلیغ اسلام صرف ہماری جماعت ہی کر رہی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ عیسائی اور دوسرے غیر مذاہب کے لوگ ہمارے ذریعہ سے ہی اسلام میں داخل ہو رہے ہیں اور اس طرح اپنی تائید میں ایک عقلی دلیل ہمیں حاصل ہے۔ مگر عقلی دلیل اور واقعاتی دلیل میں بڑا بھاری فرق ہوتا ہے عقلی طور پر بے شک ہم اسلام کو پھیلا رہے ہیں۔ لیکن اگر اسلام کو ہمارے ذریعہ سے غلبہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ ہماری آئندہ نسلیں اس کو

غالب کرنی ہیں تو ہماری خوشی ایسی ہی ہو گی جیسے گیدڑوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ رات کو اکٹھے ہوتے ہیں ۔ تو شور مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ پدرم سلطان بود ۔ ہمارا باپ بادشاہ تھا اس پر ایک گیدڑ آگے نکل کر انہیں کہتا ہے " تراچہ" کہ اگر تمہارا باپ بادشاہ تھا تو پھر تمہیں کیا ۔ گیدڑ تو اپنی پرانی بادشاہت یاد دلاتے ہیں ۔ ہم لوگوں کو اپنی آئندہ بادشاہت یاد دلا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک صدی کے بعد دیکھ لینا ، سب دنیا پر ہمارا ہی غلبہ ہو گا وہ کہتا ہے اوّل تو مجھے یقین ہی نہیں اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو پھر تراچہ ۔ تجھے کیا ۔ جن کے زمانہ میں جماعت پھیلے گی وہ فخر بھی کریں گے ۔ اور خوش بھی ہو لیں گے ، تمہیں کیا حق حاصل ہے کہ تم خوشیاں مناتے پھرو ۔ تمہارے ہاتھ سے تو پچھلی بادشاہت بھی گئی اور آئندہ کی بھی تمہیں امید نہیں ۔ مثل مشہور ہے کہ ایک شخص نے کسی سے کہا کہ دو آدمی حلوے اور مٹھائیوں کی سینیاں اٹھائے ہوئے آ رہے تھے ۔ وہ کہنے لگا پھر مجھے کیا ۔ اس نے کہا نہیں وہ تمہارے گھر کی طرف آ رہے تھے ۔ وہ کہنے لگا پھر تجھے کیا یعنی اگر وہ کہیں اور جا رہے تھے تو پھر مجھے کیا ۔ اور اگر وہ میری طرف آ رہے تھے تو پھر تجھے کیا ۔ کہ تو خوش ہو رہا ہے ۔ اگر تمہاری اولادوں نے ہی کامیاب ہونا ہے ۔ تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ تراچہ ۔ تم کو کیا ۔ تم کو تو تبھی خوشی ہو سکتی ہے جبکہ تم آنے والی کامیابی اور فتح میں خود حصّہ لو ۔ یہ کیا کہ گھروں میں آرام سے سوئے ہوئے ہو ۔ رات دن کے کاموں میں مشغول ہو ۔ سستی اور غفلت تمہارا پیچھا نہیں چھوڑتی اور آئندہ آنیوالی نسلوں نے جو فتح حاصل کرنی ہے اس پر تمہارا سر اونچا ہو رہا ہے اور تم خوشی سے جھوم رہے ہو ، آنے والے آئیں گے ۔ اور کامیابیاں حاصل کریں گے ، تو خوش بھی ہو لیں گے ، تمہارا کیا حق ہے کہ تم خوش ہوتے پھرو ۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو فتح اور کامیابی حاصل کی تھی اس پر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تو فخر کر سکتے تھے لیکن اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادے پردادے فخر کرتے کہ ہماری نسل میں سے ایک ایسا انسان پیدا ہو گا ۔ جو دنیا میں عظیم الشان کامیابی حاصل کرے گا تو ہر شخص انہیں یہی کہتا کہ تراچہ ۔ تمہیں کیا ۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جب دنیا میں آئیں گے اور فتح حاصل کر لیں گے تو خوشی بھی منا لیں گے ، تم کو کیا حق حاصل ہے کہ تم خوشی مناتے پھرو ۔ اسی طرح اگر تمہاری کامیابی نے بھی ڈیڑھ سو سال کے بعد آنا ہے اور تم نے اس کی بنیادیں بھی نہیں رکھیں تو پھر تمہیں کیا ، آنیوالے آئیں گے تو فخر بھی کر لیں گے ۔ پس اپنے حالات میں تبدیلی پیدا کرو ۔ تم میں سے بعض کی مثال اب اس شخص کی سی ہو گئی ہے ۔ جو افیون کھاتے کھاتے افیون کا عادی ہو جاتا ہے ۔ میں ایسے لوگوں سے کہتا ہوں کہ تمہیں اتنے وعظ سنائے گئے ہیں ، دنیا کی اور کسی قوم کو اتنے وعظ نہیں سنائے گئے مگر تم محض چکنا گھڑا ثابت ہوئے ہو تم نے بھی وعظ سنے مگر ان کا اثر قبول نہ کیا ۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا تعالیٰ نے سلطان القلم قرار دیا تھا۔[۱] اس کے مقابلہ میں اس نے مجھے اتنا بولنے کا موقع دیا کہ مجھے اس نے سلطان البیان بنا دیا۔

مگر نہ قلم نے تمہیں کوئی فائدہ دیا اور نہ بیان نے تمہیں کوئی فائدہ دیا۔ قلم نے لکھا اور اتنا لکھا کہ سو کتاب بن گئی۔ مگر اس کثرت نے بھی تمہارے لئے صرف اتنا ماحول پیدا کیا کہ ؎

شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا[۲]

کتابوں کی کثرت نے تمہیں قلم سے بالکل غافل کر دیا اور لکھنا نہ لکھنا تمہارے لئے مساوی ہو گئے۔ میں نے اتنی تقریریں کیں اور اتنے لیکچر دیئے کہ شاید دنیا میں اس کی بہت ہی کم مثال ملے گی لیکن میری تقریریں اور میرے بیانات بھی کچھ نہ کہنے کے مساوی ہو گئے۔ گویا تم میں سے بعض کی وہی حالت ہو گئی۔ سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ[۳]

دونوں باتیں تمہارے لئے برابر ہو گئیں۔ ڈرانا بھی اور نہ ڈرانا بھی۔ تمہارے لئے قلم بھی برابر ہو گئی اور بیان بھی برابر ہو گیا۔ قلم نے لکھا اور اتنا لکھا کہ تم نے کہدیا کہ قلم نے تو اب اتنا لکھدیا ہے کہ ہم سے پڑھا ہی نہیں جاتا۔ اور زبان نے اتنا بیان کیا اتنا بیان کیا کہ تم نے کہدیا ہم اب کس کس بات کو یاد رکھیں۔ ہم سے تو عمل ہی نہیں ہو سکتا۔ پس دونوں باتیں تمہارے لئے برابر ہو گئیں۔

یہ بڑے فکر کی بات ہے، یہ بڑے خطرہ کی بات ہے کئی ایسے ہوتے ہیں جو ایک بات سنتے ہیں اور نجات پا جاتے ہیں، وہ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں۔ اور کئی ایسے ہوتے ہیں جو بار بار سنتے ہیں اور نجات پا جاتے ہیں، وہ بھی خوش قسمت ہوتے ہیں۔ مگر وہ جن کے لئے اتنا لکھا گیا جس کی حد نہیں اور جن کے لئے اتنا کہا گیا جس کی حد نہیں اور پھر بھی ان میں تبدیلی پیدا نہ ہوئی، وہ خوش قسمت نہیں کہلا سکتے۔ دوسرا لفظ میں نہیں بولتا، اس لئے کہ میری زبان پر وہ گراں گذرتا ہے۔ بہرحال ابھی وقت ہے اپنے اندر تغیر پیدا کرو۔ زمانہ کے حالات بتا رہے ہیں کہ خدا کچھ کرنا چاہتا ہے۔ تمہارا فرض یہ ہے کہ تم اپنے اندر نیک تبدیلی پیدا کرو تا کہ جب خدائی تقدیر ظاہر ہو تو وہ تمہارے حق میں فیصلہ کرے۔ اگر تم اپنے اندر نیک تبدیلی پیدا کر لو تو دنیا تمہیں تباہ نہیں کر سکتی۔ سمندر میں تلاطم آئے گا اس کی موجیں اٹھیں گی اور لوگ سمجھیں گے کہ تم تباہ ہو گئے۔ مگر جب طوفان میں سکون پیدا ہو گا تو دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ جائے گی کہ تم سلامتی کے ساتھ کنارے پر کھڑے ہو اور لوگ تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکے۔

(الفضل ۹ مئی ۱۹۶۲ء)

۱؎ ۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ۔ مؤلفہ عبد الرحمٰن الجزیری جزء اوّل ص۳۵۳

۲؎ ۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ مؤلفہ عبد الرحمٰن الجزیری جزء اوّل ص۳۵۸

۳؎ ۔ حبیبؐ مؤلفہ حضرت مفتی محمد صادق صاحبؓ۔ ص۲۲

۴؎ ۔ جامع ترمذی کتاب الجنائز باب ماجاء فی کراھیۃ الفرار من الطاعون۔

۵؎ ۔ التوبہ ۹ : ۱۰۷

۶؎ ۔ تمام مستند تاریخی اور تفسیری کتب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مسجد ضرار کے گرانے اور جلانے کا حکم صادر فرمایا تھا

۷؎ ۔ تفسیر ابن جریر جلد ۱۱ ص۱۸

۸؎ ۔ یہ حضور رضی اللہ عنہ کی اپنی روایت ہے اور ظاہر ہے کہ اسے ایک مستند درجہ حاصل ہے۔

۹؎ ۔ صحیح بخاری کتاب التہجد باب قیام النبی صلے اللہ علیہ وسلم اللیل حتی ترماہ قدماہ

۱۰؎ ۔ جامع ترمذی شمائل النبی صلے اللہ علیہ وسلم باب ما جاء عبادۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۱۱؎ ۔ صحیح بخاری کتاب المناقب باب مناقب قریش، مستدرک حاکم جلد ۴ ص۷۳

۱۲؎ ۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب الہجرۃ

۱۳؎ ۔ پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۷-۱۸

۱۴؎ ۔ آسٹریلوی پارلیمنٹ میں مسٹر ویف ہارون سابق پاکستانی سفیر اس وقت ہائی کمشنر کو بیٹھنے کی اجازت دی گئی تھی (ڈان کراچی ۹ مئی ۱۹۸۱)

۱۵؎ ۔ انتخاب ضرب الامثال والحکم فارسی ص۸۳ مؤلفہ آقائے علی اکبر مطبوعہ اردو بازار ۱۹۵۸ء

۱۶؎ ۔ تذکرہ ایڈیشن سوم ص۴۰۸

۱۷؎ ۔

۱۸؎ ۔ البقرہ ۲ : ۷

(۴۰)

(فرمودہ ۱۴؍ ستمبر ۱۹۵۱ء* بمقام ربوہ)

آج میرا ارادہ تھا کہ ایک خاص مضمون کے متعلق خطبہ پڑھوں۔ عام طور پر تو یہی ہوتا ہے کہ مَیں بغیر کسی خیال کے خطبہ کے لئے آجاتا ہوں بعض دفعہ شاید ۴۰۔ ۵۰ یا سو میں سے ایک دفعہ خطبہ کے لئے آنے سے پہلے بھی مضمون ذہن میں آجاتا ہے اور کبھی کبھی اس بات کے لئے فکر کیا جاتا ہے کہ آجکل کے اہم مسائل میں سے کونسا مسئلہ خطبہ میں بیان کیا جائے۔ کل شام مجھے خیال آیا کہ عید الاضحیہ کا تعلق جو درود سے ہے اس پر عید کا خطبہ پڑھا جائے۔ چنانچہ اس بارہ میں کچھ سوچتا بھی رہا۔ رات کو مَیں نے ایک رؤیا دیکھا، مَیں نے دیکھا کہ مَیں کہیں سے آرہا ہوں وہ بازار ہے یا گلی ہے جہاں میں جارہا ہوں مَیں نے اس کے پہلو میں ایک مکان دیکھا جہاں مَیں جانا چاہتا ہوں معین صورت میں مجھے یاد نہیں کہ مَیں اس مکان میں کیوں جانا چاہتا ہوں۔ اس مکان کا جو دروازہ ہے وہ گلی یا بازار میں ذرا اونچا کرکے لگایا گیا ہے۔ وہ قریباً تین فٹ بازار یا گلی سے اونچا ہے۔ خواب میں مجھے یہ احساس ہے کہ میرے گھٹنے میں تکلیف ہورہی ہے، مَیں نے سہارا لیکر پتھر پر پاؤں رکھا ہے۔ آگے ایک کھلا میدان ہے اس کھلے میدان میں مَیں نے دیکھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ (آپ کی زیارت ایک عرصہ کے بعد اس خواب کے ذریعہ ہوئی) آپ نے داڑھی پر خضاب لگایا ہوا ہے وہی خضاب جو آپ سے منقول ہے[1]۔ اور مَیں بھی وہی لگاتا ہوں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس میں مہندی ذرا زیادہ ملایا کرتے تھے لیکن مَیں ذرا کم مہندی ملاتا ہوں۔ اس لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بالوں پر ذرا سُرخی رہ جاتی تھی، ویسی سُرخی جیسے وفات کے قریب جب آپ خضاب لگاتے تھے تو بالوں پر دکھائی دیتی تھی

---

* اس خطبہ کو الفضل میں اشاعت کے لئے بھجواتے وقت حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اپنے دستِ مبارک سے یہ نوٹ رقم فرمایا۔ جو اس خطبہ کی ابتداء میں درج ہے:۔

"یہ خطبہ نہایت لطیف اور ضروری تھا مگر خطبہ لکھنے والے ظالم نے اسے اس قدر مسخ کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس طرح کی خلافِ عقل باتیں لکھی ہیں کہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ لکھتے ہوئے اپنے حواس میں تھا یا نہیں۔ بہرحال تکلیف اٹھا کر جس قدر اصلاح کر سکا ہوں کرکے چھپوانے کے لئے بھجواتا ہوں۔" (مرتب)

آپ کا چہرہ روشن تھا، آپ پگڑی پہنے ہوئے تھے کوٹ پہنا ہوا تھا۔ بالکل ایسا کوٹ جیسا آپ اپنی زندگی میں پہنا کرتے تھے اور آپ چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے مَیں نے السلام علیکم کہا۔ آپ نے جواب دیا اور وعلیکم السلام فرمایا۔ مجھے خیال آیا کہ ذرا اور آگے جاؤں وہاں اور لوگ بھی بیٹھے ہیں میں ایک دو قدم ہی آگے چلا تھا کہ مَیں نے دیکھا وہاں لوہے کا ایک پلنگ رکھا ہوا ہے یہ پلنگ اسی طرف پڑا ہے جس طرف حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ پلنگ عام پلنگوں سے اونچا ہے اور چوڑا بھی ہے اور تار کے ساتھ بُنا ہوا ہے۔ اس پلنگ پر میاں جان محمد صاحب جو قادیان کے رہنے والے ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندان کا کام کرنے والے حجام خاندان میں سے ہیں۔ اور قادیان میں پوسٹ مینی کا کام کرتے تھے تشہد کی حالت میں نماز پڑھ رہے ہیں (ان کے بیٹے تجارت کا کام کرتے ہیں اور ان کے بھتیجے میاں محمد عبداللہ صاحب ربوہ میں حجام کا کام کرتے ہیں) باوجود اس کے کہ میاں جان محمد صاحب تشہد کی حالت میں نماز پڑھ رہے ہیں مجھے خیال آتا ہے کہ وہ بیمار ہیں اس لئے بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے انہوں نے سلام پھیرا اور مَیں آگے چلا گیا۔ میرا خیال ہے کہ مَیں آگے جس جگہ جانا چاہتا ہوں وہ کچھ فاصلہ پر ہے۔ وہ فاصلہ میلوں کا نہیں وہ فاصلہ فرلانگوں کا نہیں بلکہ بیس تیس گز کا ہے مَیں آگے چلا تو میں نے دیکھا کہ پاس ہی ایک کھلی جگہ ہے اور اس میں کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ان کرسیوں پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ملنے کے لئے آئے ہیں۔ میرے ذہن میں آتا ہے۔ کہ مَیں اسی جگہ کی طرف آرہا تھا۔ ان میں ایک نوجوان بھی ہے جس کی داڑھی منڈھی ہوئی ہے یا اس کی داڑھی ابھی نکلی ہی نہیں لیکن اس کی شکل ایسی ہے جیسے غیر احمدی نوجوانوں یا کمزور احمدیوں کی ہوتی ہے۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی جُوتا پہنکر میرے پیچھے چل پڑے ہیں جب آپ میرے قریب آئے تو آپ نے زور سے کچھ الفاظ دہرانے شروع کئے جو اس قسم کے تھے کہ کیا کا ہو مل گیا ستھوا مل گیا اور ایک تیسری چیز کا نام بھی لیا جو یاد نہیں رہا۔ آپ کے ان الفاظ کے جواب میں اس داڑھی منڈے شخص نے جسے اب مَیں کوئی طبیب خیال کرتا ہوں کہا کہ کاہو مل گیا اور ایک اور چیز کے بارہ میں کہا کہ وہ مل گئی ہے اور تیسری شے کے متعلق کہا اس کی تلاش ہے۔ مجھے کاہو اور ستھوا کا نام یاد رہا ہے۔ تیسری چیز بھول گیا ہوں شاید وہ کاسنی ہے یا کوئی اَور چیز مجھے اب یاد نہیں رہا۔ مجھے چونکہ اس وقت بہت خوشی تھی کہ میں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا ہے اس لئے اس خوشی سے آنکھ کھل گئی اور خواب پوری طرح یاد نہ رہا۔ یہ خواب ایسا واضح تھا کہ اب بھی جب مَیں اس خواب کو بیان کر رہا ہوں آپ کی شکل میرے سامنے پھر رہی ہے۔

کچھ دیر کے بعد میری آنکھ پھر لگ گئی۔ اور میں نے ایک اور رؤیا دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ہم ایک ایسے ہی گھر میں رہتے ہیں جس قسم کے گھر میں میں آجکل رہتا ہوں لیکن وہ گھر ذرا کھلا ہے اور خاندان کے کچھ لوگ وہاں جمع ہیں۔ وہاں ایک عورت ہے جس کی گود میں ایک بچہ ہے۔ اس بچہ کو دیکھتے ہی میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ وہ مولود احمد ہے جو میری لڑکی امۃ الحکیم اور سید داؤد مظفر کا لڑکا ہے۔ وہ اس عورت کی گود میں بیٹھا ہے میں نے اس بچہ کو دیکھا اور کہا۔ مولود احمد ہے؟ پھر میں نے کہا۔ کیا اس کی ماں بھی آئی ہے؟ اس عورت نے کہا۔ نہیں۔ اس کے معًابعد نظارہ بدلا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ مولود احمد بڑی عمر کا ہے اور وہ اس عورت کی گود سے اُتر گیا ہے اور دوڑتا ہوا میرے سامنے سے گذر رہا ہے۔

یہ دونوں نظارے جو میں نے دیکھے اُس وقت اُن کی تعبیر میرے ذہن میں نہیں آئی۔ صبح اُٹھ کر میں نے اتنا سمجھا کہ کاہو کھانسی نزلہ اور سوزش گلو کے علاج میں استعمال ہوتا ہے۔ اور بنفشہ بھی کھانسی اور حدتِ معدہ وغیرہ کے کام آتا ہے تیسری چیز بھی غالبًا اسی قسم کی ہوگی۔ اس حصہ کے متعلق صبح میرا ذہن اس طرف گیا کہ شاید جس طرح کی کھانسی کے دورے پچھلے سال مجھے ہوئے تھے اسی قسم کے دورے پھر مجھے ہوں۔

ہاں ایک بات میں بھول گیا گذشتہ سال جب میں کھانسی سے بیمار ہوا کراچی اور لاہور کے ڈاکٹر میرا علاج کرتے رہے لیکن کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ لیکن ایک دیسی نسخہ کے استعمال سے مجھے کافی فائدہ ہوا تھا۔ خواب میں میں سمجھتا ہوں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کھانسی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کو وہ نسخہ بتاؤں۔ لیکن ابھی میں یہ بات کہنے نہ پایا تھا۔ کہ میری آنکھ کھل گئی۔ صبح خیال ہے کہ شاید یہ نسخہ بھی کھانسی نزلہ اور سوزش گلو کے لئے بتایا گیا ہے لیکن زیادہ تر خیال یہ ہے کہ اس خواب کا تعلق جماعت سے ہے۔ جب یہ دیکھا جائے کہ امام کو کچھ تکلیف ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوا کرتی ہے کہ اس کے توابع کمزور ہیں۔ کھانسی ورم اور گلے کی سوزش کا تعلق بولنے سے ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں اس کی تعبیر یہ ہے کہ جماعت میں بولنے کی عادت ہوگئی ہے جس سے کھانسی ورم اور سوزشِ گلو پیدا ہوتی ہے اور عمل کی عادت کم ہوگئی ہے۔ اور خدا تعالےٰ نے اس کا علاج بنفشہ اور ایک اور چیز جس کا نام میں بھول گیا ہوں، بتایا ہے مطلب اس کا یہ ہے کہ کوئی ایسا علاج کیا جائے کہ جس سے سوزشِ گلو۔ بلغم اور کھانسی دُور ہو۔ ایک قسم کی گرمی مفید ہوتی ہے۔ انسان محنت کرتا ہے اور اس میں تیزی اور گرمی پیدا ہوتی ہے یہ گرمی اور تیزی مفید ہے لیکن ایک قسم کی گرمی بیکار ہوتی ہے۔ اس سے بلغم پیدا ہوتی ہے اور انسان تکلیف اُٹھاتا ہے کھانسی والی گرمی کے یہ معنے ہیں کہ طبائع میں ایک جوش پیدا ہوگیا ہے جس کا صحیح استعمال

نہ کرنے کی وجہ سے ایک بیکار قسم کی گرمی اور سوزش پیدا ہو گئی ہے یعنی محض باتیں کرنے، بڑے بڑے دعوے کرنے، بلاوجہ فخر کرنے اور یہ کہنے کی کہ ہم یوں کر دیں گے ہم دُوں کر دیں گے کی عادت پیدا ہو گئی ہے۔ جس کے نتیجہ میں بعض روحانی امراض مثلاً بلغم کا آنا۔ سوزش گلو کھانسی اور نزلہ پیدا ہو گئی ہیں۔ خواب میں یہ نظارہ دکھا کر خدا تعالیٰ اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ یہ عادت دور ہونی چاہیئے اور عمل کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیئے۔

میری طبیعت پر یہی اثر ہوتا رہتا ہے اور اس نظارہ کے دیکھنے کے بعد وہ اثر زیادہ نمایاں ہو گیا ہے کہ جماعت میں بولنے کی عادت زیادہ ہو گئی ہے اور عمل کی طرف توجہ بہت کم ہے۔ دو سال سے مَیں دیکھ رہا ہوں کہ احراری جماعت کے خلاف شرارتیں کر رہے ہیں۔ کہیں احمدیوں کو مارا جا رہا ہے، کہیں سے انہیں نکالا جا رہا ہے۔ کہیں ان کا منہ کالا کیا جا رہا ہے، کہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اور مجھے گالیاں دی جاتی ہیں۔ کہیں مکانوں پر نشان لگائے جاتے ہیں کہ کسی رات اچانک حملہ کر کے تمام احمدیوں کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن ہماری جماعت صرف ریزولیوشن لکھ کر الفضل کو بھیج دیتی ہے۔ اور الفضل بھی اسے جماعت احمدیہ میں غم و غصہ کی لہر کے عنوان سے شائع کر دیتا ہے۔ حالانکہ میں نے تو یہ غم و غصہ کی لہر جماعت میں کبھی نہیں دیکھی اور یُوں بھی مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا، کہ مَیں کوئی نئی سکیم سوچوں۔ کیونکہ جب تک جماعت میں کام کا احساس پیدا نہ ہو اور جماعت سنجیدگی سے قربانی کرنے کے لئے تیار نہ ہو اس کے لئے کوئی نئی سکیم سوچنے کا کیا فائدہ؟ جب احرار کا فتنہ ۱۹۳۴ء میں شروع ہوا، ایک دفعہ مَیں لاہور کا سفر کر رہا تھا، ایک جوشیلا نوجوان میرے ساتھ آیا۔ اس نے مجھے کہا، اب ہمیں گاندھی جی کی طرح کرنا چاہیئے۔ مَیں نے کہا۔ گاندھی تو فوراً مطلب کی بات دیکھ کر صلح کر لیتا ہے۔ کیا تم اپنے امام سے بھی یہی امید رکھتے ہو کہ کہیں ہمالیہ کی غلطی ہوئی کہیں بندصیا چل کی غلطی ہوئی، کہیں گنگا اور جمنا کی غلطی ہوئی اور پھر صلح کر لی۔ اگر اپنے امام کے لئے تم یہ اخلاق پسند کرتے ہو تو پھر تمہارا مشورہ بجا ہے۔ یا پھر یہ ہو کہ امام جنگ کے لئے کہے تو تمام جماعت تیار ہو جائے۔ پھر جنگ میں فتح ہو یا سب لوگ مارے جائیں۔ میں نے کہا، بتاؤ کیا ہے ہمت؟ اگر یہ ہو جائے کہ سارے مر جاؤ اور یا فتح حاصل کرو۔ تب تو تمہارا مشورہ مفید ہو سکتا ہے۔ ورنہ دوسروں میں سے اگر ۹۰ فیصدی لوگ بھی بھاگ جائیں تو ان کی عزت اور درجہ میں فرق نہیں آتا۔ لیکن ہماری جماعت کے دس فیصدی لوگ بھی بھاگ جائیں تو اس کی عزت اور درجہ قائم نہیں رہتا۔ جب تک یہ نہ ہو کہ مسلمان ۱۰۰ اکے ۱۰۰ ٹکڑے ہو جائیں اور پھر اگر ان کی تقدیر میں شکست لکھی ہے تو میدان سے ان کی ۱۰۰ کی ۱۰۰ نعشیں برآمد ہوں، اس وقت تک ہم اپنے آپ کو کامیاب خیال نہیں کر سکتے۔ اگر ظاہری طور پر شکست ہو جائے اور ۱۰۰

لڑنے والوں میں سے ۵۲ کی نعشیں میدان میں ملیں اور ایک کی نہ ملے اور وہ بھاگ جائے تو یہ بھی ہماری ذلت ہے۔ مومن کے معنے ہی یہ ہیں کہ وہ اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتا۔ اگر احراری احمدیوں کو مارتے ہیں تو صرف اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں ریزولیوشن پاس کرنے کی عادت ہوگئی ہے۔ یہ ریزولیوشن پاس کریں گے اور بیٹھ جائیں گے۔ جہانتک قانون شکنی کا سوال ہے۔ احمدیت اس سے روکتی ہے۔ لیکن کیا تم سمجھتے ہو کہ جہاں اسلام اور احمدیت نے قانون شکنی سے منع کیا ہے وہاں اس نے اس کا کوئی علاج نہیں بتایا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ انگریز آدھی دنیا پر حاکم تھے۔ جب پہلی جنگ ہوئی تو ان کی طاقت پوری طرح قائم تھی لیکن انہوں نے قادیان کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ ہم نے قانون شکنی نہیں کی تھی صرف الٰہی تدبیر سے کام لیا تھا۔ لیکن حکومت کو پارلیمنٹ میں اعلان کرنا پڑا کہ ہمیں احمدیوں کے متعلق کوئی شبہ نہیں کتنا تلخ گذرا ہوگا یہ لمحہ اس گورنر پر جس نے حکم دیا تھا کہ تم سے نقص امن کا خطرہ ہے۔ اس لئے فلاں دفعہ کے ماتحت تمہیں یہ نوٹس دیا جاتا ہے۔ اسے پارلیمنٹ کے سامنے بیان دینے کے لئے یہ ماننا پڑا کہ جماعت احمدیہ نہایت وفادار جماعت ہے۔ کتنے تلخ گھونٹ تھے جو اسے پینے پڑے مگر نہ ہم نے کسی کو مارا تھا نہ پیٹا تھا اور نہ قانون شکنی کی تھی۔ صرف جماعت میں اس وقت ارادۂ عمل تھا اور نظر آتا تھا کہ جماعت میں عمل کی قوت موجود ہے۔

اس وقت میں دیکھتا ہوں کہ جماعت میں وہ قوتِ عمل نہیں پائی جاتی جو اس وقت پائی جاتی تھی۔ اس لئے میں چپ ہوں۔ جب میں الفضل میں ریزولیوشن پڑھتا ہوں تو ہنستا ہوں کہ یہ غم و غصہ کی لہر کہاں سے آگئی جو الفضل کے ایڈیٹر کو نظر آگئی ہے۔ مان لیا کہ میری جسمانی نظر کمزور ہے اور میں عینک استعمال کرتا ہوں لیکن میری باطنی آنکھیں تو ان سے تیز ہیں مگر مجھے وہ غم و غصہ کی لہر نظر نہیں آتی۔ پھر غم کی لہر تو جائز ہے غصہ کی لہر اسلام میں بالکل جائز نہیں۔ مسلمان پر غصہ کی لہر نہیں آسکتی۔ غصہ کے معنے ہیں اس قدر غیظ ہونا کہ انسان کی عقل ماری جائے اور اس کا گلا گھٹنے لگ جائے۔ لیکن غضب جائز ہے۔ خدا تعالےٰ غضب کرتا ہے لیکن اسے غصہ نہیں آتا۔ کیونکہ جسے غصہ آتا ہے اس کی جان تنگ ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو مارنے پر تیار ہو جاتا ہے اور یہ چیز اسلام میں جائز نہیں۔ لیکن یہاں تو غم کی لہر بھی نظر نہیں آتی جیسے وہ پہلے تھے ویسے ہی اب ہیں۔ سیدھی بات ہے کہ اس وقت میں نے ۷۲ ہزار روپیہ مانگا تھا اور ایک لاکھ سات ہزار روپیہ کے وعدے آگئے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ دو لاکھ چالیس ہزار کے وعدوں میں سے نو ماہ میں صرف ایک لاکھ بیس ہزار کی رقم وصول ہوئی ہے۔ لیکن پہلے ایک لاکھ سات ہزار کے وعدوں میں سے سال میں ایک لاکھ دس ہزار روپیہ وصول ہو گیا تھا۔ یہ

صاف بتاتا ہے کہ جماعت میں جو جوش اُس وقت تھا اس وقت نہیں ہے۔ مَیں یہ نہیں کہہ سکتا کہ جماعت پر مُردنی چھائی ہوئی ہے۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ طبائع کے اندر سستی پیدا ہو رہی ہے ممکن ہے کہ یہ نیند کی قسم ہو اور اس کے بعد لوگ بیدار ہو جائیں اور کام کرنے لگ جائیں۔ اس لئے مَیں مایوس نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ کام کا وقت نہیں ہوتا جب لوگ سوئے ہوئے ہوں ہم انہیں اٹھائیں اور وہ پھر سو جائیں۔ پھر اٹھائیں اور وہ دوبارہ سو جائیں تو ہم ان سے کام نہیں لے سکتے۔ ہاں ہم مایوس بھی نہیں ہیں کیونکہ وہ بالکل مر نہیں گئے لیکن ایسا وقت کام کا وقت نہیں ہوتا۔ اس وقت اگر کوئی سکیم بنائی جائے تو یہ بیوقوفی اور حماقت کی علامت ہوگی لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ جب وہ جاگیں تو کوششوں کا موقعہ ہی جاتا رہے لیکن مَیں سمجھتا ہوں کہ اس کی تعبیر اس رنگ میں کی جا سکتی ہے (واللہ اعلم بالصواب) کہ جماعت میں جوش تو ہے لیکن وہ جوش غلط قسم کا اور بناوٹی ہے۔ وہ حقیقی قربانی جو اسلام پیش کرتا ہے۔ اور وہ گرمی جو صحت اور عمل کی علامت ہوا کرتی ہے۔ وہ جماعت میں نہیں پائی جاتی جیسے اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ مومنوں کو جنت میں زنجبیل کے پیالے پلائے جائیں گے[۷] اس سے یہ نہیں ہوگا۔ کہ وہ جگر کی بیماریوں اور پیاس میں مبتلا ہو جائیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ ان کے اندر وہ گرمی اور حرارت پیدا کی جائے جو قوت عملیہ کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ سردی اور گرمی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک سردی وہ ہوتی ہے جو کم ہمتی پیدا کرتی ہے۔ لیکن دوسری قسم کی سردی غلط جوش کو زائل کرتی ہے۔ جیسے قرآن کریم میں کاس کا فوری کہا گیا ہے[۸] کافور کے زیادہ استعمال سے انسان نامرد ہو جاتا ہے۔ اس کی صحت خراب ہو جاتی ہے اور وہ کام کے قابل نہیں رہتا۔ لیکن اگر اسے مناسب موقعہ پر اور مناسب مقدار میں استعمال کیا جائے تو یہ ناجائز گرمی کو روکتا ہے اور غلط جوش کو دُور کرتا ہے۔ چنانچہ کاہو اور بنھوا بھی جیسا کہ اطباء لکھتے ہیں۔ سرد اور خشک ہیں اور ان کا صحیح استعمال کیا جائے تو یہ ناجائز گرمی کو دور کرتے ہیں۔ اسی طرح کاس کافوری کے ساتھ نادرست اور ناجائز گرمی کو دور کیا جائیگا خواب میں کاہو اور بنھوا سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہم جماعت کے موجودہ غلط جوش کو کاس کافوری کے ساتھ دور کریں۔ پھر خدا تعالےٰ فرماتا ہے اس کے بعد مومنوں کو زنجبیل کے پیالے پلائے جائیں گے اور ان کے ذریعہ ان کے اندر وہ گرمی پیدا ہوگی جو قوتِ عملیہ پیدا کرنے کا موجب ہوگی۔ یہ زنجبیلی پیالے ناجائز گرمی اور غلط جوش پیدا کرنے اور جگر کی خرابی اور دیگر بیماریوں کا موجب نہیں ہوں گے بلکہ مومنوں کے اندر قوتِ عملیہ پیدا کریں گے۔

پھر جو دوسری رؤیا ہوئی اس کو اس رؤیا کے ساتھ جب میں نے ملایا تو مَیں نے سمجھا کہ ان کے

اندر وہی مضمون بیان کیا گیا ہے جو میرے ذہن میں تھا کہ آج خطبہ عیدالاضحیہ میں بیان کرونگا۔
حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک نام ابراہیم بھی تھا، آپ کو الہامات میں بار بار ابراہیم کہا گیا ہے؎ مجھے بھی ایک دفعہ بیت الدعا دکھائی گئی کہ میں اس میں دعا کر رہا ہوں۔ مجھے بتایا گیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام بھی ابراہیم تھے اور خلیفہ اوّلؓ بھی ابراہیم تھے۔ اور آپ ابراہیم ادھم ہیں؎۔ اور مجھے بتایا گیا کہ میں بھی ابراہیم ہوں۔ ابراہیم ادھم ایک بادشاہ گذرا ہے۔ غالبا وہ ترک تھا۔ کیونکہ ترکوں میں یہ نام زیادہ پایا جاتا ہے۔ وہ توبہ کر کے فقیر ہو گیا تھا اور بڑے پایہ کا صوفی گنا جاتا ہے۔

دوسری رؤیا میں مجھے ایک لڑکا دکھایا گیا جس کا نام مولود احمد ہے۔ اور مولود احمد کے معنے ہیں احمد کا بیٹا۔ اور یہاں دوڑنے کے بھی وہی معنے ہیں جو قرآن کریم کی آیت فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ؎ کے ہیں اور وہ لڑکا بھی دکھایا گیا۔ درحقیقت اس میں بتایا گیا ہے۔ کہ اس جدید ابراہیم کا بیٹا بھی اسمٰعیلؑ کا رنگ رکھتا ہے۔ پھر یہ بھی دکھایا گیا کہ قربانی کا وقت آگیا ہے پھر یہ بتایا گیا کہ جماعت کی کمزوریاں دور کرنی چاہئیں کیونکہ جماعت کے تمام افراد روحانی طور پر ابراہیم کے بیٹے ہیں۔ اور ان پر قربانی لازمی ہے ان پر ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب وہ بچے تھے لیکن اب وہ اتنے بڑے ہو گئے ہیں کہ وہ دوڑنے لگ گئے ہیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق جب فرمایا۔ کہ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ تو اس سے بڑی عمر مراد نہیں تھی، یہی چھ سات برس کی عمر مراد تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب تیز چلتے تھے تو حضرت اسمٰعیلؑ آپ کے ساتھ ساتھ دوڑتے تھے اور یہ چھ سات برس کی عمر میں ہوتا ہے۔ یہی وہ وقت تھا جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو قربان کیا گیا۔ بہرحال میں نے دونوں خوابوں کو ملا کر ان کی یہ تعبیر کی ہے اور یہی وہ مفہوم تھا جو میں درود کے متعلق بیان کرنا چاہتا تھا۔

مسلمان درود کے بہت شائق ہیں اور انہیں شائق ہونا بھی چاہیئے کیونکہ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ إِنَّ اللَّهَ وَمَلَٰئِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا؎ خدا اور اس کے فرشتے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ اے مومنو! تم بھی ان پر درود اور سلام بھیجو۔ گویا ہم درود کے ذریعہ خدا تعالیٰ کے اس حکم کو پورا کرتے ہیں۔ طبعی طور پر ایسے احکام دوسرے نبیوں کے متعلق بھی آتے ہیں لیکن کسی حکم کی عظمت کا اس بات سے یہ پتہ لگتا ہے کہ تمام لوگوں کی توجہ کو اس طرف پھیر دیا جائے۔ عیسائیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنا بیٹا بنایا ہے؎ لیکن ان میں وہ روح نہیں پائی جاتی جس سے یہ معلوم ہو کہ آپ واقعی خدا تعالیٰ

کے بیٹھے ہیں لیکن مسلمان بگڑ بھی جاتے ہیں مگر ان میں سے درود کی آواز نہیں جاتی۔ یہ ایسی گل چلی ہے جو رک نہیں سکتی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ درود اہم احکام میں سے ہے جس کو باوجود کمزوری کے مسلمان چھوڑ نہیں سکتے۔ ہر مسلمان درود پڑھتا ہے کوئی کم درود پڑھتا ہے اور کوئی زیادہ پڑھتا ہے کوئی دس دفعہ پڑھتا ہے کوئی بیس دفعہ پڑھتا ہے اور کوئی سو دفعہ پڑھتا ہے اور کئی مسلمان سارا سارا دن بھی درود پڑھتے رہتے ہیں۔ ہم انہیں خواہ نکما قرار دیں لیکن ان کی یہ خوبی ماننی پڑیگی کہ وہ سارا دن درود پڑھتے رہتے ہیں اور یہ نہایت اچھی چیز ہے بشرطیکہ صحیح رنگ میں ہو لیکن مسلمان نے غور نہیں کیا کہ درود کا کیا مفہوم ہے۔

درود جو سب سے چھوٹا اور سب سے عام ہے یہی ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ یہ مختصر ترین درود ہے۔ کئی اور درود بھی ہیں جو مختلف روایتوں سے آئے ہیں لیکن جس درود کو عام طور پر پڑھا جاتا ہے وہ یہی درود ہے۔ اس کے آدھے حصہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کیا گیا ہے اور آدھے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے بلکہ اس کے تین ٹکڑے کئے گئے ہیں۔ پہلے میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہے جیسے فرمایا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ۔ دوسرے ٹکڑے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے جیسے کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ۔ تیسرے ٹکڑے میں خدا تعالےٰ شامل کر لیا گیا ہے جیسے اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ میں ہے۔ گویا درود کے تین حصوں میں سے خدا تعالےٰ نے ایک حصہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دے دیا اور ایک حصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیدیا اور ایک حصہ خود لے لیا۔ عام طور پر لوگ خصوصاً عیسائی اور ہندو اسلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ درود میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابراہیمی انعام دینے کی دُعا کر کے اقرار کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑے تھے۔ ہندوؤں کو اسلام سے بغض تھا اور ہمارا خیال تھا کہ پارٹیشن کے بعد یہ بغض کم ہو جائیگا لیکن یہ بغض اب بھی کم نہیں ہوا۔ سُنا جاتا ہے کہ وہاں جب کوئی مصنف تاریخ وغیرہ کی کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے تو اس کی تان رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہی ٹوٹتی ہے۔ اگرچہ یہ ایسی ہی چیز ہے جیسے چاند پر تھوکنے والے کی تھوک اس کے اپنے منہ پر پڑتی ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان اعتراضوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن ایک مسلمان کا دل دکھتا ہے اور اس کو اپنا دل قربان کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ چیز اس کی روحانیت کے لئے مفید ہو جاتی ہے۔ بہرحال معترضین میں سے بعضوں نے اعتراض کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے چھوٹے ہیں۔ کیونکہ جب ہم کہتے ہیں ہمیں فلاں کی طرح بننا چاہیئے تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ ہم سے بہتر ہے وہ مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ تم رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہمیشہ دعا کرتے ہو اور قیامت تک یہ دُعا کرتے رہو گے کہ خدا تعالے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایسے ہی درود بھیجے جیسے اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر درود بھیجا تھا۔ اب یا تو تم یہ بتاؤ کہ فلاں وقت تک خدا تعالے ایسا کرے اور اگر قیامت تک تم نے یہ دعا مانگنی ہے تو معلوم ہؤا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قیامت تک افضل رہیں گے۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ زبان میں کئی قسم کے الفاظ ہوتے ہیں۔ ایک الفاظ وہ ہوتے ہیں جن کے معنے معیّن ہوتے ہیں۔ اور ایک الفاظ وہ ہوتے ہیں جن کے معنے غیر معین ہوتے ہیں ان الفاظ سے کسی ایک معنے کی بلا قرینہ تعیین کرنا جہالت ہوتا ہے۔ جیسے کوئی کہے کہ میں رات کے وقت فلاں کے گھر گیا تو اگر کوئی اس کے یہ معنے کرتا ہے کہ وہ ضرور آج رات اس کے گھر گیا ہے تو یہ اس کی حماقت پر دلالت کرے گا اور لوگ کہیں گے کہ یہ تمہاری جہالت ہے۔ اگر بولنے والے نے اپنے الفاظ کی تعیین نہیں کی تو جو معنے اس کے مدنظر ہوں وہ لے سکتا ہے۔ یہاں بھی مشابہت کا ذکر ہے جو مبہم معنے ہیں اور ان معنوں پر دلالت کرنے کے لئے عربی زبان میں مختلف الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ اُردو زبان میں اس کے لئے ایک سے زیادہ الفاظ ہیں مثلاً لفظ "کی طرح" ہے۔ مثلاً کہتے ہیں یا اللہ! تُو اسی طرح دولت دے جس طرح تو نے قارونؑ کو دولت دی۔ یا آج کل کے لحاظ سے لوگ کہتے ہیں یا اللہ تو اسے اسی طرح دولت دے جس طرح تو نے راک فیلرؔ یا روتھشیلڈؔ کو دولت دی۔ یا لوگ کہتے ہیں یا اللہ تو اسے اسی طرح دولت دے جس طرح تو نے مثلاً برمکی خاندانؔ کو دولت دی۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ تو اسے ان کی قسم کا دولتمند بنا دے یہ معنے نہیں کہ تو اسے نقد اسی قدر دولت دے جتنی دولت تُو نے قارون، برمکی خاندان، روتھشیلڈ یا راک فیلر کو دی۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ یا اللہ تو اسے اس قدر دولت دے جس قدر دولت تو نے قارونؔ کو دی برمکی خاندان کو دی یا راک فیلر اور روتھشیلڈ کو دی۔ تو اس کے معنے درجہ کے ہونگے اگر درود میں کَمَا صَلَّیْتَ کی بجائے اِلٰی قَدْرِ مَا صَلَّیْتَ کہا جاتا کہ تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اس درجہ کا درود بھیج جس درجہ کا درود تو نے ابراہیم علیہ السلام پر بھیجا۔ تو معلوم ہوتا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان سے کم ہے مگر یہاں درجہ کا ذکر نہیں قسم کا ذکر ہے۔ ایک کنگال آدمی بھی بعض دفعہ کہدیتا ہے کہ میرے پاس روپیہ ہے اور وہ روپیہ نکال دیتا ہے۔ مثلاً فرض کرو ایک کنگال آدمی

خیال کرتا ہے کہ اس کے پاس جو لوگ بیٹھے ہیں وہ سب غریب ہیں اور وہ انہیں کہتا ہے کہ میرے پاس پانچ روپے ہیں۔ اب اگر اس مجلس میں سے ایک امیر آدمی جو کروڑ پتی ہے لیکن وہ کنگال آدمی اسے نہ جانتا ہو وہ کہے جس طرح تمہارے پاس روپیہ ہے میرے پاس بھی روپیہ ہے تو اس کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ اس کروڑ پتی کے پاس بھی پانچ روپے ہیں بلکہ یہاں اس فقرہ کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ بھی روپے والا ہے۔ حالانکہ یہ کروڑ پتی ہے اور وہ کنگال آدمی صرف پانچ روپے کا مالک ہے۔ درود میں کَمَا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جیسے کَمَا صَلَّیْتَ ہے اور "کَمَا" میں "ما" مصدریہ ہے جس کے معنے ہیں کصلوٰتک علی ابراھیم جس طرح تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر درود بھیجا اے اللہ اسی قسم کا درود تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی بھیج۔ گویا اس میں "قسم" کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی کوئی خاص قسم کا فضل ہے جس کے متعلق خدا تعالیٰ سے دعا کی گئی ہے۔ کہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ملے۔ یہاں درجہ کا سوال نہیں "جس طرح" میں چھوٹا آدمی بھی آسکتا ہے اور بڑا آدمی بھی آسکتا ہے۔ مثلاً ایک مسلمان یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ جس طرح تو نے غارِ ثور میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ساتھی حضرت ابوبکرؓ کو بچایا تھا اسی طرح تو مجھے بھی بچا۔ تو اس میں قسمِ نجات کی طرف اشارہ ہوتا ہے یعنی وہ کہتا ہے کہ میرے حالات بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات جیسے ہیں اس لئے جن صفات کا تو نے اس وقت اظہار کیا تھا انہی صفات کا تو اب بھی اظہار فرما۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ تو مجھے بھی رسول اللہ بنا دے۔ پھر بعض دفعہ ایک مسلمان یہ بھی دعا کرلیتا ہے کہ اے اللہ! جس طرح تو نے بدر کے موقعہ پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مدد کی تھی ہماری بھی اسی طرح مدد کر۔ اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ میں بھی رسول ہوں۔ اور میرے ساتھی ابوبکرؓ، عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ ہیں۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ میری تکلیف اسی قسم کی ہے۔ اس لئے اے خدا مجھ پر تو اسی قسم کی برکت نازل کر جس قسم کی برکات تو نے اس وقت نازل کی تھیں۔ ایک ماں اپنے بچے کو بھی روٹی دیتی ہے اور کتے کے سامنے بھی روٹی ڈالتی ہے۔ فرض کرو اس کے پاس دو روٹیاں تھیں جن میں سے ایک روٹی اس نے اپنے بیٹے کو دے دی اور ایک روٹی اس نے کتے کے سامنے ڈال دی۔ تو کیا اس کا بچہ اور کتا برابر ہو گئے، کیا اس کی محبت بچے اور کتے سے ایک جیسی ہے؟ گویا اگر اتنی چیز بھی مل جائے تب بھی درجہ ایک نہیں ہوتا اور یہاں تو صرف قسم ایک ہے درجہ ایک نہیں اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک قسم برکت کی ابراہیم علیہ السلام

اور آپ کی اولاد کو دی گئی تھی۔ وہی قسم برکت کی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو ملے۔

اب بائیبل دیکھو کہ اس میں کس برکت کا ذکر ہے جو نمایاں طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی۔ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکومت یا شریعت کی تکمیل کی برکت نہیں دی گئی تھی۔ بلکہ انہوں نے اپنا اکلوتا بیٹا خدا تعالےٰ کی خاطر قربان کر دیا تھا[۵۱] پس جب یہ کہا جائیگا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس قسم کی برکت ملے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملی تو اس کا اشارہ اس برکت کی طرف جائے گا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمایاں طور پر ملی اس کا اشارہ کسی مبہم چیز کی طرف نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں آدمی نے رات کو یہ کام کیا ہے تو بھی ایسا ہی کر۔ تو وہ اس جیسا کام کب کر سکتا ہے کیونکہ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ اس نے کیا کام کیا ہے۔ اس طرح ہم کسی کو وہی کام کرنے کے لئے کہہ سکتے ہیں جو ہم نے دیکھا ہو۔ پس جب اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ کہا جاتا ہے۔ اس سے وہ برکت مراد ہوتی ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کا اشتراک نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کام کونسا تھا جو آپ نے اور آپ کی اولاد نے اکٹھا کیا تھا۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ وہ کام آپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنا تھا۔ اور بیٹے کا ذبح کے لئے تیار ہو جانا تھا۔ یہی وہ بنیادی کام ہے جو باپ بیٹے دونوں نے کیا اور یہ ایک ہی کام ہے جو حضرت آدم علیہ السلام نے نہیں کیا تھا جو حضرت نوح علیہ السلام نے نہیں کیا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوا دوسرے انبیاء علیہم السلام نے جن کو ہم جانتے ہیں نہیں کیا تھا اور جن انبیاء کا ہمیں علم نہیں ان کے متعلق بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے یہ کام کیا ہو۔ گویا "کَمَا صَلَّیْتَ" کے الفاظ میں شہادتِ ذبیح اسماعیلؑ کا ذکر ہے کیونکہ یہاں وہ برکت ہے جس میں حضرت ابراھیم علیہ السلام اور آپ کی اولاد دونوں شریک تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیلؑ سے کہا میں تمہیں خدا تعالےٰ کے حکم کے ماتحت ذبح کرنا چاہتا ہوں اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے کہا میں ذبح ہونے کے لئے تیار ہوں[۵۲]

تم ہمیشہ یہ دعا کرتے ہو اور اپنے منہ پر تھپڑ رسید کرتے ہو۔ تم نماز میں یہ کہتے ہو اے اللہ تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو وہی برکت دے جو تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اور ان کی اولاد کو دی یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بیٹوں کو بھی قربان ہونے کی توفیق دے۔ پھر کہتے ہو الٰہی مجھے بھی اور میری اولاد کو بھی وہی قربانی کرنے کی توفیق عطا فرما

جس کے کرنے کی تو نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو توفیق دی ہم آگے بڑھ کر خنجر پر اپنی گردنیں رکھ دیں۔ تم نمازیں یہ کہتے ہو لیکن جب چندہ کے لئے کہا جاتا ہے تو اپنی جیبیں پکڑ لیتے ہو۔ ہر نماز میں تم درود پڑھتے ہوئے یہ کہتے ہو کہ اے اللہ تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنی اولاد قربان کرنے کی توفیق عطا فرما اور اولاد کو قربان ہونے کی توفیق دے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو فوت ہو چکے ہیں۔ اس لئے اس دعا کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ چیز ہمیشہ جاری رہے۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تو ایک بیٹے کے قربان کرنے کی توفیق ملی تھی لیکن یہاں یہ چیز ہمیشہ رہے یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ اپنے بیٹے قربان کرنے کی توفیق ملے۔ اب بتاؤ بڑا کون ہوا؟ وہ جس نے ایک بیٹا ذبح کیا یا جو ہر زمانہ میں بیٹے قربان کرتا ہے۔ مگر سوچو کہ جب تم یہ کہتے ہو کہ اے اللہ! تو مجھے ویسے ہی قربان ہونے کی توفیق عطا فرما جیسے قربان ہونے کی توفیق تو نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو دی تھی۔ تو پھر تم دیانتدار ہوتے ہوئے قربانی سے بھاگ کس طرح سکتے ہو۔ کیا تم اپنے نفس کو اس سے مستثنیٰ کر لیتے ہو۔ بلکہ حقیقتاً دعا کرنے والا تو سب سے پہلا مخاطب ہوتا ہے پس سب سے پہلے اپنے نفس کو اس میں شریک کرنا چاہیئے ورنہ یہ ایک تمسخر بن جائے گا اور کیا یہ چیز کوئی مسلمان برداشت کر سکتا ہے اور کیا کوئی مسلمان اس بات کا اقرار کرے گا۔ کہ میں دعا کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اے اللہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہمیشہ اپنے بیٹے قربان کرنے کی توفیق عطا فرما اور آپ کے بیٹوں کو بھی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی طرح ذوق شوق سے قربان ہونے کا موقعہ دے سوائے میرے اور میرے بچوں کے۔ کوئی احمق بھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ وہ یہ دعا کرتے ہوئے اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو اس سے مستثنیٰ قرار دے لیتا ہے۔ کوئی بے حیا ہی ہوگا جو یہ کہے میں دعا کرتے ہوئے اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو مستثنیٰ قرار دے لیتا ہوں۔ اگر یہ حماقت کرنے کے لئے تیار نہیں ہو تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ تم نماز پڑھتے ہوئے تو یہ کہتے ہو کہ اے اللہ تو مجھے اور میری اولاد کو قربان ہونے کی توفیق عطا فرما لیکن باہر جا کر کوشش کرتے ہو کہ تمہاری اور تمہاری اولاد کی جانیں بچ جائیں۔

عیدالاضحیہ اس بات کی طرف توجہ دلانے کے لئے آتی ہے۔ خدا تعالےٰ کہتا ہے کہ ہم سال میں یہ ایک دن لا کر یہ واقعہ تمہارے سامنے لے آتے ہیں تا تمہیں یاد رہے کہ درود میں جو تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی اُمت کے لئے دعا مانگتے ہو اس میں تم بھی شریک ہو۔ یہ نہیں کہ تم دعا تو یہ کرو کہ اے اللہ تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح بیٹے قربان کرنے کی توفیق عطا فرما اور ہمیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام

کی طرح قربان ہونے کی توفیق عطا فرما لیکن جب قربان ہونے کا وقت آئے تو پیچھے بھاگ جاؤ۔ اگر تم ایسا کرتے ہو تو تمہاری مثال اس عورت کی سی ہے جس کے متعلق لطیفہ مشہور ہے کہ اس کی بیٹی جس کا نام مہتی تھا دق اور سل ہو گئی۔ وہ ہمیشہ یہ دعا کیا کرتی تھی کہ اے خدا! میں مرجاؤں لیکن میری بیٹی بچ جائے۔ جب عزرائیل اس کی جان نکالنے آئے تو اس کی بجائے میری جان نکال لے۔ اس عورت نے ایک گائے رکھی ہوئی تھی۔ ایک رات کو اس کا رسہ ٹوٹ گیا وہ صحن میں گھس آئی۔ وہاں ایک گھڑا پڑا تھا گائے نے بھوسہ کھانے کے لئے اس میں اپنا منہ ڈال لیا گھڑے کا منہ تنگ تھا لیکن بوجہ دباؤ اس کا سر گھڑے میں پڑ گیا۔ مگر جب اس سے سر نکالنا چاہا تو وہ نہ نکلا۔ گائے گھبرائی اور صحن میں اس نے ناچنا شروع کر دیا۔ وہ عورت یہ خیال کرتی تھی کہ عزرائیل کی شکل نرالی ہوگی۔ جب اس گائے کو گھڑا اٹھائے ناچتے دیکھا تو اس نے خیال کیا کہ یہ عزرائیل ہے جو مہتی کی جان نکالنے آیا ہے۔ وہ پہلے تو یہ دعا کیا کرتی تھی کہ یا اللہ! میں مرجاؤں۔ مہتی نہ مرے اور جب عزرائیل آئے تو میری جان نکال لے مہتی کی جان نہ نکالے لیکن جب اس کے خیال میں عزرائیل جان نکالنے آیا تو وہ سب دعائیں بھول گئی اور کہنے لگی

ملک الموت من نہ مہتی ام   من یکے پیر زال محنتی ام

یعنی جو عورت پہلے یہ دعا کر رہی تھی کہ عزرائیل میری لڑکی کی بجائے میری جان نکال لے۔ وہی جب وقت آیا تو کہنے لگی میں مہتی یعنی لڑکی کی والدہ نہیں ایک اور مزدور عورت ہوں۔ یہی مثال اس شخص کی ہے جو درود پڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے بیٹے قربان کرنے کے مواقع بار بار دے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تو ایک دفعہ بیٹا قربان کرنے کا موقعہ ملا تھا لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بار بار بیٹا قربان کرنے کا موقعہ ملے۔ پھر اسمٰعیل علیہ السلام کو تو ایک دفعہ قربان ہونے کا موقعہ ملا تھا لیکن تم دعا کرتے ہو کہ اے خدا ہمیں بار بار قربان ہونے کا موقعہ دے۔ لیکن جب قربان ہونے کا وقت آتا ہے تو کہتے ہیں ملک الموت من نہ مہتی ام۔ من یکے پیر زال محنتی ام۔ یہ چیز ہے جو عیدالاضحیہ یاد کرانے کے لئے آتی ہے۔ گویا درود کی تشریح عیدالاضحیہ ہے اور تم یہ کہتے ہو کہ ہم خدا تعالیٰ کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دیں گے اور جب تم ہمیشہ یہ اقرار کرتے ہو تو اب اپنی جانیں قربان کرو، کبھی تمہاری بھی عیدالاضحیہ آئیگی کہ نہیں؟

(الفضل ۷ راکتوبر ۱۹۵۱ء)

۱ : سیرت المہدی مرتبہ حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ جلد ۲ صفحہ ۱۲۳

۲ - میاں جان محمد صاحب رضی اللہ عنہ (۱۸۸۲ء - ۱۹۶۲ء) بیعت ۱۸۹۶ء - بڑے نیک اور مخلص انسان تھے۔

۳ - تاریخ احمدیت جلد ۷ صفحہ ۵۱۸

۴ - صحیح بخاری کتاب الادب باب الصبر والاذی

۵ - صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب

۶ - الدھر ۷۶ : ۱۸

۷ - الدھر ۷۶ : ۶

۸ - تذکرہ طبع سوم صفحہ ۷۹، صفحہ ۳۳۱، صفحہ ۳۷۶، صفحہ ۳۹۵

۹ - تذکرۃ الاولیاء صفحہ ۳۳ مرتبہ سید رئیس احمد جعفری

۱۰ - الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۳

۱۱ - الاحزاب ۳۳ : ۵۷

۱۲ - متی باب ۴ آیت ۳، باب ۲۸ آیت ۲۹

۱۳ - صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی - صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد التشھد۔

۱۴ - مسنون درود شریف کے علاوہ صحیح بخاری کتاب الانبیاء اور صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ میں یہ درود شریف بھی مروی ہے:- اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّتِہٖ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ وَبَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّتِہٖ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

۲ - سنن ابن ماجہ کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیھا باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ درود شریف بھی روایت کئے گئے ہیں۔

ا - اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ عَبْدِکَ وَرَسُوْلِکَ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَبَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ۔

ب - اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ صَلَاتَکَ وَرَحْمَتَکَ وَبَرَکَاتِکَ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَاِمَامِ الْمُتَّقِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ، مُحَمَّدٍ عَبْدِکَ وَرَسُوْلِکَ اِمَامِ الْخَیْرِ وَقَائِدِ الْخَیْرِ وَرَسُوْلِ الرَّحْمَۃِ۔ اَللّٰھُمَّ ابْعَثْہُ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا یَغْبِطُہٗ بِہِ الْاَوَّلُوْنَ وَالْاٰخِرُوْنَ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ الخ

۱۵ - قارون جس کا نام بائبل نے قورح بتایا ہے اسرائیلی قوم ہی کا ایک فرد تھا فرعون کا افسر خزانہ اور بہت مالدار شخص تھا اس نے دولت کے نشے اور غرور میں آکر اپنی قوم پر ظلم کرنا شروع کر دیا۔ اسکے تفصیلی حالات کیلئے ملاحظہ ہو تفسیر کبیر جلد ہفتم حصہ سوم صفحہ ۲۳۳۔

١٦ - جان ڈیوی سن راک فیلر JOHN DAVISON ROCKEFELLER (۱۸۳۹ — ۱۹۳۷ء) امریکہ کا مشہور ترین شخص جسے تیل کی صنعت و تجارت نے ارب پتی بنا دیا۔

١٧ - روتھشیلڈ ایمسم میئر MEYER ANSELME ROTHSCHILD (۱۷۴۴ — ۱۸۱۲ء) جرمنی کا بہت بڑا یہودی مالدار جو فرینکفرٹ کے بنک کا بانی تھا اسکے پانچ بیٹوں نے فرینکفرٹ۔ وی آنا۔ لندن، نیپلز اور پیرس میں بہت بڑے بڑے بنک قائم کیے۔

١٨ - برمکی خاندان کے متعلق بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس خانوادہ کا جدِ اعلیٰ برمک بلخ کے بدھ مندر نوبہار کا پجاری اور متولی تھا۔ بعض مورخین نے نوبہار کو مجوسیوں کا آتشکدہ قرار دیا ہے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے۔ کہ برمک اس شخص کا نام نہ تھا بلکہ یہ اُس عہدے کا نام تھا جس پر وہ فائز تھا۔ ولید بن عبد الملک کے زمانہ میں قتیبہ بن مسلم نے بلخ کو فتح کیا تو برمک مسلمان ہو گیا۔ برمک کا لڑکا خالد صاحبِ علم و دانش تھا۔ سینٹ جان فلبی لکھتا ہے کہ یہ ولید کے مشہور جرنیل قتیبہ کے بھائی عبد اللہ کا بیٹا تھا۔ لیکن اس کی ماں ایرانی النسل تھی۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ جب قتیبہ نے بلخ پر حملہ کیا تو اس لڑائی میں جہاں اور مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا وہاں لونڈیاں بھی گرفتار ہو کر آئی تھیں ان میں ایک عورت برمک کی تھی۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت یہ عورت قتیبہ کے بھائی عبد اللہ کے حصّہ میں آئی۔ خالد اسی عورت کے بطن سے پیدا ہوا۔ ابو مسلم خراسانی کی تحریک میں خالد نے نمایاں حصہ لیا اور اپنی عالی ہمتی اور عقل و فراست سے اس میں بڑا مقام حاصل کر لیا۔ بنو عباس کی حکومت قائم ہوئی تو اسے وزیر بنا دیا گیا۔ خالد کا بیٹا یحییٰ بھی باپ کے اوصاف سے متصف تھا۔ ہارون الرشید کا اتالیق مقرر ہوا۔ ہارون کے کمالات یحییٰ کے فیضانِ تربیت کا نتیجہ تھے۔ یحییٰ کے آٹھ بیٹے تھے جن میں سے فضل اور جعفر زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے روز افزوں اقتدار، جاہ و جلال اور علم و فضل کے چرچے جب عام ہو گئے اور ہارون الرشید کی حیثیت برائے نام ہو کر رہ گئی تو ہارون کے دل میں برامکہ خصوصاً جعفر کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو گئی جو بالآخر جعفر کے قتل پر منتج ہوئی۔ یحییٰ اور فضل کو قید کر دیا گیا۔ اسی قید و بند میں نہایت بے بسی کی حالت میں دونوں نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔ بنو عباس خصوصاً ہارون الرشید کے عہدِ حکومت کو سنہری زمانہ بنانے میں برامکہ کا سب سے زیادہ حصہ ہے لیکن دنیا یہ دلدوز منظر دیکھ کر محوِ حیرت رہ گئی کہ اسی ہارون الرشید نے برامکہ کو خون کے آنسو رُلا کر مروا ڈالا۔ (برامکہ کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو اسلامی انسائیکلو پیڈیا جلد ۲ صـ۶۶۳، تاریخ ابن خلدون جلد ۳ (اردو ترجمہ) صـ۱۲۱، تاریخ اسلام مصنفہ پروفیسر سید عبد القادر جلد ۲ صـ۲۳۵)

١٩ - پیدائش باب ۲۲ آیت ۱-۲ ٢٠ - الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۳

(۴۱)

(فرمودہ یکم ستمبر ۱۹۵۲ء بمقام ربوہ)

یہ ہمارے اسلامی سال کی دوسری عید ہے اور آج وہ مبارک دن ہے جب خدا تعالیٰ کے بندے جو لاکھوں کی تعداد میں مکہ مکرمہ میں جمع ہوئے ہیں حج کرکے واپس لوٹ آئے ہیں۔ آج ان میں سے بہت سے لوگ منیٰ سے سواریوں پر جلدی جلدی مکہ مکرمہ کی طرف آرہے ہیں تاکہ وہ خانہ کعبہ کا طواف کریں اور طواف کے بعد وہ دو یا تین دن منیٰ میں ٹھہریں گے اور اس کے بعد حج ختم ہو جائے گا۔ یہ عید جو عید الاضحیہ کہلاتی ہے حج کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس عید کا ایک تعلق تو تاریخی لحاظ سے اس قربانی سے ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے کی کی اور دوسرا تعلق اس کا حج کے ساتھ ہے کہ ان ایام میں لاکھوں لاکھ مسلمانوں کو حج کے لئے جمع ہونے کا موقع ملتا ہے۔ گویا ہم سارے کے سارے مسلمان اس خوشی میں عید مناتے ہیں کہ ہمارے کچھ بھائیوں کو حج کا موقعہ مل گیا۔

اس عید کا وہ پہلو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم الشان قربانی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے میں ہمیشہ بیان کرتا آیا ہوں۔ آج میں اختصار کے ساتھ اس تعلق کو لیتا ہوں کہ یہ عید اس بات کی خوشی میں ہے کہ ہمارے بعض بھائیوں کو حج کا موقعہ نصیب ہوا ہے۔ ہماری یہ عید اس خوشی میں ہے کہ مسلمان ابھی مرکزِ وحدت پر قائم ہیں۔ ہماری یہ عید اس خوشی میں ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی زندگی کا ثبوت پیش کرنے کے لئے لاکھوں مسلمان آج مکہ مکرمہ میں جمع ہیں۔ ہماری یہ عید اس خوشی میں ہے کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے نمائندے دین کے مرکز مکہ مکرمہ میں اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت کریں اور اس کے نام کو بلند کریں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو اس عید کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ شاید بسا اوقات یہ باتیں عید منانے والوں کے دلوں سے غائب ہوتی ہیں۔ عید کے دن کو دیکھ لو۔ ہزاروں آدمی چھوٹے چھوٹے قصبات میں بھی اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ وہ عید منائیں۔ ابھی ربوہ کیا چیز ہے ایک نئی آباد ہونے والی چھوٹی سی بستی ہے اس میں بھی ہزاروں آدمی عید کے لئے جمع ہیں۔ اور ان کی خواہش کی انتہاء کا اس بات سے پتہ لگتا ہے کہ اس وقت سینکڑوں عورتیں اور بچے اس قدر شور کر رہے ہیں کہ لوگ خطبہ بھی نہیں سن سکتے۔ گویا عید کیا ہے ایک نشہ ہے جو دماغوں پر طاری ہے ایک مستی ہے جو انسانوں پر چھائی ہوتی ہے۔ عید آگئی۔ عید آگئی۔ مگر کیا چیز آگئی ہے دیکھنے والے کو

یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ کیا چیز آئی ہے جس سے ہر انسان خوشی سے معمور نظر آتا ہے۔ کسی جگہ مٹھائیاں بٹ رہی ہوتی ہیں تو دریافت کیا جائے کہ یہ خوشی کیسی ہے؟ تو لوگ کہتے ہیں دلہن آگئی ہے۔ اور دلہن ایک چیز ہے جو ہمیں نظر آتی ہے۔ کسی جگہ یہ خوشیاں منائی جاتی ہیں اور چھوہارے بٹ رہے ہوتے ہیں لوگ پوچھتے ہیں کیا ہوا تو انہیں کہا جاتا ہے نکاح ہو گیا ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ کل کو دلہن آئے گی۔ کبھی خوشیاں منائی جاتی ہیں کہ لڑکا پاس ہو گیا ہے اور ہمیں نظر آتا ہے کہ کل وہ لڑکا بی۔اے نہیں تھا، آج بی۔اے ہو گیا ہے۔ کل وہ لڑکا ایم۔اے نہیں تھا آج ایم۔اے ہو گیا ہے۔ کل اس پر بعض نوکریوں کے دروازے بند تھے آج وہ دروازے اس کے لئے کھل گئے ہیں۔ پھر یہ عید کیا چیز ہے۔ ہمیں کوئی چیز نظر تو آنی چاہیئے۔ لوگ کہتے ہیں عید آگئی عید آگئی۔ لوگ مست ہوئے جاتے ہیں شور پڑ رہا ہے اور اتنا شور ہے کہ خطبہ بھی سنائی نہیں دے رہا، آخر یہ کیا چیز ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلی چیز تو وہی ہے جو میں نے بتائی ہے یعنی ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کی قربانی اور اس کا نتیجہ۔ دوسری بات یہ ہے کہ آج کے دن ہمیں دو چیزیں ملتی ہیں جو یا تو کل تک ہمیں نہیں ملی تھیں یا جن کا کل تک ہمیں پتہ نہیں تھا۔ آج کی عید ایک تو یہ خبر لائی ہے کہ پونے چودہ سو سال کے بعد بھی مسلمان اپنے مرکز پر قائم ہیں۔ آج بھی ساری دنیا کے مسلمانوں کے نمائندے اس مقام پر گئے ہیں جہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ظاہر ہوئے جہاں اسلام کی بنیاد رکھی گئی۔ آج افریقہ سے بھی کچھ مسلمان وہاں گئے ہیں۔ ایشیاء سے بھی کچھ مسلمان وہاں گئے ہیں۔ یورپ سے بھی مسلمان وہاں آئے ہیں ابھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیا امریکہ سے بھی مسلمان حج کے لئے آئے ہیں یا نہیں لیکن وہ زمانہ یقینی طور پر آنیوالا ہے کہ امریکہ سے بھی لوگ وہاں آئیں گے اور شاید اس سال بھی بعض مسلمان امریکہ سے حج کے لئے آگئے ہوں تا کہ وہ اپنے ملک کو اس الزام سے بچائیں کہ امریکن لوگ حج نہیں کرتے۔ یورپ سے تو بعض مسلمان حج کے لئے آجاتے ہیں خصوصاً مشرقی اور جنوبی یورپ میں مسلمان پائے جاتے ہیں اور ان میں سے ایک تعداد حج کے لئے بھی آتی ہے۔ بہرحال آج ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان پھر ایک دفعہ مکہ مکرمہ میں جمع ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے پھر اس بات کی شہادت دی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لایا ہوا دین آج بھی زندہ ہے۔ آپ کے خادم آج بھی آپ کی آواز کو بلند کرنے کے لئے دنیا میں موجود ہیں اور یہ بات ہمارے لئے کتنی خوشکن ہے دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ماں باپ کے پاس سے کوئی شخص ہمیں ملنے کے لئے آتا ہے۔ تو ہم پوچھتے ہیں کہ ہمارے ماں باپ کا کیا حال ہے اگر وہ ان کی خیریت کا پتہ دیتا ہے تو ہم کہتے ہیں الحمد للہ۔ عید بھی ہمارے لئے ایک سندیسہ

اور ایک خبر لائی ہے کہ اسلام کی رگوں میں اب بھی خون چل رہا ہے۔ اب بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق رکھنے والے لوگ دین کے مرکز مکہ مکرمہ میں جمع ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے اپنے اس تعلق کا اعلان کیا ہے جو انہیں آپؐ سے ہے انہوں نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ چاہے کمزور رہی سہی لیکن آپ کے نام لیوا اب بھی دنیا میں موجود ہیں تو دیکھو یہ کتنی خوشی کی بات ہے۔ اگر کوئی شخص ہم سے کسی کے ماں باپ کی خیریت کی خبر لاتا ہے تو وہ کہتا ہے الحمدللہ۔ تو جب یہ عید ہمارے پاس اسلام کی زندگی کا ثبوت لائی ہے تو ہم کیوں نہ سجدوں میں گر جائیں کیوں نہ ہم خدا تعالےٰ کا شکر بجالائیں کہ ابھی قومی زندگی کی رگ پھڑک رہی ہے ابھی ہماری قومی زندگی کا سانس چل رہا ہے۔ ابھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وفاداری کا دم بھرنے والے دنیا میں موجود ہیں۔ ابھی مسلمان وحدت کے مرکز پر قائم ہیں۔

دوسری چیز جس کی خبر یہ عید لائی ہے وہ حج ہے یہ عید ہمیں بتاتی ہے کہ ہمارے کچھ بھائیوں کو حج نصیب ہوا ہے کسی بھائی کا بیاہ ہوتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ کسی کے ہاں بھائی پیدا ہوتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے کسی کی بہن کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو وہ خوش ہو رہا ہوتا ہے۔ کسی کے بھائی کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو وہ خوش ہو رہا ہوتا ہے۔ تم سے اگر کوئی یہ سوال کرے کہ بیٹا تو تمہاری والدہ کے ہاں پیدا ہوا ہے تم کیوں ہنس رہے ہو۔ بیٹا تو تمہارے باپ کے ہاں پیدا ہوا ہے تم کیوں خوش ہو رہے ہو۔ بیٹا تو تمہاری بہن کے ہاں ہوا ہے تمہیں خوشی کیوں ہے۔ بیٹا تو تمہارے بھائی کے ہاں ہوا ہے یا بیٹا تو تمہارے چچا کے ہاں ہوا ہے تم خواہ مخواہ کیوں ہنس رہے ہو تو تم میں سے ہر ایک یہ جواب دیگا کہ واہ کیا ان کی خوشی میری خوشی نہیں کیا میرے ماں باپ کے ہاں بیٹا ہوا ہے تو میں ان کی خوشی میں شریک نہیں اگر میں اپنے بھائی کی خوشی میں شریک ہوا ہوں تو کیا وہ میرا بھائی نہیں، اگر میری بہن کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے تو میں کیوں خوشی نہ مناؤں؟ کیا وہ میری بہن نہیں۔ اس کی خوشی کی وجہ سے مجھے کیوں خوشی نہ ہو۔ پس دنیا میں یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ بھائی بھائی کی خوشی سے خوش ہوتا ہے۔ ایک بھائی کامیابی حاصل کرتا ہے تو دوسرا بھائی بھی خوش ہوتا ہے۔ ایک بھائی نجاری کا کام سیکھ رہا ہوتا ہے اور ایک تعلیم حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں —— میاں! اگر تمہارا بھائی بی۔ اے ہو گیا ہے تو تم خوش کیوں ہوتے ہو، تم نے تو ساری عمر لکڑیاں چیرنی ہیں۔ ایک بھائی نانبائی کا کام کرتا ہے اور وہ آگ کے سامنے جھلس رہا ہوتا ہے تو دوسرا بھائی ڈاکٹر بن رہا ہوتا ہے یا اپنے عہدے میں ترقی پا رہا ہوتا ہے، تو وہ نانبائی بھی اپنے بھائی کی کامیابی پر خوش ہوتا ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ میاں تمہارے لئے خوشی کی کیا بات ہے، تم نے تو آگ میں جھلسنا

ہے۔ تو وہ کہتا ہے آخر وہ میرا بھائی ہے اور بھائی کی خوشی سے مجھے خوشی ہوتی ہے۔

بہرحال ہمیں ہر جگہ یہ بات نظر آتی ہے کہ کسی کا عزیز یا دوست کسی بات میں کامیابی حاصل کرتا ہے تو اس کو بھی خوشی ہوتی ہے۔ پس عید کی دوسری وجہ یہ ہوتی کہ اگرچہ ہمیں حج نصیب نہیں ہوا لیکن ہمارے کچھ بھائیوں کو حج نصیب ہوا ہے اور جس طرح ایک نانبائی کے بھائی کو ڈگری ملتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اور وہ یہ نہیں کہتا کہ ڈگری میرے بھائی کو ملی ہے مجھے کیا فائدہ؟ ایک نجار اپنے بھائی کی کامیابی یا عہدے میں ترقی پر خوش ہوتا ہے اور یہ نہیں کہتا کہ کامیابی میرے بھائی کو ہوئی ہے یا ترقی میرے بھائی کو ملی ہے مجھے کیا فائدہ؟ اسی طرح آج مسلمان اس لئے عید مناتے ہیں کہ ان کے کچھ بھائیوں کو حج نصیب ہوا ہے۔ اور پھر جہاں کسی کو خوشی کا موقعہ ملتا ہے وہاں اس کے اندر یہ جذبہ بھی ہوتا ہے کہ مجھے بھی کل کو یہ خوشی نصیب ہو۔ جب انسان اپنے بھائی کی خوشی پر خوش ہوتا ہے تو وہ یہ نہیں کہتا کہ مَیں یہ کام نہیں کروں گا۔ بسا اوقات وہ اس کی خوشی میں اس لئے شامل ہوتا ہے کہ وہ یا تو وہ کام کر چکا ہوتا ہے یا اسے امید ہوتی ہے کہ میں بھی یہ کام کروں۔ جب اس کے بھائی کو کامیابی ہوتی ہے تو وہ یہ نہیں کہتا کہ میرے بھائی کو یہ موقع ملا ہے مجھے یہ موقع نہ ملے۔ بلکہ اس کے اندر یہ جذبہ نہاں ہوتا ہے۔ کہ یہ چیز مجھے مل چکی ہے یا خدا کرے آئندہ کسی وقت مل جائے۔

پس یہ عید اس طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ اپنے بھائیوں کو دیکھکر ہمارے اندر بھی حج کرنے کا جذبہ پیدا ہونا چاہیئے۔ جہاں اپنے بعض بھائیوں کو حج نصیب ہونے کی خبر سُنکر ہم خوش ہوتے ہیں، وہاں ساتھ ہی ہمیں یہ خیال بھی کرنا چاہیئے کہ ہم کیوں حج نہ کریں۔ ہمارے اندر یہ خواہش پیدا ہونی چاہیئے کہ خدا تعالےٰ ہمیں بھی حج کا موقع دے۔ مگر افسوس کہ حج کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹ گئی ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو حج کے لئے جاتے ہیں اور اس سے ہماری جماعت بھی مستثنیٰ نہیں۔ ہماری جماعت کے افراد بھی بہت کم تعداد میں حج کے لئے جاتے ہیں حالانکہ حج پر اتنا روپیہ خرچ نہیں ہوتا جتنا روپیہ ہم میں سے بعض زمیندار اپنے بچوں کی شادیوں پر خرچ کر دیتے ہیں اور اس قسم کے زمیندار جماعت میں سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ آجکل کے حالات کے مطابق جس شخص کے پاس دو مربعے زمین ہے وہ ۵۔ ۷۔ ۱۰ ہزار روپیہ سالانہ تک کماتا ہے جب لوگ مشورہ کے لئے آتے ہیں تو کہتے ہیں لڑکی کی شادی کے لئے اتنے ہزار روپیہ جمع کیا ہے اور اس قدر اُدھار لے لیا جائیگا۔ وہ زمیندار جن کے پاس دو دو تین تین مربعے ہیں جماعت میں سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں اور وہ سینکڑوں ایسے ہیں جن پر حج فرض ہے ان میں سے ہر ایک اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی پر اس قدر روپیہ خرچ کر دیتا ہے جس سے بہت کم روپیہ حج پر خرچ ہوتا

ہے۔ اور غیر احمدیوں میں تو اس کی کوئی انتہا نہیں۔ ان میں لاکھوں نہیں کروڑوں لوگ ایسے ہیں جن پر حج فرض ہے لیکن انہوں نے حج نہیں کیا۔ پھر ایسا شخص جس کی تنخواہ چار پانچ سو روپیہ ماہوار ہو اس پر بھی حج فرض ہے۔ اور اس قسم کے آدمی بھی ہماری جماعت میں سینکڑوں کی تعداد میں ہیں مگر کتنے ہیں جنہوں نے حج کیا ہے؟ تم بہت کم لوگ ایسے دیکھو گے جن پر حج فرض تھا اور انہوں نے حج کیا۔ جماعت میں سے یہی پانچ دس پندرہ بیس آدمی ہر سال حج کے لئے جاتے ہیں یہ تعداد ایسی نہیں جس کے متعلق یہ خیال کیا جائے کہ کافی ہے۔ بیرون عرب سے چالیس پچاس ہزار کے قریب لوگ حج کے لئے جاتے ہیں۔ رپورٹیں تو بہت زیادہ تعداد کی آتی ہیں لیکن ان میں مبالغہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ہندوستان و پاکستان سے ۱۵ ۲۰ ہزار آدمی حج کے لئے ہر سال جاتا ہے۔ دس بیس ہزار آدمی انڈونیشیا سے جاتا ہے ۱۵-۱۶ ہزار آدمی جنہیں پچاس ہزار کہہ دیا جاتا ہے۔ مصر سے حج کے لئے جاتا ہے یہ کل ملا کر پچاس ساٹھ ہزار آدمی ہو جاتا ہے۔ اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ کے قریب شام عرب اور عراق اور خود مکہ سے شریک ہو جاتا ہے۔ اس لئے ڈیڑھ دو لاکھ کی تعداد بن جاتی ہے اور اگر زیادہ کامیابی ہو تو دو اڑھائی لاکھ کی تعداد حاجیوں کی ہو جاتی ہے۔ لیکن دنیا میں چالیس کروڑ کے قریب مسلمان ہے۔ اگر سو میں سے ایک آدمی حج کے قابل سمجھا جائے تو چالیس لاکھ کے قریب لوگ حج کے قابل بنتے ہیں اور اگر بیس سال کی عمر بھی حج کی سمجھ لی جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ زمانہ ایسا ہے کہ انسان کے پاس سفر کے لئے روپے جمع ہوتے ہیں اس کی صحت ایسی ہوتی ہے کہ سفر کرے تو گویا دو لاکھ آدمی حج کے لئے سالانہ جانا چاہیئے۔ لیکن اتنی تعداد مسلمانوں کی حج کے لئے نہیں جاتی اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے مکہ اور عرب والوں کو ملا کر ڈیڑھ دو لاکھ حاجی ہر سال حج کے لئے جاتا ہے جن میں سے بیرون عرب کے صرف ۵۰-۶۰ ہزار حاجی ہوتے ہیں۔ اگر پاکستان کو ہی لیا جائے تو اس میں ۷ کروڑ سے زیادہ مسلمان ہیں۔ اس طرح لاکھ آدمی حج کے قابل بنتے ہیں۔ اور اگر بیس سال کی عمر حج کے قابل سمجھ لی جائے تو قریباً تیس ہزار آدمی سالانہ پاکستان سے حج کے لئے جانا چاہیئے تب کہیں جا کر حج کے قابل آدمی کا حساب پورا ہوتا ہے لیکن جاتے صرف بارہ تیرہ ہزار ہیں۔ پھر بڑی مشکل یہ ہے کہ جو لوگ پاکستان سے حج کے لئے جاتے ہیں یا جو لوگ افریقہ اور مصر وغیرہ سے حج کے لئے آتے ہیں وہ سو فیصدی ایسے نہیں ہوتے جن پر حج شرعی طور پر فرض ہوتا ہے۔ ان میں سے ۸۰ فیصدی ایسے ہوتے ہیں جن پر حج فرض نہیں ہوتا۔ صرف وہ ایمان کی وجہ سے حج کے لئے چلے جاتے ہیں۔ جس سال میں نے حج کیا ہے اس سال کا ایک واقعہ ہے۔ ایک آدمی میرے پاس کچھ مدد مانگنے کیلئے آیا

میری عمر جوانی کی تھی۔ بعض باتیں جائز ہوتی ہیں لیکن تجربہ کار آدمی منہ پر نہیں لاتا۔ میں نے جوانی کی وجہ سے اس کا خیال نہ کیا۔ جب وہ شخص میرے پاس آیا تو میں نے اس سے دریافت کیا۔ کہ اگر تمہارے پاس اخراجاتِ سفر نہیں تھے تو پھر تم حج کے لئے کیوں آئے۔ شریعت کا یہ حکم ہے کہ اگر تمہارے پاس اخراجات سفر ہوں اور پھر اپنی غیر حاضری میں بال بچوں کے گذارہ کے لئے بھی تمہارے پاس روپیہ ہو تو حج کے لئے جاؤ۔ اس لئے اگر تمہارے پاس اخراجات سفر نہیں تھے تو پھر تم حج کے لئے آئے کیوں؟ پھر میں نے دریافت کیا کہ تم کام کیا کرتے ہو۔ اس نے کہا میں نائی کا کام کیا کرتا ہوں میں جب حج کے لئے چلا تو میرے پاس کافی روپیہ تھا لیکن بعض مشکلات کی وجہ سے مزید روپیہ کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ میں نے جب دریافت کیا کہ تمہارے پاس کتنا روپیہ تھا تو اس نے کہا بمبئی سے جب میں چلا تو میرے پاس پچاس روپے تھے گویا ان دنوں جب حج پر اڑھائی تین سو روپیہ خرچ ہوتا تھا پچاس روپے کی پونجی والا حج کے لئے چل پڑا۔ (اب بارہ تیرہ سو روپیہ کے قریب حج پر خرچ ہوتا ہے) اب کجا پچاس روپے اور کجا اڑھائی تین سو روپے۔ میں نے کہا کہ جب تمہارے پاس اس قدر قلیل رقم تھی تو تم حج کے لئے کیوں چلے؟ تو اس نے کہا۔ میں نے خیال کیا کہ اس قدر روپیہ میرے پاس ہے اور کچھ رستہ میں محنت کر لونگا۔ چلو دربارِ محبوب کی زیارت تو کر آؤں لیکن اب واپس جانے کے لئے میرے پاس اخراجات نہیں۔ لیکن دوسری طرف یہ حال ہے کہ جس کے پاس ایک لاکھ روپیہ کی جائداد ہے وہ بھی حج کے لئے نہیں جاتا۔ شاید اس لئے کہ جتنی زیادہ دولت کسی کے پاس آتی ہے اس کا ایمان کمزور ہوتا جاتا ہے۔ ایک دفعہ ایک مالدار شخص حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کے پاس آیا اور اس نے عرض کیا اے استاد مجھے بھی اپنی شاگردی میں لے لیجئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے دیکھا کہ اس کے کپڑے اچھے ہیں آپ نے اس کے حالات دریافت کئے۔ اس کے حالات سے معلوم ہوا کہ وہ ایک لاکھ پتی آدمی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا۔ سوئی کے ناکہ میں سے اونٹ کا گذر جانا ممکن ہے۔ لیکن خدا تعالےٰ کی بادشاہت میں ایک مالدار کا داخل ہونا ممکن نہیں۔ گویا اگر کوئی بیوقوف تم سے کہے کہ سوئی کے ناکے میں سے اونٹ گذر گیا۔ تو تم اس پر اعتبار کر لو لیکن اگر کوئی کہے کہ فلاں مالدار شخص خدا تعالےٰ کی بادشاہت میں داخل ہو گیا ہے تو اس پر اعتبار نہ کرو۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس شخص سے کہا جاؤ تمہیں خدا تعالےٰ کی بادشاہت میں داخل کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ پس جن لوگوں کی حیثیت ہوتی ہے وہ تو حج کے لئے نہیں جاتے اور جن کی حیثیت کچھ نہیں ہوتی وہ حج کے لئے جاتے ہیں اور بارہ تیرہ ہزار آدمی جو پاکستان سے حج کے لئے جاتا ہے اس میں سے درحقیقت پانچسو یا ہزار آدمی ایسا ہوتا ہے جس پر حج فرض ہوتا ہے۔ پس وہ اندازہ جو میں نے لگایا ہے وہ بھی

گھٹانا پڑتا ہے اور درحقیقت حج پر جانے والوں میں سے صرف تین فیصدی وہ لوگ ہوتے ہیں جن پر حج فرض ہوتا ہے۔ باقی لوگ جو حج کے لئے جاتے ہیں ان پر حج فرض نہیں ہوتا۔ وہ عاشق ہوتے ہیں جن کے پاؤں میں کانٹے چبھ رہے ہوتے ہیں لیکن وہ ان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے محض عشق کی وجہ سے جا رہے ہوتے ہیں وہ حج کا فریضہ ادا کرنے نہیں جاتے وہ عشق کی آواز پر لبیک کہہ رہے ہوتے ہیں۔

پس یہ عید اس لئے آتی ہے تا ہمارے دلوں کو بیدار کرے اور ہمیں ہمارا فرض یاد دلائے۔ عید ہمیں یہ بتانے آتی ہے کہ حج کی عبادت تم پر بھی فرض ہے جس طرح نماز ایک ضروری فریضہ ہے، جس طرح زکوٰۃ ایک ضروری فریضہ ہے۔ جس طرح روزے ایک ضروری فریضہ ہیں، اسی طرح حج بھی ایک ضروری فریضہ ہے لیکن افسوس کہ نہ غیر احمدیوں میں اس فریضہ کا صحیح احساس پایا جاتا ہے اور نہ احمدیوں کو اس کا پورا احساس ہے۔ غیر احمدیوں میں تو یہ لطیفہ ہوتا ہے ان کے خطوط آتے ہیں کہ اگر حضرت مرزا صاحب مسلمان تھے تو انہوں نے حج کیوں نہیں کیا۔ پھر ان کے پہلے خلیفہ نے بھی حج نہیں کیا اور آپ نے بھی حج نہیں کیا۔ حالانکہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل ؓ نے نہ صرف حج کیا تھا بلکہ دو سال کے قریب آپ مکہ مکرمہ میں رہے[5]۔ اور میں نے بھی حج کیا ہے[6]۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ آپ سفر کرتے پھر آپ کے لئے رستہ میں امن بھی نہیں تھا۔ اس لئے آپ نے حج نہیں کیا لیکن آپ کی طرف سے ہم نے حج بدل کروا دیا تھا[7]۔ گویا غلو میں دشمنوں نے کمال کر دیا ہے۔ سیالکوٹ میں ایک بڑے پیر تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ تقریر کی وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے رنگ میں پیش کرتے تھے۔ انہوں نے تقریر میں کہا۔ دیکھو مرزائی اپنی سچائی کے ثبوت میں بڑے بڑے دلائل دیتے ہیں اور علماء میں بحثیں ہوتی ہیں۔ یہ تو مولویوں والی باتیں ہیں مَیں روحانی آدمی ہوں۔ مَیں تمہیں موٹی دلیل دیتا ہوں جس سے پتہ لگ جائے گا کہ مرزائی اپنے دعویٰ میں سچے نہیں اور وہ دلیل یہ ہے کہ مرزا صاحب چونکہ دجّال ہیں جو شخص مرزائی ہوتا ہے وہ مرتد اور سخت بے ایمان ہو جاتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اس کا رنگ کالا کر دیتا ہے تم کوئی مرزائی دیکھ لو اس کا رنگ کالا ہوگا۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ خدا تعالیٰ کی لعنت ان پر پڑتی ہے۔ پیر صاحب کی ایک آنکھ میں نقص تھا اور مجلس میں ایک احمدی مدرس بھی بیٹھے تھے انہیں غصہ آگیا۔ ان کا رنگ بہت سفید تھا۔ پیر صاحب سے بھی زیادہ جن کا رنگ بھی سفید تھا مگر اس احمدی کے برابر نہیں وہ احمدی مدرس کھڑے ہوئے اور کہا۔ مَیں ایک احمدی ہوں۔ آپ اپنے مریدوں سے پوچھ لیں کہ مَیں زیادہ گورا ہوں یا آپ زیادہ گورے ہیں۔ پھر آپ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دجّال کہتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تو اب دنیا میں موجود نہیں لیکن آپ ایک آنکھ سے کانے ہیں اور دجّال کے متعلق احادیث میں آتا ہے کہ

وہ ایک آنکھ سے کانا ہوگا۔[1] اس پر پیر صاحب کے مریدوں نے اس احمدی دوست کو مارنا شروع کر دیا اور اسے خوب پیٹا۔ اس نے پیر صاحب اور اس کے مریدوں کے خلاف نالش کر دی۔ پیر صاحب بہت گھبرائے۔ وہ زمانہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کا تھا۔ مَیں اس وقت کوئی اکیس سال کا تھا اور لاہور گیا ہوا تھا۔ جب میں واپس قادیان جا رہا تھا تو اتفاقاً جس کمپارٹمنٹ میں مَیں بیٹھا تھا اس میں وہ پیر صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بڑے جہاندیدہ آدمی تھے۔ انہوں نے کرید کرید کر پتہ لے لیا کہ مَیں کون ہوں اور جھٹ قلم کاغذ منگوایا اور کہا۔ ایک مرزائی نے کسی شخص پر نالش کی ہے اور اب دونوں طرف سے جھوٹ بولا جائے گا اور ایمان خراب ہوگا۔ میں ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو کہ فریقین میں سے کوئی اس میں پھنس جائے۔ اس لئے آپ اس احمدی کو چٹھی لکھ دیں کہ وہ مقدمہ واپس لے لے۔ مَیں نے کہا۔ مرزائی تو جھوٹ نہیں بولتے اس لئے ان کا ایمان خراب نہیں ہوتا اور اگر دوسرے فریق کو علم ہے کہ جھوٹ بولنے سے ایمان خراب ہوتا ہے تو وہ جھوٹ کیوں بولے گا واپس آکر مَیں نے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کو یہ واقعہ سُنایا تو آپ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں خدا تعالیٰ نے موقعہ دیا تھا کہ تم احمدیت کے ایک دشمن کو ممنونِ احسان کر لیتے لیکن تم نے یہ موقع ضائع کر دیا۔ تمہیں چاہیئے تھا کہ ضرور رقعہ لکھ دیتے۔ میں نے کہا۔ مجھے قانون کا علم نہیں تھا، مَیں نے خیال کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دوست میری اس تحریر کی وجہ سے کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔ وہ پیر صاحب یہ بھی کہا کرتے تھے کہ مرزائی حج کو نہیں جاتے اور نہ وہ حج کر سکتے ہیں کیونکہ دجّال خانہ کعبہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ دیکھ لو مرزا صاحب نے حج نہیں کیا اور نہ ان کے مرید کرتے ہیں۔ اس بات کا اظہار انہوں نے جس مجلس میں کیا تھا اس میں سرگودھا کے ایک احمدی بیٹھے ہوئے تھے جنہوں نے حج کیا ہوا تھا۔ اتفاق سے جب وہ احمدی دوست عرفات میں کھڑے تھے تو وہ پیر صاحب بھی وہیں تھے انہیں جگہ نہیں ملی تھی۔ پاس ہی پتھروں کی ایک منڈیر تھی جس پر وہ احمدی دوست کھڑے تھے۔ اس احمدی دوست نے پیر صاحب کو ان پتھروں پر سہارا دے کر بٹھا دیا اور خود نیچے اُتر آئے تھے۔ جب پیر صاحب نے یہ کہا کہ مرزائی حج نہیں کرتے، مرزائی دجّال ہیں اور دجّال خانہ کعبہ میں داخل نہیں ہو سکتا تو اس احمدی دوست نے کہا آپ کو تو وہاں جگہ بھی ایک احمدی نے دی تھی۔[2]

غرض اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دشمن جھوٹ کو انتہا تک لے جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو چھپایا نہیں جا سکتا کہ فریضہ حج کو جماعت احمدیہ بھی پوری طرح ادا نہیں کر رہی۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ باقی مسلمان بھی تو اس کی ادائیگی میں سُستی کر رہے ہیں کیونکہ تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ جو نقائص اور بُری باتیں مسلمانوں میں پیدا ہو گئی تھیں۔ ہم انہیں مٹانے آئے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں

کہ احمدیوں کی مساجد غیر احمدیوں کی مساجد سے زیادہ آباد ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض احمدیوں میں سستی پائی جاتی ہے لیکن یہ سستی اسی رنگ میں ہے کہ وہ مسجد میں نماز ادا کرنے میں باقاعدہ نہیں۔ ویسے وہ نماز پڑھتے ہیں۔ اور شاید سو میں سے ایک احمدی ایسا نکلے جو نماز میں سست ہو، اکثر حصہ نماز پڑھ لیگا۔ روزہ میں بھی احمدی اچھے ہیں گو خواہ رسمًا ہی سہی۔ غیر احمدیوں میں بھی روزہ اچھا ہے۔ اس میں ہم ان پر الزام نہیں لگا سکتے۔ زکوٰۃ میں احمدی بہت زیادہ اچھے ہیں دوسرے مسلمانوں میں اس فریضہ کی طرف بہت کم توجہ ہے۔

پس چاروں ارکانِ عبادت میں سے روزہ میں تو ہم فضیلت کا دعویٰ نہیں کر سکتے ہاں تھوڑا بہت فرق ہو تو کوئی بات نہیں لیکن نماز اور زکوٰۃ میں احمدیوں کا پلّہ یقینًا بھاری ہے اور اس بارہ میں احمدیوں اور غیر احمدیوں میں نمایاں فرق ہے۔ لیکن حج میں بظاہر کوئی فرق نہیں حالانکہ ہمارا فرض آدھی اصلاح کرنا نہیں بلکہ پوری اصلاح کرنا ہے جب تک روزے اور حج میں بھی احمدیوں اور دوسرے مسلمانوں میں نمایاں فرق نظر نہ آئے۔ اس وقت تک ہم پوری اصلاح کا دعویٰ نہیں کر سکتے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ احمدی روزہ میں آوارگیاں نہیں کرتے۔ گالی گلوچ نہیں کرتے، قرآن کریم کا درس سنتے ہیں پھر نسبتًا زیادہ روزے رکھتے ہیں لیکن کوئی نمایاں فرق نہیں۔ یہاں بھی رپورٹیں ایسی آتی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نوجوان روزے نہیں رکھتے۔ ہمارے خاندان کے بعض لوگ بھی روزے نہیں رکھتے اور خرابیٔ صحت کا عذر کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر بھی اس گناہ میں شامل ہو جاتے ہیں کیونکہ ڈاکٹر اس بارہ میں ان کی مدد کرتے ہیں بہرحال حقیقت یہی ہے۔ کہ احمدیوں سے بھی ایک طبقہ ایسا ہے جو روزے نہیں رکھتا حالانکہ ان کی عمر اور صحت ایسی نہیں ہوتی۔ کہ وہ روزے نہ رکھ سکیں۔ کمزوری اور چیز ہے اور ترک اور چیز ہے مثلاً ایک شخص نماز پڑھتا ہے لیکن وہ باوجود طاقت کے مسجد میں نہیں جاتا تو ہم اسے کمزور کہیں گے، تارک نہیں کہیں گے کیونکہ اس نے نماز چھوڑی نہیں۔ اس طرح اگر کوئی شخص روزہ میں احتیاط نہیں کرتا وہ گالی گلوچ سے کام لیتا ہے یا کسی سے لڑ پڑتا ہے تو ہم اس کو کمزور کہیں گے اس کو روزے کا تارک نہیں کہیں گے۔ تارک اسے کہتے ہیں جو باوجود طاقت کے روزہ رکھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ آخر وہ بیماریاں جو ہمارے اندر ہیں کیا صحابہؓ کے اندر نہیں تھیں صحابہؓ میں کیوں ایسی بیماریاں نہیں تھیں۔ تم لوگ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ پیش کر دیتے ہو، پھر کھاتے پیتے ہو۔ شکار کرتے ہو، سیر کرتے ہو۔ کیا صحابہ اور قسم کے انسان تھے اور تم اور قسم کے انسان ہو؟ ان میں اور تم میں صرف یہ فرق ہے کہ تم بہانے بناتے ہو وہ بہانے نہیں بناتے تھے۔ اس لئے اس قسم کے استثناء ان میں نظر نہیں آتے۔ اسی طرح حج کے متعلق مختلف بہانے بنا دیئے جاتے ہیں ہمیں اس کے متعلق سوچنا

چاہیئے اور اپنے اپنے محلہ میں دیکھنا چاہیئے کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جن پر حج فرض ہے اور انہوں نے حج کیا ہے۔ پھر دیکھو کتنے لوگ مکان بنا رہے ہیں۔ ہجرت کے چار سال کے بعد ہی کئی مہاجرین نئے مکان بنا رہے ہیں۔ پیچھے چھوڑے ہوئے سامان کے متعلق جو رپورٹیں وہ گورنمنٹ کو دیتے ہیں ان میں سے کوئی دو لاکھ کی ہوتی ہے کوئی تین لاکھ کی ہوتی ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ ان کی جائداد اس قدر تھی تو انہوں نے حج کیوں نہیں کیا تھا حقیقت یہ ہے کہ دلوں میں حج کی وہ عظمت نہیں رہی جو ایک سچے مسلمان کے دل میں ہونی چاہیئے اور افسوس کہ احمدیوں نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ اب اس عید سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے دلوں میں حج کی عظمت پیدا کرو اور زیادہ سے زیادہ حج کے لئے جاؤ تا کہ حج کی غرض پوری ہو اور حج سے جو خدا تعالٰی کا منشاء ہے وہ پورا ہو اور پھر جو لوگ حج کے لئے جائیں ان کا فرض ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس بات پر غور کریں کہ آج باوجود اتنی تعداد میں ہونے کے مسلمان آزاد کیوں نہیں ہیں مسلمان منظم کیوں نہیں وہ اسلام کو اس کی پہلی شان پر لے جانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ وہ ان ذرائع پر غور کیوں نہیں کرتے جن سے اسلام کو پہلی شان حاصل ہو۔ اگر مسلمان غور کریں گے تو انہیں احمدیت کے سوا کوئی اور جگہ نظر نہیں آئے گی۔ احمدیت کے اصول ہی ایسے ہیں جن پر عمل کر کے ہم اسلام کو وہی شان دلا سکتے ہیں جو اسے پہلے حاصل تھی۔ صرف پاکستان کی گورنمنٹ کا یہ کہہ دینا کہ احمدی جماعت کے سرکاری آفیسرز اپنے محکمے کے لوگوں کو تبلیغ کرتے ہیں۔ درست نہیں اگر یہ بات تھی تو ان کا فرض تھا کہ وہ اس کا ثبوت دیتے کہ فلاں افسر کی وجہ سے فلاں محکمے کے اتنے لوگ احمدی ہو گئے ہیں محض مولویوں نے یہ بات کہی اور حکومت نے یہ خیال کر کے کہ وہ ان کے بزرگ ہیں اور ہمیشہ ہی سچ بولتے ہیں، ان پر اعتبار کر لیا۔ حالانکہ دو جھوٹ مل کر سچ نہیں ہو جاتے وہ زیادہ خطرناک گناہ بن جاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ احمدیت وہ چیز پیش کرتی ہے کہ جب انسان مخلی بالطبع ہو کر اس پر غور کرے گا تو وہ ضرور ایمان لے آئے گا۔ جن عقائد اور تعلیموں کو احمدیت پیش کرتی ہے اگر انسان تعصب کی پٹی اتار کر ان پر غور کرے گا تو وہ احمدی ہو جانے پر مجبور ہو گا یہی وجہ ہے کہ مولوی کہتے ہیں کہ احمدیوں کی باتیں نہیں سننی چاہئیں۔ احمدیوں کو پتھر مارو کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جب ایک مسلمان مخلی بالطبع ہو کر احمدیت کی تعلیم پر غور کرے گا تو اس پر اُن کی دلیل کارگر نہ ہو گی۔ احمدیوں کے دلائل کے مقابلہ میں ان کی دی ہوئی دلیل کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس لئے وہ اس بات کی جرأت نہیں رکھتے کہ وہ دوسروں کو احمدیوں کی باتیں سننے دیں۔ کبھی وہ گورنمنٹ کے آگے ناک رگڑتے ہیں کبھی وہ پبلک کو احمدیوں کا بائیکاٹ کرنے پر اُکساتے ہیں۔ کبھی وہ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ جو شخص احمدیوں کی باتیں سُنے گا وہ کافر ہو جائے گا۔

کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ احمدیت کی تعلیم جب بھی مسلمانوں کے سامنے آئے گی ان کی آنکھیں کھلیں گی اور وہ احمدیت قبول کرلیں گے اس میں شبہ نہیں کہ ہزار وقت ایسے آتے ہیں جب دلیل ضائع ہوجاتی ہے لیکن پھر بھی انسان پر کچھ نہ کچھ بیداری آتی ہے اور جب بھی کسی پر بیداری آتی ہے۔ اور اس کے دل کی کھڑکی کھلتی ہے وہ سچائی کو قبول کرلیتا ہے۔ آخر وہ لوگ بھی تھے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم پر پہلے دن ایمان لائے جیسے حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ اور وہ لوگ بھی تھے جو بیسویں سال ایمان لائے جیسے حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عمروؓ بن عاصؓ۔ بے شک جو عقل خالدؓ میں بیسویں سال تھی وہی پہلے سال بھی تھی۔ لیکن فرق یہ تھا کہ پہلے سال ان کے دل کی کھڑکیاں نہیں کھلی تھیں۔ حضرت عمروؓ بن عاص میں بھی عقل تھی جو انہیں پہلے سال مسلمان بنا سکتی تھی لیکن ان کے دل کی کھڑکیاں ابھی نہیں کھلی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ اور زیدؓ کی کھڑکیاں کھلی تھیں اس لئے وہ پہلے دن ایمان لے آئے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جب فرمایا کہ مَیں خدا تعالےٰ کی طرف سے مبعوث ہُوا ہوں تو ان سب نے اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا کہا۔ لیکن کچھ لوگوں کی کھڑکیاں سال بعد کھلیں، کچھ لوگوں کی کھڑکیاں دو سال بعد کھلیں، کچھ لوگوں کی کھڑکیاں چار سال بعد کھلیں اور بعض لوگ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات کے قریب ایمان لائے۔ پس کھڑکی کھلنے کی بات ہے ورنہ یہ یقینی بات ہے کہ جب کسی کی کھڑکی کھلے گی، وہ احمدیت قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ جس طرح مولویوں نے اسلام کی شکل کو بگاڑ کر پیش کیا ہے، کوئی مسلمان مختلّی بالطبع ہو کر اسے مان نہیں سکتا۔ جو اسلام حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پیش کیا ہے، جو تشریح قرآن کریم اور حدیث کی آپ نے پیش کی ہے وہی ہے جسے دنیا آرام اور خوشی سے مان سکتی ہے باقی تشریحیں جو مولوی کرتے ہیں وہ ڈنڈے سے تو منوائی جاسکتی ہیں عقل سے نہیں منوائی جاسکتیں۔

اب میں دُعا کر دیتا ہوں کہ خدا تعالےٰ مسلمانوں کو ہدایت نصیب کرے، انہیں سعادت نصیب کرے۔ خدا تعالےٰ انہیں توفیق دے کہ جس طرح وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر حج کے لئے گئے ہیں خدا تعالےٰ بھی انہیں اپنا بنالے تاکہ وہ اللہ تعالےٰ کا سچا قرب حاصل کرسکیں۔ اور ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا تعالےٰ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو حج کی توفیق عطا فرمائے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مولد اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اٹھایا ہُوا گھر وہ عزت و شوکت حاصل کرے جس کا وہ مستحق ہے۔ مسلمان اپنے گھروں میں بھی سب سے زیادہ مومن سب سے زیادہ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اطاعت گذار اور آپؐ کے فرمانبردار ہوں اور

سب سے زیادہ آپؐ کے ساتھ تعلق رکھنے والے ہوں، ان میں ایمان ہو، تقویٰ ہو، پرہیزگاری ہو۔ سعادت ہو۔ ان کی ہر بات خدا تعالےٰ کو یاد دلانے والی ہو۔ ان کا ایک ایک لفظ خدا تعالےٰ کے ذکر کو بلند کرنے والا ہو اور اسلام کو وہ شوکت حاصل ہو جس کا وہ مستحق ہے۔

پھر ہم دُعا کرتے ہیں کہ مکّہ کے رہنے والے اسلام کی صحیح خدمت کرنے والے ہوں۔ اللہ تعالےٰ چاروں طرف سے ان کے لئے رزق مہیا کرے وہ کسی کے محتاج نہ ہوں۔ انہیں سوال کی عادت نہ ہو۔ اللہ تعالےٰ ان کی ہر قسم کی احتیاج کو دُور کرے ان کی کمینگی اور ذلّت جاتی رہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں طیّب اور فراواں رزق بہم پہنچائے۔ وہ حج کے لئے جانے والوں سے ہمیشہ محبت رکھنے والے، ان کے سچے خدمتگار اور معلّم ثابت ہوں۔ پھر ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا تعالےٰ ہم سب کو حج کی توفیق عطا فرمائے۔ ہم میں سے جن کو حج نصیب نہیں ہوا، وہ بھی حج کریں۔ تقویٰ اور پرہیزگاری سے حج کریں اور ایک ولولہ اور شوق سے کریں۔ جس ایمان سے وہ حج کے لئے جائیں، اس سے ہزاروں گنا ایمان کے ساتھ وہ واپس آئیں۔ اللہ تعالےٰ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حکومت کو دنیا میں قائم کرے اور کفر و ضلالت کو مٹا دے۔ باتوں کو بگاڑ کر پیش کرنے والوں اور جھوٹ بولنے والوں کو تباہ کرے اور لوگوں کو ان کے پنجہ سے نکالے تا وہ سچے متقی اور پرہیزگار بن جائیں وہ صالح ہو جائیں، وہ شہید ہو جائیں، وہ صدیق ہو جائیں اور جب کبھی بھی اسلام ماموروں کا محتاج ہو وہ اس میں ظاہر ہوتے رہیں۔ اور مسلمانوں کے اندر ایسی نیکی پیدا ہو کہ ان کو دیکھ کر خدا تعالےٰ سے نفرت کی بجائے خدا تعالےٰ سے محبت پیدا ہو اور لوگ مسلمانوں کے مذہب کی طرف خود بخود کھنچے چلے آئیں۔

(الفضل ۳ راکتوبر ۱۹۵۲ء)

۱؎ ۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ مؤلفہ عبد الرحمٰن الجزیری جز اوّل صفحہ ۶۳۳

۲؎ ۔ مرقس باب ۱۰ آیت ۲۵

۳؎ ۔ تاریخ احمدیت جلد ۴ صفحہ ۵۲ ، صفحہ ۶۴

۴؎ ۔ تاریخ احمدیت جلد ۴ صفحہ ۴۵

۵؎ ۔ حضرت حافظ احمد اللہ صاحب ناگپوری رضی اللہ عنہ (وفات ۱۹۲۶ء) نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی طرف سے حج بدل کیا تھا۔ (الفضل ۲۶ راکتوبر ۱۹۲۶ء)

۶؎ ۔ صحیح مسلم کتاب ذکر الدجال وصفتہ و ما معہٗ

۷؎ ۔ اس واقعہ کا تعلق حضور رضی اللہ عنہ کی ذاتی یادداشت سے ہے۔

۸؎ ۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق دیکھیں نوٹ ص۳۷

۹؎ ۔حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پہلی زوجہ مطہرہ تھیں۔زمانہ جاہلیت میں آپ کے اخلاق کو دیکھکر لوگ آپ کو طاہرہ کے نام سے پکارتے تھے۔آپ سب سے پہلے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور بعثت نبویؐ کے دسویں سال رحلت فرمائی۔اسی سال آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت ابوطالب بھی فوت ہوئے تھے۔اس لئے ان دو صدمات کی وجہ سے اس سال کو عام الحزن کہا جاتا ہے۔(زرقانی شرح مواہب لدنیہ جلد ا ص۱۹۷، ص۲۹۶)

۱۰؎ ۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق نوٹ ص۳۸ پر ملاحظہ فرمائیں۔

۱۱؎ ۔حضرت ابواسامہ زید بن حارثہ الکلبی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور پہلے تین مرد مسلمانوں میں سے ایک تھے۔جنگ موتہ میں اسلامی لشکر کے سپہ سالار تھے اسی جنگ میں لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔(اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ جلد ا ص۲۲۴)

۱۲؎ ۔حضرت خالدؓ بن ولید کے متعلق نوٹ ص۲۷ پر گزر چکا ہے۔

۱۳؎ ۔حضرت عمرو بن العاص السہمی صلح حدیبیہ اور غزوہ خیبر کے درمیانی عرصہ میں ایمان لائے۔پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اور پھر امیر معاویہ کے عہد حکومت میں دوبارہ مصر کے گورنر رہے۔سنہ ۴۳ھ میں وفات پائی (کتاب الاصابہ فی تمیز الصحابہ جلد ۶ ص۱)

۱۴؎ ۔تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۲ ص۵۵ تا ص۵۹

(۴۲)

(فرمودہ ۱۲؍اگست ۱۹۵۳ء بمقام ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی)

بوجہ اس کے کہ رستہ میں غالباً ایک جگہ کھانے میں خرابی تھی اور گھی خالص نہیں تھا، میرا گلا بیٹھ گیا۔ یہاں آکر بھی ابھی گلے کی خرابی برابر چلی جارہی ہے اور وہ درست ہونے میں نہیں آتی، شاید یہاں بھی گھی میں خرابی اور ملاوٹ ہے۔ بہرحال گلے کی سوزش اور آواز کے بیٹھنے اور پھر پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے میں زیادہ دیر تک کھڑا نہیں ہوسکتا۔ یوں تو پاؤں میں ایسی تکلیف نہیں جو کھڑے ہونے میں زیادہ دقت پیدا کرسکے، صرف انگوٹھے میں تکلیف ہے اور پاؤں کے دوسرے حصّہ پر دباؤ ڈال کر مَیں کھڑا ہوسکتا ہوں لیکن اگر کوئی اور تکلیف ہوجائے تو پھر اسے بھی مَیں محسوس کرنے لگتا ہوں۔ اسی سفر میں مَیں نے انگوٹھے کی تکلیف کے باوجود ایک لمبا خطبہ دیا تھا جواب تک مَیں درست نہیں کرسکا کیونکہ اس کا بھی طبیعت پر بوجھ معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال عید الاضحیہ کا خطبہ ایک مسنون خطبہ ہے[1] اور ایک بڑے واقعہ کی یاد دلاتا ہے اس لئے کچھ نہ کچھ تو اس موقعہ کے مناسبِ حال کہنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے تکلیف کے باوجود میں یہاں آگیا ہوں۔

قوموں میں یادگاریں قائم رکھنے کا بڑا بھاری رواج ہے اور مختلف قومیں اپنی اپنی یادگاریں قائم رکھتی ہیں۔ اوروں کو جانے دو چوہڑوں اور چماروں تک میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ وہ اپنی قومی روایات کو قائم اور زندہ رکھیں اور انہوں نے بھی اپنے لئے کوئی نہ کوئی فخر کی بات نکالی ہوئی ہوتی ہے۔

علم النفس کے ماہرین کا تجربہ ہے کہ انسانی جدوجہد جو اپنے نفس کی بہتری کے لئے کیجاتی ہے، اس کو جاری رکھنے اور پوری شان کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے جن ذرائع کو استعمال کیا جاسکتا ہے ان ذرائع میں سے زیادہ اہم اور مؤثر ذریعہ ٹریڈیشنز (TRADITIONS) یعنی رعایاتِ سابقہ ہوتی ہیں۔ ایک بچہ جب اپنے کام کے لئے اپنی جدوجہد کو لمبا نہیں کرسکتا تو اس کے رشتہ دار اور دوست اور عزیز و اقرباء اسے کہتے ہیں کہ ذرا یاد رکھنا تم کن کی اولاد میں سے ہو اور فوراً اس کی طبیعت اصلاح کی طرف مائل ہوجاتی ہے اور وہ اپنی ناکام جدوجہد کو کامیابی میں بدل دیتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی اس طریق کو استعمال کیا ہے اور اس نے لوگوں کے سامنے ان کے آباء کے کارنامے رکھے ہیں بلکہ قرآن کریم نے یہ حربہ دوہرے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس نے کفار کے آگے بھی ان کے آباء کے کارنامے رکھے ہیں اور انہیں توجہ دلائی ہے کہ جب تم ایسے

ذلیل لوگوں کی نسل میں سے ہو تو تم کیسے کامیاب ہو سکتے ہو اور اس نے مسلمانوں کے سامنے بھی ان کے پیشرؤوں کے کارنامے رکھ کر بتایا ہے کہ تم ایسے شاندار پیشرو لوگوں کے قائم مقام ہو تو کس طرح ناکام ہو سکتے ہو جب مسلمان دکھوں اور تکالیف سے گھبراتے تھے تو ان کے سامنے یہ بات پیش کی جاتی تھی کہ تمہارے پیشرؤوں نے تم سے زیادہ تکلیفیں اُٹھائی ہیں اور جب کبھی دشواریوں نے ان کی ہمتوں کو پست کرنا چاہا تو فوراً ان کے سامنے یہ بات رکھدی گئی کہ تمہارے پیشرؤوں کے سپرد جو کام تھے وہ بھی اپنی عظمت کے لحاظ سے کچھ کم نہیں تھے بلکہ بہت بڑے تھے اسی طرح اگر مسلمانوں نے کبھی قربانی کرنے میں سُستی دکھائی تو انہیں بتایا گیا کہ پہلے لوگوں نے بھی بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی مسلمانوں کو ہمّت دلانے کے لئے یہی طریق اختیار کیا تھا۔ چنانچہ جب آپ نے دیکھا کہ مسلمانوں میں ان مصائب اور آلام کی وجہ سے جو دشمن کی طرف سے پیدا کئے جا رہے ہیں۔ گھبراہٹ کے آثار نظر آتے ہیں تو آپ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم سے پہلے ایسے لوگ گزر چکے ہیں جن سے یہ سلوک کیا گیا کہ انہیں کھڑا کر کے ان کے سروں پر آرہ رکھ دیا جاتا اور پھر انہیں چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا مگر پھر بھی وہ اُف تک نہیں کرتے تھے۔ جب انہوں نے ان سخت مشکلات کو برداشت کر لیا تو تم کیوں برداشت نہیں کر سکتے؟ غرض ٹریڈیشن یا کسی قوم کے بزرگوں کی سابقہ روایات اس قوم کو ہمّت دلانے اور اسے سیدھے راستہ پر قائم رکھنے میں بڑی ممد ہوتی ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو ہماری ٹریڈیشن تو سورۃ فاتحہ سے شروع ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالےٰ ہمیں یہ دعا سکھلاتا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ اے خدا تو ہمیں سیدھا راستہ دکھا وہ رستہ جو منعم علیہ لوگوں کا تھا اور جس پر چل کر وہ لوگ کامیاب ہوئے۔ یہ منعم علیہ گروہ ہی ہے جسے قرآن کریم نے مسلمانوں کا آباء واجداد قرار دیا ہے دنیوی آباء دنیوی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور رُوحانی آباء رُوحانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص خالصۃً نسلاً بعد نسلٍ بغیر کسی شبہ کے ابراہیم علیہ السلام کا پوتا ہو لیکن ابراہیم علیہ السّلام کی خوبیوں اور اس کے کمالات سے اسے کچھ نہ ملا ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک شخص نسلی لحاظ سے ابراہیم علیہ السلام سے سینکڑوں سال کا فاصلہ رکھتا ہو اور اس کا کوئی باپ دادا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نہ ہو لیکن سو یا دو سو یا ہزار پشتوں کے باوجود پھر بھی وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہو کیونکہ ابراہیمؑ یہودیوں کا باپ نہیں تھا۔ ابراہیمؑ خلیفۃ اللہ تھا اور خلیفۃ اللہ ہونے کے لحاظ سے وہی اس کی نسل تھی جو خدا تعالےٰ سے تعلق رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بار بار مسلمانوں کو ابراہیمی طریق پر چلنے کی ہدایت دیتا ہے اور ابراہیمؑ کے طریق عبادت کو اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم خود کہتا ہے کہ

انبیاء سابقین میں سے کوئی نبی بھی ایسا نہیں جو ساری دنیا کی طرف بھیجا گیا ہو۔ صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ایک ایسے وجود ہیں جو ساری دنیا کی طرف مبعوث کئے گئے ہیں۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی فرماتے ہیں کہ مجھے خدا تعالےٰ نے ابیض واسود اور احمر و اصفر سب کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے اور مشرق و مغرب اور شمال وجنوب میں کوئی شخص ایسا نہیں جو میرے دائرہ ہدایت سے باہر ہو۔ مگر اس کے باوجود جب اللہ تعالےٰ سب مسلمانوں کو ابراہیم علیہ السلام کی اتباع کا حکم دیتا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ان کی جسمانی نسل سے نہیں بلکہ ساری دنیا سے خطاب کرتا ہے۔ اور رُوحانی لحاظ سے ساری دنیا کو ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے قرار دیتا ہے ورنہ ابراہیم علیہ السلام صرف ایک قوم کی طرف آئے تھے۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری دنیا کی طرف مبعوث ہوئے تھے بلکہ ایک قوم بھی نہیں صرف ایک قبیلہ تھا جس کی طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ بلکہ اگر ہم بائیبل کے بیان کو دیکھیں تو ایک قبیلہ بھی نہیں صرف ایک خاندان تھا جس کی ہدایت کے لئے وہ مبعوث ہوئے۔ پس یہ کہنا کہ وہ شخص صرف ایک خاندان کی طرف آیا تھا تم اس کے نقشِ قدم پر چلو بتاتا ہے کہ تم کو اس کا خاندان قرار دیا جاتا ہے اور تم بھی آئندہ ابراہیمی نسل میں سے ہو۔

غرض قرآن کریم نے ہمارے لئے ہمارے بزرگوں کی روایات کو زندہ رکھا ہے اگر ہم ان روایات کو یاد رکھیں تو ہمارے اخلاق اور ہماری ہمت اور ہمارے حوصلے کو بڑھانے میں یہ بات بہت کچھ مدد دے سکتی ہے یہ بات جو میں نے تمہارے سامنے بیان کی ہے یہ علم النفس کے لحاظ سے نہایت ہی اہم ہے اتنی اہم کہ انسان کے اخلاق اور اس کے کردار کو بالکل بدل دیتی ہے۔ میں نے تمہیں یہ نکتہ بتایا ہے کہ عید آتی ہے تو لوگ کہتے ہیں ابراہیمؑ نے بڑی قربانی کی۔ لوگ سمجھتے ہیں اسمٰعیلؑ نے اپنی جان خدا تعالےٰ کے لئے دیدی جس وقت لوگ کہتے ہیں کہ ابراہیمؑ نے بڑی قربانی کی اور جس وقت لوگ کہتے ہیں کہ اسمٰعیلؑ نے بڑی قربانی کی تو دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ سامی نسل کے ایک انسان ابراہیمؑ نے بڑی قربانی کی یا سامی نسل کے ایک انسان اسمٰعیلؑ نے بڑی قربانی کی۔ وہ اس سے یہ نتیجہ نکال رہے ہوتے ہیں کہ وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں۔ اگر وہ ایسی قربانی کر سکتے تھے تو ہم کیوں نہیں کر سکتے۔ مگر جو بات میں نے بیان کی ہے اس کے نتیجہ میں جب ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ ابراہیمؑ نے بڑی قربانی کی یا اسمٰعیلؑ نے بڑی قربانی کی تو وہ یہ نہیں سمجھتا کہ ایک سامی نسل کے انسان ابراہیمؑ نے بڑی قربانی کی یا ایک سامی نسل کے انسان اسمٰعیلؑ نے بڑی قربانی کی بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ میرے دادا ابراہیمؑ نے یہ قربانی کی یا میرے دادا اسمٰعیلؑ نے یہ قربانی کی۔ اور تم سمجھ سکتے ہو کہ میرے باپ دادا کہنے اور سامی نسل کے

ایک باپ اور دادا کہنے میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ ایک شخص سمجھتا ہے کہ سامی نسل کا ایک انسان تھا جس نے یہ قربانی کی۔ وہ بھی انسان تھا اور مَیں بھی انسان ہوں۔ اگر وہ یہ کام کرسکتا ہے تو مَیں بھی یہ کام کرسکتا ہوں لیکن دوسرا شخص سمجھتا ہے کہ مجھے قرآنی اصطلاحات نے ابراہیمؑ کی اولاد میں سے قرار دیا ہے۔ مجھے قرآنی اصطلاحات نے اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے قرار دیا ہے۔ پس ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے جو کچھ کیا سامی نسل کے لئے نہیں کیا بلکہ میرے ایک باپ اور میرے ایک دادا نے یہ کام کیا اور مَیں بھی اس کا خون اپنے اندر رکھتا ہوں۔ جو شخص اس نقطۂ نگاہ سے ابراہیمؑ کی قربانی کو دیکھتا ہے اس کے جذبات بالکل اور ہوتے ہیں۔ لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات حدیثوں میں پڑھتے ہیں یہ حدیثیں شیعوں کی بھی ہیں اور سُنیوں کی بھی ہیں لیکن جب شیعوں کی حدیثیں پڑھی جائیں تو ان میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ ہمارے نانا محمد رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں کہا یا ہمارے دادا علیؓ نے یوں کہا۔ اب جس شان کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نانا اور علیؓ کو دادا کہنے والے راوی کا قول نظر آتا ہے اسی شان کے ساتھ کسی دوسرے راوی کا قول کہاں نظر آسکتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں درود میں بھی یہی تعلیم دی گئی ہے چنانچہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ میں یہی بتایا گیا ہے۔ کہ ہر مسلمان کو اپنی ذہنیت ایسی بدل لینی چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو محمد رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد میں سے سمجھنے لگے۔ جب ہم دُعا کرتے ہیں کہ الٰہی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپ کی آل پر فضل نازل کر۔ تو ظاہر ہے کہ اس جگہ آل سے مراد صرف نسل نہیں ہوتی بلکہ ہر وہ شخص ہوتا ہے جو محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلقۂ غلامی میں شامل ہوتا ہے۔ آخر انسان کا کوئی فقرہ اس کے عام طریق کار اور معمول سے مختلف نہیں ہوسکتا۔ یا تو ہمیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی ایسی دُعا نظر آنی چاہیئے جس میں آپ نے عام مسلمانوں کو باہر رکھا ہو اور صرف اپنی نسل کو شامل کیا ہو اور یا پھر یہی سمجھنا چاہیئے کہ اس جگہ آل سے صرف جسمانی آل مراد نہیں بلکہ روحانی آل مراد ہے۔ جب رسُول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لئے اور اپنے خاندان کے لئے کوئی الگ دعا نہیں کی تو ماننا پڑے گا کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ میں سارے مسلمانوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اور آل سے صرف جسمانی آل مراد نہیں بلکہ رُوحانی آل مراد ہے۔

اور روحانی آل جسمانی آل سے کم نہیں ہوتی۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں عملاً اس کا تجربہ ہوچکا ہے۔ جب صلح حدیبیہ کا موقعہ آیا تو عرب لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ اگر ہم مسلمانوں کو عمرہ سے روکیں گے تو سارے عرب میں ہماری بدنامی ہوگی اور دوسری طرف اگر ہم نے ان کو نہ

آنے دیا تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے زور سے داخل ہوئے ہیں انہوں نے ایک درمیانی طریق نکالا کہ ہم آپس میں صلح کر لیں اور اگلے سال مسلمانوں کو طواف کعبہ کے لئے آنے کی اجازت دیں۔ چنانچہ انہوں نے عرب کا ایک بڑا سردار صلح کے لئے بھجوایا۔ وہ اتنا بڑا سردار تھا کہ سارا عرب اس کی عزت کرتا تھا اور وہ اتنا مخیر تھا کہ مکہ کا کوئی فرد ایسا نہیں تھا جو اس کے احسان کے نیچے نہ ہو۔ مکہ والے جانتے تھے کہ جب یہ سردار گیا تو مسلمان جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ریڑھ کی ہڈی ہیں ان کی آنکھیں اس کے سامنے نیچی ہو جائیں گی چنانچہ وہ آیا اور اس نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گفتگو شروع کی۔ بات کرتے وقت جیسے گاؤں کے لوگوں اور زمینداروں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کی داڑھی کو اپنا ہاتھ لگاتے ہیں اس نے بھی متکبرانہ لہجہ میں کہا کہ جانتے ہو میری کیا حیثیت ہے۔ میں سارے عرب کا سردار ہوں تم کچھ تو میرا لحاظ کرو۔ اور دیکھو میں تمہاری داڑھی کو ہاتھ لگاتا ہوں کہ میری عزت کا خیال کرو۔ یہ کہکر اس نے اپنا ہاتھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی داڑھی کی طرف بڑھایا۔ اس پر ایک صحابی نے زور سے اپنی تلوار کا کندہ اس کے ہاتھ پر مارا اور کہا اپنے ناپاک ہاتھ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک داڑھی کو مت لگا۔ اس نے اوپر کی طرف دیکھا کہ یہ شخص کون ہے اور اسے پہچان کر کہنے لگا کہ تم فلاں ہو۔ کیا تم میں بھی جرأت ہے کہ تم میرے ہاتھ کو اپنی تلوار کے کندہ سے ہٹاؤ۔ کیا تمہیں میرے فلاں فلاں احسانات یاد نہیں رہے؟ چونکہ اس صحابی کا خاندان اس سردار کا ممنونِ احسان تھا اس لئے جب اس نے یہ فقرہ سُنا تو پیچھے ہٹ گیا۔ وہ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہوا اور اس نے کہا میں بزرگ ہوں۔ بڑی عمر گذار چکا ہوں۔ تم زمانہ کے حالات کو سمجھو۔ یہ لوگ جن میں سے کوئی کسی جگہ کا آدمی ہے اور کوئی کسی جگہ کا آدمی۔ یہ تمہارے کیا کام آسکتے ہیں۔ آخر اپنے خاندان کے آدمی اور اپنے بھائی ہی کام آیا کرتے ہیں۔ تم ان کے لئے اپنے بھائیوں سے نہ لڑو۔ اور دیکھو میں تمہیں یہ بات کہتا ہوں اور پھر اس نے آپ کی داڑھی کو ہاتھ لگانا چاہا اس پر ایک اور شخص آگے بڑھا اور اس نے اپنی تلوار کا کندہ اس کے ہاتھ پر مارا اور کہا۔ اپنے ناپاک ہاتھ پیچھے ہٹا۔ اس نے پھر اوپر کی طرف آنکھ اٹھائی اور پہچان کر کہنے لگا کیا تم میں جرأت ہے کہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرو۔ کیا تم جانتے نہیں کہ میں کون ہوں اور میرے تم پر کتنے احسانات ہیں؟ اس پر وہ بھی شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ غرض وہ بار بار زور دیتا کہ اپنے خاندان کے لوگوں سے نہیں لڑنا چاہیئے۔ ان کے تعلقات دوسروں کے قائم مقام نہیں ہو سکتے یہ لوگ منہ سے تو باتیں کرتے ہیں مگر اتنی محبت نہیں رکھ سکتے جتنی محبت رشتہ دار رکھا کرتے ہیں

اس وقت ایک ایک صحابی کے دل میں جوش آتا تھا کہ ہم اسے پیچھے ہٹائیں مگر وہ سب کے سب مجبور تھے کیونکہ ان کے دلوں میں یہ احساس تھا کہ اس شخص کے ہم پر احسانات ہیں۔ تب صحابہؓ کہتے ہیں اس وقت ہمارے دل میں دعا کا جوش پیدا ہوا اور ہم نے کہا۔ خدا اب کسی ایسے بندے کو آگے لائے جس پر اس کا احسان نہ ہو۔ تب ایک شخص آگے بڑھا اور جب پھر اس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی داڑھی کو ہاتھ لگانے کے لئے اپنا ہاتھ آگے کیا تو اس نے ایک سخت لفظ استعمال کر کے جو میں خطبہ میں دہرا نہیں سکتا مگر بخاری میں موجود ہے۔ زور سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیکر پیچھے ہٹا دیا اور کہا کہ اپنا ناپاک ہاتھ پیچھے ہٹا۔ اس نے آنکھیں اٹھائیں یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ کون شخص ہے اور پھر اس نے اپنی آنکھیں نیچی کرلیں اور کہا کہ میں تجھے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میرا تجھ پر کوئی احسان نہیں۔ یہ نیا شخص ابوبکرؓ تھا۔ گویا سارے صحابہؓ میں سے صرف ایک ابوبکرؓ ہی تھے جن پر اس کا کوئی احسان نہیں تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ سارے اس کے احسانوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور اس وجہ سے وہ کچھ نہیں کرسکتے تو انہوں نے سمجھا کہ اب میرا کام ہے کہ میں آگے آؤں تو رشتہ داروں کی محبت اور ان کے فوائد بتانے کا واقعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں موجود ہے۔

مگر پھر وہی لوگ جن کے متعلق پنجابی محاورہ کے مطابق کہا جاتا ہے کہ یہ وَنْ وَنْ کی لکڑی ہے۔ (مختلف جنگلوں کی لکڑی ہے) انہوں نے اپنے اخلاص اور فدائیت کا وہ نمونہ دکھایا جس کی نظیر دنیا میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ حقیقت یہی ہے کہ وہ وَنْ وَنْ کی لکڑی تھی اور وَنْ وَنْ کی لکڑی کارآمد نہیں ہوتی۔ اگر تم نے اچھا فرنیچر تیار کرنا ہو اور مختلف قسم کی لکڑیاں تمہارے پاس ہوں۔ کوئی دو سال کی ہو۔ کوئی پانچ سال کی ہو کوئی دس سال کی ہو، کوئی سو سال کی ہو اور پھر کوئی شیشم کی ہو کوئی کیکر کی ہو، کوئی گیلی ہو اور کوئی سوکھی تو کبھی تم اس سے اچھا فرنیچر تیار نہیں کرسکتے۔ اچھے فرنیچر کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایک جگہ اور ایک عمر اور ایک ہی قسم کی لکڑی ہو۔ اگر مختلف جنگلوں سے مختلف قسم کی لکڑی کاٹ کر لائی جائے تو عمدہ فرنیچر نہیں بن سکتا۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت سے اور آپ کی دعاؤں اور روحانیت کی برکت سے وہی جو مختلف جنگلوں کی کاٹی ہوئی لکڑیاں تھیں ان میں اتنا اتحاد پیدا ہو گیا کہ کوئی رشتہ دار اپنی محبت کا اس قسم کا نمونہ نہیں دکھا سکتا جس قسم کا نمونہ انہوں نے دکھایا۔

اسلام کی سخت ترین جنگوں میں سے ایک غزوۂ احزابؓ ہے۔ عام طور پر مسلمان چونکہ تاریخ کا مطالعہ نہیں کرتے اس لئے وہ بدر اور احد کی تفصیلات سے تو واقف ہیں لیکن احزاب سے نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم نے اس پر خاص زور دیا ہے۔ کیونکہ احزاب کی جنگ ہی ہے جس میں دشمن نے متحدہ طور پر مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ اور ایسی صورت میں کیا کہ ظاہری حالات

کے لحاظ سے مسلمانوں کا ان کے مقابلہ میں ٹھہرنا بالکل ناممکن نظر آتا تھا۔ مسلمانوں کی تعداد اس جنگ میں صرف بارہ سو تھی جس میں سے پانچ سو مسلمان عورتوں کی حفاظت کے لئے رکھے گئے تھے[۱۱۵] اور صرف سات سو مسلمان دشمن کے مقابلے میں کھڑے کئے گئے تھے[۱۱۶]۔ اور دشمن کی کم سے کم تعداد دس ہزار تھی جسے چوبیس ہزار تک بھی بیان کیا جاتا ہے[۱۱۷]۔ پھر یہ سارے عرب کا مقابلہ تھا۔ مکہ کے تمام قبائل اس میں شریک تھے اور یہودی بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے[۱۱۸]۔ عرب کے ایک ایک قبیلہ کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ تھی۔ اور پھر ان کے آپس میں خونی رشتے بھی تھے۔ اور وہ سب مل کر اپنی جان دینے کے لئے تیار اور آمادہ تھے۔ ادھر مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ ان کے اپنے پہلو میں یہودی لوگ تھے جن سے ان کا معاہدہ تھا مگر یہ بھی خطرہ تھا کہ وہ کسی وقت کوئی شرارت نہ کر دیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ لینے کے بعد شہر کی اس جہت میں جو بے حفاظت تھی اور جس طرف سے دشمن کے حملہ کا امکان تھا قریباً ایک میل لمبی خندق کھدوا دی تھی۔ مگر مسلمانوں کے پاس چونکہ سامان کم تھا اور آدمی بھی تھوڑے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ زیادہ لمبی، زیادہ گہری اور پھر زیادہ چوڑی خندق نہیں کھود سکتے تھے۔ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ وہ خندق جو مسلمانوں نے کھودی اس پر سے ایک اچھا گھوڑ سوار اپنے گھوڑے کو کدا کر آ سکتا تھا۔ پھر مشکل یہ تھی کہ ایک میل لمبے علاقہ کی حفاظت مسلمانوں کے سپرد تھی۔ اور مسلمانوں کی تعداد صرف سات سو تھی۔ سات سو آدمیوں کا چوبیس گھنٹے متواتر اس کی حفاظت کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ چنانچہ ایک دو دن کے بعد کفار نے فیصلہ کیا کہ بہترین طریق مقابلہ کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو تھکایا جائے۔ انہوں نے اپنی فوج کو چار ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ چوتھا حصہ حملہ کرتا تھا اور باقی لوگ آرام کرتے تھے۔ اور جب وہ لوگ تھک جاتے تو دوسری تازہ دم فوج ان کی جگہ آ جاتی۔ فرض کرو کہ وہ دس ہزار تھے تو صرف اڑھائی ہزار مقابلہ کرتے اور ساڑھے سات ہزار آرام کرتے۔ جب اڑھائی ہزار مقابلہ کر کے تھک جاتے تو واپس چلے جاتے اور دوسرے اڑھائی ہزار ان کی جگہ آ جاتے۔ لیکن مسلمانوں کے لئے ایک منٹ بھی آرام کرنا ناممکن تھا کیونکہ ان کی تعداد تھوڑی تھی اور انہوں نے اپنا سات سو آدمی تمام خندق پر پھیلا رکھا تھا۔ چنانچہ بیسیوں واقعات ایسے ہوئے کہ دشمن کے آدمی گھوڑوں پر سوار ہو کر خندق پر سے کودے اور مسلمانوں کے علاقہ میں آ گئے مگر باوجود اس کے وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک نہیں پہنچ سکے۔ سر ولیم میور SIR WILLIAM MUIR اسلام کے شدید دشمنوں میں سے ہے مگر باوجود شدید دشمن ہونے کے وہ بڑا ذہین انسان ہے اور جہاں کوئی بات اسے مسلمانوں کی تائید میں نظر آتی ہے اسے بھی وہ بیان کرنے میں ہچکچاتا نہیں وہ اپنی کتاب میں جنگ احزاب کے واقعات پر تفصیل سے بحث کرتا ہے اور پھر کہتا ہے

کہ اتنے دنوں تک مسلمانوں پر حملہ کیا گیا اور متواتر اور پوری شدت کے ساتھ کیا گیا۔ یہ حملہ چوبیس چوبیس گھنٹے مسلسل کیا گیا اور مسلمانوں کو آرام کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا۔ پھر اگر خندق زیادہ چوڑی ہوتی تب بھی ہم سمجھ سکتے تھے کہ مسلمان مطمئن تھے کہ دشمن ہم تک نہیں پہنچ سکتا۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ متعدد بار دشمن کے آدمی مسلمانوں کے علاقہ میں آ گئے اور پھر واپس بھاگنے پر مجبور ہو گئے وہ سوال اٹھاتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ اتنی تھوڑی تعداد کے باوجود اور دشمن کے اتنے متفقہ حملے کے باوجود جبکہ مسلمانوں کو آرام کرنے کا بھی کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔ ایسا کیوں ہوا کہ دشمن جب بھی خندق پار کر کے آتا وہ واپس بھاگنے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہمیں صرف ایک ہی وجہ نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا وجود ان کی نگاہوں میں اتنا عزیز تھا اور اتنا قیمتی اور مقدس تھا کہ جب دشمن قریب پہنچتا تو مسلمان انسان نہیں رہتے تھے بلکہ وہ کچھ اور ہی چیز بن جاتے تھے۔ وہ پہاڑوں کو دھکیل کر پرے پھینک دینے پر تیار ہو جاتے تھے، وہ سمندروں کو چیر کر گذر جانے پر آمادہ ہو جاتے تھے، وہ اس وقت آپ کی محبت میں اپنے وجود کو بھول جاتے تھے۔ اپنی انسانی کمزوریوں کو بھول جاتے تھے اور مجنونوں کی طرح آگے بڑھ کر ہر سامنے کی چیز کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر پھینک دیتے تھے[۱۷]۔ چنانچہ جب کبھی دشمن کا لشکر کود کر آگے آیا اور اس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھنا چاہا تو وہ دیوانہ وار اس کے مقابلے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ اور انہوں نے کم سامان اور کم تعداد کے باوجود زیادہ ساز و سامان اور زیادہ تعداد رکھنے والوں کو ایسا مارا کہ ان کے لئے سوائے بھاگنے کے اور کوئی چارہ نہ رہا[۱۸]

غرض فتح بے شک آئی مگر کئی ہفتوں کے بعد۔ درمیانی عرصہ جو ایک نہایت ہی کٹھن زمانہ تھا۔ اس غیر معمولی ایثار۔ اور قربانی اور بے مثال اخلاص اور فدائیت کی وجہ سے گذرا جس کا مظاہرہ عرب کے مختلف حصوں کے مسلمانوں نے کیا۔ جن کی رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے کوئی رشتہ داریاں نہیں تھیں مگر دینی لحاظ سے ان کا آپ کے ساتھ ایسا تعلق تھا کہ انہوں نے آپ کے لئے اتنی بڑی قربانیاں کیں کہ قریبی رشتہ داروں میں سے کوئی باپ اپنے بیٹے کے لئے یا کوئی بیٹا بھی اپنے باپ کے لئے ایسی قربانی نہیں کر سکتا۔ تو دینی رشتہ دنیوی رشتوں سے بہت زیادہ اہم ہوتا ہے یہی وہ رشتہ ہے جو اپنی شدت کے لحاظ سے اور اپنی اہمیت اور تقدیس کی وجہ سے چھوٹی قوموں کو آگے بڑھاتا اور انہیں دنیا پر غالب کر دیتا ہے۔ ان کے اندر اس تعلق کی وجہ سے قربانی اور ایثار کا ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز اسے دبا نہیں سکتی۔ بدر کی جنگ میں تھوڑے سے مسلمان تھے اور پھر انہیں لڑائی کا کسی قسم کا تجربہ حاصل نہیں تھا۔ جب کفار کا لشکر مسلمانوں

کے قریب پہنچ گیا تو کفار نے یہ جائزہ لینے کے لئے کہ مسلمانوں کی کتنی تعداد ہے اپنے ایک آدمی کو تحقیقات کے لئے بھجوایا۔ اس نے ان اونٹوں سے جو ذبح کئے جا رہے تھے مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ لگا لیا اور انہیں جا کر کہا کہ میرے نزدیک مسلمانوں کی تعداد تین سو ساڑھے تین سو کے درمیان ہے۔ اس پر انہوں نے سمجھا کہ اتنی تھوڑی تعداد کا تو ہم بڑی آسانی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں گے۔ مگر جو شخص تحقیقات کے لئے گیا تھا اس نے کہا کہ واقعہ تو یہی ہے جو میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ ان کی تعداد زیادہ نہیں بس تین سو اور ساڑھے تین سو کے درمیان ہے لیکن میری نصیحت یہی ہے کہ آپ لوگ ان سے لڑنے کا ارادہ نہ کریں۔ کیونکہ وہ ہیں تو تھوڑے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں جب ان کو دیکھنے کے لئے گیا تو میں نے اونٹوں اور گھوڑوں پر آدمی سوار نہیں دیکھے بلکہ موتیں سوار دیکھی ہیں۔ یعنی ان میں سے ہر شخص اس نیت اور ارادہ سے اپنے گھر سے نکلا ہے کہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دائیں اور بائیں مر جائیگا مگر واپس نہیں جائیگا۔ ایسے لوگوں کا مقابلہ کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ یہ اخلاص اور فدائیت کی روح ان میں کس طرح پیدا ہوئی؟ اسی دینی تعلق کی وجہ سے جو اُن کا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھا۔ پھر یہ تو دُور کی بات ہے تیرہ سو سال گزر گئے اور مسلمان نسلاً بعد نسلٍ کمزور ہوتے چلے گئے۔ دین کی محبت ان کے دلوں سے کم ہو گئی، اسلامی احکام پر عمل جاتا رہا، غفلت اور سستی ان پر چھا گئی مگر اس گئے گذرے زمانہ میں بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ان کے دلوں میں ایسی مرکوز نظر آتی ہے کہ اسے دیکھکر مُردہ ایمان بھی زندہ ہو جاتا ہے۔

میں چھوٹا تھا کہ قادیان میں ایک عورت آئی وہ میراثی خاندان میں سے تھی۔ وہ اپنے ساتھ اپنے لڑکے کو بھی لائی، اُسے سِل کا مرض تھا۔ اس نے حضرت مولوی صاحب خلیفہ اوّلؓ کی تعریف سُنی تو وہ آپ کے پاس اپنے لڑکے کو علاج کے لئے لے آئی۔ مگر جب وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملی تو اس نے کہا کہ اصل میں میں اس لئے نہیں آئی کہ اپنے بیٹے کا علاج کرواؤں بلکہ دراصل میں اس لئے آئی ہوں کہ میرا بیٹا عیسائی ہو گیا ہے۔ میں نے سُنا تھا کہ آپ نے عیسائیوں کا بڑا ردّ کیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اس لڑکے کو سمجھائیں تاکہ یہ کسی طرح مسلمان ہو جائے۔ اس نے بتایا کہ ہمارا قبیلہ اپنے اخلاق کے لحاظ سے بہت گھٹیا قسم کا ہے ہمارا پیشہ گانا بجانا ہے۔ میں خود بھی شادیوں پر گاتی بجاتی ہوں لیکن میں اس امر کو برداشت نہیں کر سکتی کہ میرا بیٹا عیسائی ہو کر مرے۔ میں آپ کے پاس اسے اس لئے لائی ہوں کہ وہ کسی طرح مسلمان ہو جائے۔ میں اس وقت چھوٹا بچہ تھا مگر وہ نظارہ ایسا تھا جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے سامنے بیٹھی ہے اس نے ہاتھ

جوڑے ہوئے ہیں اور زار و قطار رو رہی ہے۔ اور کہہ رہی ہے کہ حضور میرا ایک ہی بیٹا ہے میں نہیں چاہتی کہ یہ اچھا ہو جائے میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ یہ ایک دفعہ کلمہ پڑھ لے اور پھر خواہ اسی وقت مر جائے۔ غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت تیرہ سو سال گذرنے کے بعد بھی مسلمانوں کے دلوں میں اتنی پائی جاتی ہے کہ ایک ایسی عورت جو نہایت ادنیٰ اور ذلیل خاندان میں سے تھی وہ بھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کا لڑکا کلمہ پڑھے بغیر اس دنیا سے گذر جائے۔ مگر وہ لڑکا بھی بڑا پکا عیسائی تھا۔ اسے تبلیغ شروع ہوتی تو اس نے ارادہ کیا کہ قادیان سے بھاگ جائے۔ چنانچہ ایک رات کو وہ اُٹھا اور بیماری کی حالت میں ہی بٹالہ کی طرف بھاگ گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی ماں کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ چارپائی خالی پڑی ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ میرا لڑکا بھاگ گیا ہے۔ چنانچہ وہ بھی اس کے پیچھے بھاگی اور پانچ سات میل پر جا کر اس نے اپنے بیٹے کو پکڑا اور پھر اسے قادیان واپس لائی۔ اور اس طرح گڑگڑا گڑگڑا کر وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے کہنے لگی کہ حضور دعا کریں یہ ایک دفعہ کلمہ پڑھ لے پھر بے شک مر جائے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ آخر خدا نے اس کی دعا سُن لی اور وہ لڑکا مسلمان ہو گیا اور پھر چند دنوں کے بعد مر گیا۔ اس کی ماں نے اس صدمہ کو بڑے صبر سے برداشت کیا۔ اور وہ خوش تھی کہ میرا لڑکا عیسائی ہو کر نہیں مرا بلکہ کلمہ پڑھ کر مرا ہے۔ تو رشتوں کی محبت بے شک جاہل لوگوں اور نادان لوگوں میں زیادہ ہوتی ہے لیکن انسانیت کا مقام اس محبت سے انسان کو اونچا لے جاتا ہے۔ جتنا نیچے چلے جاؤ محبت کا ذریعہ مادیت ہوتی ہے لیکن جتنا اوپر چلے جاؤ محبت کا ذریعہ روحانیت ہوتی ہے۔ جتنا جتنا انسان جانوروں میں شامل ہو گا۔ اتنی ہی اس میں مادیت والی محبت اور بھائیوں اور رشتہ داروں کی محبت زیادہ ہو گی اور جتنا جتنا اونچا ہو گا۔ اتنی ہی اس کی محبت بھی بلند سے بلند تر ہوتی چلی جائے گی۔ پہلے وہ اپنی اولاد سے زیادہ محبت رکھے گا۔ پھر اَور اونچا ہو گا تو اپنے خاندان سے محبت رکھے گا۔ اَور اونچا ہو گا تو اپنے وطن سے محبت کرنے لگ جائے گا۔ اور اونچا ہو گا تو اپنی قوم سے محبت کرنے لگ جائے گا۔ اَور اونچا ہو گا تو انسانیت سے محبت کرنے لگ جائیگا۔ اَور اونچا ہو گا تو دینِ الٰہی سے محبت کرنے لگ جائیگا۔ اور اونچا ہو گا تو فرشتوں سے تعلق رکھنے لگ جائے گا۔ اَور اونچا ہو گا۔ تو اس کا خدا سے تعلق ہو جائے گا۔ مگر خدائی تعلق کا پہلا زینہ خدا تعالےٰ کے نبیوں سے تعلق پیدا کرنا ہے جس طرح تمہارے لئے یہ ناممکن ہے کہ تم چھلانگ لگا کر چھت پر چڑھ سکو اسی طرح تمہارے لئے یہ ناممکن ہے کہ خدا تعالےٰ کی طرف راہنمائی کرنے والے وجودوں کو چھوڑ کر تم خدا تعالےٰ سے تعلق پیدا کر سکو مگر جس طرح کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے

کہ چھت پر بیٹھا ہوا انسان جب دیکھتا ہے کہ کسی پر شیر یا ڈاکو نے حملہ کر دیا ہے تو وہ بھی گر کر اس کو اوپر کھینچ لیتا ہے اسی طرح کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ جب دیکھتا ہے کہ کوئی شخص اس سے ملنے کی سچی تڑپ رکھتا ہے لیکن وہ ایسے ماحول میں ہے کہ اسے انبیاء کی رہنمائی میسّر نہیں آسکتی تو وہ خود اس کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے مگر ایسا بہت شاذ ہوتا ہے اور شاذ پر کسی قانون کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ عام قانون یہی ہے کہ جو لوگ خدا نما وجود ہوتے ہیں انہی کے ذریعہ انسان کو روحانی ترقی ملتی ہے۔ اور اس ترقی کے حصول کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ انسان دنیوی محبتوں کو سرد کر کے، ان کی محبت کو اپنے اوپر غالب کرے۔ جب وہ ان کی محبت کو غالب کر لیتا ہے تو ان کا نمونہ اختیار کرنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی غیر ہے جس کی میں اقتداء کر رہا ہوں بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا باپ ہے اور اس کا خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ یہی سبق اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ میں سکھایا گیا ہے اور پھر آگے ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ کا ذکر کر کے بتایا گیا ہے کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ ابراہیمؑ کی اولاد میں بھی شامل ہو جاتا ہے۔ پھر جو کام اسمٰعیلؑ نے کیا وہی کام وہ خود بھی کرنے لگ جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ اگر اسمٰعیلؑ نے یہ قربانی پیش کر دی تھی تو میں کیوں نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس لئے کہ وہی خون جو اسمٰعیلؑ کی رگوں میں دوڑ رہا تھا میری رگوں میں بھی دوڑ رہا ہے۔ اور میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیٹا ہو کر ابراہیمؑ کا بھی بیٹا ہوں اور ابراہیمؑ کا بیٹا ہو کر اسمٰعیلؑ کے کاموں میں اس کا شریک ہوں پس جو کام اس نے کیا وہ میں بھی کر دوں گا۔ جو شخص اس نقطۂ نگاہ سے اسلام کو دیکھتا ہے اس کے لئے عید الاضحیہ بالکل اور چیز ہو جاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دوسروں کی باتیں سن کر نصیحت حاصل کرنا عقلمند انسان کا کام ہے۔ یہ بھی درست ہے مگر اپنے ہی خاندان کے افراد کی قربانی اور ان کا نمونہ جو تغیر انسان کے اندر پیدا کر سکتا ہے وہ کسی دوسرے کی قربانی اور اس کا نمونہ تغیر پیدا نہیں کر سکتا۔

پس عید الاضحیہ کے آنے پر ہر مسلمان یہ سبق تازہ کرتا ہے کہ اس میں کسی غیر کا ذکر نہیں بلکہ میرے بھائی اسمٰعیلؑ کی قربانی کا ذکر ہے۔ اگر اس نے ایسا نمونہ دکھایا تھا تو میں کیوں نہیں دکھا سکتا۔ اگر ابراہیمؑ کا ایک بیٹا ایسی قربانی کر سکتا ہے تو اس کا دوسرا بیٹا ایسی قربانی کیوں نہیں کر سکتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ چونکہ ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل میں سے ہیں جو ساری دنیا کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ اس لئے ایک سچا مسلمان تو اس موقع پر یہ کہے گا کہ اگر حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی راہ میں اپنا ایک بیٹا قربان کیا تھا تو میں دین کی راہ میں اپنے

دو بیٹے پیش کروں گا۔ کیونکہ میں ابراہیمؑ ہی کی نہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی آل ہوں۔
غرض ہر مسلمان اگر حقیقی معیارِ رُوحانیت کو حاصل کرنا چاہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد میں سے سمجھنے کی عادت ڈالے۔ پھر آدم تک جو سلسلہ انبیاء جاری رہا اس کا اپنے آپ کو جزو سمجھے۔ جب وہ اس بات کو سمجھ لے گا تو اس کا اخلاص بالکل اور رنگ اختیار کرلے گا۔ اس کی روحانیت ترقی کرجائے گی۔ اس کی قربانی بڑھ جائے گی۔ اور اس کی روح ایک نیا جامہ پہن لیگی۔ اور جو چیز اسے پہلے دوسروں کے باپ میں نظر آتی تھی۔ وہ اسے اپنے خاندان میں نظر آنے لگے گی۔ تب وہ خطرناک وادیاں جن میں سے گذرتے بلکہ داخل ہوتے بھی لوگ ڈرتے اور گھبراتے ہیں ان میں سے گذرنا اس کے لئے آسان ہوجائے گا اور وہ خدا تعالیٰ کے قرب میں تیزی سے ترقی کرنے لگے گا۔ پس اس عید سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ روح اپنے اندر پیدا کرو کہ یہ دوسروں کے باپ کے قصے نہیں بلکہ تمہارے اپنے باپوں اور اپنے خاندان کے واقعات ہیں جو تمہارے لئے ایک مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کو عید الاضحیہ کے ذریعہ تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔"

(المصلح کراچی ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۳ء)

لہ ۔ سنن ابی داؤد کتاب صلوٰۃ العیدین باب الخطبۃ یوم العید۔

ٹہ ۔ المائدہ ۵: ۱۰۵۔ الانعام ۶ ۸۸۔ الاعراف ۷: ۷۴

تہ ۔ صحیح بخاری کتاب المناقب (بنیان الکعبۃ) باب ما لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ من المشرکین بمکۃ۔

کہ ۔ الفاتحہ ۱: ۶-۷

ھہ ۔ البقرہ ۲: ۱۳۶۔ آل عمران ۳: ۹۶۔ النساء ۴: ۱۲۶

لہ ۔ الاعراف ۷: ۱۶۰، سبا ۳۴: ۲۹

ٰ ۔ تفسیر دُر منثور جلد ۵ صفحہ ۲۳۷

شہ ۔ صحیح بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب۔ تاریخ کامل ابن اثیر ۲۰۱/۲
تاریخ طبری ۶۲۲/۲، زرقانی شرح المواہب اللدنیہ ۱۸۹/۲

فہ ۔ غزوۂ احزاب یا خندق کے متعلق نوٹ صفحہ ۲۰۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔

۱۱۱ ۔ زرقانی شرح المواہب اللدنیہ جلد ۲ صفحہ ۱۱

۱۱۲ ۔ زرقانی شرح المواہب اللدنیہ جلد ۲ صفحہ ۱۰۵

۱۱۳ ۔ زرقانی شرح المواہب اللدنیہ جلد ۲ صفحہ ۱۰۵

۱۱۴ ۔ سیرۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم مؤلفہ علامہ شبلی نعمانی جلد اول صفحہ ۳۰۸

۱۱۵ ۔ تاریخ کامل ابن اثیر ۲ صفحہ ۱۸۰ ، زرقانی شرح المواہب اللدنیہ ۲ صفحہ ۱۱۱

۱۱۶ ۔ تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۵۲۷

۱۱۷ ۔ یہ تبصرہ صرف جنگِ اُحد کے ضمن میں کیا گیا ہے ۔ (WILLIAM MUIR: LIFE OF MAHOMET. V.3. P.172-173.)

۱۱۸ ۔ زرقانی شرح المواہب اللدنیہ جلد ۲ صفحہ ۱۱۷

۱۱۹ ۔ عمیر بن وہب الجمحی

۱۲۰ ۔ تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۴۴۷

۱۲۱ ۔ اس سارے واقعہ کے راوی حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ ہی ہیں معلوم ہوتا ہے سائلہ مذکورہ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمتِ اقدس میں جب یہ درخواست پیش کی تو اس وقت حضور رضی اللہ عنہ موجود تھے اس لئے کسی حوالے کی ضرورت نہیں ہے ۔

۴۳

(فرمودہ ۱۰ اگست ۱۹۵۴ء بمقام ناصر آباد سندھ)

یہ عید ہمیں اس بات کا سبق دیتی ہے کہ کس طرح قربانیوں سے قومیں بنتی ہیں اور کس طرح عیاشیوں سے قومیں مرتی ہیں جس طرح موت ایک ایسی چیز ہے جو ہر انسان پر آتی ہے مگر پھر بھی لوگ اسے یاد نہیں رکھتے۔ اسی طرح قومی تباہی بھی ایسی چیز ہے جو ہر قوم پر آتی ہے مگر پھر بھی کوئی قوم اسے یاد نہیں رکھتی یہ ایسا سبق ہے جسے آجتک کبھی کسی نے یاد نہیں رکھا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے بھیڑوں میں سے جب اگلی بھیڑ کوئی کام کرے تو دوسری بھیڑ بھی وہی کام کرنے لگتی ہے جو پہلی نے کیا ہوتا ہے۔ اگر آگے گڑھا ہو اور پہلی بھیڑ اس میں گر جائے تو دوسری بھی اس میں گرتی ہے اور تیسری بھی اس میں گرتی ہے۔ یہانتک کہ چرواہا انہیں ہٹائے تو وہ ہٹتی ہیں ورنہ اس میں گرتی چلی جاتی ہیں۔ علم حیوانات کے ماہرین نے ایک دفعہ تجربہ کر کے دیکھا ہے کہ بھیڑوں کے گلّے کے آگے دو آدمی ایک رسّی پکڑ کر بیٹھ گئے اور گیارہ انچ انہوں نے رسّی کو اونچا رکھا جب بھیڑیں وہاں پہنچیں تو پہلے پہلی بھیڑ کودی پھر دوسری کودی اور اس کے بعد تیسری کودی۔ دو تین بھیڑوں کے کودنے کے بعد انہوں نے رسّی ہٹالی مگر ہزار بھیڑ اسی طرح کودتی چلی گئی۔ جب بھی کوئی بھیڑ وہاں پہنچتی تو وہ کود کر اس جگہ سے گزرتی۔ گویا اپنے خیال کے نتیجہ میں وہ ایسی اندھی ہو جاتی ہیں کہ دیکھتی نہیں کہ واقعہ کیا ہے۔ یہی حال قوموں کا نظر آتا ہے جب کوئی قوم غریب ہوتی ہے ناتوان ہوتی ہے، کمزور ہوتی ہے اور اس کے افراد دولت مند قوموں کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے بڑے بڑے محلات بنائے ہوئے ہیں، بڑے بڑے تکلفات کے سامان ان میں موجود ہیں آٹھ آٹھ دس دس نوکر ایک ایک شخص کے ہیں، انہوں نے وردیاں پہنی ہوئی ہیں، پیٹیاں باندھی ہوئی ہیں اور جب وہ گھر کے دروازہ پر پہنچتا ہے تو وہ اسے سلام کر کے بڑی عزت سے بٹھاتے اور اس کی خدمت کے لئے آگے پیچھے دوڑتے ہیں تو بجائے یہ خیال کرنے کے کہ یہ قوم تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ دیکھنے والا دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ اگر مجھے دولت ملی تو میں بھی اسی طرح کرونگا۔ وہ دیکھتا نہیں کہ یہ اس قوم کی موت کی علامت ہے جب قومیں مرنے لگتی ہیں تو اسی طرح کرتی ہیں اور اگر وہ اس طرح نہ کریں تو مریں کیوں۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ توبہ کرے اور کہے کہ یہ مرنے لگے ہیں اور خدا کا شکر کرے کہ اب ان کی گدی پر بیٹھنے کے لئے میری باری آئی ہے وہ انہی کی نقل کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے اور اس طرح خود بھی تباہ ہو جاتا ہے پہلے انگریز آئے تو دائسرائے

تک کی تنخواہ ہزار روپیہ ہوئی مگر اب ڈپٹی کمشنر کی تنخواہ تین ہزار روپیہ ہوگئی تھی۔ اسی طرح انگلستان سے جو سپاہی آئے ان کو صرف تین روپے ہفتہ کے ملتے تھے یعنی بارہ روپے ماہوار۔ ہمارے ہندوستانی سپاہی کی تنخواہ بعد میں اس سے زیادہ ہوگئی تھی یعنی آج سے پندرہ سولہ سال پہلے اسے اٹھارہ روپے ماہوار ملتے تھے۔ مگر وہ چھ ہزار میل سے اپنا وطن چھوڑ کر آتا اور اسے تین روپے ایک ہفتہ کے ملتے اور وہ بھی یکمشت نہیں بلکہ ایک روپیہ ہفتہ وار ملتا۔ اور دو روپے سرکاری خزانہ میں جمع رکھے جاتے اور کہا جاتا کہ یہ روپیہ اس لئے جمع کیا جا رہا ہے تاکہ جب تم واپس جاؤ تو اپنے بیوی بچوں کے لئے لے جاؤ۔ مگر اس وقت ساری دنیا میں انگریز پھیلتے چلے جاتے تھے۔ ان میں دلیری بھی تھی، طاقت بھی تھی، ہمت بھی تھی۔ مگر جب دولت آئی اور ترقہ پیدا ہوا تو ان کی تنخواہیں بڑھنی شروع ہوئیں اور یا تو پہلے انگریز گھوڑے پر سوار ہو کر سارا سارا دن دھوپ میں پھرتا رہتا تھا اور اس کے ماتحت اسے کہتے تھے کہ صاحب کچھ آرام بھی کر لیجئے اور یا پھر ڈاک بنگلے بن گئے جن میں وہ اترا کرتے۔ اب سارا دن پنکھے چل رہے ہیں۔ برفیں آ رہی ہیں۔ شرابیں پی جا رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں ہمت نہ رہی اور ہندوستانیوں نے انگریزوں کو پکڑ کر نکال دیا۔ گاندھی جی نے اعلان کیا تھا کہ اگر تم ساری ہندوستانی اکٹھے ہو جاؤ تو تم ان لوگوں کو جبراً یہاں سے نکال سکتے ہو اور سمندر سے پرے دھکیل سکتے ہو۔ لوگوں نے سمجھا کہ گاندھی جی کوئی معجزہ دکھانے لگے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی گاندھی جی اپنے ملک کے لوگوں کے متعلق تو سمجھتے ہی تھے کہ وہ غافل اور سست ہیں لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ انگریز مر چکے ہیں اور اب انکی لاش کو پھینکنا کوئی مشکل کام نہیں۔ رستم کی لاش بھی اسی طرح اٹھا کر پھینکی جا سکتی ہے جس طرح ایک کتے کی لاش۔ گاندھی جی کی ذہانت اور ہوشیاری یہ تھی کہ وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ انگریز اب مر چکا ہے۔ اور نیم جان ہندوستانی بھی اسے اٹھا کر پرے پھینک سکتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو، انگریز کو ہندوستان نے ہی اٹھا کر نہیں پھینکا، سیلون نے بھی اسے پھینکا، برما نے بھی اسے پھینکا، مصر نے بھی اسے پھینکا، ایران نے بھی اسے پھینکا، عراق نے بھی اسے پھینکا، غرض تمام ممالک کے لوگوں نے اسے اپنے اپنے ملک سے نکال دیا۔ آخر سمٹ سمٹا کر وہ انگلستان میں محدود ہو کر رہ جائیں گے۔ اور پھر کچھ مدت کے بعد ممکن ہے ان کی ایسی ہی حالت ہو جائے جیسے ابتدا میں تھی کہ چمڑے کے تہہ بند باندھا کرتے تھے اور ننگے جسم رہا کرتے تھے یا اگر یہ زمانہ نہ آئے تو اس کے قریب قریب ان کی حالت پہنچ جائے۔ گاندھی جی کی عقلمندی یہ نہیں تھی کہ انہوں نے ہندوستانیوں کو زندہ کیا۔ ان کی عقلمندی یہ تھی کہ انہوں نے دیکھ لیا کہ انگریز مر چکا ہے۔ اور اب ذرا سے اتحاد کی ضرورت ہے اگر ہندوستانی اکٹھے ہو جائیں تو وہ ان کو بڑی آسانی

سے نکال سکتے ہیں۔ مگر اس کے مقابلہ میں اب ہم دوسری طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یورپ کے پاس دولت ہے۔ مگر روس کے پاس دولت نہیں اور اس نے لوگوں میں یہ شور مچایا ہوا ہے کہ ہم ساری دنیا کو کھانا دیں گے اور وہ لوگ جو بھوکے مرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اگر روس کو جگہ ملے تو ہمیں کھانے کے لئے روٹی میسر آجائیگی۔ حالانکہ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ روسی نظام میں کوئی برتری ہے وہ غلطی کرتے ہیں۔ اگر روس کو دنیا میں نفوذ کا موقع مل جائے تو وہ بھی وہی کچھ کرے گا جو انگریز کرتے رہے ہیں۔ اور اسی طرح اس نے دنیا کی دولت سے فائدہ اٹھانا ہے جس طرح انگریز فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ غرض ایک قوم کے بعد دوسری قوم مرتی چلی جاتی ہے مگر وہ عبرت حاصل نہیں کرتی۔ جب ایک قوم کے بعد دوسری قوم کی باری آتی ہے تو اس کے افراد بھی چاہتے ہیں کہ ہم اسی طرح ناچیں اسی طرح گائیں اسی طرح شرابیں پئیں جس طرح پہلی قوم کیا کرتی تھی۔ پھر خدا اسے تباہ کر دیتا ہے۔ اور کسی اور قوم کو بھیج دیتا ہے غرض انسانوں کی موت پر ان کو قبروں میں دفن کیا جاتا ہے۔ انسانوں کی موت کی علامت یہ ہوتی ہے کہ تیز بخار ہو گیا یا تیز کھانسی ہو گئی یا انتڑیوں میں سے خون آنے لگ گیا یا شدید پیچش ہو گئی۔ اور قوموں کی موت کی علامت یہ ہوتی ہے۔ کہ ان کے پاس دولت بہت ہوتی ہے۔ مگر ان کو اس دولت کے خرچ کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ اپنی ذات پر خرچ کرتے ہیں، اچھے سے اچھا کھانا کھاتے ہیں، اچھے سے اچھا لباس پہنتے ہیں۔ اچھے سے اچھے مکانات میں رہتے ہیں۔ اچھے سے اچھا فرش رکھتے ہیں اور رات دن ترفہ اور آرام طلبی میں بسر کرتے ہیں، محنت کی عادت ان میں نہیں رہتی یہ ساری علامتیں اس کی موت کی ہوتی ہیں جس طرح انسانی جسم کی حرارت معلوم کرنے کے لئے تھرما میٹر ہوتا ہے۔ اسی طرح قوم کی زندگی اور اس کی موت کی گھڑیاں معلوم کرنے کا یہ تھرما میٹر ہوتا ہے جب تم دیکھو کہ کسی قوم میں ترفہ پیدا ہو گیا ہے۔ اور کام کی عادت اس میں نہیں رہی تو سمجھو کہ اس کا پارہ حرارت بہت بڑھ گیا ہے۔ اور وہ موت کے قریب پہنچ گئی ہے۔

عید الاضحیہ ہمیں یہی سبق سکھاتی ہے کہ قومی زندگی قربانیوں کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا بیٹا خدا تعالےٰ کے حکم کے ماتحت ایک جنگل میں جا کر رکھ دیا تھا یہاں ناصر آباد میں اگر تمہارا لڑکا ذرا بڑا ہو جائے اور وہ ابتدائی تعلیم حاصل کر لے تو تم کہتے ہو ہم اسے کنری بھجوائیں گے۔ کنری والوں سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو میرپور خاص بھجوائیں گے۔ میرپور خاص والوں سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں ہم اپنے لڑکوں کو کراچی بھجوائیں گے۔ کراچی والوں سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو انگلینڈ بھجوائیں گے غرض تم اوپر کی طرف جاتے ہو لیکن ابراہیم جہاں رہتے تھے گو وہ بھی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا مگر انہوں نے اپنے بیٹے کو

اس جگہ سے بھی نکال کر وہاں جا کر رکھا جو ایک وادیٔ غیر ذی زرع تھی۔ جہاں نہ کھانے کا کوئی سامان تھا نہ پینے کا کوئی سامان تھا تاکہ اس میں محنت کی عادت پیدا ہو۔ کام کی عادت پیدا ہو قربانی کی عادت پیدا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ابراہیمؑ کا اپنے بیٹے کو اس طرح ایک جنگل میں جا کر چھوڑ دینا گو ظاہر میں اسے اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنا تھا مگر فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ۔ ہم نے اسمٰعیلؑ کا فدیہ ایک بہت بڑی قربانی کے ذریعہ سے دیدیا۔ بعض لوگ غلطی سے اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیلؑ کے بدلے ایک مینڈھا قربان کروا دیا۔ حالانکہ یہاں ذبح عظیم کے الفاظ ہیں جس کے معنے ہیں بہت بڑی قربانی اور مراد یہ ہے کہ دنیا میں جو بڑی بڑی قومیں سمجھی جاتی تھیں ہم نے ان کو ابراہیمؑ کی نسل پر قربان کر دیا۔ بڑے لوگ تختوں پر بیٹھتے ہیں مگر وہ قوم جو بھوکی رہنے کی عادی ہو جب اس کے غلبہ کا وقت آتا ہے تو وہ بڑی بڑی حکومتوں کا تختہ اُلٹ دیتی ہے۔ یہ ایک پیشگوئی تھی جو حقیقی معنوں میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں پوری ہوئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کو قربان کرنا چاہا اور اس نے ایک ایسی جگہ اسے بھیجا جہاں نہ کھانا تھا نہ پانی اور جہاں اس کے زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ہم نے اس کی اس قربانی کو دیکھا اور کہا کہ اب اس کے بدلہ میں ایک بہت بڑی قربانی پیش کی جائیگی چنانچہ دیکھ لو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں جو اسماعیلؑ کی نسل میں سے تھے کس طرح عرب نکلے اور انہوں نے قیصر و کسریٰ کو کاٹ کر رکھ دیا۔ گویا بجائے اس کے کہ اسمٰعیلؑ کی نسل بھوکی مرتی اس نے بڑی بڑی دولتوں اور شانوں والی حکومتوں کو تباہ کر دیا۔ قومی ترقی درحقیقت ٹڈی دَل کی طرح ہوتی ہے۔ جس طرح ٹڈیاں جنگلوں میں پلتی ہیں۔ اور جب ان کی غذا ختم ہو جاتی ہے تو وہ اُڑتی ہیں اور بڑے بڑے سرسبز و شاداب کھیتوں کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں اسی طرح جو قومیں صحیح اصول پر چلنے والی ہوتی ہیں وہ غربت سے گذارے کرتی ہیں محنت اور قربانی سے کام لیتی ہیں۔ مگر جب لوگ پھر بھی ان کو جینے نہیں دیتے اور انہیں مارنے کے لئے اٹھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا عذاب ظلم کرنے والوں پر نازل ہوتا ہے۔ اور وہ غریب اور کمزور سمجھے جانے والے دنیا پر غالب آجاتے ہیں۔ جب عرب کے لشکر نے ایران پر حملہ کیا تو ایران کے بادشاہ نے اس خبر کو سُن کر کہا کہ یہ جھوٹی خبر ہے مَیں کس طرح مان لوں۔ کہ وہ عرب جس میں ہمارے دس سپاہی بھی جاتے تو سارے ملک کو آگے لگا لیتے تھے۔ اس نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ لوگوں نے کہا۔ خبر درست ہے واقعہ میں ہم پر حملہ ہو چکا ہے۔ اس نے کہا۔ اچھا ان کے چند لیڈر بلواؤ۔ تاکہ مَیں ان سے خود بات کروں اور پوچھوں کہ آخر ان کا مقصد کیا ہے۔ چنانچہ وہ گئے اور صحابہؓ نے ایک وفد تیار کر کے بادشاہ کی ملاقات کیلئے بھجوا دیا۔ جب صحابہؓ کا وفد پہنچا تو بادشاہ نے کہا۔ مَیں نے سُنا ہے کہ تم لوگوں

نے میرے ملک پر حملہ کر دیا ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تم میں یہ جرأت کس طرح پیدا ہوئی۔ تم وہ ہو جو ٹڈیاں کھایا کرتے تھے، نہ تمہارا کھانا اچھا تھا، نہ پینا اچھا تھا، نہ تمہارا لباس اچھا تھا۔ تم ننگے پھرتے تھے، اخلاق تم میں تھے ہی نہیں، ماؤں سے تم نکاح کر لیتے تھے۔ تمہیں کیا سوجھا کہ تم حملہ کے لئے آ گئے اگر تم پر غربت کا بہت ہی دور آ گیا ہے تو میں تم میں سے ہر افسر کو دو دو اشرفی اور ہر سپاہی کو ایک ایک اشرفی دینے کے لئے تیار ہوں۔ تم روپیہ لو اور واپس چلے جاؤ اس زمانہ میں گو روپیہ کی بڑی قیمت تھی مگر پھر بھی پتہ لگتا ہے کہ اس کی نگاہ میں عربوں کی کیا حیثیت تھی عرب کا جو لشکر ایران پر حملہ آور ہو رہا تھا اس کی حیثیت ایران کے بادشاہ کے نزدیک یہ تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ اگر میں ان کو پندرہ پندرہ روپے دے دوں تو یہ واپس جانے کے لئے تیار ہو جائیں گے اب پینتالیس روپے ماہوار اور راشن سپاہی کو ملتا ہے مگر وہ سمجھتا تھا کہ اگر میں انہیں صرف پندرہ پندرہ روپے بھی دیدوں گا تو یہ واپس چلے جائیں گے اور کہیں گے کہ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔ تو ایران کے بادشاہ کے نزدیک عربوں کی حیثیت اتنی ہی تھی مگر جو اس وفد کے سردار تھے انہوں نے کہا تم جو کچھ کہتے ہو ٹھیک ہے ہم ایسے ہی تھے۔ ٹڈیاں کھاتے تھے، مردار کھاتے تھے، ماؤں سے نکاح کر لیا کرتے تھے مگر اب اللہ تعالیٰ نے ہم میں اپنا رسول بھیج دیا ہے جس کی وجہ سے ہماری حالت بدل چکی ہے اور ہم خدا تعالیٰ کے وعدوں کے مطابق تمہارے ملک پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ بادشاہ کو غصہ آیا، اس نے درباریوں کو حکم دیا کہ مٹی کا ایک بورا لاؤ اور اس کے سر پر رکھ دو۔ باقی صحابہؓ کو غصہ آیا کہ یہ ہمارے امیر کی ہتک کرتا ہے مگر وہ ہنس پڑا۔ اور اس نے کہا انہیں مٹی کا بورا میرے سر پر رکھنے دو۔ جب انہوں نے مٹی کا بورا اس کے سر پر رکھ دیا۔ تو وہ دربار سے بھاگے اور انہوں نے بلند آواز سے کہا کہ بادشاہ نے ایران کی زمین اپنے ہاتھ سے ہمارے سپرد کر دی ہے۔ مشرک بڑا وہمی ہوتا ہے، اب تھا تو یہ ایک لطیفہ مگر وہ گھبرا گیا اور اس نے سمجھا کہ یہ تو بڑی بدشگونی ہوئی چنانچہ اس نے حکم دیا کہ دوڑو اور ان کو پکڑ کر واپس لاؤ۔ مگر عرب لوگ گھوڑے کی سواری کے بڑے مشاق ہوتے ہیں۔ وہ دربار سے نکلتے تو انہوں نے اپنی گھوڑوں کو ایڑیاں لگائیں اور وہ کہیں سے کہیں نکل گئے۔[۱] یہ کیفیتیں تھیں صحابہؓ کی، دنیا حیران تھی کہ یہ لوگ کہاں سے آ گئے۔ جس طرح ٹڈی آتی ہے تو اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا، کوئی روس کے میدانوں سے آتی ہے، کوئی چین کے میدانوں سے آتی ہے، کوئی عرب کے میدانوں سے آتی ہے اور وہ سارے علاقہ پر چھا جاتی ہے۔ اتنا چھوٹا سا جانور ہوتا ہے مگر اس کے مقابلہ میں لوگ عاجز آ جاتے ہیں اور پھر اس کی نسل میں خدا تعالیٰ نے اتنی برھوتی رکھی ہے کہ جہاں بیٹھی اور اس نے انڈے دیئے۔ وہیں اگلے سال پھر ٹڈی پیدا ہو جاتی ہے اور فصلوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ یہی علامت بڑھنے والی قوموں کی ہوتی ہے۔

لوگوں کا ایک ایک بچہ ہوتا ہے تو ان کے آٹھ آٹھ ہوتے ہیں۔ غرض قوموں کی ترقی کا راز صرف قربانیوں میں ہے۔ مگر بہت سے لوگ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے پہلے قدم پر ہی گر جاتے ہیں اور ان کی حالت بالکل ایسی ہی ہوجاتی ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

لیکن جو لوگ قربانیوں کے معیار کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں وہ اس زمانہ کو دیکھتے ہیں جس میں اللہ کی قربانیوں کا بدلہ ان کو ملتا ہے۔ ایران کے بادشاہ نے صحابہؓ کو صرف ایک ایک پونڈ دینا چاہا مگر جو صحابہؓ کو ملا اس کے مقابلہ میں بھلا پونڈ کی کیا حیثیت تھی۔

حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا ہے کہ جب وہ فوت ہوئے تو باوجود اس کے کہ وہ اس قدر صدقہ و خیرات کرنے والے تھے کہ سارے عرب میں مشہور تھے پھر بھی ان کے ورثاء کو لاکھوں روپیہ ملا۔ تو اللہ تعالیٰ غلبہ کے موقعہ پر قوموں کو بہت کچھ دیتا ہے لیکن اصل سوال یہ ہوتا ہے کہ اس وقت بھی اس کی عادت میں یہ بات داخل ہو کہ اپنے نفس پر خرچ کرنے کی بجائے وہ اس روپیہ کو دین پر خرچ کرے، غرباء پر خرچ کرے، صدقہ و خیرات میں دے۔ یہ ٹھیک ہے کہ شریعت کہتی ہے کہ جب تمہیں دولت ملے تو تمہارے جسم اور چہرہ پر بھی اس کے کچھ آثار ہونے چاہئیں مگر وہ کچھ آثار ہی کہتی ہے یہ نہیں کہتی کہ ساری دولت اپنے نفس کے لئے خرچ کرنی شروع کردو اور اچھے کھانے اور اچھے پہننے میں مشغول ہو جاؤ۔ لیکن بیوقوف اور نادان انسان اس وقت کے آنے سے پہلے ہی پھول جاتا ہے اور اس کی مثال ویسی ہی ہوجاتی ہے جیسے ہمارے ملک میں مشہور ہے کہ "چھپنے جٹ کٹوری لبھی پی پی پانی آپھریا"

بھلا ایک کٹوری کی بادشاہوں کی دولتوں کے مقابلہ میں کیا حیثیت ہے۔ مگر وہ صرف کٹوری ملنے پر ہی اتنا مغرور ہوجاتا ہے کہ کبھی اس گھر میں جاتا ہے اور یہ دکھانے کے لئے کہ اس کے پاس کٹوری ہے وہ ان کے گھڑے سے پانی پینے لگ جاتا ہے۔ کبھی دوسرے گھر میں جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے پیاس لگی ہے اور یہ بتانے کے لئے کہ اس کے پاس کٹوری ہے وہ اس میں ان کے سامنے پانی پیتا ہے۔ جو قوم اتنے بڑے وعدوں کے ہوتے ہوئے ایران کے بادشاہ کے پونڈ یا ایک کٹوری پر مرنے لگتی ہے اس کے متعلق کیا امید کی جاسکتی ہے کہ وہ بڑھے گی۔ وہی قوم بڑھتی ہے جو خدا تعالیٰ کے وعدوں کو اپنے سامنے رکھتی ہے جو سمجھتی ہے کہ ہم نے اخلاق اور روحانیت کے ساتھ دنیا کو فتح کرنا ہے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں وہ ویسی ہی قربانی بھی کرتے ہیں اور ویسی ہی محنت بھی کرتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جب نیا نیا دعویٰ فرمایا تو مولوی برہان الدین صاحب

رضی اللہ عنہ جو اہلِ حدیث میں سے تھے اور ان کے لیڈر تھے۔ انہوں نے بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر سُنا۔ شاید انہوں نے براہین کا اشتہار پڑھا یا آریوں اور عیسائیوں کے خلاف کسی اخبار میں آپ کا مضمون دیکھا تو ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں خود انہیں جاکر دیکھ آؤں۔ چنانچہ وہ قادیان پہنچے مگر ان دنوں حضرت مسیح موعود علیہ السلام قادیان میں نہیں تھے بلکہ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ غالباً یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام چلّہ کے لئے ہوشیار پور تشریف لے گئے تھے وہ قادیان سے ہوشیار پور پہنچے مگر وہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ آپ سے ملاقات نہیں ہو سکتی کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ساتھ والوں کو ہدایت دے دی تھی کہ کسی کو اندر نہیں آنے دینا اور شیخ حامد علی صاحبؓ کو دروازہ پر بٹھایا ہوا تھا کہ وہ نگرانی رکھیں اور کسی کو اندر نہ آنے دیں۔ یہ وہاں پہنچے اور انہوں نے منتیں کیں کہ مجھے ملنے دو مگر انہوں نے نہیں مانا آخر مولوی برہان الدین صاحبؓ نے کہا کہ مجھے صرف چق اُٹھا کر ایک دفعہ دیکھ لینے دو۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کروں گا۔ لیکن حامد علی صاحبؓ نے یہ بات بھی نہ مانی مگر اللہ تعالیٰ نے چونکہ ان کی خواہش کو پورا کرنا تھا اس لئے اتفاق ایسا ہوا کہ ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کوئی ضرورت پیش آئی اور آپ نے فرمایا میاں حامد علی! تم فلاں چیز لے آؤ۔ وہ اس طرف چلے گئے اور انہیں موقع میسّر آگیا۔ یہ چپکے سے چوری گئے اور انہوں نے چق اُٹھا کر حضرت صاحب کو دیکھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس وقت کچھ لکھ رہے تھے اور جلدی جلدی کمرہ میں ٹہل رہے تھے۔ یہ عام انسان کی نظر میں بہت معمولی بات ہے مگر صاحب عرفان کی نگاہ میں یہ بڑی بات تھی۔ انہوں نے آپ کو دیکھا اور واپس آ گئے لوگوں نے آپ سے پوچھا مولوی صاحب آپ نے کیا دیکھا۔ انہوں نے کہا۔ اس نے بہت دور جانا ہے یہ کمرے میں بھی تیز تیز چل رہا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بڑا کام کرنا ہے۔" تو حقیقت یہ ہے کہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" جس نے جینا ہوتا ہے اس میں جینے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اور جس نے مرنا ہوتا ہے اس میں مرنے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ انگریز بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کو کون نکال سکتا ہے۔ فرانسیسی بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کو انڈوچائنا سے کون نکال سکتا ہے۔ کسی زمانہ میں ہسپانیہ والے بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کو ہسپانیہ سے کون نکال سکتا ہے۔ مسلمان بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کو ہندوستان اور چین وغیرہ سے کون نکال سکتا ہے مگر آخر نکل گئے۔ یہ موت ہے جو ایک کے بعد دوسری قوم پر آئی اور کسی قوم نے پہلی قوم سے عبرت حاصل نہیں کی۔ انفرادی موت سے بچا نہیں جا سکتا۔ لیکن قوم کی موت سے بچا جا سکتا ہے اگر وہ زندہ رہنے کی کوشش کرے۔ مگر آج تک کسی قوم نے یہ کوشش نہیں کی جو بھی آتا ہے وہ فوراً زہر کھانا شروع کر دیتا ہے۔ اور موت کو قبول کر لیتا ہے۔"

(الفضل ۵ جولائی ۱۹۵۷ء)

۱؎ ۔موہن داس کرم چند گاندھی (۱۸۶۹ - ۱۹۴۸ء) ہندوؤں کے مشہور رہنما اور ہندوستان کی آزادی کے اوّلین معمار تھے۔ "مہاتما" کہلاتے اور "عدم تشدد" کا پرچار کیا کرتے تھے۔

۲؎ ۔ (i) TH EPIC OF MHN. P. 139. Published by TIME-LIFE International (Nederland) 1963.
(ii) "LOOKING AT HISTORY" Britain from Cavemen to The present day. by R.J. unstead. P. 24

۳؎ ابراہیم ۱۴ : ۳۸ ۴؎ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۸

۵؎ ۔تاریخ کامل ابن اثیر ۲/۴۵۶ ، تاریخ طبری ۳/۲۹۰ ، البدایہ والنہایہ ابن کثیر ۷/۴۱

۶؎ دیوانِ غالب صفحہ ۱۵۵ مطبوعہ مکتبۂ جدید لاہور۔

۷؎ ۔اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ جلد ۳ صفحہ ۲۱۷

۸؎ ۔اس سے کسی کی کم ظرفی اور کمینگی کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے (فرہنگ آصفیہ جلد اوّل صفحہ ۲۰۹ زیر لفظ اوچھا)

۹؎ ۔حضرت مولوی برہان الدین صاحب رضی اللہ عنہ (۱۸۳۰ - ۱۹۰۵ء) حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے جلیل القدر صحابی تھے ۱۸۹۲ء میں بیعت کی۔ اس سے قبل اہل حدیث کے پرجوش مبلغ تھے قبولِ احمدیت کے بعد ایمان اور اخلاص میں اتنی ترقی کی کہ عند اللہ احمدیت کے شہتیر ٹھہرے۔ (تاریخ احمدیت ۳/۲۱۵)

۱۰؎ ۔حضرت حافظ شیخ حامد علی صاحب رضی اللہ عنہ (وفات ۱۹۱۹ء) حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے قدیم صحابہ اور مخلص خدام میں سے تھے۔ ان کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ اصحاب احمد جلد ۱۳

۱۱؎ ۔حضور رضی اللہ عنہ کی اپنی روایت ہی کافی ہے۔ اس کیلئے کسی حوالہ کی ضرورت نہیں

۱۲؎ ۔فرہنگ آصفیہ جلد چہارم صفحہ ۷۶۱

۴۴

(فرمودہ ۳۱ / جولائی ۱۹۵۵ء بمقام لندن)

یہ عید جس کو مسلمان عید الاضحیہ کہتے ہیں یعنی قربانیوں کی عید۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے کی یاد میں منائی جاتی ہے جس کے قربان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو حکم دیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو پورا کرنے کے لئے ابراہیمؑ تیار ہو گیا تھا۔ وہ کونسا بیٹا تھا اس معاملہ میں اسلام اور عیسائیت میں اختلاف ہے۔ بائیبل کہتی ہے کہ وہ اسحٰقؑ تھا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ وہ اسمٰعیلؑ تھا جہاں تک اس واقعہ سے جو نتیجہ نکلتا ہے۔ اس کا تعلق ہے مذبوح اسحٰقؑ ہو یا اسمٰعیلؑ ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بات ایک ہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا نے اپنے ایک بیٹے کی قربانی کا حکم دیا، اور اس نے قبول کر لیا۔ لیکن جہاں تک اس واقعہ کے اخلاقی پہلو کا تعلق ہے قرآن کا بتایا ہوا واقعہ بہت زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے۔ بائیبل کہتی ہے کہ خدا نے ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ کے قتل کرنے کا حکم دیا۔ اور اس نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن پھر وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ جب وہ اسے ذبح کرنے لگا تو فرشتہ نے اسے منع کر دیا کہ اس کو مت ذبح کر بلکہ ایک بکرا جو جھاڑیوں میں پھنسا ہوا کھڑا تھا اسے ذبح کر۔[1] گویا اسحٰقؑ کو کسی شکل میں بھی، نہ ظاہری الفاظ میں نہ تشبیہی الفاظ میں ذبح کیا گیا۔ گویا یہ سارا واقعہ ایک مضحکہ تھا۔ ایک کھیل تھا۔ جو خدا نے ابراہیمؑ سے کھیلا آخر اس میں کیا لطف تھا کہ پہلے تو خدا نے ابراہیمؑ سے کہا کہ تو اسحٰقؑ کو ذبح کر اور پھر اسے منع کر دیا۔ بعض عیسائی پادری کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اس ذریعہ سے ابراہیمؑ کو بتایا۔ کہ انسانی قربانی آئندہ نہیں ہوگی۔[2] لیکن یہی بات خدا تعالیٰ اس سے زیادہ عمدہ اور صاف الفاظ میں بھی کر سکتا تھا۔

قرآن کریم نے جو اسمٰعیلؑ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ نہایت معقول ہے اور ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔ کہ اس واقعہ میں بہت سی حکمتیں تھیں اس میں کہا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو دو حکم دیئے ایک یہ کہ تو اسمٰعیلؑ کو ذبح کر اور دوسرے یہ کہ تو اسمٰعیلؑ کو بغیر پانی اور بغیر کھیتی باڑی والی جگہ میں چھوڑ آ یعنی مکہ میں جہاں وہ اس لئے دنیا سے دور رہ کر اور بھوک پیاس کی تکلیف برداشت کر کے زندگی گذارے کہ لوگوں کو دین کی تعلیم دے اور خدائے واحد کی عبادت میں لگائے۔ گویا اسمٰعیلؑ کی قربانی کا جو ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا تھا وہ تشبیہی زبان میں تھا۔ مراد یہ نہ تھی کہ واقعہ میں چھری سے اپنے بیٹے کو ذبح کرے جو بے کار اور بیہودہ فعل ہے بلکہ ذبح

سے مراد اس کو دین کی خاطر ایسی جگہ پر رکھنا مراد تھا جہاں کھانے پینے کے سامان مہیا نہیں تھے چنانچہ گو قرآن کریم کے مطابق بھی اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے سے منع کر دیا اور اس کی جگہ ایک دُنبہ ذبح کرنے کی تلقین کی۔ لیکن خواب کا جو اصل مفہوم تھا یعنی اسمٰعیلؑ کو ایک بے آب وگیاہ جنگل میں چھوڑ آنا اس سے ابراہیمؑ کو منع نہیں کیا بلکہ اسی حکم پر ابراہیمؑ سے عمل کروایا۔ چنانچہ آجتک مکہ اسمٰعیلؑ کی نسل سے آباد ہے اور خدائے واحد کی وہاں پرستش کی جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف لوگوں کو بلایا جاتا ہے۔ اس تشریح کے مطابق ابراہیمؑ نے واقعہ میں اسمٰعیلؑ کو قربان کر دیا۔ اور یہ قربانی ظالمانہ اور وحشیانہ قربانی نہیں تھی۔ بلکہ پُر مغز اور بامعنی قربانی تھی جس سے آجتک دُنیا فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ اور اب بھی اسمٰعیلؑ کے ذریعہ سے اس بے آب وگیاہ جنگل میں خدا تے واحد کا نام بلند کیا جاتا ہے

آج ہم اس واقعہ کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے اس جگہ پر جمع ہوئے ہیں۔ لاکھوں آدمی اس وادیٔ غیر ذی زرع میں جمع ہیں اور بلند آواز سے کہہ رہے ہیں لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ اے میرے خدا میں حاضر ہوں جس طرح کہ ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں تیرے سوا کوئی معبود نہیں میں تیری توحید کو پھیلانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

ذرا اس بات پر غور کرو اور سوچو کہ بائیبل میں بیان کیا ہوا واقعہ قرآن کے بیان کردہ واقعہ سے کیا کوئی بھی مناسبت رکھتا ہے۔ بائیبل کا حکم تو ایک وحشیانہ اور ظالمانہ حکم معلوم ہوتا ہے جس میں کوئی حکمت نہیں تھی۔ اسحٰقؑ کے گلے پر چھُری پھیرنے سے دنیا کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا یا خود اسحٰقؑ کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ مگر اسمٰعیلؑ کو مکہ میں چھوڑنے سے اسمٰعیلؑ کو بھی فائدہ ہوا اور دنیا کو بھی فائدہ ہوا۔ اسمٰعیلؑ توحید سکھانے کا ایک بہت بڑا استاد بن گیا اور دنیا اس کے ذریعہ سے خدائے واحد کی عبادت کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ مکہ کو دنیا کے نقشہ سے الگ کر دو تو ساری دنیا میں توحید کا کوئی مرکز باقی نہیں رہتا۔ اور اسمٰعیلؑ کی قربانی کو حذف کر دو۔ تو خدا کے لئے زندگیاں وقف کرنے والا ولولہ پیدا کرنے کی کوئی صورت دنیا میں باقی نہیں رہتی۔ اسحاقؑ اپنی قربانی دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ بڑی اچھی بات ہے۔ مگر ہم تو اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اسحاقؑ ایک خدا پرست انسان تھا۔ اسمٰعیلؑ بھی اپنی قربانی دینے کے لئے تیار ہو گیا اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسمٰعیلؑ توحید کے لئے زندگی وقف کر کے دنیا کا محسن بن گیا اور جس جس جگہ پر اس نے یہ قربانی پیش کی تھی وہ ہمیشہ کے لئے توحید کا مرکز بن گئی۔ پس خدا تعالیٰ کی برکتوں کا مستحق ہے اسمٰعیلؑ اور خدا تعالیٰ کی برکتوں کا مستحق ہے مکہ جہاں اس نے قربانی پیش کی قیامت تک خدا کی توحید کا جھنڈا وہاں کھڑا رہے گا۔ قومیں قوموں پر چڑھائی کریں گی۔ ایک قوم کے بعد دوسری قوم کا جھنڈا زمین پر گرے گا مگر مکہ میں اسمٰعیلؑ کے ہاتھ سے گاڑا ہوا توحید کا جھنڈا قیامت تک کھڑا رہیگا۔

کوئی نہیں جو اس کو توڑ سکے۔ کوئی نہیں جو اُس کو گرا سکے۔ وہ کونے کا پتھر ہے جو اس پر گرے گا۔ وہ بھی چکنا چور ہو جائے گا اور جس پر وہ گرے گا وہ بھی چکنا چور ہو جائے گا[۵]۔ یہ خدائی فیصلہ ہے جس کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ ایک ایک کرکے دنیا اس توحید کے جھنڈے کے نیچے آئے گی۔ یہاں تک کہ ساری دنیا وہاں جمع ہو جائیگی۔ اور آخر ایک دن آئے گا کہ جس طرح آج کی عید کے دن مکہ میں خدا کی توحید کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں دنیا کے کونہ کونہ سے توحید کے نعرے بلند کئے جائیں گے اور خدائے واحد کی تکبیر کہی جائے گی اور جس طرح دنیا سے تمام جھوٹے معبود مٹا کر ایک خدا کی حکومت قائم کی گئی ہے اسی طرح دنیا سے مختلف قومیتیں مٹا کر انسانیت کی حکومت قائم کی جائے گی۔ اور آسمان پر بھی ایک خدا ہوگا اور زمین پر بھی ایک ہی نسل ہو گی۔ سب جھوٹی قومیتیں مٹا دی جائیں گی جس طرح سب جھوٹے خدا مٹائے جا چکے ہیں۔

آخر میں میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ دن جلد آئے اور اس عید کا سبق ساری دُنیا یاد کرے۔ اور ساری دنیا اپنے پیدا کرنے والے خدا کے آگے جھک جائے۔ اور فساد اور لڑائی جھگڑا دنیا سے مٹ جائے۔ ہر دل کعبہ بن جائے یعنی خدا کا گھر اور جس طرح خدا عرش پر ہے۔ اسی طرح خدا انسان کے دل میں بھی ہو۔"

(الفضل ۳۱ر اگست ۱۹۵۵ء)

۱۔ پیدائش باب ۲۲ آیت ۲

۲۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۳۔ تفسیر دُرِّ منثور جلد ۵ صفحہ ۲۸۰

۳۔ پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۳

۴۔ پیدائش کی کتاب کی تفسیر صفحہ ۱۱۳ مصنفہ پادری کینن سیل ڈی ڈی مترجمہ ای۔ جوزف۔ ناشر کرسچن نالج سوسائٹی پنجاب طبع اوّل مطبوعہ وکٹوریہ پریس بٹالہ۔

۵۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۸

۶۔ ابراھیم ۱۴ : ۳۸

۷۔ یسعیاہ باب ۸ آیت ۱۳ تا ۱۷

۴۵

(فرمودہ ۱۹؍جولائی ۱۹۵۶ء بمقام ربوہ)

آج عیدالاضحیہ ہے یعنی قربانیوں کی عید کا دن۔ یوں تو اس عید پر مسلمانوں میں سے صاحب توفیق لوگ بھی بہت کم قربانی کرتے ہیں۔ سوائے حج کے کہ اس موقعہ پر مَیں نے دیکھا ہے بڑی کثرت کے ساتھ قربانیاں کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ عید، عیدالاضحیہ اسی طرح ہوگئی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کروڑوں کی تعداد میں امت ملی۔ چنانچہ کہتے ہیں اس وقت مسلمانوں کی تعداد ۶۰ کروڑ ہے۔ اگر ان ساٹھ کروڑ مسلمانوں میں سے فی کروڑ ایک مسلمان بھی سنتِ رسُولؐ پر صحیح طور پر عمل کرنے والا ہو تو ۶۰ آدمی قربانی کرنے والے نکل آتے ہیں۔ اور اگر لاکھ میں سے ایک آدمی سنتِ رسُولؐ پر عمل کرنے والا ہو تو ۶۰۰۰ مسلمان قربانی کرنے والا نکل آتا ہے۔ اور اس طرح یہ عید حقیقی معنوں میں عیدالاضحیہ بن جاتی ہے گویا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عید کا نام عیدالاضحیہ رکھکر بتایا کہ آپ کی امت کو خدا تعالے اس قدر بڑھائے گا کہ اگر ان میں سے اس موقعہ پر بہت کم قربانی کرنے والے لوگ ہوں تب بھی ان کی قربانیاں ایک بہت بڑا مجموعہ ہوجائیں گی پس یہ عید بڑی شاندار عید ہے جس کی مثال دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی۔ اس موقعہ پر لوگ بکروں اور دنبوں کی قربانیاں کرتے ہیں لیکن قرآن کریم فرماتا ہے۔

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَاؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ۔[1]

اللہ تعالےٰ کو ان قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ قربانی کرنے والوں کا تقوی پہنچتا ہے۔

پس اصل قربانی وہ ہے جو انسان اپنی اور اپنے اہل وعیال کی پیش کرے اور یہی وہ سبق ہے جو عیدالاضحیہ ہمیں سکھاتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسمٰعیل اور حضرت ہاجرہؓ کو ایک بے آب وگیاہ جنگل میں چھوڑ آئے[2] تو گو وہ خود اس جنگل سے باہر چلے گئے لیکن ان کی قربانی یہ تھی کہ انہوں نے اپنی بیوی اور اکلوتے بچے کی جدائی کا دُکھ اُٹھایا اور بیوی کی یہ قربانی تھی کہ اس نے اپنے خاوند کی جدائی کا دُکھ اُٹھایا اور اپنے بیٹے کا دُکھ دیکھا اور بیٹے کی قربانی یہ تھی کہ وہ اپنی مرضی سے ایک ایسے جنگل میں بس گیا جہاں دُور دُور تک انسان نظر نہیں آتا تھا۔ اور اس نے نہ صرف خود پیاس اور بھوک کی تکلیف اُٹھائی بلکہ ماں اور باپ کا دُکھ بھی دیکھا پس وہ قربانی کسی ایک فرد کی نہیں تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ایک بے آب وگیاہ جنگل میں چھوڑ کر کی بلکہ درحقیقت وہ سارے خاندان کی قربانی تھی۔ مَیں سمجھتا ہوں اگر

فی الواقعہ آج ہر مسلمان ان معنوں میں عید منانے لگ جائے اور وہ دُنبوں اور بکروں کی قربانی کے ساتھ ساتھ اپنی اور اپنے بیٹوں کی قربانی بھی کرنے لگ جائے تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں تباہ نہیں کر سکتی۔ دیکھو سکھوں نے اپنے زمانہ حکومت میں پشاور پر قبضہ کر لیا تو حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ نے جو تیرھویں صدی کے مجدد تھے سید اسمٰعیل صاحب شہید کو اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے مقرر کیا۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پشاور کی طرف بڑھے۔ سکھوں کے پاس توپیں تھیں اور مسلمانوں کے پاس نہیں تھیں جب مسلمان سامنے کھڑے ہوئے تو لوگ کہنے لگے یہ کیا مقابلہ کریں گے بلکہ بعض نے تو یہانتک کہا کہ یہ لوگ بیوقوف ہیں جو توپوں کے سامنے کھڑے ہو گئے ہیں اس وقت کی جنگ آجکل کی جنگ کی طرح زیادہ خطرناک نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت توپ کا گولہ اگرچہ کئی کئی من کا ہوتا تھا مگر وہ ایک ہی جگہ پڑتا تھا اور آجکل کے گولوں کی طرح پھیل کر زیادہ نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔ سید اسمٰعیل صاحب شہید نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اگر تم متفرق طور پر کھڑے ہوئے تو توپ کا گولہ زیادہ سے زیادہ تم میں سے ایک کو مارے گا۔ اس لئے تم ایک دوسرے سے کندھا لگا کر کھڑے نہ ہو بلکہ آپس میں دس دس گز کا فاصلہ رکھو اور دشمن کی طرف اس طرح بڑھو کہ جوں جوں تم دشمن کے قریب ہوتے جاؤ تمہارا درمیانی فاصلہ کم ہوتا جائے۔ اور جب تم دشمن کے بالکل قریب پہنچ جاؤ تو یکدم حملہ کر کے اس کی توپوں پر قبضہ کر لو۔ ان لوگوں میں اطاعت کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ انہوں نے سید اسمٰعیل صاحب شہید کی ہدایات کے ماتحت آپس میں دس دس گز کا فاصلہ رکھکر قلعہ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے دشمن کے گولے انہیں زیادہ نقصان نہیں پہنچاتے تھے زیادہ سے زیادہ وہ ایک آدمی کو اپنی زد میں لیتے تھے اور باقی محفوظ رہتے تھے۔ غرض مسلمان اسی طرح آگے بڑھتے گئے اور جُوں جُوں دشمن کے قریب ہوتے گئے ان کا فاصلہ کم ہوتا گیا۔ جب وہ توپ خانہ کے بالکل قریب پہنچے تو یکدم حملہ کر کے انہوں نے توپچیوں کو توپوں کے دہانے سکھوں کی طرف پھیر دینے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح سکھوں کی توپیں سکھوں پر ہی چلیں اور پشاور پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ اب دیکھو جو کچھ ہوا۔ قومی قربانی کا ہی نتیجہ تھا، ورنہ مسلمان خالی ہاتھ تھے۔ اور دشمن مسلح تھا اور اس کے مقابلہ میں ان کی ظاہری طور پر کوئی حیثیت نہیں تھی۔ صرف اتنی بات تھی کہ وہ لوگ مرنا جانتے تھے جس کی وجہ سے انہوں نے فتح حاصل کر لی۔ اسی طرح پٹھانوں میں بھی بڑی جرأت اور دلیری پائی جاتی ہے اور اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ مرنا جانتے ہیں۔ پٹھان لڑتے تھے تو بعض دفعہ انگریزی فوج پر حملہ کر کے ان کی رائفلیں تک چھین کرلے جاتے تھے۔ جب نادر شاہ نے سرحد پر حملہ کیا تو نادر شاہ کے پیچھے آتے اور مرتے جاتے یہانتک کہ وہ علاقہ فتح کر لیتے۔ مَیں نے ان دنوں ایک خواب دیکھی کہ ایک انگریز میرے پاس آیا ہے۔ اور اس نے کہا ہے

کہ سرحد پر پٹھانوں کے حملے ہو رہے ہیں اور وہ بڑی سختی سے حملہ کرتے ہیں کیا اسلام میں یہ بات جائز ہے کہ اگر کوئی دشمن ہمارے کسی آدمی کو مارے اور اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے تو اس کے مقابلہ میں بھی ان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے۔ میں نے کہا ہاں قرآن کریم میں جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ہے۔ یہ مسئلہ تو فقہی طرز کا تھا جو میں نے خواب میں بتایا لیکن خواب کا دوسرا حصہ نہایت اہم تھا مجھے خواب میں بتایا گیا کہ اگر انگریزوں نے اس محاذ پر اپنے چوٹی کے افسر نہ بھیجے تو انہیں شکست ہو گی۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں کچھ عرصہ کے بعد شملہ گیا وہاں گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم سیکرٹری نے مجھے چائے پر بلایا۔ اس وقت مسٹر کریرا ہوم سیکرٹری تھے جو وائسرائے ہند کے رشتہ دار تھے۔ اس موقعہ پر سر ولیم (SIR WILLIAM) بھی آئے ہوئے تھے جو انگریزی فوج کے چیف آف دی جنرل سٹاف تھے ان کا ایک بھائی اس وقت بادشاہ انگلستان کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا باتوں باتوں میں اس خواب کا ذکر آگیا۔ جو میں نے اوپر بیان کی ہے تو سر ولیم بے اختیار بول اُٹھے کہ آپ کی رؤیا بالکل درست ہے۔ اور میں اس کا گواہ ہوں میں ان دنوں اس فوج کا کمانڈر تھا جو پٹھانوں سے لڑ رہی تھی۔ ایک دن پٹھان فوج ہمیں دھکیل کر اتنا پیچھے لے گئی کہ ہماری شکست میں کوئی شبہ باقی نہ رہا اور ہمیں مرکز کی طرف سے یہ احکام موصول ہو گئے کہ فوجیں واپس لے آؤ۔ چنانچہ ہم نے اپنا سامان ایک حد تک واپس بھی بھجوا دیا تھا لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ پٹھان فوج کو ہماری فوجی طاقت کے متعلق غلطی لگ گئی اور وہ آگے نہ بڑھی۔ اگر وہ آگے بڑھتی تو افغان فوج ڈیرہ اسمٰعیل خاں تک ہمیں دھکیل کر لے آتی۔ سر ولیم نے بتایا کہ پٹھانوں کے جتھے ہمارے مقابلہ پر آتے تو وہ مرتے چلے جاتے اور اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رہتا جب تک کہ وہ اس علاقہ کو فتح نہ کر لیتے۔ آخر ہمیں حکم ہوا کہ اپنی فوجیں پیچھے لے جاؤ۔ نادر شاہ بہت ہوشیار جرنیل تھا اس نے قبائلیوں کو اکٹھا کر کے ان کی تنظیم کر لی تھی۔ یہ لوگ چاروں طرف سے پہاڑوں سے بارش کی طرح اُترتے اور انگریزی فوج کے سپاہیوں کو مارتے چلے جاتے اور تھوڑے ہی عرصہ میں انگریزوں کی رائفلیں ان کے پاس ہوتیں جس کی وجہ سے ان کا مقابلہ کرنا انگریزوں کے لئے مشکل ہو گیا۔ اب دیکھو یہ قربانی کا ہی نتیجہ تھا کہ ناتجربہ کار لوگ مسلح فوج پر غالب آگئے۔ اسی طرح اگر سب مسلمانوں کے اندر ابراہیمی روح پیدا ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

عیدالاضحیہ ہمارے اندر اسی قسم کا نمونہ پیدا کرنا چاہتی ہے اگر ہم ابراہیمی روح اپنے اندر پیدا کر لیں اور پاکستانی خدا تعالیٰ کی راہ میں مرنا قبول کر لیں تو وہ یقیناً دنیا پر غالب آسکتے ہیں۔ لیکن شرط یہی ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بات کی کوئی پرواہ نہ کی کہ میری بیوی

اور بیٹے کا کیا بنے گا۔ اسی طرح پاکستانی یہ خیال نہ کریں کہ اگر وہ مر گئے تو ان کے بعد ان کے بیوی بچوں کا کیا حال ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب خدا تعالیٰ نے اپنی بیوی اور اکلوتے بیٹے کو ایک بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑنے کا حکم دیا تھا تو آپ نے یہ سوال نہیں کیا تھا کہ خدایا انہیں وہاں کیا خرچ ملے گا۔ بلکہ آپ نے بغیر کوئی سوال کئے خدا تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی اور کہا کہ اگر وہ بھوک سے مرتے ہیں تو بے شک مریں۔ دھوپ میں جلتے ہیں تو بے شک جلیں، میں نے خدا تعالیٰ کا حکم پورا کرنا ہے۔ اگر پاکستانیوں کے اندر بھی یہ روح پیدا ہو جائے کہ ان کے بیوی بچے مرتے ہیں تو مریں، وہ وطن کی حفاظت کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے تو دیکھو کس طرح کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔

اسی طرح اگر یہ روح ہماری جماعت کے افراد میں بھی پیدا ہو جائے تو ہماری تبلیغ کتنی وسیع ہو سکتی ہے۔ اب تو ہم بعض مبلغین کے بیوی بچوں کو بھی ساتھ ہی بھیج دیتے ہیں لیکن بعض مبلغین نے جب پچھلے دنوں اپنے بیوی بچوں کو بھیجنے کے لئے کہا تو تحریک جدید نے انہیں لکھا کہ اس سے خرچ بڑھ جائیگا ہاں اگر بجٹ بڑھ جائے تو ایسا کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اس بات کا علم ہوا تو میں نے کہا اس میں دونوں کا قصور ہے تحریک جدید کا بھی قصور ہے اور مبلغین کا بھی قصور ہے تحریک جدید کا یہ قصور ہے کہ اس نے غیر ابراہیم کو ابراہیم سمجھ لیا اور مبلغین کا یہ قصور ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ابراہیم نہ بنایا۔ اگر وہ فی الواقع ابراہیم بن جائیں تو پچاس سال تک بھی اپنے بیوی بچوں کو بلانے کا نام نہ لیں، اتنے عرصہ میں احمدیت دنیا پر غالب آسکتی ہے۔ اور پھر ان کی جگہ اور مبلغ بھی بھیجے جا سکتے ہیں گویا اتنے لمبے عرصہ میں تحریک جدید پر صرف چند مبلغین کے آنے جانے کا خرچ پڑے گا۔ پس یہ قصور دونوں طرف کا ہے، مبلغین ابراہیم نہیں ہیں اور تحریک جدید نے غیر ابراہیم کو ابراہیم سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ جو شخص ابراہیم بنے گا اسے ابراہیمی کام بھی کرنا پڑے گا۔ اسے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی طرح اپنے بیوی بچوں کو چھوڑنا بھی پڑیگا۔ اگر وہ اپنے بیوی بچوں کو نہیں چھوڑتا تو وہ ابراہیم نہیں اور اگر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح انہیں خدا تعالیٰ کے لئے ذبح کرتا ہے تو پھر وہ وہیں بیٹھا رہے گا۔ اور تبلیغ کے کام کو جاری رکھے گا۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کی رحمت مرکز کے پاس روپیہ بھجوا دے گی۔ اور وہ اس کے بیوی بچوں کو اس کے پاس بھیج دے گا۔ تم دیکھ لو حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو کھانا کس نے مہیا کیا تھا انہیں کھانا خدا تعالیٰ نے ہی مہیا کیا تھا ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو ان کے پاس صرف ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجوروں کی چھوڑ آئے تھے اور یہ چیزیں تو ہفتہ بھر کے لئے بھی کافی نہیں تھیں اور وہ ساری عمر کے لئے دے کر گئے تھے۔ پھر خدا تعالیٰ نے ان کے کھانے کا انتظام کیا۔ وہ ایک قبیلہ کو وہاں لے آیا۔ اس نے پانی کا چشمہ دیکھا۔ تو

حضرت ہاجرہ سے درخواست کی کہ انہیں پانی استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس کے بدلہ میں وہ ہر سال انہیں ٹیکس ادا کیا کریں گے۔ چنانچہ انہیں اجازت دے دی گئی اور اس کے بدلہ میں وہ جو کچھ کماتے اس کا دسواں حصہ آپ کو دے جاتے۔ پس اگر مبلغین ابراہیمؑ بننا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے بیوی بچوں سے بھی حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ والا سلوک کرنا چاہیئے۔

اب تو یہ حالت ہے کہ وہ کہتے تو اپنے آپ کو ابراہیم ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کے لئے خرچ مقرر کیا جائے۔ حالانکہ حضرت ابراہیمؑ نے جب حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو جنگل میں چھوڑا تھا تو انہیں صرف ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجوروں کی دی تھی اگر تحریک جدید بھی اپنے ہر مبلغ کے بچوں کو اتنا ہی خرچ دے تو میں سمجھتا ہوں کہ جماعت کے لوگ تحریک جدید کے افسروں کے پاس آئیں اور انہیں کہیں کہ تم پاگل ہو گئے ہو کہ ایک تھیلی کھجوروں کی اور ایک مشکیزہ پانی کا مبلغ کے گھر بھجوا کر یہ سمجھ لیتے ہو کہ اب عمر بھر کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ ایسی صورت میں ان کا جواب یہی ہوگا کہ تم ابراہیمؑ نہیں ہو۔ اگر تم ابراہیمؑ بنو گے تو تمہارے بیوی بچوں کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیوی بچوں کے ساتھ ہؤا۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جب ایک مبلغ کے بیوی بچے جدا رہیں گے تو وہ اس طرح قربانی کرے گا کہ جماعت کی تعداد بڑھے گی اور زیادہ سے زیادہ چندے آئیں گے لیکن اگر وہ بیکار بیٹھا رہے گا اور دس سال کے بعد یہ رپورٹ بھیجے گا کہ دو احمدی ہوئے ہیں اور ڈیڑھ روپیہ چندہ ہے اور ساتھ ہی کہے کہ میرے بیوی بچوں کو بھیج دیا جائے۔ اور اس پر سینکڑوں روپیہ خرچ آئے تو کام کیسے ہوگا۔

پس ہمارے مبلغوں کو اپنے اندر ابراہیمی روح پیدا کرنی چاہیئے اگر وہ یہ روح اپنے اندر پیدا کرلیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل نہ ہو۔ دیکھو حضرت ابراھیم علیہ السلام کے مخالف اکٹھے ہوئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ یا تو وہ تبلیغ سے باز آئیں ورنہ انہیں آگ میں ڈال دیا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تبلیغ بند کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ انہوں نے آپ کو آگ میں ڈال دیا۔ اگر آپ کہتے کہ میں آگ میں نہیں پڑتا۔ تو فرشتے آسمان پر چلے جاتے لیکن جب آپ نے کہا میں آگ میں پڑنے کے لئے تیار ہوں تو خدا تعالےٰ نے عرش سے کہا۔

يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ۔[۵]

اے آگ تو لوگوں کو تو جلاتی ہے لیکن ابراہیمؑ کے لئے تو اس خاصیت کو چھوڑ دے اور ٹھنڈی ہو جا۔ یہ عظیم الشان نشان اس لئے ظاہر ہؤا۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا تعالےٰ کے لئے جلنا منظور کر لیا تھا اگر تم بھی اسی طرح کے مومن بن جاؤ تو خدا تعالےٰ تمہارے لئے بھی اپنے نشانات نازل کرے گا

اور تمھیں اپنے دشمنوں پر غلبہ عطا کرے گا۔ پس تم عید الاضحیہ منانے کے لئے اپنا نمونہ پیش کرو۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کے لئے ہجرت کرتا ہے۔ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَّ سَعَةً ۔ وہ دنیا میں بڑی کشائش اور رزق کے سامان پاتا ہے۔ تم دوسرے مہاجروں سے اپنا مقابلہ کرو اور دیکھو کہ خدا تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کس قدر امتیازی سلوک کیا ہے۔ تمہارے خدا نے تمھیں ایک علیحدہ شہر بسانے کی توفیق دے دی ہے جس میں تم اطمینان سے زندگی بسر کر رہے ہو اور اگر تم اپنے ایمان اور اخلاص میں بڑھ جاؤ تو یہ شہر انشاء اللہ تعالیٰ ایک دن لائل پور کی طرح ترقی کر جائے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ مکہ میں ہر قسم کا رزق لائے گا اور رزق لانے کے کچھ طریق ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ طریق اختیار کیا کہ ایک تجارتی قبیلہ وہاں آگیا۔ وہ دوسرے ممالک میں تجارت کے لئے جاتا اور اپنے ساتھ دولت لاتا اور اس میں سے دسواں حصہ حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیل کو دے دیتا۔ اس طرح گویا انہوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ لیکن یہاں منظم حکومت موجود ہے اور وہ اس قسم کے ٹیکس خود لیتی ہے اس لئے یہاں یہ صورت نہیں ہو سکتی۔ یہاں وہ لوگوں کو توفیق عطا کرے گا کہ وہ کارخانے کھولیں جس سے یہاں کے رہنے والوں کے لئے محنت اور مزدوری کے ذرائع نکل آئیں گے۔ اور بعد میں ترقی کر کے کراچی اور بیرونی ممالک سے تجارت کے وسائل پیدا ہو جائیں گے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ہوگا جب تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح قربانی کرنے لگ جاؤ گے۔ جب تمہاری بیویاں ہاجرہ کی سی قربانیاں کرنے لگ جائیں گی اور تمہارے بچے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا سا نمونہ پیش کریں گے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے یہ ذکر کیا کہ انہوں نے خواب میں دیکھا ہے کہ وہ اسے ذبح کر رہے ہیں تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے چیخیں نہیں ماریں۔ بلکہ فرمایا کہ آپ خدا تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کریں میں اس کے لئے بسر و چشم تیار ہوں۔ پھر جب آپ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ میں چھوڑ کر گئے تو حضرت ہاجرہ نے واویلا نہیں کیا بلکہ صرف اتنا پوچھا کہ آپ ہمیں اپنی مرضی سے یہاں چھوڑ کر جا رہے ہیں یا خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ایسا کرنے کا حکم ملا ہے اس پر آپ نے آسمان کی طرف اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کا حکم ملا ہے۔ حضرت ہاجرہ کے لئے آپ کا آسمان کی طرف اشارہ کرنا ہی کافی ہو گیا۔ اور انہوں نے فرمایا۔ اِذًا لَّا یُضَیِّعُنَا ۔ اگر یہ بات ہے تو پھر خدا تعالیٰ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ چنانچہ آپ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے پاس واپس آگئیں اور اس کے بعد آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف نہیں دیکھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

متعلق احادیث میں آتا ہے کہ جب کوئی اُونچی جگہ آتی تو وہ واپس مُڑ کر دیکھتےؐ لیکن حضرت ہاجرہ نے لوٹ کر نہیں دیکھا۔ بلکہ وہ اپنے بچے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے پاس چلی گئیں اور یہ سمجھا کہ جب خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہمیں یہاں چھوڑا گیا ہے تو اب وہ خدا تعالیٰ کی طرف ہی دیکھیں گی۔ اگر تم بھی اپنے اندر اور اپنی اولاد کے اندر یہ روح پیدا کر لو اور دعاؤں کے ذریعہ خدا تعالیٰ سے ہی اپنی حاجات طلب کرو۔ تو تم دیکھو گے کہ زمین اپنے خزانے اُگل کے رکھ دے گی اور آسمان اپنی ساری دولتیں برسا دے گا۔ اب تو آسمان برستا ہے تو طوفان آجاتا ہے لیکن جب تم خدا تعالیٰ کے ہو جاؤ گے تو وہ طوفان کی بجائے رحمتیں برسائے گا۔ اب تو وہ پانی برساتا ہے تو اس سے راوی چناب اور جہلم کی سطح بلند ہو جاتی ہے، پانی سیلاب کی شکل میں کناروں سے باہر نکل آتا ہے اور سب کچھ اپنے ساتھ بہا لیجاتا ہے۔ لیکن جب تم خدا تعالیٰ کے بن جاؤ گے تو یہ آسمانی پانی بجائے سب کچھ بہا لے جانے کے اپنے پیچھے روئیدگی چھوڑ جائے گا۔ اور گندگی بہا لے جائیگا۔ پس تم عید مناؤ لیکن اس طرح جس طرح خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ پھر دیکھو گے کہ خدا تعالیٰ کی برکتیں کس طرح نازل ہوتی ہیں۔ خدا تعالیٰ کے رسولؐ پہ درُود بھیجو اور بار بار وہ درُود پڑھو جو نماز میں تمہیں سکھایا گیا ہے۔

مَیں بچہ ہی تھا اب مجھے یاد نہیں رہا یہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی وفات سے پہلے کا ذکر ہے یا حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کے ابتدائی زمانہ کی بات ہے۔ بہرحال مَیں بیت الدعا میں دُعا کر رہا تھا کہ مجھے رؤیا میں بتایا گیا کہ پانچ ابراھیم گذرے ہیں ایک ابراہیم تو وہ تھے جن کا تورات میں ذکر آتا ہے۔ دوسرے ابراہیم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھے۔ تیسرے ابراہیم حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تھے۔ چوتھے ابراہیم حضرت خلیفہ اوّلؓ تھے اور پانچویں ابراہیم تم ہو۔

اب دیکھو یہ بچپن کی بات ہے جب مجھے رؤیا میں بتایا گیا کہ تم ابراھیم ہو، اس وقت کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ہمیں قادیان چھوڑنا پڑے گا لیکن ابراہیمی مشابہت کے لئے ضروری تھا کہ ہمیں بھی ہجرت کرنی پڑے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوُا کہ ہمیں قادیان چھوڑنا پڑا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ابراہیم قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو اسمٰعیل بنا دیا۔ پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ابراہیم قرار دے کر مجھے اسمٰعیل بنا دیا۔ اور پھر مجھے ابراہیم قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ ربوہ بسایا اور تم اسمٰعیل بن گئے اور تم نے اسے آباد کر لیا۔ غرض ایک کے طفیل دوسرا ابراہیم بنا اور دوسرے کی وجہ سے تیسرا بنا۔ یہ تسلسل خدا تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں ہمیشہ جاری رکھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

قرآن کریم میں فرماتا ہے ۔ کہ اَللّٰہُ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ پیدائش عالم کو شروع بھی کرتا ہے اور پھر اس سلسلہ کو دہراتا بھی جاتا ہے ۔ اسی طرح ابراہیمی مقام بھی چکر کھاتا رہتا ہے ۔ پہلا ابراہیم جاتا ہے تو ایک اور ابراہیم آجاتا ہے ۔ دوسرا جاتا ہے تو تیسرا آجاتا ہے اور یہ سب کچھ یُعِیْدُہٗ کے ماتحت ہوتا ہے ۔

پس تم خدا تعالیٰ کے اس قانون سے فائدہ اٹھاؤ اور دعائیں کرنے کی عادت پیدا کرو تا تمہیں بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے رؤیا وکشوف ہونے لگیں ۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے اپنے ایک خطبہ میں نوجوانوں کو دعا کی طرف توجہ دلائی تو میرے پاس درجنوں ایسے خطوط آئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ انہیں رؤیا وکشوف ہونے لگ گئے ہیں بلکہ بعض کو خدا تعالیٰ کی زیارت بھی ہوئی ہے ۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ انہوں نے اس کا تجربہ کیا اور پھل کھایا ۔ تم بھی اس کا تجربہ کرو یہانتک کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہو جسے دعاؤں اور گریہ وزاری کی وجہ سے رؤیا وکشوف نہ ہونے لگ جائیں ۔ اسی طرح تم سب کے دل مضبوط ہو جائیں گے اگر کوئی آفت آئے اور لوگ گھبرا جائیں تو تم انہیں کہو کہ گھبراؤ مت میں نے رات کو رؤیا میں دیکھا ہے یا مجھے الہام ہوا ہے کہ خدا تعالیٰ یہ آفت دور کر دے گا اور ترقی کے سامان پیدا کر دے گا ۔ پھر تمہاری اولادیں رؤیا وکشوف اور الہام سے مشرف ہوں ۔ اور وہ لوگوں کو گھبراتے دیکھکر تسلی دیں ۔ پھر تمہارے پوتوں اور پڑپوتوں کو بھی الہام ہوں اور یہ سلسلہ ہزاروں سال تک چلتا چلا جائے ۔ مگر یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ تم نہ صرف خود دعاؤں کی عادت ڈالو بلکہ اپنی اولاد کو بھی دعاؤں کی عادت ڈالو ۔ ان کے اندر خدا تعالیٰ کی محبت پیدا کرو ۔ تم اسمٰعیل پیدا کرو ۔ ابراہیم خود آئیں گے اور یہ سلسلہ دنیا میں ہمیشہ جاری رہے گا یہانتک کہ ساری دنیا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل پھیل جائے گی ۔ دیکھو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ۔ لَوْکَانَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی حَیَّیْنِ لَمَا وَسِعَھُمَا اِلَّا اتِّبَاعِیْ کہ اگر موسیٰؑ اور عیسیٰؑ بھی زندہ ہوتے تو انہیں میری اطاعت کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا حالانکہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے تھے ۔ پس اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۔ کی دعا سکھا کر اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو بھی آپ کی غلامی میں دیدیا اور بتا دیا کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو آپ کی کامل اتباع کرتے اور آپ کی امت بن جاتے گویا بتایا کہ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کوئی علیحدہ امت نہیں رہی بلکہ اب تیری امت بن کر ہی ان کی امت بنے گی ۔ پہلے کوئی تیرا مطیع بنے گا تو پھر ابراہیم علیہ السلام کا مطیع ہوگا ، اسی طرح یہ درود چکر کھاتا چلا جائے گا ۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ ایک معجزانہ کلام نظر آتا

ہے کیونکہ اتنے چھوٹے سے فقرہ میں یہ سارا مفہوم بیان کرنا انسان کی طاقت میں نہیں تھا۔ پس یہ سلسلہ قیامت تک چلتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ ساری دنیا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد پھیل جائیگی اور کوئی بچہ ایسا نظر نہیں آئیگا جو رُوحانی طور پر ابراہیم اکبر یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد نہ ہو۔ اور جب ایسا ہو جائے گا تو دنیا میں امن ہی امن قائم ہو جائیگا۔"

(الفضل ۱۰ر جون ۱۹۵۹ء)

لے۔ الحج ۲۲ : ۳۸۔ ﷺ۔ ابراہیم ۱۴ : ۳۸

سے۔ حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء — ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) تیرھویں صدی ہجری کے مجدد تھے سکھوں سے جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ ضلع ہزارہ میں شہادت کا درجہ پایا۔ اور وہیں دفن کئے گئے۔

کے۔ حضرت سید اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۱ء — ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) حضرت شاہ عبدالغنی کے اکلوتے بیٹے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز ممتاز عالم دین کے بھتیجے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پوتے تھے ساری زندگی حضرت سید احمد بریلوی کے دستِ راست رہے اور پھر انہی کے ساتھ بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے ان کا مدفن بھی بالاکوٹ میں ہے۔

ھے۔ سوانح احمدی مصنفہ محمد جعفر تھانیسری صفحہ ۱۰۹

ﷺ۔ نادر خاں (۱۸۸۳ء-۱۹۳۳ء) مشہور افغان جرنیل جس نے ۱۹۲۹ء میں بچہ سقہ کو شکست دیکر نادر شاہ کے لقب سے افغانستان کی عنانِ حکومت سنبھالی اور ملک میں امن و امان قائم کیا ۱۹۳۳ء میں اسکا اچانک قتل ہو جانا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیشگوئی کا مصداق ٹھہرا۔ جس کے الفاظ تھے "آہ! نادر شاہ کہاں گیا!" ﷺ الشوریٰ ۴۲ : ۱۴

شہ۔ (۱) "سٹوری آف خیبر" مصنفہ محمد شفیع صابر ملک مطبوعہ پشاور ۱۹۶۶ء

(۲) AFGHANISTAN HIGH WAY OF CONQUEST by Arnold Fletcher P. 238. New york 1966.

ﷺ۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی

نلہ۔ الانبیاء ۲۱ : ۶۰ سلہ۔ النساء ۴ : ۱۰۱

سلہ۔ ابراہیم ۱۴ : ۳۸ سلہ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۳

سلہ۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی

ھلہ۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی

ﷺ۔ الروم ۳۰ : ۱۱

ﷺ۔ خطبہ جمعہ یکم جون ۱۹۵۶ء مطبوعہ الفضل ۲۲ر جون ۱۹۵۶ء

ﷺ۔ الیواقیت والجواہر مصنفہ عبدالوہاب شعرانی جلد ۲ صفحہ ۲۴۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۲۴۶

۴۶

(فرمودہ ۹ جولائی ۱۹۵۷ء بمقام مسجد مبارک ربوہ)

یہ عید عید الاضحیہ کہلاتی ہے یعنی اس میں جانوروں کی قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ہم قادیان میں اس طرح کیا کرتے تھے کہ قربانیاں جمع کر لیا کرتے تھے اور پھر ان کا گوشت تمام محلوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اور یہ انتظام اس لئے کیا جاتا تھا کہ تا قربانی کا گوشت ہر غریب اور امیر کے گھر پہنچ جائے یہاں ابھی اس طریق پر انتظام مکمل نہیں ہوا لیکن چونکہ انڈونیشیا میں قادیان کے پڑھے ہوئے طالب علم گئے ہیں اس لئے وہاں جماعت نے یہ انتظام کیا ہوا ہے کہ ہر احمدی اپنی قربانی مرکز میں پہنچا دیتا ہے اور آگے تمام احمدیوں کی لسٹ بنا لیتے ہیں اور ایک انتظام کے ماتحت ان میں گوشت تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اب یہاں فوری طور پر تو سارا انتظام مشکل تھا تاہم ایک بکرا تو میں نے قادیان میں کروا دیا اور پانچ دنبوں کے متعلق یہ ہدایت دے دی ہے کہ انہیں ذبح کرکے ان کا گوشت پانچ محلوں کے عہدیداروں کو دے دیا جائے کہ وہ اپنے طور پر تقسیم کر دیں۔ مگر ہونا یہاں بھی یہی چاہیئے کہ لوگ قربانی کا گوشت اکٹھا کریں اور ایک نظام کے ماتحت شہر کے لوگوں میں تقسیم کریں۔ آخر یہاں بھی خدا تعالیٰ کے فضل سے جماعت بڑھ رہی ہے اور لوگ باہر سے بھی قربانیاں بھجوا دیتے ہیں۔ کچھ مدت پہلے ربوہ میں یہ دستور رہا تھا کہ لوگ اپنی قربانیاں لنگر خانہ میں دے دیتے تھے۔ مگر ہر مہمان لنگر خانہ میں نہیں ٹھہرا ہوتا۔ کئی مہمان گھروں میں بھی ٹھہرتے ہیں اور پھر صرف مہمان ہی قربانی کے مستحق نہیں ہوتے بلکہ ربوہ کے مقیم لوگ بھی قربانی کے مستحق ہیں۔ اس لئے انتظام ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ گوشت اکٹھا کر لیا جائے اور اس میں سے ایک مناسب مقدار لنگر کو دے دی جائے۔ اور باقی گوشت تمام شہر کے لوگوں کی لسٹ بنا کر ان میں تقسیم کیا جائے۔

گرمی کی شدت اور تکلیف کی وجہ سے میں نے آج مصافحہ کے لئے بھی بعض خاص ہدایات دی ہیں پہلے تو میں نے ہدایت دیدی تھی کہ مصافحہ نہیں ہوگا لیکن پھر میں نے خیال کیا کہ عید کے موقعہ پر قدرتی طور پر لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش ہوگی کہ وہ مصافحہ کریں۔ اس لئے میں نے مصافحہ کے لئے بعض ہدایات دے دی ہیں ان کے ماتحت منتظمین صف وار مصافحہ کرائیں گے لیکن کسی کو انتظار نہیں کرنے دیا جائے گا۔ پچھلی عید پر میں نے دیکھا تھا کہ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا۔ لوگوں کو دھکے دے کر آگے لایا جاتا تھا اور قریب آکر کوئی ادھر کھسک جاتا تھا کہ میں آخر میں مصافحہ کروں گا اور کوئی اُدھر کھسک جاتا تھا کہ کسی طرح اسے زیادہ موقعہ مل جائے۔ یہ

طریق دوسروں کے حقوق کو بھی ناجائز طور پر تلف کرنے والا ہے اور خود اپنی جماعت اور امام کو بھی تکلیف میں ڈالنے والا ہے اس لئے میں نے کہدیا ہے کہ کسی کو انتظار میں مت بٹھنے دو منتظمین پہلے پہلی صف والوں کو مصافحہ کراویں اور وہ باہر چلی جائے پھر دوسری صف والوں کو مصافحہ کرائیں جب وہ باہر چلے جائیں تو تیسری صف والوں کو مصافحہ کرائیں۔ جب وہ باہر چلے جائیں تو چوتھی صف والوں کو مصافحہ کرائیں جتنے لوگ مصافحہ کرلیں ما کرلیں۔ جو رہ جائیں رہ جائیں کسی کو یہ اختیار نہ ہو کہ وہ مرضی سے آگے جاتے۔ جو پہلی صف والا پہلے مصافحہ نہیں کرنا چاہتا وہ باہر جا کر بیٹھ جائے اور انتظار کرے پھر بعد میں اسے موقعہ مل جائے تو مصافحہ کرلے ورنہ صبر کرے۔

یہ عید جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے قربانیوں کی عید ہے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی یاد میں ہے۔ میں نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی یہ نہیں تھی جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انہیں ذبح کرنے کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے زمین پر لٹا دیا تھا لیکن بعد میں خدا تعالیٰ سے الہام پا کر آپ نے ذبح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور الٰہی اشارہ کی بناء پر ان کی جگہ ایک بکرا ذبح کر دیا۔ میں بارہا بتا چکا ہوں کہ درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے وادیٔ مکہ میں چھوڑ آنے کے متعلق یہ رؤیا دکھائی گئی تھی۔ کیونکہ ایک بے آب وگیاہ وادی میں بیٹھ جانا بھی بہت بڑی قربانی ہے۔ جیسے شروع شروع میں ربوہ میں چند آدمی خیمے لگا کر بیٹھ گئے تھے تاکہ اسے آباد کیا جائے۔ وہ آدمی درحقیقت اس وقت اسمٰعیلی سنّت کو پورا کر رہے تھے، وہ صرف اس لئے یہاں بیٹھ گئے تھے کہ آئندہ یہاں ربوہ آباد کیا جائے۔ اگر وہ قربانی نہ کرتے اور ربوہ میں آکر خیمے لگا کر نہ بیٹھ جاتے تو نہ یہ شہر بنتا نہ سڑکیں بنتیں نہ بازار بنتے، نہ مکانات بنتے اور یہ جگہ پہلے کی طرح چٹیل میدان ہی رہتی۔

امریکہ میں جو فری تھنکنگ (FREE THINKING) کی تحریک پیدا ہوئی ہے اس کا بانی ایک فرانسیسی شخص ہے اس نے اپنا قصہ یہی لکھا ہے کہ میں ایک دن اپنے باپ کے ساتھ ایک پادری کا وعظ سننے گیا تو وہاں اس نے یہ کہا کہ ابراہیمؑ بڑا نیک انسان تھا اس نے خدا کی خاطر اپنے اکلوتے بیٹے کے گلے پر چھری پھیر دی۔ وہ لکھتا ہے کہ اتفاق کی بات ہے میں بھی اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہی تھا میں وہاں سے نکل کر بھاگا۔ میرے دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ اگر میرے باپ کو یہ خطبہ پسند آگیا تو وہ کہیں میری گردن پر بھی چھری نہ پھیر دے۔ میں سمندر پر گیا وہاں ایک امریکہ جانیوالا جہاز کھڑا تھا میں اس میں گھس گیا اور کسی کونہ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اور اس طرح امریکہ پہنچ گیا۔ یہاں آکر میں نے یہ دہریوں والی تحریک جاری کی۔

غرضیکہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی قربانی کو غلط شکل میں پیش کیا جاتا ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی رؤیا کا یہ مطلب تھا کہ آپ اپنی مرضی سے اور یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ وادی مکہ ایک بے آب و گیاہ جنگل ہے اور وہاں کھانے پینے کو کچھ نہیں ملتا۔ اپنی بیوی اور بچے کو وہاں چھوڑ آئیں۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بڑے ہوتے تو آپ نے اپنی نیکی اور تقویٰ کے ساتھ اپنے گرد لوگوں کا ایک گروہ جمع کر لیا۔ اور انہیں نماز اور زکوٰۃ اور صدقہ و خیرات کی تحریک کر کے اور اسی طرح عمرہ اور حج کے طریق کو جاری کر کے آپ نے مکہ کو آباد کرنا شروع کیا۔ چنانچہ ان کی قربانیوں کے نتیجہ میں صدیوں سے مکہ آباد چلا آتا ہے قریباً تین ہزار سال سے برابر خانہ کعبہ آباد ہے اور اس کا طواف اور حج کیا جاتا ہے۔

پس عیدالاضحیہ کی قربانی بے شک اس قربانی کی یاد دلاتی ہے۔ مگر اس قربانی کی یاد نہیں دلاتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ظاہری شکل میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی گردن پر چھری پھیر دی۔

درحقیقت قربانیوں کی عید ہمیں اس طرف توجہ دلاتی ہے کہ ہم خدا تعالےٰ کی خاطر اور اس کے بعد دین کے لئے جنگلوں میں جائیں اور وہاں جا کر خدا تعالےٰ کے نام کو بلند کریں۔ اور لوگوں سے اس کے رسول کا کلمہ پڑھوائیں جیسا کہ ہمارے صوفیاء کرام کرتے چلے آئے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو یقیناً ہماری قربانی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کے مشابہ ہوگی۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ قربانی بالکل حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی طرح ہو جائے گی کیونکہ دلوں کی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے دل کی حالت اور تھی اور ہمارے زمانہ کے لوگوں کے دلوں کی حالت اور ہے مگر بہرحال وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کے مشابہ ضرور ہو جائیگی پس تم اپنے آپ کو اس قربانی کے لئے پیش کرو۔ میرے نزدیک اس زمانہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کے مشابہ قربانی وہ مبلغ کر رہے ہیں جو مشرقی اور مغربی افریقہ میں تبلیغ کا کام کر رہے ہیں۔ وہ غیر آباد ملک ہیں جن میں کوئی شخص خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کا نام نہیں جانتا تھا لیکن ان لوگوں نے وہاں پہنچکر انہیں خدا تعالےٰ اور اس کے رسولؐ کا نام بتایا۔ میں پہلے بھی ایک خطبہ میں بتا چکا ہوں کہ مغربی افریقہ کے ایک ملک میں عیسائیوں نے اپنے پریس میں احمدی اخبار کا چھاپنا بند کر دیا تو ہمارے مبلغ انچارج جماعت کا علیحدہ پریس لگانے کے سلسلہ میں چندہ اکٹھا کرنے کے لئے ایک جگہ گئے وہاں انہیں ایک ایسا آدمی ملا جسے انہوں نے بڑی تبلیغ کی تھی مگر اس نے احمدیت قبول نہیں کی تھی۔ بعد میں اس کے پاس ایک مقامی مبلغ پہنچا تو اس نے کہا کہ تمہارے بڑے پاکستانی مبلغ نے مجھے تبلیغ کی ہے لیکن اگر یہ دریا (وہ اس وقت ایک دریا کے کنارے جا رہے تھے) اپنا رُخ پھیر کر الٹی طرف چل پڑے تو یہ بات ممکن ہے لیکن میرا احمدیت کو قبول کرنا ناممکن ہے۔

لیکن کچھ دن اس مبلغ کی صحبت میں رہنے کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ وہ احمدی ہو گیا۔ ہمارے مبلغ انچارج کہتے ہیں کہ جب میں وہاں چندہ لینے گیا تو اتفاقاً وہ شخص اس شہر میں آیا ہوا تھا وہ مجھے ملا اور کہنے لگا۔ آپ یہاں کیسے تشریف لائے ہیں۔ مَیں نے اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا اور کہا کہ عیسائیوں نے اپنے پریس میں ہمارا اخبار شائع کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اگر تمہارے خدا میں کوئی طاقت ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ کوئی معجزہ دکھائے اور تمہارا اپنا پریس جاری کر دے۔ پس میں اپنا علیحدہ پریس لگانے کے لئے چندہ اکٹھا کرنے آیا ہوں۔ اس پر وہ احمدی دوست کہنے لگا مولوی صاحب! یہ تو بڑی بے غیرتی ہے کہ اب ہمارا اخبار ان کے پریس میں چھپے۔ آپ یہاں کچھ دیر انتظار کریں مَیں ابھی آتا ہوں۔ اس کا گاؤں قریب ہی تھا۔ وہ وہاں گیا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آکر اس نے پانچ سو پونڈ کی رقم مولوی صاحب کے ہاتھ میں دے دی اور کہا کہ پریس کے سلسلہ میں یہ میرا چندہ ہے۔ اس کے بعد خدا تعالیٰ کے فضل سے اس مد میں ۲۵۰۰ پونڈ کے قریب چندہ جمع ہو چکا ہے۔ اور اب سُنا ہے کہ پریس لگ رہا ہے یا کم از کم وہ انگلستان سے چل چکا ہے۔ غرض ہمارے یہ مبلغ ایسے ممالک میں کام کر رہے ہیں جہاں جنگل ہی جنگل ہیں۔ شروع شروع میں جب ہمارے مبلغ وہاں گئے تو بعض دفعہ انہیں وہاں درختوں کی جڑیں کھانی پڑتی تھیں اور وہ نہایت تنگی سے گذارہ کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہو جاتی تھی۔ گو اب ہمارے آدمیوں کے میل ملاپ کی وجہ سے ان لوگوں میں کچھ نہ کچھ تہذیب آگئی ہے۔ ان ممالک کو سفید آدمیوں کی قبر کہا جاتا ہے کیونکہ وہاں کھانے پینے کی چیزیں نہیں ملتیں جب سفید آدمی وہاں جاتے ہیں تو وہ مناسب خوراک نہ ملنے کی وجہ سے مر جاتے ہیں اور پیچش وغیرہ بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ غرض اس زمانہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے زیادہ سے زیادہ مشابہت ہمارے مبلغوں کو حاصل ہے۔ جو اس وقت مشرقی اور مغربی افریقہ میں کام کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ ملک اس وقت بھی جنگل ہیں اور دنیا میں کوئی اور ملک جنگل نہیں۔ امریکہ بھی آباد ہے یورپ بھی آباد ہے اور مڈل ایسٹ بھی اب آباد ہو چکا ہے لیکن افریقہ کے اکثر علاقے اب بھی غیر آباد ہیں۔ ان میں تبلیغ کرنے والوں کو بڑے بڑے لمبے سفر کرنے پڑتے ہیں اور بڑی جانکاہی کے بعد لوگوں تک اسلام پہنچانا پڑتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہ ملک ہمارے لئے رکھے تھے تاکہ ہمارے نوجوان ان میں کام کر کے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے مشابہت حاصل کریں۔ پس خدا تعالیٰ کے فضل سے ہمارے نوجوان افریقہ کے جنگلات میں بھی کام کر رہے ہیں۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ اس ملک میں بھی اس طریق کو جاری کیا جا سکتا ہے چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ اگر کچھ نوجوان ایسے ہوں جن کے دلوں میں یہ خواہش پائی جاتی ہو کہ وہ حضرت خواجہ معین الدین صاحب چشتیؒ اور حضرت

شہاب الدین صاحب سہروردیؒ کے نقشِ قدم پر چلیں تو جس طرح جماعت کے نوجوان اپنی زندگیاں تحریک جدید کے ماتحت وقف کرتے ہیں۔ وہ اپنی زندگیاں براہِ راست میرے سامنے وقف کریں تاکہ میں ان سے ایسے طریق پر کام لوں کہ وہ مسلمانوں کو تعلیم دینے کا کام کرسکیں۔ وہ مجھ سے ہدایتیں لیتے جائیں اور اس ملک میں کام کرتے جائیں۔ ہمارا ملک آبادی کے لحاظ سے ویران نہیں لیکن رُوحانیت کے لحاظ سے بہت ویران ہوچکا ہے۔ اور آج بھی اس میں چشتیوں کی ضرورت ہے سہروردیوں کی ضرورت ہے نقشبندیوں کی ضرورت ہے اگر یہ لوگ آگے نہ آئے اور حضرت معین الدین صاحب چشتیؒ، حضرت شہاب الدین صاحب سہروردیؒ اور حضرت فریدالدین صاحب شکر گنجؒ جیسے لوگ پیدا نہ ہوئے تو یہ ملک رُوحانیت کے لحاظ سے اور بھی ویران ہوجائے گا۔ بلکہ یہ اس سے بھی زیادہ ویران ہوجائیگا جتنا مکہ مکرمہ کسی زمانہ میں آبادی کے لحاظ سے ویران تھا۔ پس میں چاہتا ہوں کہ جماعت کے نوجوان ہمت کریں اور اپنی زندگیاں اس مقصد کے لئے وقف کریں وہ صدر انجمن احمدیہ یا تحریک جدید کے ملازم نہ ہوں۔ بلکہ اپنے گذارہ کے لئے وہ طریق اختیار کریں جو میں انہیں بتاؤں گا اور اس طرح آہستہ آہستہ دُنیا میں نئی آبادیاں قائم کریں۔ اور طریق آبادی کا یہ ہوگا کہ وہ حقیقی طور پر تو نہیں ہاں معنوی طور پر ربوہ اور قادیان کی محبت اپنے دل سے نکال دیں اور باہر جاکر نئے ربوے اور نئے قادیان بسائیں۔ ابھی اس ملک کے کئی علاقے ایسے ہیں جہاں میلوں میل تک کوئی بڑا قصبہ نہیں وہ جاکر کسی ایسی جگہ بیٹھ جائیں اور حسبِ ہدایت وہاں تبلیغ بھی کریں اور لوگوں کو تعلیم بھی دیں۔ لوگوں کو قرآن کریم اور حدیث پڑھائیں اور اپنے شاگرد تیار کریں جو آگے اور جگہوں پر پھیل جائیں۔ اس طرح سارے ملک میں وہ زمانہ دوبارہ آجائیگا جو پُرانے صوفیاء کے زمانہ میں تھا۔

دیکھو ہمت والے لوگوں نے پچھلے زمانہ میں بھی کوئی کمی نہیں کی۔ یہ دیوبند جو ہے یہ ایسے ہی لوگوں کا قائم کیا ہوا ہے؎۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے حضرت سیّد احمد صاحب بریلویؒ کی ہدایت کے ماتحت یہاں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اور آج سارا ہندوستان ان کے علم سے منور ہو رہا ہے۔ حالانکہ وہ زمانہ حضرت معین الدین صاحب چشتیؒ کے زمانہ سے کئی سو سال بعد کا تھا لیکن پھر بھی روحانی لحاظ سے وہ اس سے کم نہیں تھا جبکہ ان کے زمانہ میں اسلام ہندوستان میں ایک مسافر کی شکل میں تھا۔ اس زمانہ میں بھی وہ ہندوستان میں ایک مسافر کی شکل میں ہی تھا حضرت سیّد احمد صاحب بریلویؒ نے اپنے شاگردوں کو ملک کے مختلف حصوں میں بھجوایا جن میں سے ایک ندوہ کی طرف بھی آیا پھر ان کے ساتھ اور لوگ مل گئے اور ان سب نے اس ملک میں دین اور اسلام کی بنیادیں مضبوط کیں۔ اب چاہے ان کی اولاد خراب ہوگئی ہے

؎ دارالعلوم دیوبند مراد ہے جو مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نام پر قاسم العلوم کہلاتا ہے اس مدرسے کے اصل محرک مولوی فضل الرحمٰن صاحب تھے اور دو اور اساتذہ تھے بعد میں مولانا نانوتوی کی سرپرستی میں اسے بہت فروغ حاصل ہوا۔ (موج کوثر صفحہ ۲۲۵ مطبوعہ فیروز سنز لاہور ۱۹۵۸ء)

اللہ تعالیٰ ہماری اولادوں کو بچائے کہ وہ خراب نہ ہوں) لیکن ان کی اولادوں کی خرابی ان کے اختیار میں نہیں تھی۔ انہوں نے تو جس حد تک ہو سکا دین کی خدمت کی بلکہ جہاں تک صُلبی اولاد کا تعلق تھا مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی اولاد پھر بھی دوسروں سے بہت بہتر ہے۔ مَیں جب ندوہ[1] دیکھنے گیا۔ تو مولویوں نے ہماری بڑی مخالفت کی۔ مگر مولوی محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے بیٹے یا پوتے جو اُن دنوں ندوہ کے منتظم تھے انہوں نے میرا بڑا ادب کیا۔ اور مدرسہ والوں کو حکم دیا کہ جب یہ لوگ آئیں تو ان سے اعزاز کے ساتھ پیش آئیں۔ بعد میں انہوں نے میری دعوت بھی کی لیکن میں پیچش کی وجہ سے اس دعوت میں شریک نہ ہو سکا۔ میرے ساتھ اس سفر میں مولوی سیّد سرور شاہ صاحبؓ۔ حافظ روشن علی صاحبؓ اور قاضی سیّد امیر حسین صاحبؓ بھی تھے اس سے پتہ لگتا ہے کہ ان کے اندر ابھی مولوی محمد قاسم صاحب نانوتویؒ والی شرافت باقی تھی اگر ان میں وہ شرافت نہ ہوتی تو ہمارے جانے پر جیسے اور مولویوں نے مظاہرے کئے تھے وہ بھی مظاہرہ کرتے لیکن انہوں نے مظاہرہ نہیں کیا۔ اور بڑے ادب سے پیش آئے اور بڑی محبت کے ساتھ انہوں نے ہماری دعوت کی اور استقبال کیا۔ بعد میں انہوں نے مولوی عبید اللہ صاحبؒ سندھی کو ہمارے پاس بھجوایا اور معذرت کی کہ مجھے پتہ لگا ہے کہ بعض مولویوں نے آپ سے گستاخانہ کلام کیا ہے مجھے اس کا بڑا افسوس ہے مَیں انہیں ہمیشہ کہتا رہتا ہوں کہ ایسا نہ کیا کریں لیکن وہ سمجھتے نہیں۔ اس وقت مولوی عبید اللہ صاحب سندھی جو بڑے متمدن اور مہذب آدمی تھے ان کے مشیر کار تھے۔ اور وہ مولوی صاحب کا بڑا لحاظ کرتے تھے اور انہیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کی باتیں مانتے تھے لیکن اصل بات یہی ہے کہ ماننے والے کے اندر جب تک اطاعت کا مادہ نہ ہو تو چاہے اسے کوئی کتنا بڑا آدمی ہی کیوں نہ مل جائے۔ وہ مفید نہیں ہو سکتا۔ مولوی محمد قاسم صاحبؒ کے یہ بیٹے یا پوتے جن کا میں نے ذکر کیا ہے ان کا نام غالباً محمد یا احمد تھا۔ مولوی عبید اللہ صاحب سندھی انہیں ہمیشہ صحیح مشورہ دیتے رہتے تھے اور وہ ان سے ایسا کام لیتے تھے جس سے اسلامی اخلاق صحیح طور پر ظاہر ہوں۔ چنانچہ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ انہوں نے میرا بڑا ادب کیا اور دعوت کی اور بعد میں مولوی عبید اللہ صاحب سندھی کو میرے پاس بھیجکر معذرت کی کہ بعض مولویوں نے آپ کے ساتھ گستاخانہ کلام کیا ہے جس کا مجھے افسوس ہے آپ اس کی پرواہ نہ کریں۔ تو ہماری جماعت کے لئے اس ملک میں بھی ابھی صوفیاء کے طریق پر کام کرنے کا موقعہ ہے جیسا کہ دیوبند کے قیام کے زمانہ میں ظاہری آبادی تو بہت تھی لیکن روحانی آبادی کم ہو گئی تھی۔ روحانی آبادی کی کمی کی وجہ سے مولوی محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے دیکھ لیا تھا کہ یہاں اب رُوحانی نسل جاری کرنی چاہیئے تاکہ یہ علاقہ اسلام اور رُوحانیت کے

---

[1] اس سے مراد دارالعلوم ندوہ لکھنؤ ہے جس کو مولانا سیّد محمد علی صاحب کانپوری نے ۱۸۹۴ء میں قائم کیا اسے ندوۃ العلماء بھی کہتے ہیں مولانا شبلی نعمانی کی سرپرستی

نور سے منور ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے بڑا کام کیا۔ جیسے ان کے پیر حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ نے بڑا کام کیا تھا اور جیسے ان کے ساتھی حضرت اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کے بزرگ اعلیٰ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے بڑا کام کیا تھا۔ یہ سارے کے سارے لوگ اپنے زمانہ کے لئے اسوۂ حسنہ ہیں۔ درحقیقت ہر زمانہ کا فرستادہ اور خدا تعالیٰ کا مقرب بندہ اپنے زمانہ کے لئے اسوۂ حسنہ ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے زمانہ کے لئے اسوۂ حسنہ تھے (باقی انبیاء اپنے اپنے زمانہ کے لئے اسوۂ حسنہ تھے) سید احمد صاحب سرہندیؒ اپنے زمانہ کے لئے اسوۂ حسنہ تھے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ اپنے زمانہ کے لئے اسوۂ حسنہ تھے اور حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ اپنے زمانہ کے لئے اسوۂ حسنہ تھے۔ پھر دیوبند کے جو بزرگ تھے وہ اپنے زمانہ کے لئے اسوۂ حسنہ تھے انہوں نے اپنے پیچھے ایک نیک ذکر دنیا میں چھوڑا ہے۔ ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ اسے یاد رکھنا چاہیئے اور اس کی نقل کرنی چاہیئے۔ سو آج بھی زمانہ ہے کہ ہمارے وہ نوجوان جن میں اس قربانی کا مادہ ہو کہ وہ اپنے گھر بار سے علیحدہ رہ سکیں۔ بے وطنی میں ایک نیا وطن بنائیں اور پھر آہستہ آہستہ اس کے ذریعہ سے تمام علاقہ میں نور اسلام اور نور ایمان پھیلائیں اپنے آپ کو اس غرض کے لئے وقف کریں۔ میرے نزدیک یہ کام بالکل ناممکن نہیں بلکہ ایک سکیم میرے ذہن میں آرہی ہے۔ اگر ایسے نوجوان تیار ہوں جو اپنی زندگیاں تحریک جدید کو نہیں بلکہ میرے سامنے وقف کریں اور میری ہدایت کے ماتحت کام کریں تو مَیں سمجھتا ہوں کہ خدمتِ اسلام کا ایک بہت بڑا موقعہ اس زمانہ میں ہے جیسا کہ مولوی محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے زمانہ میں تھا یا جیسا کہ حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ اور دوسرے صوفیاء یا اولیاء کے زمانہ میں تھا۔"

(الفضل یکم اگست ۱۹۵۷ء)

۱؎ ۔ الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۰۸ ، سنن ابن ماجہ کتاب الاضاحی باب ثواب الاضحیۃ

۲؎ ۔ تاریخ احمدیت جلد ۱۲ صفحہ ۲۲۴

۳؎ ۔

۴؎ ۔ انچارج مبلغ مکرم مولانا محمد صدیق صاحب امرتسری۔ اخبار کا نام "دی افریقن کریسنٹ" اور افریقن دوست جن کا یہاں ذکر ہے۔ مکرم حاجی حبیب قاسم کمانڈا صاحب ہیں۔

۵؎ ۔ تاریخ احمدیت جلد ۸ صفحہ ۴۰۹

۶؎ ۔ "INSIDE AFRICA" by John Gunther Page 720. London 1955.

۷؎ ۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ ($\frac{۵۳۶}{۱۱۴۲}$ ھ/ء – $\frac{۶۳۳}{۱۲۳۶}$ ھ/ء)

۸ - حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (۵۳۹ھ/۱۱۴۵ء - ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء)

۹ - حضرت فریدالدین باباشکر گنج رحمۃ اللہ علیہ (۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء - ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء)

۱۰ - حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء - ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۹ء)

۱۱ - تاریخ احمدیت جلد ۳ صفحہ ۴۱۷

۱۲ - ناظم مدرسہ مولوی محمد احمد صاحب تھے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے خلف الرشید تھے (تاریخ احمدیت جلد ۳ صفحہ ۴۲۲)

۱۳ - حضرت سید سرور شاہ صاحب رضی اللہ عنہ کے متعلق نوٹ صفحہ ۱۶۲ پر ملاحظہ ہو۔

۱۴ - حضرت حافظ روشن علی صاحب (۱۸۸۲ - ۱۹۲۹ء)

۱۵ - حضرت قاضی سید امیر حسین صاحب رضی اللہ عنہ (۔۔۔۔۔ - ۱۹۳۰ء)

۱۶ - مولوی عبیداللہ صاحب سندھی (۱۸۷۲ء - ۱۹۴۴ء) برصغیر پاک و ہند کے مشہور عالم دین تھے۔

۱۷ - حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ (۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲ء - ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) برصغیر پاک و ہند کے ممتاز عالم دین محدث اور مفسر تھے آپ کئی مشہور کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

۱۸ - حضرت شیخ احمد سرہندیؒ مجدد الف ثانی (۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء - ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء)

۱۹ - "وقفِ جدید" کی طرف اشارہ ہے جس کے اجراء کا اعلان حضور رضی اللہ عنہ نے ۱۹۵۷ء کے جلسہ سالانہ کے موقعہ پر کیا تھا۔ (الفضل ۷ رجنوری ۱۹۵۸ء) اس کی تفصیلات حضور نے خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۷ رجنوری ۱۹۵۸ء (مطبوعہ الفضل ۲۰ رجنوری ۱۹۵۸ء) میں جماعت کے سامنے رکھیں۔ وقفِ جدید انجمن احمدیہ کا باقاعدہ قیام ۱۹ رجنوری ۱۹۵۸ء کو عمل میں آیا۔

(۴۷)

(فرمودہ ۲۹؍جون ۱۹۵۵ء بمقام مری)

"مری سے بذریعہ فون اطلاع موصول ہوئی ہے کہ مورخہ ۲۹؍جون ۱۹۵۵ء کو سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالےٰ نے نماز عید الاضحیہ پڑھائی جس کے بعد حضور نے قربانی کے موضوع پر ایک بصیرت افروز خطبہ ارشاد فرمایا جو قریبًا نصف گھنٹے تک جاری رہا۔

خطبہ میں حضور نے فرمایا کہ یہ زمانہ خصوصیت کے ساتھ قربانیوں کا زمانہ ہے۔ اس میں وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے اور ترقی کر سکتی ہے جو عملاً ہر وقت قربانیوں کے لئے آمادہ رہے۔ حضور نے فرمایا: عیسائیوں نے قربانیاں کیں اور آج تک ان کی نسلیں اس قربانی سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے آہستہ آہستہ اس سبق کو فراموش کر دیا جس کی وجہ سے انہوں نے ناقابلِ تلافی نقصان اٹھایا۔ اب ہماری جماعت کا فرض ہے کہ وہ متواتر اور مسلسل دین کی راہ میں قربانیاں کر کے اسلام کی نشأۃ ثانیہ کو قریب سے قریب تر کر دے۔"

(الفضل ۲؍جولائی ۱۹۵۵ء)

افسوس ہے یہ خطبہ الفضل یا کسی دوسرے رسالہ میں شائع نہیں ہوا۔ (مرتب)

اشاریہ خطباتِ محمودؓ

جلد دوم

ابراہیم علیہ السلام۔ حضرت ابوالانبیاء۔ ۳-۴
۱۴-۱۵-۱۸-۲۱-۴۲-۴۹-۶۰-
۶۲-۷۷-۸۱-۸۲-۱۰۲-۱۰۷-۱۱۳
۱۱۹-۱۲۳-۱۲۹-۱۳۴-۱۴۵-۱۴۸
۱۵۲-۱۵۵-۱۶۸-۱۷۱-۱۷۵-۱۷۷
۱۸۹-۱۹۸-۲۰۱-۲۱۰-۲۱۷-۲۲۷
۲۳۵-۲۴۴-۲۵۷-۲۶۲-۲۷۸-
۲۸۳-۲۹۷-۳۰۶-۳۱۲-۳۱۸-
۳۴۶-۳۶۵-۳۷۹-۳۸۵-۳۸۸
۳۹۲-۳۹۳-
ابراہیم۔ صاحبزادہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم
۲۹-۲۴۷
ابراہیم ادھمؒ۔ ۳۴۲
ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ حضرت خلیفۃ الرسول الاوّل۔ ۳۰
۳۷-۵۰-۱۶۹-۱۸۱-۲۲۵-۲۴۷
۲۴۸-۲۵۱-۲۵۳-۲۶۹-۳۴۵
۳۶۱-۳۶۹
ابوطالب عمّ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔
۸۵-۲۱۸
اَبوعبیدہؓ بن الجراح۔ ۱۰۰-۲۴۷-۲۵۶
ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ ۱۲۵
ابودجانہ رضی اللہ عنہ۔ ۱۸۶
ابوبرزۃ الاسلمی رضی اللہ عنہ۔ ۲۳۲
ابوجہل۔ ۲۴۰-۲۵۵-۲۶۹-۲۷۱
اُحد جنگ۔ ۴۹-۲۱۵-۲۲۹-۲۴۸-
۳۰۲
احزاب جنگ۔ ۲۰۳-۲۰۷-۳۶۹
احمد اللہ ناگپوری۔ حضرت حافظ۔ ۳۶۲
احمدیہ انٹر کالجئیٹ ایسوسی ایشن۔ ۲۰۸
حضرت آدم علیہ السلام۔ ۶۷-۱۲۸-۱۳۴-۱۵۱
حضرت اسمٰعیل علیہ السلام۔ ۴-۱۶-۵۵-۶۰
۶۱-۶۳-۸۲-۸۳-۱۰۵-۱۰۷
۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴-۱۲۹-۱۳۴-۱۵۶
۱۵۹-۱۹۱-۲۱۸-۲۴۴-۲۵۰-
۲۷۸-۲۹۸-۳۱۸-۳۲۱-۳۴۲
۳۴۶-۳۸۵-۳۸۸-۳۹۳-۳۹۸
حضرت اسحاق علیہ السلام۔ ۸۳-۱۰۳-۱۲۹-
۱۳۴-۲۵۰-۳۲۱-۳۹۵
آسنور (کشمیر)۔ ۷۰
آسٹریلوی پارلیمنٹ۔ ۳۳۲
افریقہ۔ ۲۱-۳۲۲-۳۵۲-۳۵۵-
۳۹۹
افغانستان۔ ۲۱-۹۸۳-۲۸۶-۲۳۲
۲۸۶-۳۲۲
افریقن کریسنٹ اخبار۔ ۴۰۳
الفضل اخبار۔ ۱۹۴-۱۹۵-۳۳۹

امریکہ - ۲۱ - ۳۲۲ - ۳۵۲
امۃ العزیز صاحبزادی - ۸۸
امۃ الحکیم صاحبزادی - ۳۳۸
امیر حسینؓ - حضرت قاضی سید - ۴۰۲-۴۰۴
اُمیہ بنو - ۱۸۱ - ۱۸۶
امرت سر - ۲۶۱
انس بن مالک رضی اللہ عنہ - ۲۳۲
انڈونیشیا - ۳۲۲ - ۳۵۵
انڈین یونین - ۳۲۲
اُوربستی - ۱۴۸
ایران - ۲۱ - ۵۰ - ۱۸۱ - ۳۲۲ - ۳۷۸
ایشیا - ۱۱۳ - ۳۲۳ - ۳۵۲

باتو خان - ۳۲۳ - ۳۲۶
بُدھ مذہب - ۲۷۱
بدر جنگ - ۲۲۹ - ۲۴۸ - ۳۴۵ - ۳۷۱
برمکی خاندان - ۳۴۴ - ۳۵۰
برما - ۳۲۲ - ۳۷۸
بُرہان الدین - حضرت مولوی - ۳۸۲ - ۳۸۴
بھیرہ (ضلع سرگودھا) - ۲۶۱
بہار (صوبہ) - ۱۷۰ - ۲۸۸
بیرم خاں - ۴۰ - ۵۲

پاکستان - ۳۱۶ - ۳۵۵ - ۳۶۰
پروٹسٹنٹ - ۱۱۳

تحریک جدید - ۲۲۶ - ۳۹۱
تحریک فری تھنکنگ - ۲۹۸
تحریک وقف جدید - ۴۰۳ - ۴۰۴

ثناء اللہ مولوی - ۶۷ - ۶۹
ثور غار - ۲۱۴ - ۳۴۵
ثقیفہ بنو - ۲۷

جاپان - ۱۸۳
جان محمدؓ حضرت میاں - ۳۲۷ - ۳۴۹
جرمنی - ۱۸۳
جنگِ عظیم (اوّل) - ۵ - ۷ - ۵۶
جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ - ۱۶۲ - ۱۶۸
جہلم دریا - ۳۹۴

چنگیز خاں - ۳۲۳ - ۳۲۶
چناب دریا - ۳۹۴
چھتری یادگار - ۸۷
چین - ۱۸۳ - ۲۷۱ - ۳۲۲
چیمبرلین - برطانوی وزیر اعظم - ۲۷۹ - ۲۸۱

حامد علیؓ حضرت شیخ - ۳۸۳ - ۳۸۴
حبشہ (ایبے سینیا) - ۲۴۹ - ۲۶۶ - ۳۲۲
حجاز (سعودی عرب) - ۱۲۰ - ۱۸۱ - ۳۱۶
۳۵۵
حجاج بن یوسف - ۱۶۱
حرا غار - ۲۱۴
حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ - ۲۶ - ۳۶

حسینؓ حضرت امام ـ ۸۶ ـ ۲۲۳ ـ ۲۲۵
حسنؓ حضرت امام ـ ۹۰ ـ ۲۲۵
حسن نظامی خواجہ علی ـ ۲۵۳ ـ ۲۵۶
حمزہ رضی اللہ عنہ ـ ۲۵۱ ـ ۲۵۳ ـ ۲۵۶
حمیر ـ ۲۰۴
حنین جنگ ـ ۲۷

خالدؓ بن ولید ـ ۲۷۰ ـ ۲۷۴ ـ ۳۲۰ ـ ۳۶۱
خدیجہؓ ام المومنین ـ ۶۳ ـ ۳۶۱
خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ ـ ۴۸ ـ ۹۴ ـ ۱۳۹ ـ ۲۰۹ ـ ۲۶۰ ـ ۳۲۸
خندق جنگ ـ ۲۰۳ ـ ۳۷۱

داؤد مظفر احمد سید ـ ۳۳۸
دولتشاہ ـ ۱۷۴ ـ ۱۸۶
دہلی ـ ۲۸۶
دیانند پنڈت ـ ۲۷۱ ـ ۲۷۵
دیوبند ـ دارالعلوم ـ ۴۰۱
ڈچ قونصل ـ ۱۳۷
ڈیرہ اسمٰعیل خاں ـ ۳۹۰

راشکین ـ ۱۷۴
راک فیلر ـ ۳۴۴ ـ ۳۵۰
راوی دریا ـ ۳۹۴
ربوہ ـ ۳۲۴ ـ ۳۵۱ ـ ۳۹۳ ـ ۳۹۷ ـ ۳۹۸

رتن باغ ـ ۳۲۷
رجیع ـ ۲۳۱
رستم ـ ۱۰۰
رنبیر سنگھ مہاراجہ ـ ۱۶۷ ـ ۱۸۶
روس ـ ۳۷۹
روشن علیؓ ـ حضرت حافظ ـ ۴۰۲ ـ ۴۰۴
روشیلڈ ـ ۳۴۴ ـ ۳۵۰

زبیرؓ بن العوام ـ ۳۰ ـ ۳۸ ـ ۲۴۷ ـ ۲۵۱ ـ ۲۵۳ ـ ۲۵۶
زرتشتی مذہب ـ ۸۳
زکریا علیہ السلام ـ ۲۲ ـ ۲۵۱
زمزم ـ ۱۵ ـ ۱۹ ـ ۶۳ ـ ۸۲ ـ ۱۵۱ ـ ۲۴۶
زید بن عمرو بن نفیل ـ ۶۶ ـ ۱۴۹
زیدؓ بن دثنہ ـ ۲۳۱
زیدؓ بن ارقم ـ ۲۳۲
زیدؓ بن حارثہ ـ ۳۶۳
زین العابدین ـ ۱۵۷ ـ ۲۲۳ ـ ۲۲۴

سارہ رضی اللہ عنہا ـ ۲۱۰
سعیدؓ بن جبیر ـ ۲۶
سعدؓ بن معاذ ـ ۳۷
سعدؓ بن الربیع ـ ۲۳۱ ـ ۲۴۷
سعدؓ بن ابی وقاص ـ ۲۵۶
سلمانؓ الفارسی ـ ۳۱ ـ ۳۸
سلمہ رضی اللہ عنہا ام المومنین ـ ۹۰

سہارنپور — ۲۳۹
سیالکوٹ — ۳۵۷
سیلون — ۳۷۸
سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ — ۳۸۹ - ۳۹۶ - ۴۰۱ -
سید احمد سرہندیؒ — ۴۰۳ - ۴۰۴
سید اسمٰعیل شہیدؒ — ۳۸۹ - ۳۹۶
سی انڈریا سامسٹر — ۱۴۰

شام — ۱۲۰ - ۳۱۶ - ۳۲۲ - ۳۵۵
شبلی رحمۃ اللہ علیہ — ۱۶۱ - ۱۷۷
شریف دوتسا شہید — ۲۹۴
شعب ابی طالب — ۶۸
شعیب علیہ السلام — ۲۵۱
شہاب الدین سہروردیؒ — ۴۰۱ - ۴۰۳
شیر شاہ سوری — ۴۰ - ۵۲
شیبہ — ۲۴۷ - ۲۶۹ - ۲۷۱

صالح علیہ السلام — ۲۵۱
صفا — ۶۳ - ۸۲ - ۱۲۳ - ۱۵۶ - ۲۲۱ - ۲۲۲
صفوان بن امیہ — ۲۳۱
صلح حدیبیہ — ۳۱۸ - ۳۶۷

طلحہؓ بن عبیداللہ — ۳۰ - ۳۸ - ۲۴۷ - ۲۵۱ - ۲۵۵

عائشہؓ۔ حضرت ام المؤمنین — ۱۸۱ - ۲۷۰ - ۳۲۹
عامرؓ بن ابی وقاص — ۲۵۶
عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما — ۱۵ - ۲۶ - ۳۶ - ۱۱۸
عبداللہؓ بن مسعود — ۳۷
عبداللہ حفیف — ۱۲۷
عبداللہ بن ابی بن سلول — ۵۰
عبیداللہ سندھی مولوی — ۲۹۴ - ۴۰۲ - ۴۰۴
عبیداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما — ۳۲۹
عباسؓ بن عبدالمطلب — ۲۵۱ - ۲۵۳ - ۲۵۶
عباسؓ بنو — ۱۸۱ - ۱۸۶
عبدالاحد خاں — ۱۶۶ - ۱۷۲
عبدالقادر جیلانیؒ حضرت سید — ۹۵ - ۱۶۰
عبدالکریمؒ۔ حضرت مولوی — ۱۷۰ - ۱۷۲ - ۲۷۱
عبداللطیف شہیدؒ۔ صاحبزادہ سید — ۱۸۶
عبدالرحمٰن شہیدؒ۔ مولوی — ۱۸۶
عبدالمطلب — ۲۱۷
عبدالرحمٰنؓ بن عوف — ۲۴۷ - ۲۵۳ - ۲۵۶ - ۳۸۲
عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ — ۲۴۸
عبدالمجید شہزادہ — ۲۹۴
عتبہ — ۲۴۷ - ۲۶۹ - ۲۷۱
عثمانؓ بن عفان۔ حضرت خلیفۃ الرسول الثالث — ۳۰ - ۳۱ - ۸۵ - ۲۲۵ - ۲۴۷ - ۲۵۱ - ۲۶۱

عثمانؓ بن مظعون ۔ ۲۴۷ - ۲۵۳ - ۲۷۶
عراق ۔ ۵۰ - ۱۴۸ - ۳۵۵ - ۳۶۶ - ۳۷۸
عرفات ۔ ۱۲۰ - ۱۲۲ - ۱۲۷ - ۳۵۸
عضل قبیلہ ۔ ۲۳۱
عُقبہ رضی اللہ عنہ ۔ ۱۰۰
عکرمہ بن ابی جہل ۔ ۲۷۰ - ۲۷۴
علیؓ بن ابی طالب ۔ حضرت خلیفۃ الرسول الرابع ۔
۳۰ - ۳۸ - ۱۰۰ - ۱۸۱ - ۲۲۵ - ۲۴۷ - ۲۵۱
عمرؓ بن خطاب ۔ حضرت خلیفۃ الرسول الثانی ۔ ۳۰ - ۳۸ - ۱۰۰
۱۸۱ - ۲۲۵ - ۲۴۷ - ۲۵۱
عمرؓ بن ابی سلمہ ۔ ۹۰
عمر بن عبدالعزیز ۔ ۲۲۴ - ۲۳۲
عمروؓ بن عاص ۔ ۳۶۱ - ۳۶۳
عمر بن وہب الجمحی ۔ ۳۷۶
عیسیٰ مسیح ناصری علیہ السلام ۔ ۸۰ - ۸۹ -
۹۵ - ۹۸ - ۱۵۳ - ۲۵۱ - ۳۵۶
غلام احمد مسیح موعود علیہ السلام ۔ حضرت مرزا ۔
۱۲ - ۱۳ - ۱۹ - ۲۱ - ۲۲ - ۲۵ -
۴۵ - ۵۴ - ۹۹ - ۱۳۶ - ۱۴۷ -
۱۶۹ - ۱۸۰ - ۲۲۳ - ۲۴۲ - ۲۶۱
۲۷۱ - ۲۸۰ - ۳۲۵ - ۳۳۴ -
۳۳۶ - ۳۸۳
غلام محمد حکیم ۔ ۱۶۶ - ۱۷۲

فاطمہؓ بنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ۔ ۸۵
فتح مکہ ۔ ۲۶۹
فرانس ۔ ۱۴۱ - ۱۸۳
فرعون ۔ ۶۴
فریدالدین شکر گنجؒ ۔ ۴۰۱ - ۴۰۴
فضل برمکی ۔ ۲۳۶
فضل الرحمٰنؓ ۔ مفتی ۔ ۲۱۷
فضیلؒ بن عیاض ۔ ۸۷
فلسطین ۔ ۲۷۹ - ۳۲۲

قادیان ۔ ۲۲ - ۱۱۸ - ۲۶۰ - ۳۱۱ -
۳۱۴ - ۳۲۷ - ۳۴۰ - ۳۹۴
قارہ قبیلہ ۔ ۲۳۱
قارون ۔ ۳۴۴ - ۳۴۹
قاسم کمانڈا حاجی چیف ۔ ۴۰۳
قبلائی خاں ۔ ۳۲۳ - ۳۲۶

کابل ۔ ۱۹۳
کافور ۔ ۳۴۱
کرپیا مسٹر ۔ ۳۹۰
کُدی ۔ ۱۴۸
کشمیر ۔ ۱۵۶ - ۱۶۹ - ۱۷۶
کعبہ ۔ ۲۰۲ - ۲۴۶ - ۲۵۷ - ۲۶۶ -
۲۶۹ - ۳۵۱ - ۳۵۸ - ۳۹۹
کعب بن اشرف ۔ ۲۹
کنفیوشس مذہب ۔ ۲۷۱

گاندھی مہاتما ۔ ۳۳۹ - ۳۷۸
گلاب سنگھ مہاراجہ ۔ ۱۷۶ - ۱۸۶

لاہور - ۱۶۱ - ۳۲۸
لبید شاعر - ۲۶۷
لوط علیہ السلام - ۱۵۰ - ۱۹۹ - ۳۱۱ - ۳۱۲

مبارکہ بیگم - حضرت سیدہ نواب - ۲۱۹
حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم - ۱ - ۱۱ - ۲۵ - ۲۶ - ۲۷ - ۲۸ - ۴۲ - ۴۴ - ۴۹ - ۶۱ - ۶۳ - ۶۶ - ۹۴ - ۹۵ - ۱۱۶ - ۱۳۸ - ۱۴۲ - ۱۴۹ - ۱۸۱ - ۲۱۴ - ۲۲۴ - ۲۲۹ - ۲۳۳ - ۲۴۵ - ۲۴۸ - ۲۵۰ - ۲۶۵ - ۲۶۹ - ۲۹۱ - ۳۰۲ - ۳۰۵ - ۳۱۹ - ۳۲۹ - ۳۴۳ - ۳۴۵ - ۳۶۱
محمد سرور شاہؓ - حضرت سید - ۱۶۹ - ۱۷۱ - ۴۰۲
محمد صادقؓ - حضرت مفتی - ۲۸۲
محمد ابراہیمؓ بقاپوری - مولوی - ۲۶۳ - ۲۶۴
محمد بن یزید الدمشقی - ۳۴۳
محمد قاسم نانوتوی - مولانا - ۴۰۱ - ۴۰۲ - ۴۰۴
محمد صدیق امرتسری - مولانا - ۴۰۳
محمد احمد - مولوی - ۴۰۴
محمد حسین بٹالوی مولوی - ۶۶ - ۶۹
محمد علی مولوی - ۵۱
مدینہ منورہ - ۲۲۸ - ۳۰۲
مروہ - ۶۳ - ۸۲ - ۱۲۲ - ۱۵۶ - ۲۲۱ - ۲۲۲
مریم صدیقہ - ۲۷۰
مزدلفہ - ۱۲۰ - ۱۲۲ - ۱۲۶
مصر - ۳۱۶ - ۳۵۵ - ۳۷۸
معاویہ بن یزید - ۲۲۴ - ۲۳۲
معین الدین چشتی - خواجہ - ۴۰۰ - ۴۰۳ - ۴۰۴
مقداد بن عمرو - ۳۷
مکہ معظمہ (وادی غیر ذی زرع) - ۳ - ۴ - ۱۵ - ۱۶ - ۱۹ - ۵۱ - ۸۱ - ۱۲۰ - ۱۲۳ - ۱۲۶ - ۱۳۱ - ۱۳۴ - ۱۴۶ - ۱۵۱ - ۲۰۲ - ۲۱۱ - ۲۱۸ - ۲۲۱ - ۲۴۵ - ۲۴۹ - ۲۵۱ - ۲۵۹ - ۲۶۵ - ۳۵۱ - ۳۸۵ - ۳۹۹
منیٰ - ۱۵ - ۱۲۰ - ۱۲۲ - ۱۲۶ - ۲۴۲ - ۳۵۱
منماڑ ریلوے جنکشن - ۷۹
منصوری پہاڑ - ۱۴۱
منصور حلاجؒ - ۱۷۸ - ۱۸۶
موسیٰ علیہ السلام - ۴۲ - ۴۶ - ۹۸ - ۲۵۱ - ۲۷۸
مولود احمد - ۳۳۸
میرٹھ - ۲۳۹

نادر شاہ - ۳۸۹ - ۳۹۶
ناصر نوابؓ - ناناجان حضرت میر - ۲۰۸ - ۲۴۰ - ۲۴۳
نپولین - ۴۰
ندوۃ العلماء لکھنؤ - ۴۰۲

نظام الدین اولیاء — ۲۵۳ - ۲۵۶
نظام الدین مرزا — ۲۱۳ - ۲۳۱
نعمت اللہ خاں شہید مودی — ۱۸۷
نوح علیہ السلام — ۴۲ - ۴۶ - ۱۵۱ - ۲۵۱
نور علی شہید قاری — ۱۸۷

واٹرلو — ۴۱
ولید بن مغیرہ — ۲۶۵
ولیم میور سر — ۳۷۰
ولیم سر چیف آف دی جنرل سٹاف — ۳۹۰
ولی اللہ شاہ محدث دہلوی — ۴۰۳ - ۴۰۴

ہاجرہ رضی اللہ عنہا — ۴ - ۱۵ - ۱۷ - ۲۱ - ۶۱ - ۶۲ - ۸۱ - ۱۰۷ - ۱۲۱ - ۱۵۵ - ۱۵۹ - ۱۹۱ - ۲۱۰ - ۲۱۸ - ۲۵۹ - ۳۸۸ - ۳۹۳
ہاٹن ٹاٹ قبیلہ — ۱۷۴
ہارون الرشید — ۲۳۶
ہامان — ۴۶

ہابیل — ۵۸
ہٹلر اوڈلف — ۲۷۹ - ۲۸۱
ہلاکو خان — ۳۲۳ - ۳۲۶
ہمایوں شہنشاہ نصیر الدین محمد — ۴۰ - ۵۲
ہندوستان — ۱۵ - ۲۱ - ۱۹۳ - ۳۵۵ - ۳۷۸
ہوَن — ۳۹
ہوازن بنو — ۲۷
ہوشیارپور — ۳۸۳

یحییٰ برمکی — ۲۳۶
یزید بن معاویہ — ۱۵۷ - ۲۲۳
یعقوب علیہ السلام — ۲۵۰
یعقوب علی عرفانی شیخ — ۹ - ۷۹ - ۲۱۷ - ۲۳۱
یوحنا حواری — ۹۶
یورپ — ۲۱ - ۸۷ - ۲۶۲ - ۳۲۲ - ۳۵۲ - ۳۷۹
یورپین مصنفین — ۱۰ - ۱۳
یوسف علیہ السلام — ۲۳۳ - ۲۹۰

کتابیات : BIBLIOGRAPHY

قرآن کریم

الفاتحہ ۱ : ۳۷۵

البقرہ ۲ : ۷-۲۴-۳۸-۶۹-۷۸-۱۱۰-۱۱۸-۱۳۲-۱۹۵-۲۵۵-۲۶۳-
۳۳۵-۳۷۵

آل عمران ۳ : ۱۳-۵۲-۱۸۶-۲۶۴-۳۷۵

النساء ۴ : ۵۳-۱۷۲-۲۳۱-۳۷۵-۳۹۶

المائدہ ۵ : ۳۷-۵۹-۱۳۲-۲۷۵-۳۷۵

الانعام ۶ : ۱۶۳-۳۷۵

الاعراف ۷ : ۵۲-۱۹۵-۲۵۵-۳۲۶-۳۷۵

الانفال ۸ : ۱۱

التوبہ ۹ : ۳۷-۱۶۳-۱۷۲-۱۹۵-۲۳۱-۲۵۵-۳۳۰

یونس ۱۰ : ۵۳

ہود ۱۱ : ۲-۵۲-۱۱۸-۱۶۳-۲۰۷-۳۱۷

یوسف ۱۲ : ۲۹۴

ابراہیم ۱۴ : ۷-۲۳-۲۴-۳۸-۶۸-۹۰-۱۴۷-۱۶۳-۱۷۲-۲۳۱-۲۶۴
۳۱۷-۳۸۴-۳۸۷-۳۹۶

مریم ۱۹ : ۳۸

طٰہٰ ۲۰ : ۶۹

الانبیاء ۲۱ : ۵۲-۷۸-۱۱۸-۱۶۳-۱۹۵-۲۷۵-۳۹۶

الحج ۲۲ : ۷-۱۳-۱۶۳-۲۶۳-۲۶۴-۳۹۶

الفرقان ۲۵ : ۵۲

الشعراء ۲۶ : ۱۶۴

العنکبوت ۲۹ : ۷۸

الروم ۳۰ : ۳۹۶

الاحزاب ۳۳ : ۳۷-۱۱۱-۲۵۵-۳۴۹

سبا ۳۴ : ۳۷۵

یٰسٓ ۳۶ : ۵۲

الصّٰفّٰت ۳۷ : ۷-۲۳-۵۳-۶۸-۷۸-۱۱۰-۱۱۱-۱۷۲-۲۶۳-۲۶۴-
۲۸۱-۲۹۳-۳۰۵-۳۱۷-۳۴۹-۳۵۰-۳۸۴-۳۸۷-۳۹۶-۴۰۳

الزمر ۳۹ : ۱۶۴

المؤمن ۴۰ : ۵۳

الشوریٰ ۴۲ : ۳۹۶

محمّد ۴۷ : ۷۸

الفتح ۴۸ : ۲۵۵

الحجرات ۴۹ : ۱۸۶

قٓ ۵۰ : ۲

الذّٰریٰت ۵۱ : ۱۳-۲۵۶-۳۱۷

النجم ۵۳ : ۵۲

التحریم ۶۶ : ۹۰

الدّھر ۷۶ : ۳۴۹

الضّحٰی ۹۳ : ۵۹-۱۱۸

الکوثر ۱۰۸ : ۳۶

الاخلاص ۱۱۲ : ۳۰۵

تفاسیر قرآن کریم

تفسیر الدر المنثور مصنفہ امام جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطیؒ جلد ۱ : ۳۸

جلد ۲ : ۲۳۱

جلد ۳ : ۲-۱۶۳-۲۲۶

جلد ۵ : ۱۱۱-۳۸۷

جلد ۶ : ۳۷-۲۴۳

تفسیر فتح البیان مصنفہ ابو الفضل شہاب الدین السید محمود الالوسی البغدادی جلد ۱۰ : ۳۶
تفسیر کبیر مصنفہ امام فخر الدین رازیؒ جلد ۴ : ۲۵۵
جلد ۸ : ۳۶ - ۳۷
تفسیر ابن کثیر (حاشیہ بر تفسیر فتح البیان مؤلفہ نواب صدیق حسن خاں) جلد ۲ : ۳۹۷
مصنفہ حافظ عماد الدین ابو الفداء اسمٰعیل بن عمر ابن کثیر جلد ۱۰ : ۳۶ - ۳۷
تفسیر الکشاف مصنفہ امام ابو القاسم جار اللہ محمود بن عمر الزمخشری الخوارزمی جلد ۲ : ۱۶۴
تفسیر روح البیان مؤلفہ شیخ اسمٰعیل حقی البروسوی جلد ۷ : ۱۸۷
تفسیر ابن جریر مصنفہ امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری جلد ۱۱ : ۳۳۵
تفسیر کبیر مصنفہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانیؓ جلد ۵ حصہ سوم ۳۴۹
قدسی العرفان تفسیر سورۃ النجم من القرآن مصنفہ محمد نوزی : ۱۱۸ - ۱۶۳
ارض القرآن مؤلفہ سید سلیمان ندوی جلد اوّل ۲۳۰ - ۲۳۱
انوارِ انبیاء ادارہ تصنیف و تالیف لاہور ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز ۷ — ۲۳۱

کُتبِ احادیث و فقہ

جامع صحیح بخاری مؤلفہ امام ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری ۲ - ۷ - ۲۳ - ۲۴ - ۳۶ - ۳۷
۳۸ - ۵۳ - ۵۹ - ۶۸ - ۶۹ - ۷۴ - ۷۸ - ۸۹ - ۹۵ - ۱۱۵ -
۱۲۷ - ۱۳۲ - ۱۶۳ - ۱۶۴ - ۱۷۲ - ۲۰۷ - ۲۳۱ - ۲۴۳ - ۲۵۵
۲۶۴ - ۲۷۴ - ۲۷۵ - ۲۹۴ - ۳۰۵ - ۳۳۵ - ۳۴۹ - ۳۹۶
صحیح مسلم مؤلفہ امام ابو الحسین مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری ۲ - ۳۶ - ۳۸ - ۷۴ - ۱۱۰
۱۴۷ - ۲۴۳ - ۳۴۹ - ۳۶۲
جامع ترمذی و شمائل ترمذی مؤلفہ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی ۲ - ۳۷ - ۵۲ - ۵۳ - ۵۹
۷۴ - ۷۸ - ۱۲۷ - ۱۴۰ - ۱۶۴ - ۱۸۷ - ۲۹۴ - ۳۳۵
سُنن ابی داؤد مؤلفہ ابی داؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی ۱۳ - ۳۷ - ۷۴ - ۹۰ - ۱۱۵
۱۴۷ - ۱۸۷ - ۲۳۰ - ۲۶۴ - ۲۹۴
سُنن نسائی مؤلفہ امام ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی النسائی ۷۴ - ۱۲۶ - ۳۱۶
سُنن ابن ماجہ مؤلفہ حافظ ابو عبداللہ محمد بن یزید القزوینی ابن ماجہ ۷ - ۳۷ - ۲۳۰ - ۲۵۵ - ۲۹۴
۳۰۵ - ۳۲۵ - ۳۴۹ - ۴۰۳

موطا امام مالک مؤلفہ ابوعبداللہ مالک بن انس ۲۳۱-۲۹۴

زرقانی شرح موطا امام مالک مؤلفہ محمد بن عبدالباقی بن یوسف الزرقانی جلد ۱: ۱۴۷

مسند احمد بن حنبل مؤلفہ امام ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل جلد ۱: ۵۹
جلد ۴: ۱۸۷

مشکوٰۃ المصابیح مؤلفہ محمد بن عبداللہ التبریزی ۳۶-۷۴

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ المصابیح للعلامہ علی بن سلطان محمد القاری جلد ۲: ۳۲۶

مجمع بحار الانوار مؤلفہ الشیخ محمد طاہر ۲۳-۱۲۷-۱۷۱-۱۹۵

کنز العمال مؤلفہ الشیخ علاؤ الدین علی المتقی بن حسام الدین الہندی جلد ۶: ۲۵۵

السنن الکبریٰ مؤلفہ ابوبکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی جلد ۳: ۷۴-۱۴۷-۲۴۳-۲۶۴
۲۹۴-۳۱۶
جلد ۵: ۵۹-۶۸

الخصائص الکبریٰ علامہ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی جلد ۱: ۲۰۷

سنن دارمی مؤلفہ امام ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی جلد ۱: ۶۸ جلد ۲: ۱۴۵

سنن دارقطنی مؤلفہ علی بن عمر الدارقطنی مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۶ء جلد ۲: ۲۹۴

المنتقیٰ من اخبار المصطفیٰ مؤلفہ ابوالبرکات عبدالسلام بن تیمیۃ الحرانی ۱۴۷

المصنف للحافظ ابی بکر عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی مطبوعہ بیروت ۱۹۷۱ء جلد ۳: ۱۴۷

کشف الغمہ مؤلفہ الشیخ عبدالوہاب الشعرانی جلد ۱ مطبوعہ مصر ۲۹۴

المغنی لابن قدامہ مؤلفہ ابواحمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ ۱۴۷

کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ مؤلفہ عبدالرحمٰن الجزیری جلد ۱: ۷۲-۲۹۴-۳۳۵-۳۶۲

نیل الاوطار مصنفہ محمد بن علی الشوکانی جلد ۲: ۲۰۷
جلد ۳: ۷۴-۱۴۷-۲۰۷

فقہ احمدیہ حصہ اوّل ۷۴

"عید کی قربانیاں" مصنفہ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب ایم اے رضی اللہ عنہ ۳۰۵

کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام

حقیقۃ الوحی ۱۳-۹۴-۱۷۳

تحفہ گولڑویہ ۱۳-۱۴۵
خطبہ الہامیہ ۷ - ۱۳ - ۳۶ - ۳۸ - ۱۶۱
الاستفتاء ۲۴
براہین احمدیہ حصّہ پنجم ۲۴ - ۱۴۰ - ۱۹۵
فتح اسلام ۲۴ - ۱۴۵ - ۱۶۴ - ۲۳۲
ایک غلطی کا ازالہ ۳۸
آئینہ کمالات اسلام ۵۲
الوصیت مطبوعہ ۱۹۶۱ء ۱۱۱
تریاق القلوب ۱۱۸
بشیر احمد۔ شریف احمد اور مبارکہ کی آمین ۱۶۴-۲۷۵
اعجاز احمدی ۲۷۵
تذکرہ (مجموعہ الہامات و رؤیا و کشوف حضرت مسیح موعود علیہ السلام) طبع سوم ۳۸ - ۵۲ - ۱۴۰ - ۱۹۵ - ۲۸۱ - ۳۲۶ - ۳۳۵ - ۳۴۹
تبلیغ رسالت جلد ۶ : ۳۸
جلد ۱۰ : ۱۴۷
ملفوظات جلد ۱ : ۲۷۵
جلد ۳ : ۱۳
جلد ۴ : ۱۴۰
جلد ۶ : ۱۸۷
جلد ۷ : ۱۳-۲۴
جلد ۸ : ۲۴-۲۶۴
جلد ۹ : ۱۱۰
جلد ۱۰ : ۲۴

کتب سیرت، تاریخ و تصوّف

سیرت المہدی مصنفہ حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ ایم اے حصّہ دوم ۱۷۲ - ۳۴۹
حصّہ سوم ۲۴

السیرۃ الامام ابی محمد عبدالملک ابن ہشام جلد ۱ : ۹۰ - ۲۷۴
جلد ۲ : ۳۷ - ۲۷۴
جلد ۳ : ۳۷
ذکر حبیب مؤلفہ حضرت مفتی محمد صادق صاحب رضی اللہ عنہ ۳۳۵
سیرت ابن ہشام (اردو ترجمہ از شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی) ۵۲ - ۵۳ - ۲۷۴
السیرۃ الحلبیہ مؤلفہ علامہ علی بن برہان الدین الحلبی جلد ۱ : ۹۰ - ۲۳۱
جلد ۲ : ۵۳ - ۲۷۴
تاریخ الخمیس مصنفہ علامہ الشیخ حسین بن محمد بن الحسن الدیار بکری جلد ۱ : ۶۹ - ۱۶۴ - ۲۳۰ - ۲۵۵
۲۷۴ - ۳۰۵
جلد ۲ : ۳۲۵ - ۳۲۶

نور الیقین فی سیرۃ خیر المرسلین مصنفہ محمد خضری ۹۰
حیاۃ النبیؐ مصنفہ شیخ یعقوب علی عرفانی حصہ سوم ۱۸
حیات نور الدینؓ مطبوعہ دسمبر ۱۹۲۲ء ۲۶۴
حیاتِ نور مصنفہ شیخ عبدالقادر صاحب ۲۶۴
تزک بابری مترجمہ مولوی محمد ابراہیم علی چشتی ۲۸۱
سیرۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم مولفہ علامہ شبلی نعمانی جلد اوّل ۳۷۶
سوانح احمدی مصنفہ محمد جعفر تھانیسری ۳۹۶
کتاب الطبقات الکبیر موسومہ طبقات ابن سعد مصنفہ محمد بن سعد کاتب الواقدی جلد ۱ : ۳۷ - ۶۸ - ۹۰
جلد ۳ : ۳۷ - ۶۸
تاریخ کامل مؤلفہ الشیخ ابی الحسن علی بن ابی المکرم الشیبانی المعروف ابن الاثیر
جلد ۲ : ۳۷ - ۲۵۵ - ۲۷۴ - ۳۶۳ - ۳۷۶ - ۳۸۴
جلد ۳ : ۳۷
جلد ۴ : ۲۳۲
معجم البلدان مؤلفہ ابوعبداللہ یاقوت بن عبداللہ الحموی جلد ۳ : ۳۷
جلد ۸ : ۱۳۷ - ۲۵۵
اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ مؤلفہ ابن الاثیر جلد ۱ : ۳۶۳
جلد ۲ : ۳۸ - ۱۱۱ - ۳۲۶
جلد ۳ : ۲۷۴ - ۳۸۴

خلاصۃ التواریخ مصنفہ سبحان رائے بٹالوی ۵۲

منتخب اللباب (مغلیہ دورِ حکومت) مصنفہ خافی خاں مترجمہ محمود احمد فاروقی جلد ا : ۵۲

تاریخ ہندوستان مصنفہ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ جلد ۳ : ۵۲

تاریخ طبری مؤلفہ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری جلد ا : ۸۲-۱۶۳-۱۶۴-۲۷۴

جلد ۲ : ۶۹-۹۰-۲۵۵-۳۷۶

جلد ۳ : ۵۳-۹۰-۳۸۴

جلد ۷ : ۱۸۶

ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام مصنفہ علامہ عباس محمود العقاد المصری مترجمہ راغب رحمانی

۶۸ - ۱۱۸ - ۱۳۲

زرقانی شرح المواہب اللدنیہ مؤلفہ امام علامہ محمد بن عبدالباقی الزرقانی جلد ا : ۶۹-۹۰-۲۳۱-۲۵۵-۲۷۴-۳۶۳

جلد ا : ۲۰۷-۲۳۱-۳۷۶

زاد المعاد للامام علامہ شمس الدین ابی عبداللہ محمد بن عبدالمالک المشہور بابن قیم جلد ا : ۹۰

کتاب الاصابہ فی تمییز الصحابہ مؤلفہ شہاب الدین احمد بن علی المشہور بابن حجر العسقلانی جلد ۵ : ۹۰

جلد ۶ : ۳۶۳

جلد ۹ : ۱۸۶

فتوح الشام واقدی جلد ا : ۱۱۱

الفاروق مؤلفہ علامہ شبلی نعمانی ۱۱۱

طبقات الشافعیۃ الکبریٰ مؤلفہ شیخ الاسلام تاج الدین السبکی جلد ۲ : ۱۳۲

تفریح الازکیا فی احوال الانبیاء مؤلفہ مولوی ابوالحسن کاکوروی جلد ا : ۱۶۳

الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب للحافظ ابی عمر یوسف بن عبداللہ المعروف بابن عبدالبر النمری القرطبی

جلد ۲ : ۱۸۶

تاریخ ابن خلدون موسومہ بہ تاریخ الانبیاء مترجمہ علامہ حکیم احمد حسین الہ آبادی جلد ا : ۲۳۱

جلد ۲ : ۲۷۴

بحار الانوار مؤلفہ علامہ باقر مجلسی (یکے از شیعہ کتب) جلد ۱۰ : ۲۳۲

تاریخ احمدیت مؤلفہ مولانا دوست محمد صاحب شاہد فاضل جلد ۲ : ۲۶۴

جلد ۳ : ۳۸۴

جلد ۴ : ۲۶۴-۳۶۲-۴۰۴

تاریخ احمدیت مؤلفہ مولانا دوست محمد صاحب شاہد فاضل جلد ۵ : ۶۹ - ۲۹۴
جلد ۷ : ۳۴۹
جلد ۸ : ۴۰۳
جلد ۱۰ : ۲۹۴
جلد ۱۱ : ۳۱۷
جلد ۱۲ : ۴۰۳
اصحابِ احمد مؤلفہ ملک صلاح الدین صاحب ایم۔اے جلد ۲ : ۲۶۴
جلد ۳ : ۳۸۴
انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم مؤلفہ ولیم ایل لینگر مترجمہ غلام رسول مہر جلد ۱ : ۳۲۶
جلد ۲ : ۳۲۶
البدایہ والنہایہ مؤلفہ ابن الاثیر جلد ۷ : ۳۸۴
بھارت کا بحران مصنفہ رونلڈ سیگل مترجمہ حسن عابدی ۱۹۵
مثنوی مولانا روم دفتر چہارم ۸۷
تذکرۃ الاولیاء مترجمہ عبدالرحمٰن شوق مطبوعہ لاہور ۸۷
سفینۃ الاولیاء مصنفہ داراشکوہ ۱۱۰
نیا تذکرۃ الاولیاء مؤلفہ رئیس احمد جعفری ۱۱۰ - ۱۶۴ - ۱۸۶ - ۳۴۹
گلدستہ کرامات مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء ۱۱۰
تذکرہ اولیائے ہند جلد ۳ : ۱۸۶
تذکرۃ الاولیاء ناشر ملک چنن دین وغیرہ تاجر کتب کشمیری بازار لاہور ۱۸۶
موجِ کوثر مطبوعہ فیروز سنز لاہور ۱۹۰۸ء ۴۰۱ - ۴۰۲
تعبیر الرؤیاء مصنفہ امام محمد ابن سیرین مترجمہ سید حبیب احمد ہاشمی ۱۸۷
تعطیر الانام مؤلفہ الشیخ عبدالغنی النابلسی جزو اول ۲۵۶
خیر المجالس مرتبہ حمید شاعر القلندر ۱۲۷ - ۱۷۱
نزہۃ المجالس و منتخب النفائس مصنفہ عبدالرحمٰن الصفوری جلد ۲ : ۵۳ - ۱۲۲ - ۲۴۳
کتاب تحفۃ المجالس و نزہت المجالس مؤلفہ علامہ جلال الدین السیوطیؒ ۲۴۳

کتبِ ادب، کلام و عقائد

مجانی الادب فی حدائق العرب جز ثانی ۲۴

دیوان غالب مطبوعہ ۱۹۶۱ء ۳۸-۳۸۴

دیوان حسان بن ثابت مع شرح مطبوعہ مصر ۱۹۲۹ء ۵۲

آبِ حیات مصنفہ مولانا محمد حسین آزاد ۲۸۵-۲۹۴

انتخاب ضرب الامثال و الحکم فارسی مؤلفہ آقائے علی اکبر ۳۳۵

الملل و النحل مصنفہ امام ابی الفتح محمد بن عبد الکریم الشہرستانی جلد ۳: ۱۲۷-۲۰۷-۲۵۵

الیواقیت و الجواہر مصنفہ امام عبد الوہاب شعرانی جلد ۲: ۳۹۶

حُسنُ الاُسوۃِ بماثبت من اللہ و رسولہٖ فی النسوۃِ مؤلفہ نواب محمد صدیق حسن خان ۱۳۰۱ھ ۲۷۵

لُغات

لسان العرب للامام العلامہ ابن منظور جلد ۷: ۲۵۵

جلد ۱۴: ۱۳

المفردات فی غریب القرآن للامام راغب الاصفہانی ۳۶-۳۷-۱۹۵-۲۰۷-۲۷۵

محیط المحیط مؤلفہ المعلم بطرس البستانی جلد ۲: ۱۹۵

تاج العروس للامام ابی الفیض السید محمد مرتضیٰ الحسینی جلد ۳: ۲۷۵

جلد ۸: ۲۰۷

المنجد ۱۲۷-۱۶۴

فرہنگ آصفیہ مطبوعہ ۱۹۰۸ء جلد ۱: ۳۸۴

جلد ۴: ۲۳۱-۳۸۴

پُرانا عہد نامہ

پیدائش باب ۱۱: ۱۶۳

باب ۱۲: ۱۱۸-۳۱۷

باب ۱۵: ۹۰

باب ۱۶: ۶۸-۹۰-۱۱۸-۲۳۰

پیدائش باب ۱۷ : ۲۳۰
باب ۱۸ : ۱۱۸—۱۶۳—۲۰۷—۳۱۷
باب ۲۱ : ۲۲—۴۴—۹۰—۱۰۴
باب ۲۲ : ۶۸—۱۱۱—۱۳۷—۲۶۴—۲۹۳—۳۱۷—۳۲۶—
۳۵۰—۳۸۷
باب ۲۳ : ۲۳۰
باب ۲۴ : ۲۸۱
باب ۲۵ : ۱۳۲
گِنتی باب ۱۱ : ۱۱۰—۲۳۰
یسعیاہ باب ۸ : ۳۸۷

نیا عہد نامہ

متی باب ۴ : ۳۴۹
باب ۹ : ۱۱۰
باب ۱۰ : ۱۶۴
باب ۱۹ : ۹۰
باب ۲۸ : ۳۴۹
مرقس باب ۲ : ۱۱۰
باب ۱۰ : ۳۶۲

متفرق کُتب

علم الامراض مصنّفہ میر اشرف علی ۱۴۰
"دیدوں کی قربانیاں اور چڑھاوے" مطبوعہ لدھیانہ مشن ۱۹۰۳ء ۱۷۲
مخزن الجواہر مؤلفہ شمس الاطبا حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی خاں ۲۹۴
پیدائش کی کتاب کی تفسیر مصنّفہ پادری کینن سیل مترجمہ ای جوزف ۳۸۷

اخبارات و رسائل

بدر قادیان	۷ر دسمبر ۱۹۱۱ء	۲
الفضل قادیان	۳ر نومبر ۱۹۱۴ء	۷
	۳۱ر اکتوبر ۱۹۱۵ء	۱۳
	۲۴ر اکتوبر ۱۹۱۶ء	۲۳
	۲ر اکتوبر ۱۹۱۷ء	۳۶
	۲۸ر ستمبر ۱۹۱۸ء	۵۲
	۲۰ر ستمبر ۱۹۱۹ء	۵۹
	۶ ستمبر ۱۹۲۰ء	۶۸
	۵ر اگست ۱۹۲۱ء	۷۰
	۱۰ر اگست ۱۹۲۱ء	۷۱
	۱۷ر اگست ۱۹۲۲ء	۷۴
	۲۱ر جولائی ۱۹۲۳ء	۷۵
	۳ر اگست ۱۹۲۳ء	۷۸
الحکم قادیان	۲۱ر جولائی ۱۹۲۴ء	۷۹
الفضل قادیان	۲۱ر جولائی ۱۹۲۵ء	۸۹
	۱۳ر جولائی ۱۹۲۶ء	۱۱۰
	۲۱ جون ۱۹۲۷ء	۱۱۸
	۵ر جون ۱۹۲۸ء	۱۲۷
	۲۸ر مئی ۱۹۲۹ء	۱۳۱
	۸ر اپریل ۱۹۳۰ء	۱۴۰
	۹ر مئی ۱۹۳۰ء	۱۴۰
	۶ر مئی ۱۹۳۰ء	۱۴۰
	۲۶ر اپریل ۱۹۳۲ء	۱۴۵
	۱۶ر اپریل ۱۹۳۳ء	۱۶۳
	۲۷ر مارچ ۱۹۳۴ء	۱۷۳
الفضل قادیان	۳ر اپریل ۱۹۳۴ء	۱۷۱
	۴ر اپریل ۱۹۳۵ء	۱۸۵
	۸ر مارچ ۱۹۳۶ء	۱۹۵
	۴ر مارچ ۱۹۳۷ء	۲۰۷
	۱۵ر مارچ ۱۹۳۸ء	۲۳۰
	۹ر مئی ۱۹۴۰ء	۲۵۵
	۱۷ر جنوری ۱۹۴۱ء	۲۶۳
	یکم جنوری ۱۹۴۲ء	۲۶۵
	۸ر جنوری ۱۹۴۲ء	۲۷۴
	۲۲ر دسمبر ۱۹۴۲ء	۲۷۶
	۱۱ر دسمبر ۱۹۴۳ء	۲۷۷
	یکم دسمبر ۱۹۴۴ء	۲۸۱
	۱۹ر نومبر ۱۹۴۵ء	۲۸۲
	۲۴ر مئی ۱۹۴۷ء	۲۹۳
الفضل لاہور	یکم نومبر ۱۹۴۷ء	۳۰۴
	۸ر مارچ ۱۹۴۹ء	۳۱۶
	۲۳ر مئی ۱۹۵۰ء	۳۲۵
ڈان کراچی	۱۲ر ستمبر ۱۹۵۰ء	۳۳۵
الفضل لاہور	۷ر اکتوبر ۱۹۵۱ء	۳۴۸
	۳ر اکتوبر ۱۹۵۲ء	۳۶۳
المصلح کراچی	۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۳ء	۳۵۷
الفضل ربوہ	۱۳ر اگست ۱۹۵۵ء	۳۸۷
	۱۷ر جولائی ۱۹۵۶ء	۲۴۲
	یکم اگست ۱۹۵۷ء	۴۰۳
	۲ر جولائی ۱۹۵۸ء	۴۰۵
	۱۰ر جون ۱۹۵۹ء	۳۹۶
	۹ر مئی ۱۹۶۲ء	۳۳۴

رسالہ جامعہ احمدیہ سالنامہ ۱۹۳۰ء ۱۷۲
ریویو آف ریلیجنز انگریزی ۱۹۲۳ء ۹۰

انگریزی کتب

GEORGE SALE : The Koran P. 13

MAX MULLER : The Sacred Books of the East Pixxv (Introduction). P. 13

WILLIAM MUIR : Life of Mahomet (Mohammad p.b.u.h.) P. 13-376

H.A.L. FISHER : Napolean P. 52

Encyclopaedia Britannica P. 52-186

Commentry on the Old Testament 1893 P. 69

Encyclopaedia of Religion and Ethics P. 110, 118, 147, 172,207

The Jewish Encyclopaedia P. 118, 132, 163

Fredrick H. Martens : The Story of Religion and Philosophic Thought P. 118

MATHEW HENRY : The Family Devotional Bible with Copious Notes and Reflections on the Old and New Testament P. 230

Encyclopaedia of Islam. P. 326

THE EPIC OF MAN (TIME — LIFE INTERNATIONAL) P. 384

R.J. UNSTEAD : looking at History P. 384

M. S. SABIR : Story of Khyber P. 396

ARNOLD FLETCHER : Afghanistan Highway of Conquest. P. 396

JOHN GUNTHER : Inside Africa P. 403

PRINTED BY [illegible] LAHORE